نئے افق

کراچی

























پبلشر مشتاق احمد قریشی پرنٹر جمیل حسن مطبوعہ ابن حسن پرنٹنگ پریس ہاکی اسٹیڈیم کراچی
دفتر کا پتا: 7 فرید چیمبرز عبداللہ ہارون روڈ صدر کراچی

خط و کتابت کا پتہ: آنچل پوسٹ بکس نمبر 75 کراچی 74200 فون 021-35620771/2
فیکس: 021-35620773 ای میل info@aanchal.com.pk

دستک

مشتاق احمد قریشی

دیکھنا ہے کہ آگے آگے ہوتا ہے کیا؟

ذرائع ابلاغ پر آج کل بس ایک ہی شخصیت نے دھوم مچا رکھی ہے وہ ہے عزیر بلوچ۔ عزیر بلوچ کی گرفتاری ظاہر کرنے کے بعد سے ایسے ایسے ہولناک انکشافات کا سلسلہ چل نکلا ہے کہ الامان والحفیظ۔ کہنے والے کہہ رہے ہیں کہ عزیر بلوچ نے سیاسی شخصیات خصوصاً پیپلز پارٹی کی سیاسی قیادت سے رابطوں کے علاوہ ان کی ایما پر ہر ماہ تقریباً دس کروڑ روپے کی رقم بھتے کی صورت وصول کرتا رہا ہے اور اس کے علاوہ اغوا برائے تاوان کی وارداتوں کے ذریعے بڑی بڑی رقوم حاصل کی گئیں جو سندھ کی حکمران جماعت جس میں پیپلز پارٹی کی قیادت اور متعلقہ پولیس افسران اور عہدیداران اور حکمران جماعت کی اعلیٰ قیادت کو دی گئیں حکمران جماعت کے ایک صوبائی وزیر فشریز کے چیئرمین کے ذریعے لیاری گینگ کو احکامات دیتے تھے۔ ان کی ہی سرپرستی اور احکامات کے مطابق علاقے میں خصوصاً اور کراچی میں خوف کی فضا پیدا کی جاتی تھی۔ عزیر بلوچ نے دوران تفتیش کہنے کو تو بہت کچھ کہا ہے پیپلز پارٹی سے اپنے تعلق کا برملا اظہار بھی کیا ہے جبکہ سندھ کی حکمران جماعت پیپلز پارٹی کے تمام اہم عہدیدار جس کے ساتھ ذرائع ابلاغ نے عزیر بلوچ کی تصاویر بھی شائع کر دیں ہیں۔ اس کے باوجود سید قائم علی شاہ، سید خورشید شاہ، سیدہ فریال تالپور، سید شرجیل میمن، قادر پٹیل سب کے سب یک زبان عزیر بلوچ کا پیپلز پارٹی سے تعلق کا انکار کر رہے ہیں۔ یقیناً اتنے معتبر اور اہم عہدوں پر فائز افراد جھوٹ تو نہیں بول رہے انہوں نے ہی کہا ہے کہ پیپلز پارٹی کا عزیر بلوچ سے کوئی تعلق نہیں ہے تو یہ حقیقت ہے اور درست ہے لیکن عزیر بلوچ نے بھی یہ نہیں کہا کہ اس کا تعلق پیپلز پارٹی سے ہے اس کی اپنی پارٹی لیاری گینگ وار ہے جو کرائے کے قاتل کا کردار ادا کرتی رہی ہے۔ عزیر بلوچ نے بھی تو یہی کہا ہے کہ اس کا تعلق پیپلز پارٹی کے اہم ارکان سے رہا ہے وہ اپنے مقاصد کے لیے اس کی سرپرستی کر رہے ہیں اور اپنے کام کراتے رہے ہیں اپنا الو سیدھا کرتے رہے ہیں اب جبکہ عزیر بلوچ دام میں آ گیا ہے اور اس نے حقیقت حال کا انکشاف شروع کر دیا ہے تو سندھ کی حکمران جماعت اس سے لاتعلقی کا اظہار کر رہی ہے۔ مسئلہ یہ ہے کہ وہ بھی کب پارٹی سے اپنے تعلق کا اظہار کر رہا ہے وہ بھی یہی کہہ رہا ہے کہ پارٹی کے لوگوں نے اس کے ذریعے اپنے من پسند جرائم کرائے ہیں اسے ٹول کے طور پر استعمال کیا گیا ہے اور ان کیے گئے جرائم کی تفصیل بھی اس نے نام بہ نام متعلقہ تحقیقاتی اداروں کو بتا دی ہے۔ دراصل سندھ میں خصوصاً اور وطن عزیز میں عموماً پیپلز پارٹی جس طرح اپنی ساکھ کھو رہی ہے اس کے لیے ضروری تھا کہ کسی نہ کسی حیلے، سہارے سے اقتدار پر اپنی گرفت رکھے چاہے جتنی کمزور ہی کیوں نہ ہو اس باعث پیپلز پارٹی کے اہم ارکان نے فیصلہ کیا تھا کہ سندھ کے شہری علاقوں کی مقبول اور قابل اعتماد سیاسی جماعت جو مقبولیت اور اثر و رسوخ میں پیپلز پارٹی سے آگے نکلتی نظر آ رہی ہے اسے صرف اقتدار سے دور رکھا جائے اور ان کی مثبت مقبولیت کو ہر قیمت پر منفی تاثر میں بدل دیا جائے اپنی اسی کوشش کے لیے پیپلز پارٹی نے عزیر بلوچ اور

اس جیسے دیگر کئی لوگوں کو استعمال کیا جس کا سب سے زیادہ نقصان متحدہ قومی موومنٹ کو پہنچایا گیا سیاسی طور پر اخلاقی طور پر اس کی مقبولیت کو ختم کرنے کم کرنے کی بھرپور کوشش کی گئی۔ اس سلسلے میں ہر قسم کے طور طریقے ہتھکنڈے استعمال کیے گئے اس ہی سلسلے کی ایک کڑی نہ صرف عزیز بلوچ کی ذات شریف تھی بلکہ ہے کہ وہ جو کہتے ہیں کہ بدا چھا بدنام برا۔ اس کے ہی مصداق پیپلز پارٹی نے جرائم تو لیاری گینگ اور عزیر بلوچ کے ذریعے کرائے اور ڈال دیے متحدہ قومی موومنٹ کے کھاتے میں۔ اسے تو پہلے ہی ذرائع ابلاغ اور جرائم پیشہ افراد کے ذریعے کافی بدنام کیا جا چکا ہے بقول متحدہ کی قیادت کے انہیں دیوار سے لگانے کی مذموم کوشش کی گئی ہے۔ پیپلز پارٹی کے وہ لوگ جن جن کے نام عزیر بلوچ نے لیے ہیں کہ وہ اس سے جرائم کراتے رہے ہیں وہ اپنی صفائی میں الٹے سیدھے بیان دے رہے ہیں۔ حقیقت تو یہ ہے کہ افواج پاکستان کے آپریشن سے وہ پریشان ہیں ان کی راتوں کی نیندیں اڑ چکی ہیں پیپلز پارٹی محترمہ بےنظیر کی شہادت کے بعد جن مفاد پرستوں کے قبضے میں آئی انہوں نے اپنے ذاتی مفادات کو فوقیت دی اور پیپلز پارٹی اور ملی مفادات کو داؤ پر لگانے سے بھی گریز نہیں کیا۔ پیپلز پارٹی یقیناً ایک بڑی اور اہم جماعت ہے لیکن چند مفاد پرستوں نے اس کی وہ درگت بنادی ہے کہ جس کی کوئی حد نہیں یہی وجہ ہے کہ پیپلز پارٹی ملک گیر جماعت سے گھٹ کر صرف سندھ کے دیہی علاقوں تک محدود ہو کر رہ گئی ہے وہ بھی اس لیے کہ سندھ کے دیہی علاقوں کے وڈیرہ زمیندار نے اپنے اپنے سیاسی مفادات اور مالی مفادات کے لیے پیپلز پارٹی کو جائے پناہ بنا رکھا ہے۔ اسی سبب گزشتہ برسوں میں ہونے والے قومی انتخابات میں جو نتائج آئے اس نے سندھ میں اس جماعت کی مقبولیت کی حقیقت بھی واضح کر دی ہے رہی سہی کسر بلدیاتی الیکشن نے پوری کر دی ہے۔

پیپلز پارٹی کے چند مفاد پرست عہدیداروں نے اپنے مفادات کے تحفظ اور حصول کے لیے عزیر بلوچ کو نہ صرف استعمال کیا بلکہ اسے دہشت اور بربریت کی علامت کے طور پر بھی کراچی خصوصاً لیاری میں مشہور کیا اسے شہہ دے کر جرائم کرائے۔ قتل غارت گردی کرائی، بھتہ خوری، اغوا برائے تاوان کرانے میں جہاں دولت کا حصول ہو رہا تھا وہیں کراچی کی اہم جماعت جس سے ان بدنیت لوگوں کو خطرہ لاحق تھا کہ وہ اگر اس طرح مقبولیت حاصل کرتی رہی تو وہ خود نہ گھر کے رہیں گے نہ گھاٹ کے شاید اسی باعث ان کے ہاتھ عزیر بلوچ کے توسط سے خون میں رنگتے چلے گئے ہیں اب جس جس طرح وہ اپنی بریت کے لیے تاویلیں دے رہے ہیں اس سے وہ عزیر بلوچ کی پیدا کردہ دلدل میں دھنستے جا رہے ہیں اب ان کے پاس صرف ایک ہی راستہ رہ گیا ہے کہ وہ وفاقی حکومت سے اپنی سیاسی قوت و اہمیت کا سودا کر کے اپنے ہاتھوں پر عزیر بلوچ کے لگائے گئے خون کو صاف کریں یعنی بقول وزیر داخلہ چوہدری نثار علی خان کے مک مکا کر لیں یا ہو سکتا ہے کہ یہ مک مکا پہلے ہی ہو چکا ہو جس کی خبر افواج پاکستان کو نہ دی گئی ہو جس نے عزیر بلوچ کا پنڈورا بکس کھول کر سب کو ہی ایک قطار میں کھڑا کر دیا ہے اب نہ بھاگتے بنے نہ اس مصیبت سے نکلتے بنے گی شاید اس لیے تمام متعلقہ نشاندہ افراد پہلے ہی بیرون ملک نکل چکے ہیں اب چند وہی لوگ رہ گئے ہیں جو حکمرانی کے کسی نہ کسی عہدے پر فائز ہیں وہ بھی خود کو سانپ کے منہ میں چھچھوندر کی طرح محسوس کر رہے ہیں اب دیکھنا یہ ہے کہ آگے آگے ہوتا ہے کیا۔



گفتگو

عمران احمد

"حضرت صہیبؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا مومن بندے کا معاملہ بھی عجیب ہے ہر معاملہ اور ہر حال میں اس کے لیے خیر ہی خیر ہے اگر اسے خوشی اور راحت پہنچے تو وہ اپنے رب کا شکر ادا کرتا ہے اور یہ اس کے لیے خیر ہی خیر ہے اور اگر اسے کوئی دکھ اور رنج پہنچتا ہے تو وہ اس پر صبر کرتا ہے اور یہ صبر بھی اس کے لیے خیر ہی ہے۔" (مسلم)

عزیزان محترم...... سلامت باشد

مارچ کا نئے افق حاضر مطالعہ ہے۔

تمام کام ختم کرنے کے بعد آخری لمحات اپنے قارئین کی عدالت میں پیشی کے ہوتے ہیں۔ یہ وہ موقع ہوتا ہے جب بڑے سے بڑے ایڈیٹر کی ٹانگیں کپکپا جاتی ہیں اور ہمت جواب دے جاتی ہے۔ سو ہم سے کچھ بھی بن پڑا لے کر حاضر ہیں لیکن اس اعتماد کے ساتھ کہ ہمارے قاری ہماری کاوشوں کی قدر ضرور کریں گے۔ اس ماہ امجد جاوید کی عشق کسی کی ذات نہیں اور ناصر ملک کی زاد سفر کا اختتام ہو رہا ہے۔ ہم دونوں حضرات کو مبارک باد دیتے ہیں کہ قارئین نے دونوں مصنفین کی تحاریر کو پسندیدگی کی سند سے نوازا۔ ان شاءاللہ آئندہ ماہ سے امجد جاوید کی نئی سلسلے وار تحریر عورت زاد کا آغاز ہوگا۔

اس ماہ معروف مصنف کاشف زبیر شدید علالت کے باعث اسپتال میں زیر علاج تھے بلکہ اب بھی ہیں لیکن اللہ کا شکر ہے اب ان کی حالت خطرے سے باہر ہے۔ قارئین سے درخواست ہے کہ ان کی کامل صحت یابی کے لیے دعا کریں۔

ہماری قارئین سے درخواست ہے کہ مجید احمد جائی کی فون اور خط میں وضاحت اور معذرت کے بعد اس باب کو ختم کر دیں۔ تنقید ہر قاری کا حق ہے لیکن کوشش کریں کہ آپ کی تنقید کا دائرہ صرف تحریر کے گرد ہی گھومے نہ کہ مصنف کی شخصیت کے گرد آئندہ اس حوالے سے کوئی تحریر شائع نہیں ہوگی۔

اب آیئے اپنے خطوط کی طرف

امجد جاوید...... حاصل پور۔ محترم عمران احمد صاحب، اسلام علیکم ورحمتہ اللہ وبرکاتہ۔ نئے افق کا تازہ شمارہ مجھے ملا۔ یقین جانیں بہت خوشی ہوئی۔ دل چاہا کہ اپنی خوشی آپ اور قارئین محترم کے ساتھ ضرور شیئر کروں۔ نئے افق میں جو حالیہ تبدیلیاں کی گئی ہیں، بلاشبہ وہ رنگ لا رہی ہیں۔ سرورق سے لے کر بیک ورق تک خوب سے خوب تر ہوتا چلا جا رہا ہے۔ لیکن میں ابھی مطمئن نہیں ہوں۔ ابھی اس میں مزید محنت کرنے کی ضرورت ہے۔ خاص طور پر مواد کے معاملے میں۔ میں اپنی بات خطوط سے شروع کروں گا۔ میں بھی محترم قارئین سے مخاطب ہوں۔ ایک لکھاری کا فرض یہ ہے کہ وہ قارئین کے مزاج پر پورا اترے اور قارئین پر لکھاری کا یہ قرض ہے کہ وہ اس کی تحریر پر بھرپور تبصرہ کریں۔ دونوں اسی سے سیکھتے ہیں۔ یہی دائرہ ہے، جس سے دونوں کی سوچ میں وسعت آتی ہے۔ خطوط میں ہم اپنی باتیں زیادہ کرتے ہیں اور ہم جیسے نکمے لکھاری یہ دیکھتے رہ جاتے ہیں کہ یار

ہماری تحریر پر کسی نے کیا تبصرہ کیا، کیا خوبی کیا خامی تھی، مگر ایسا کچھ بھی دکھائی نہیں دیتا۔ یہ طے ہے کہ قارئین ہی اچھی کہانی لکھوا سکتے ہیں، کیونکہ وہ کسی لکھاری سے نہیں اپنے ذوق سے مخلص ہوتے ہیں۔ لہٰذا گذارش یہ ہے کہ کہانیوں پر تبصرہ کیا کریں اور کسی بھی انعام یافتہ کا خط کا معیار کہانیوں پر تبصرہ ہو۔ ''گفتگو'' کا اصل مقصد بھی یہی ہے۔ گپ شپ کے لئے، دل کے پھپھولے پھوڑنے کو، ملکی و بین الاقوامی تبصرہ اور علمیت جتانے کو دوسرا کوئی کالم شروع کیا جا سکتا ہے۔ محترم احسان سحر (میانوالی) بہت شکریہ، آپ نے ''عشق کسی کی ذات نہیں'' کو پسند کیا۔ ایک سطر میں آپ نے بتا دیا کہ جو پیغام تھا وہ آپ تک پہنچ گیا۔ مجھے خوشی ہوئی کہ چاہے ایک فرد ہی سہی، اس نے میرا دیا ہوا پیغام سمجھ لیا۔ امید ہے کہ اگلی قسط کے بعد آپ ناول پر بھرپور تبصرہ کریں گے۔ محترم عمر فاروق ارشد (فورٹ عباس) اجی، میں تو آپ کی اجازت کا منتظر تھا کہ آپ نے اگر معجون وغیرہ منگوا کر کھا لی ہو تو میں ناول شروع کروں۔ ویسے میرا مشورہ ہے کہ آپ معجونِ محبت، شربتِ خلوص، حبِ وسعتِ قلب اور عرقِ شوق پیا کریں تو بہت زیادہ افاقہ رہے گا۔ اس طرح بہت ساری ایسی تحریریں جو صرف آپ کو شاید پسند نہ ہوں لیکن دوسروں کو پسند ہوں، ان سے بھی مزہ لے سکیں گے۔ ''عورت زاد'' ان شاء اللہ بہت جلد پیش کروں گا۔ خاص طور پر آپ کے تبصرے کا منتظر رہوں گا۔ محمد یاسر اعوان (رحیم یار خان) آپ کا خط اچھا لگا۔ آپ کہانی کیوں نہیں لکھتے ہیں؟ آپ نے ''عشق کسی کی ذات نہیں'' جو تبصرہ کیا اس پر مجھے حیرت ہے، کیا سعدیہ اور شبانہ کا حسن جذبات بھڑکانے والا تھا؟ حیرت اس پر ہے۔ بہرحال آپ کا شکریہ۔ محترمہ گل مہر، (کراچی) میں آپ کا بہت شکر گذار ہوں کہ آپ کو میری تحریریں پسند آتی ہیں۔ ارے یہ کیا، آپ نے میرا اور ناصر ملک کا مقابلہ کروا دیا، وہ بھی کانٹے دار، ایسا نہیں ہے۔ میرا ان سے کوئی مقابلہ نہیں، وہ میرے چھوٹے بھائیوں جیسے دوست ہیں۔ مجھے یہ جان کر بہت خوشی ہوئی کہ ناصر ملک کو قارئین نئے افق نے پسندیدگی کا اعزاز دیا۔ یہ میری ہی کوشش تھی کہ میں انہیں نئے افق تک لایا، اب یہ ہم سب قارئین کا کام ہے کہ نہ صرف ان سے اچھی اچھی کہانیاں لکھوائیں، بلکہ انہیں یہاں جمائے رکھیں۔ اگر آپ نے مقابلہ ہی کروانا ہے تو بھائی میں اپنی ہار قبول کرتا ہوں، مجھے اپنے بھائی کی جیت سے خوشی ہوگی۔ آپ کے خلوص کا بھی بہت شکریہ۔ مہر پرویز احمد دولو (میاں چنوں) آپ کی محبتوں اور خلوص کا میں ہمیشہ سے ہی معترف رہا ہوں۔ اس کی جزا صرف ربّ تعالیٰ ہی دے سکتا ہے۔ مجھ ناچیز کی کیا بساط۔ نئے سلسلہ وار ناول ''عورت زاد'' پر آپ کے تبصرے کا منتظر رہوں گا۔ محترم جاوید احمد صدیقی (راولپنڈی) میں کوشش کروں گا کہ اگلے شمارے سے ''عورت زاد'' کا آغاز ہو جائے اور آپ سے بھی تبصرے کا منتظر رہوں گا۔ محترم محمود ظفر اقبال کا انٹرویو بہت اچھا لگا، ان کا ناول سفید گلاب جب آیا تھا تو اس پر میری یہی رائے تھی کہ ان کے اندر ایک بڑا لکھاری موجود ہے، کب باہر آئے گا، اس کا مجھے انتظار ہے، مجھے لگتا ہے، وہ انتظار اب ختم ہو گیا۔ گڈ لک محترم محمود ظفر اقبال۔ محترمہ زریں قمر، آپ نئے افق کے لئے نہ صرف ایک اثاثہ ہیں بلکہ وہ لکھاری ہیں، جن سے بہت کچھ سیکھنے کا موقع ملتا ہے۔ میں ان کی تحریریوں کا منتظر رہتا ہوں۔ ''ٹماٹو کیچپ'' میں جو اور جس طرح پیش کیا، تحسین کے لائق ہے، میں معذرت خواہ ہوں کہ مزید شمارہ اگر پڑھتا تو یہ خط نہ لکھ سکتا۔ محترم اقبال بھٹی صاحب کی کاوشیں بہترین ہیں۔ اس پیش کش کا کریڈٹ انہیں جاتا ہے، جو بلاشبہ بہت محنت طلب ہے۔ مبارک باد آپ کو، محترم اقبال بھٹی، نئے اُفق کی ٹیم کو اور قارئین محترم کو۔ فی امان اللہ

مجید احمد جائی...... ملتان۔ مزاج گرامی! اُمید واثق ہے خیریت سے ہوں گے۔ اللہ تبارک وتعالیٰ اپنی حفظ وامان میں رکھے، رحمتوں، نعمتوں کا نزول ہر پل، ہر وقت رہے۔ دشمنوں کے شر سے محفوظ اور اپنوں

کے جھرمٹ میں شاد اور آباد رکھے۔ صحت کی بادشاہی، ایمان کی سلامتی اور لبوں پر مسکراہٹ کے پھول کھلتے رہیں۔ آمین ثم آمین۔ سب سے پہلے محترم جناب ہر دل عزیز طاہر احمد قریشی صاحب کو عمرہ کی سعادت حاصل کرنے پر دل کی اتھاہ گہرائیوں سے مبارک باد پیش کرتا ہوں قبول کریں...... یقیناً آپ نے ہر مومن مسلمان کے لئے دعائیں کی ہوں گی۔ ہم نے بھی دعا کی اپیل کی تھی، ضرور دعاؤں میں یاد رکھا ہوگا۔ ماہ فروری 2016ء کا نئے اُفق پوری آب و تاب کے ساتھ موصول ہوا۔ سرورق بہت پسند آیا۔ دیہاتی منظر پیش کرتا سرورق بہت کچھ یاد دِلا گیا۔ بہت خوب...... اب تو دیہات میں بھی رونق ماند پڑتی جارہی ہے۔ لوگوں میں محبت ناپید ہو رہی ہے۔ افراتفری کا بازار گرم ہے۔ غریب مرا جارہا ہے اور جاگیردار موت بانٹتے پھرتے ہیں۔ دستک میں میرے پیارے محترم مشتاق احمد قریشی صاحب سیاست کو کوس رہے ہیں، عرض کروں گا اگر نئے اُفق کو سیاست سے دُور رکھا جائے تو بہتر ہوگا۔ ادب کو سیاست کی بھینٹ نہ چڑھائیں...... گفتگو میں پہنچے تو دل کو شاک سا لگا۔ یہ جان کر دلی اُفسوس ہوا کہ ادارے نے میرے تحریریں نہ لگانے کا فیصلہ کیا ہے۔ گلہ بجائے اگر کال کر کے وجہ جانی جاتی تو بہتر ہوتا...... ماہ مئی میں لگنے والی ''حقیقی مسیحا'' نئے اُفق پر چمکی تو میں نے ادارے کو ممنون و مشکور کا خط بھی لکھا اور پھر تعلیمی سرگرمیوں میں مصروف ہوگیا...... اور چند ماہ نئے اُفق کا مطالعہ نہ کرسکا۔ ادارہ نے ماہ جون میں میرے خط کے جواب میں لکھا بھی مگر مجھے معلوم نہ ہوسکا...... اب نو ماہ بعد ''حقیقی مسیحا'' کو موضوع بنایا گیا ہے۔ اور ایک خط کے جواب میں کہا گیا ہے کہ ''مجید احمد جائی آپ کی جگہ ہمارے دلوں میں ہے جوتوں پہ نہیں'' اور پھر اب ......؟ بحرحال انسان خطا کا پتلا ہے اور خطائیں سرزد ہو جاتی ہیں۔ اگر انسان غلطی نہ کرے تو فرشتہ نہ بن جائے۔ بحرحال بات کو طول دیئے بغیر میں قارئین اور ادارہ سے اپنی غلطی مانتے ہوئے معذرت خواہ ہوں۔ اُمید ہے سنت نبوی ﷺ کی پیروی کرتے ہوئے معاف فرما دیں گے اور مجھے نئے اُفق کا پلیٹ فارم فراہم کریں گے...... اور ادارہ سے اپیل کروں گا کہ لکھاری کی تحریر ملتے ہی مطلع کردیا جائے کہ قابل اشاعت ہے کہ نہیں تاکہ میری طرح کی غلطی کوئی اور لکھاری نہ کریں۔ میں وعدہ کرتا ہوں کہ نئے اُفق کو جو تحریر بھجوں گا وہ کسی اور رسالے میں نہیں دوں گا۔ یہ میرا تحریری معاہدہ ثبوت سمجھیں۔ احسان سحر کو صدارت کی کُرسی ملی بہت بہت مبارک باد اور انعام کی مبارک الگ سے۔ قبول کریں۔ خط مدلل بھرا تھا۔ ناصر ملک کا آتش زاد ناول شائع کرنے کی اپیل میں بھی کروں گا۔ صائمہ نور کا خط جاندار تھا۔ عمر فاروق ارشد بھائی، میں نے آپ کی کہانی لغزش پہ اعتراض نہیں کیا ایک قاری کی حیثیت سے اپنے ویوز پیش کیے تھے۔ تحریروں کو پڑھ کر کمنٹ کرنا قاری کا حق ہوتا ہے۔ خوشی ہوئی کہ آپ نے میری باتوں کو مثبت لیا۔ نیئر رضوی صاحب آپ دل چھوٹا نہ کریں اور اپنا فیصلہ واپس لیں۔ کسی ایک شخص کی سزا سبھی کو نہ دیں۔ نئے اُفق ہم سب کا ہے کسی ایک کی جاگیر تو نہیں۔ تنقید، تعریف لکھاری کے ساتھ ساتھ چلتی ہیں۔ تنقید سکھاتی ہے اور تعریف راہ میں کانٹے بھر دیتی ہے اور سفر روک دیتی ہے۔ تنقید تو مثبت لے کر آگے بڑھیں۔ گل مہر آپ کی تجویز بہت اعلیٰ ہے اور میں آپ کی باتوں سے اتفاق کرتا ہوں۔ شاندار خط لکھا۔ محترم ریاض بٹ صاحب، پچھلے خط میں آپ کی کہانی پر ریویوز دیئے تھے مگر بدقسمتی سے ادارہ نے میرا خط ہی روک لیا...... فیصل مسجد کے پہلو میں ہم دس روز گزار کر آئے، 32 لوگوں کے گروپ میں ایک دوست تھے، جو نماز کے اوقات کے بعد ہی فیصل مسجد کے ساتھ ہوسٹل کی مسجد میں رہتے تھے۔ وجہ یہ تھی کہ مسجد میں سگنل آتے تھے اور مسجد کے باہر غائب ہو جاتے تھے اور وہ صاحب مسجد میں بیٹھ کر فیس بک چلاتے تھے...... ہم نے مقدس مقامات کو بھی دُنیاداری میں شامل کرلیا ہے۔ مسجد کے آداب ہوتے ہیں جن کو ہم نے پس پردہ ڈال دیا ہے۔ زلزلے کیوں نہ آئیں، قدرتی آفات معمول کیوں نہ

ہو......غور وفکر کرنے کی بات ہے......علی حسین تابش، کا خط قابل ستائش ہے۔ جاوید احمد صدیقی اور انجم فاروق ساحلی کے خطوط مدلل بھرے تھے۔ اس کے علاوہ چار خطوط ایسے تھے، جن میں میری ذات کونشانہ بنایا گیا اور پرچے پر تبصرہ غائب تھا۔ یہ اُن کی محبتیں ہیں...... میں اُن سے خفا ہر گز نہیں ہوں اور اپنا فیصلہ قدرت خداوندی پر چھوڑتا ہوں......اقراء نے دل کے نہہ خانوں کو روشن کر دیا اور محمود ظفر اقبال ہاشمی صاحب کا انٹرویو کمال کا تھا۔ شاندار جواب دیئے تھے جیسے کہ ''بارش کے بعد بھیگے پیڑوں کی خوشبو'' ''جو بھی کچھ ہے محبت کا پھیلاؤ ہے'' ''عموماً رواں چشمے کی طرح نرم گیر'' بہت خوب داد دیتا ہوں......کہانیوں میں سب سے پہلے فیورٹ لکھاری ریاض بٹ کی کہانی ''اُلٹی آنتیں'' پڑھیں۔ آپ نے جدید دُور کے قانون کی عکاسی کی ہے۔ فرحت کو اپنے کیے کی سزا مل گئی مگر جب آپ جان چکے تھے کہ امتیاز سچا ہے اور سچ کہہ رہا ہے تو آپ نے اُسے آزاد کرنے کی بجائے عدالت میں گھسیٹ دیا......یہ زیادتی ہے اور یہ بھی سچ ہے جیلوں میں بے گناہ لوگ زندگی کے ماہ وسال گزار رہے ہیں اور مجرم آزاد فضاؤں میں دندناتے پھرتے ہیں......چراغ راہ......بہت زبردست تحریر تھی۔ مریم......جو خواب میں دیکھتی تھی، اب حقیقت سے ہم کنار تھی۔ فریب خوردہ، میں میرے پیارے دوست یاسین صدیق نے کمال لکھا۔ طوالت کے باوجود کہانی میں چاشنی لحہ بہ لحہ رہی۔ رضیہ نے خوب انتقام لیا۔ ہمارے معاشرے میں ایسے کردار ہر گلی میں نکلتے ہیں۔ کہانی کو جلدی ختم کیا گیا ہے......ایسے لگتا ہے جیسے دوسری کڑی لکھ رہے ہیں......رضیہ کی شادی......ابھی باقی ہے۔ ''بھوک'' دستگیر شہزاد نے عورت کو برہنہ کر دیا......عورت اتنی بھی بُری نہیں ہے جتنا پیش کیا جاتا ہے......کچھ جملے اگر حد فکر لئے جاتے تو بہتر ہوتا......بحر حال کہانی زبردست تھی۔ پیٹ کی بھوک واقعی ظالم ہوتی ہے......جب تک پیٹ نہیں بھرتا......کسی اور بھوک کی طرف توجہ جاتی ہی نہیں......''اہرام محبت'' ثریا صغیر صدیقی نے کمال لکھا......ایک شوہر نے اپنی بے وفا بیوی اور غدار دوست سے خوب انتقام لیا......ڈیم ان کا مقبرہ تھا......یہی پُراسراریت ہے......عنقا لوگ بھی خوب رہی اور ڈائن میں خلیل جبار......صفحہ نمبر 133 پر واضح کر رہے ہیں کہ کاشی نے خود کو نازلی کے حوالے کر دیا......آگے چل کر پھر کہانی پیچھے لے جاتے ہیں......عرفان تو جیل چلا گیا مگر جو اصل مجرم تھی اس کو گمنام کر دیا گیا ہے......نازلی کو سزا ہونی چاہیے تھی اصل مجرم تو وہی تھی......اس کا ذکر تک نہیں کیا گیا......فن پارے کی تمام تحریریں خوب تھیں اور زاد سفر کا دوسرا حصہ بہت خوب رہا......ناصر ملک کمال لکھتے ہیں ......پڑھتے ہوئے ایسا لگتا تھا ابھی اگلے صفحہ پر کہانی اختتام ہو جائے گی مگر پھر ایسی کڑی ملتی ہے کہ کہانی آگے چل پڑتی ہے......بہت خوب......ذوق آگہی اور خوش بوئے سخن میں انعام یافتگان کو مبارک باد......جاتے جاتے تمام نئے افق اسٹاف اور قارئین کے لئے دعا گو ہوں کہ اللہ تعالیٰ اپنے کرم وفضل سے نوازتا رہے اور ہاں اپنی غلطی کو تسلیم کرتے ہوئے دوبارہ معذرت کرتا ہوں......اُمید ہے معاف کرتے ہوئے خوش آمدید کریں گے۔

صائمہ نور......بہاول پور روڈ ملتان۔ السلام علیکم! اُمید کرتی ہوں اللہ تعالیٰ کے خاص کرم سے خوش باش زندگی گزارتے ہوں گے۔ خوشیاں بانٹتے ہوں گے۔ محترم طاہر احمد قریشی، پیارے اقبال بھٹی، محترم عمران احمد قریشی اور انکل مشتاق احمد قریشی کی خدمت میں سلام عرض کرتی ہوں......اللہ تعالیٰ تمام بیماریوں سے محفوظ رکھے اور ہنستے مسکراتے رہیں۔ آمین ثم آمین! ماہ فروری کا نئے اُفق اپنی تمام تر رعنائیوں سے جلد مل گیا۔ دیہات کی عکاسی کرتا سرورق بہت پیارا تھا......دستک میں انکل مشتاق احمد قریشی کراچی کی سیاست کا پردہ اُٹھا رہے تھے......میں اپنے علاقے کا حال پیش کروں۔ ووٹ ڈالنے گئی اور اپنی آنکھوں سے بے ایمانی ہوتی دیکھی......ایک لیڈر خود جعلی ووٹ کاسٹ کر رہا تھا اور کوئی بولنے روکنے کی جرات نہیں کر رہا تھا......سرکاری عملہ

خاموش تماشائی بنا کھڑا تھا...... میں تو جمہوریت کو مانتی نہیں ہوں...... آمریت ہی اچھی ہے ایسی جمہوریت سے...... گفتگو میں عمران احمد بجا فرما رہے تھے...... امت محمدیہ کے لئے قرآن پاک ہی سب کچھ ہے اگر غور وفکر کرے اور تلاوت کے ساتھ ساتھ عمل بھی کرے...... قرآن مجید کو سمجھے تو ہر بیماری، ہر مسئلے کا حل موجود ہے اور سب سے بڑھ کر پیارے آقا ﷺ کے اسوہ حسنہ پر عمل پیرا ہو کر دین اور دُنیا میں کامیابی اور کامرانی پا سکتے ہیں...... مگر اُمت اپنی خرافات میں پڑ کر ذلت اُٹھا رہی ہے...... احسان سحر کو انعام یافتہ خط کے ساتھ خوش آمدید...... عمر فاروق ارشد بھیاء اِس بار آپ کی تحریر پڑھنے کو نہیں ملی۔ کیوں جی،،،؟ محمد یاسر اعوان، حمیر رضوی گل مہر، انکل ریاض بٹ محترم علی حسنین تابش، جاوید احمد صدیقی، انجم فاروق ساحلی زبردست تبصروں کے ساتھ حاضر خدمت تھے...... اقراء میں طاہر قریشی نے قرآن وسنت ﷺ کی روشنی میں دل کے نہہ خانوں کو روشن کرنے کی سعی کی ہے...... محمود مظفر اقبال ہاشمی کا انٹرویو خوب رہا اور یہ سلسلہ بھی کامیاب ٹھہرا...... کہانیوں میں عنقا لوگ پڑھی، مختصر تحریر اچھی لگی، الٹی آنتیں میں ریاض بٹ نے امتیاز کو سچا ہونے کے باوجود عدالت بھیج دیا اور فرحت لالچ میں آکر خود زندگی کی بازی ہار گیا...... ریاض بھیاء یتیم لڑکی پر کہانی لکھیں جسے معاشرہ جینے نہیں دیتا اور اس کا حق کھاتا ہے اور ساس کے طعنے اُسے مار دیتے ہیں...... وجود زن نفیسہ سید نے بہترین کہانی لکھی۔ اہرام محبت، خاموشی سے بدلہ لینا ہو تو اہرام محبت کو پڑھ لیا جائے۔ چراغ راہ بہت خوبصورت اور رُلاتی تحریر تھی۔ بھوک...... پیٹ کی بھوک انسان کو پاگل کر دیتی ہے اور بے غیرت بھی...... فریب خوردہ، میں رضیہ نے ساتھ بہت بُرا ہوا، پیار کے دُھوکے میں اپنی عزت گنوا بیٹھی اور بڑی بہادری سے دونوں شیطانوں کو ٹھکانے بھی لگایا۔ ڈائن...... عورت ہی گھر کو جنت اور قبرستان بناتی ہے...... عورت چاہے تو دُنیا بدل سکتی ہے۔ میرا محرم میرا مجرم بھی خوب رہی...... ذوق آگہی، خوشبوئے سخن میں انعام حاصل کرنے والوں کو مبارک باد...... بہترین سلسلے ہیں۔ اِس بار نیٹ کہانیاں شامل نہیں تھیں...... زاد سفر نے کافی متاثر کیا...... ناصر ملک بہت خوب قلم چلاتے ہیں...... اِس ماہ فروری کا پرچہ ہر لحاظ سے زبردست تھا...... میں بھی اپنی کہانی نئے اُفق میں روانہ کرنا چاہتی ہوں...... اجازت ہو تو۔

احسن ابرار رضوی...... پاک پتن روڈ ساہیوال۔ سلام ومحبت! سب سے پہلے تمام اسٹاف نئے اُفق، قارئین اور لکھاریوں کو سلام عقیدت قبول ہوں۔ جنوری کے جان لیوا سرد موسم میں نئے اُفق ماہ فروری جلدی مل گیا۔ ٹائٹل نے دل خوش کر دیا اور خوشگوار اثر چھوڑ گیا۔ سردیوں کے موسم میں مونگ پھلی اور چلغوزوں کے ساتھ رضائی میں دب کر نئے اُفق کے مطالعہ کرنے کا اپنا ہی مزہ ہے۔ مارچ کی آمد آمد ہے اور قرارداد پاکستان کی یاد دلاتا مہینہ قریب تر ہے۔ کاش کے اس مارچ میں غریبوں کے چولہے آباد رکھنے کی قرارداد منظور ہو جائے اور ملک میں امن قائم ہو جائے آمین ثم آمین۔ گفتگو میں عمران احمد انصاف کو موضوع بنائے ہوئے ہیں۔ جس ملک میں عدالتیں انصاف نہ کریں وہاں کسی اور کا کیا رونا روئیں...... جس کی لاٹھی اُس کی بھینس، کا قانون لاگو ہے...... ہر کوئی انصاف کا خواہاں ہے مگر خود انصاف سے کوسوں دُور بھاگتا ہے...... مجھ سمیت کوئی بھی شخص ایسا نہیں ہے جو انصاف کرتا ہو...... کیا ہی اچھا ہوتا ہر فرد اپنی جگہ رہتے ہوئے انصاف کرتا تو اِس ملک میں افراتفری، لوٹ کھسوٹ، کرپشن نہ ہوتی...... پاک وطن میں امن ہوتا...... احسان سحر انعام یافتہ خط کے ساتھ حاضر خدمت تھے۔ بہت بہت مبارک باد، قبول کیجیے...... خط بھی معلوماتی اور مدلل تھا۔ صائمہ نور نے مختصر مگر کمال تبصرہ کیا۔ واقعی میری آنکھوں نے یہ منظر دیکھے ہیں کہ چند روز جو جھنڈیاں، موٹر سائیکلوں، مسجدوں اور گھروں کی منڈیروں پر سجی تھیں اب پیروں کے نیچے روندی جا رہی ہیں، یہی عمل کوئی غیر مسلم کرتا تو ہم گستاخی کا الارم بجاتے

پھرتے ...... عمر فاروق ارشد، محمد یاسر اعوان کے خطوط کمال کے تھے۔ عامر زمان عامر ایک ہی بندے کا رونا روتے نظر آئے ...... پرچے پر کوئی بات نہیں کی ...... جعل سازی کی باتیں کر رہے ہیں اور میں حیران ہوں جو بندہ خود کسی اور کی تحریریں اپنے نام سے شائع کرواتا ہے وہ کسی اور کو کیسے الزام دے سکتا ہے ...... ادب کے ساتھ تو خود آپ مذاق کر رہے ہیں ...... جب آپ کی ناقص رائے تھی تو پیش ہی نہ کرتے۔ نیرّ رضوی آپ کی باتیں سچی ہیں۔ نئے اُفق کسی کی میراث نہیں ہے۔ ہر وہ فرد جس کا تعلق کاغذ اور قلم سے ہے، لکھ سکتا ہے۔ آپ پریشان نہ ہوں ...... لکھیں، لکھنا آپ کا حق ہے اور ادارہ بھی انصاف کرے گا ...... گل مہر کا خط مدلل اور شاندار تھا۔ عبدالغفار عابد صاحب، آپ سیاست میں رہیں تو وہی ٹھیک ہے۔ ریاض بٹ، علی حسنین تابش، جاوید احمد صدیقی، انجم فاروق ساحلی، کے تبصرے بہترین تھے۔ اقراء کا پڑھ کر دل کو روشن کیا اور محمود ظفر اقبال ہاشمی کا انٹرویو بہت پسند آیا ...... کہانیوں میں فریب خوردہ یاسین صدیق نے کمال تحریر لکھی ...... رضیہ نے کمال بہادری سے اُن دونوں ناسوروں کو موت کے گھاٹ اُتار دیا ...... چراغ راہ ...... میں مریم نے خوب ذمہ داری نبھائی ...... اور ابھی نبھانی ہے ...... بھوک میں عورت ذات کو بُرائی کا سردار پیش کیا گیا ہے حالانکہ مرد حضرات بھی پیچھے نہیں رہے ...... تالی دونوں ہاتھوں سے بجتی ہے ...... قصور دونوں کا ہوتا ہے۔ صرف عورت ذات کو قصوروار ٹھہرانا غلط ہوگا ...... اہرام محبت ...... کمال کہانی تھی۔ شوہر نے بیوی سے بے وفائی کی خوب سزا دی ہے اور غدار دوست کو ٹھیک ٹھکانہ لگایا۔ الٹی آنتیں، ریاض بٹ ہر بار خوب سے خوب تر تحریر لاتے ہیں ...... ڈائن، میں خلیل جبار نے بھی عورت ذات کی واٹ لگائی ہے ...... اس کے علاوہ ٹماٹو کیچپ، آشفتہ دل، وجود زن، میرا محرم، میرا مجرم خوب رہیں۔ فن پارے کی تحریریں ایک سے بڑھ کر ایک تھیں ...... زادِ سفر کا دوسرا حصہ زبردست رہا۔ باولی اور بانو کا کردار پسند آیا ...... شاہ سائیں جیسے پیر ہمارے معاشرے میں بہتات سے پائے جاتے ہیں اور میں حیران ہوں پڑھے لکھے انسان بھی ان کے ہتھے چڑھ جاتے ہیں۔ عشق کسی کی ذات بھی ٹھیک چل رہی ہے اور خوش بوئے سخن، ذوق آگہی بہترین سلسلے ہیں۔ آپ حیران ہونگے کہ پہلا خط بھی تنقید بھرا ہے ...... کام میں مصروفیت کی وجہ سے کم ہی لکھتا ہوں اور میں کمرشل لکھاری ہوں۔ اجازت چاہنے سے پہلے تمام اسٹاف نئے اُفق اور قارئین کے ڈھیروں محبتیں۔ اللہ تعالیٰ خوش رکھے آمین والسلام۔

(اس ماہ کا انعام یافتہ خط)

نازسلوش ذشے ...... میر پور، آزاد کشمیر۔ محترم جناب عمران قریشی بھائی تسلیمات، پچھلے کئی برسوں کی طرح اس برس بھی وہی امید ہے کہ آپ اپنے اسٹاف سمیت خیریت سے ہوں گے۔ میرے خیال میں یہ امید ہی وہ ستارہ ہے، جس کو تھامے رکھ کر انسان زندگی گزارتا چلا جاتا ہے۔ ایک بہتر زندگی کی آس، ایک بہتر وقت کی تلاش سب اسی امید پر منحصر ہے جیسے مجھے امید ہے کہ پاکستان کے حالات کبھی ٹھیک ہوں گے۔ جیسے مجھے امید ہے کہ دنیا بھر کے مسلمان بچوں کو کوئی تو تحفظ دے گا۔ کوئی تو ہوگا جو آ کر ہمارے دکھوں کا مداوا کرے گا اور اگر یہ کوئی ہم خود ہی ہیں تو یقین کریں ہم وہ نسل ہیں جو مزید بگڑ تو سکتے ہیں مگر اس میں سدھرنے کے کوئی آثار کم ہی ہیں۔ خیر گلے شکوے کرنے کا نہ وقت ہے نہ موقع محل میں یہ بھی نہیں کہوں گی کہ اس جاتے سال نے جہاں خوشیوں سے نوازا ہے وہاں بہت سے دکھ اور غم بھی ہماری جھولیوں میں ڈال گیا ہے کیونکہ یہ تو یہاں ہر کوئی کہہ رہا ہے میں اس سال کے لیے فقط دعا گو ہوں کہ خدا ہمیں وہ دکھ نہ دکھا جو ہم نے اس سال دیکھے نہ وہ دکھ دے جو ہم برداشت نہ کرسکیں۔ برداشت لفظ کم ہے میں کہوں کہ ایسے حالات سے واسطہ نہ پڑے جو ہمیں بے حس کردیں آپ تو سمجھتے ہیں نا بے حس ہونا کسے کہتے ہیں؟ ستمبر سے جنوری تک کے تمام شمارے اپنی جگہ بہترین رہے تبدیلی لانے سے واقعی

تبدیلی آتی ہے۔ سرورق کا انتخاب اس تبدیلی کا پہلا حصہ ہوتا ہے پھر کہانیوں کا معیار، لکھاریوں کی نئی تخلیقات سب اہم کردار ادا کرتی ہیں اور پر سونے پر سہاگہ انعامات کے حصول کے لیے ہر کوئی بہتر سے بہتر لکھنے کی کوشش کر رہا ہے ایک چھوٹی سی گزارش ہے کہ قارئین سے ہر ماہ کی تین بہترین کہانیوں کے بارے میں رائے لی جائے اور اول، دوم اور سوئم آنے والی کہانیوں (سلسلے وار کو چھوڑ کر) کو بھی کوئی سند یا انعام دیا جائے۔ میں شکریہ ادا کرنا چاہوں گی ان سب حضرات کا جنہوں نے مجھے اتنے عرصے یاد رکھا میرے دکھ پر مجھے حوصلہ دیا، میرے ہاتھوں میں امید اور صبر کا جگنو تھما دیا اور میں ان سب کی بھی مشکور ہوں جنہوں نے میری ادنی سی تحریر جو کہ شاید دو تین سال بعد لکھی گئی تھی کو پسند کیا اور جن کو پسند نہیں آئی ان کا بھی شکریہ کہ ان کی تنقید مجھے مزید بہتر لکھنے کا موقع فراہم کرتی ہے۔ میرا کام لکھنا ہے باقی پسند ناپسند کا اختیار آج بھی قارئین کے پاس ہے۔ ایک بات واضح کردوں، میں زندگی میں اردگرد بیتنے والے سچے واقعات کو کہانی، ناولٹ اور ناول میں لکھتی ہوں افسانوں کہانیاں لکھنا شاید کہ میرے بس سے باہر ہے سردہوا کی مرہم واقعی ایک زندہ جیتا جاگتا وجود ہے جیسے میری کہانی کے ہر کردار زندہ ہوتے ہیں وہ سب میرے ارد گرد بسنے والے لوگ ہی ہیں۔ دسمبر کے شمارے میں منشی محمد عزیز مئے نے میرے نام کے متعلق پوچھا تو عزیز بھائی یہ میرا قلمی نام ہے ناز میرے اصل نام سے لیا گیا ہے نام سلوش (سلور کلر اور سلور فش) سے انسپائر ہو کر رکھا گیا میری دوست کا نام اور رزشے میرا نک نیم، یوں آج سے دس سال قبل یہ میرا ایک قلمی نام بن گیا ویسے اس نام کے بارے میں، میں اتنی دفعہ وضاحت دے چکی ہوں کہ اب تک تو لوگوں کو از بر ہونا چاہیے۔ شمارے میں خواتین لکھاریوں کی تعداد نہ ہونے کے برابر رہ گئی ہے۔ کیا وجہ ہے مجھے یاد ہے آج سے سات آٹھ سال قبل مرد حضرات سے زیادہ خواتین تھیں مگر آج یہ مکمل ''مردوں کا رسالہ'' بن چکا ہے۔ یہ تنقید یا حسد نہیں بلکہ میں ان سب خواتین کو مس کر رہی ہوں جو کبھی میری ساتھی تھیں جیسے شہناز بانو (جن کو اللہ نے عرصہ دراز بعد پوتی سے نوازا ہے) شہنی ارشاد، زوبیہ، سرور شاذ، عبداللہ شاہد اور بہت سے ساتھی۔ دسمبر میں ہی صائمہ نور ملتان سے رائٹرز سے خفا نظر آئیں پیاری صائمہ میں باقی سب کے بارے میں تو کچھ نہیں کہہ سکتی۔ مگر اپنے بارے میں اتنا ضرور کہوں گی کہ جب جب مجھ سے میرے کسی قاری نے رابطہ کیا یا کوئی رائے دینا یا لینا چاہی میں نے اسے ضرور جواب دیا اور یہ بحیثیت ایک لکھاری ہمارا فرض ہے کہ اپنے قاری کو مطمئن کریں ان سے رابطے میں رہیں گو کہ میں بہت کم وقت نکال پاتی ہوں مگر پھر بھی کوشش ہوتی ہے کہ کوئی رہ نہ جائے۔ اب بات ہو جائے جنوری کے شمارے پر تو سرورق نئے سال کے حوالے سے اچھا لگا رنگین اور بہت کچھ کہتا ہوا۔ سیاسی دستک کے بعد گفتگو کا رخ کیا، میگزین کے آفیشل پیج اور گروپ کا پڑھ کر نہ صرف اچھا لگا بلکہ سرچ کر کے ایڈ بھی کر لیا۔ خطوط سب کے اچھے لگے پہلے انعام پر علی حسنین تابش کو مبارک باد مجید احمد جائی کا خلوص بھرا اور صائمہ نور کا اداس اداس سا خط خوب رہا ریاض حسین قمر میرے بہت پرانے ساتھی بلکہ مستقل قاری ہیں کوئی اور لکھے نہ لکھے ان کا خط ہر بار نظر آتا ہے فلک شیر ملک بھائی یہ زیادتی ہے میرے حصے کی برفی کہاں گئی۔ عمر فاروق ارشد میں آپ سے متفق ہوں خوشبوئے سخن واقعی ابنارمل کرنے کے لیے کافی ہے میری اپنی نظم کا وہاں قیمہ بن چکا ہے۔ نوشین آپ ترتیب وار سب کی شاعری لگائیں بلکہ ادنیٰ سا مشورہ ہے ایک ماہ غزل اور ایک ماہ نظم کا رکھیں۔ ریاض بٹ کی تحاریر واقعی منفرد ہوتی ہیں۔ بات فقط سمجھ کر پڑھنے کی ہے۔ ناصر ملک کا انٹرویو زبردست رہا اور ان کے بارے میں جاننے کے لیے بہت کچھ ملا میں ایک مختصر سی بات کہنا چاہوں گی ان لوگوں کو جو ادب ادب کا رونا روتے ہیں تو حضرات جو 50 سال قبل لکھا گیا وہ اس وقت کا تقاضا تھا جو آج لکھا جا رہا ہے وہ آج کا تقاضہ ہے غالب نے جو شاعری رقیب روسیا کے بارے میں کی وہ آج کل محبوب اور محبوبہ کے اوپر ہو رہی ہے با

ت صرف حالات کی ہے بات صرف تحریر کے اندر چھپے پیغام کی ہے۔ چاہے وہ کوئی بڑا ادیب لکھے یا کوئی نوآموز سو لکھاری کے اوپر تنقید کرنے کے بجائے اس کی تحریر پر تنقید و تعریف کیجیے آپ کی ایک ادنیٰ تعریف کسی کو بڑا لکھاری بنا سکتی ہے اور کسی کی ایک ادنیٰ تنقید کسی کے اندر کا لکھاری مار ہی سکتی ہے لہٰذا لفظوں میں سختی کی بجائے نرمی رکھیے کہ جیسے زبان میں ہڈی نہیں ہوتی ویسے ہی قلم کی نوک کو بھی تلوار کی نوک مت بنائیے۔ کہانیوں میں زلف کا اسیر، حق دار، تلاش سحر، بہترین کہانیاں رہیں۔ اصل قاتل میں میرا تو خیال ہے لڑکے کی ماں زیادہ قصور وار تھی۔ کیونکہ نہ وہ غلط راستے کی طرف بلاتی نہ وہ کم سن لڑکا اتنے گناہ کرتا۔ شاہدہ صدیقی کی سلو پوائزن اسٹوری آف دا منتھ ہے ان کی یہ مختصر مختصر کہانیاں پڑھ کر مجھے ایک تحریر یاد آ گئی کہ دنیا میں پراسرار مختصر ترین کہانی لکھنے کا مقابلہ ہوا اور جو تحریر منتخب ہوئی وہ کچھ یوں تھی۔ ''دنیا کا آخری شخص کمرے میں بیٹھا تھا کہ اچانک دروازے پر دستک ہوئی۔'' اس ایک جملے کی کہانی نے سمندر کو کوزے میں بند کر لیا شاہدہ صدیقی کی مختصر کہانیاں زندگی کے اتنے ہی قریب ہیں جیسے اپنے ساتھ بیتی ہوں خاص طور پر خواب، بستر، تابوت، فرشتے۔ بہت اعلیٰ میں خاص طور پر کہوں گی کہ آپ ہر ماہ اسی طرح کی منفرد تحریر لکھتے۔ آدھا بٹن اچھی کہانی ہو سکتی تھی اگر اس میں سسپنس رکھا جاتا کہانی کے شروع میں ہی پتا چل گیا تھا کہ قاتل سورج ہے پھر چاند کی ڈائری کے لکھے الفاظ اور مسز چنگیزی کی جھوٹی قسمیں میں سمجھ نہیں سکی کہ لکھاری کیا کہنا چاہ رہا ہے۔ فقط صفحات کا زیاں تھا اور بس۔ باقی کہانیاں اپنی جگہ اچھی ہیں ظل ہما کی محبت ہے واقعی انعام کی حقدار ہے باقی شعرا کا کلام بھی قابل تحسین رہا۔ ایڈیٹر سے گزارش ہے کہ سلسلے وار ناولز میں تھرل کے بجائے کوئی اور ٹاپک لے کر آئیں وہی گولیاں وہی جاسوسی وہی سب کچھ...... خدارا اس میں بھی تبدیلی کی ضرورت ہے اور ہاں اس سال بھی مختلف مہینوں کے نمبرز بتا دیجیے تاکہ لکھنے میں آسانی رہے۔ باقی اگر کوئی بات بری لگی ہو تو معذرت، میرا مقصد کسی کی دل آزادی کرنا ہرگز نہیں تھا۔ شکریہ

ریاض بٹ...... حسن ابدال۔ السلام علیکم فروری 2016ء کا شمارہ اٹھارہ جنوری کو نگاہوں کے سامنے جلوہ گر ہوا۔ سرورق کی کیا تعریف کروں لاجواب ہے۔ دستک میں مشتاق احمد قریشی صاحب سندھ کی صورت حال کو اچھے انداز میں پیش کر رہے ہیں بات وہی ہے کہ سوئے ہوئے کو تو جگایا جا سکتا ہے لیکن جان بوجھ کر خواب غفلت میں ڈوبے ہوؤں کو کون بیدار کر سکتا ہے۔ دوسرے یہ بات بھی ہے کہ اس حمام میں سب ننگے ہیں اور اپنے اپنے کالے کرتوتوں کو چھپانے کے لیے متحد ہو گئے ہیں دیکھیں یہ اونٹ کس کروٹ بیٹھتا ہے یہ بتانا ذرا مشکل ہے ہمیں انڈیا بھی دھمکیاں دے رہا ہے کہ پٹھان کوٹ والی بات بہت دور تک جائے گی۔ خدا ہمارے ملک کی حفاظت کرے آمین ثم آمین۔ کیونکہ ملک ہے وہ ہم ہیں۔ آگے بڑھنے سے پہلے ایک بات کا ذکر کرنا ضروری سمجھتا ہوں کہ اب مجھے اعزازی پرچہ مل رہا ہے بلکہ پچھلے ماہ ایک اور اعزاز بھی مل گیا میری اتنی حوصلہ افزائی کا بہت بہت شکریہ۔ اب دروازہ کھولتے ہیں گفتگو کا عمران احمد صاحب میں آپ اور ادارے کی بات اور فیصلے سے اتفاق کرتا ہوں، نیا سلسلہ تعارف والا بھی ایک احسان اور اچھا قدم ہے پہلا (انعامی) خط ہے بھائی احسان سحر کا آپ نے وقت اور لمحوں کے متعلق بہت اچھا لکھا ہے۔ لمحے بند مٹھی میں ریت کی مانند ہوتے ہیں۔ ہماری بھی یہ دعا ہے کہ یہ سال ہمارے لیے خوشیاں اور کامرانیاں لے کر آئے میری کہانی قربانی کو پسند کرنے کا شکریہ۔ اچھے لوگ ہر دور میں رہے ہیں صائمہ نور بہن کیسی ہو، تم نے بالکل سچ کہا ہے کہ عید میلاد النبی کے سلسلے میں سجی جھنڈیاں بعد میں پاؤں کے نیچے آتی ہیں یہ ہمارے لیے لمحہ فکریہ ہے۔ واقعی یہ بات بھی اپنی جگہ پر ایک اٹل حقیقت ہے کہ بلدیاتی انتخابات پر جتنی رقم خرچ کی

گئی ہے اس سے کئی بیٹیوں کی شادی ہو سکتی تھی اس وقت میرے قلم کی نوک پر ایک شعر آ رہا ہے۔

بیٹیاں سب شیش محلوں کی بیاہی جائیں گی
جھونپڑیوں میں بین کرتی بیٹیاں دیکھے گا کون

میری کہانی قربانی پسند کرنے کا شکریہ عمر فاروق ارشد نے اس بار مختصر تبصرے ساتھ حاضری لگوائی بہت مہربانی، خوش رہو محمد یاسر اعوان آپ کا تبصرہ بھی جاندار اور سندر ہے لفظوں کا چناؤ منفرد ہے۔ میری کہانی پسند کرنے اور مجھے اپنا پسندیدہ رائٹر کہنے پر یہ بندہ ناچیز تہہ دل سے مشکور و ممنون ہے۔ یہ سب آپ کی اعلیٰ ظرفی ہے عامر زمان عامر بھائی مجھے بھی آپ کی بات سے مکمل اتفاق ہے۔ نیر رضوی بھائی آپ بہت غصے میں لگتے ہیں۔ میری نئے افق کے مدیر اعلیٰ اور مدیر صاحب سے التماس ہے کہ آپ کی تحریر کو نہ پھاڑیں بلکہ اگر قابل اشاعت ہے تو شائع کر دیں اور رضوی بھائی آپ بھی غصہ تھوک دیں اور نئے افق سے رابطہ نہ توڑیں پلیز، میرا یہی مشورہ قابل احترام بھائی مہر پرویز دولو کے لیے بھی ہے گل مہر بہن آپ کا خط بھی قابل تعریف ہے میری کہانی آپ کو بھی پسند آئی یہ بات آپ کے اعلیٰ ذوق کی ترجمان ہے عبدالقادر عابد، مسکان ظفر بھٹی کے تبصرے بھی محفل کی شان ہیں۔ علی حسنین تابش بھائی آپ کے خط بھی مدلل اور اپنی مثال آپ ہوتے ہیں قربانی کو پسندیدگی کی سند دینے کا شکریہ۔ جاوید احمد صدیقی بھائی کیسے ہو، آپ کا خط محفل میں دیکھ کر سیروں خون بڑھ جاتا ہے اور آپ کے لیے ڈھیروں دعائیں دل سے نکلتی ہیں خدا آپ کو ہمیشہ خوش و خرم رکھے، آمین آپ کا تبصرہ جاندار ہے۔ آپ میری کہانیوں کو پسند کرتے ہیں اور ان کے منتظر رہتے ہیں۔ جو میرے لیے باعث اطمینان ہے۔ انجم فاروق ساحلی صاحب میں اکثر رسالوں میں آپ کی تحریریں پڑھتا رہتا ہوں اور انہیں پسند کرتا ہوں میری کہانی قربانی پسند کرنے کا شکریہ۔ اب آتے ہیں کہانیوں کی طرف خلیل جبار کی کہانی ڈائن پسند آئی۔ لیکن میری ایک زیر تحریر کہانی کو روک دینے کا باعث بن گئی کیونکہ وہ بھی اس سے ملتی جلتی تھی خیر یہ تو ہوتا ہی رہتا ہے زریں قمر کی ٹماٹو کیچپ بھی خوب رہی۔ ثریا صغیر صدیقی کی تحریر اہرام محبت ایک منفرد تحریر ہے۔ وقار الرحمان کی تحریر مختصری تحریر ہے۔ لیکن اپنے اندر ایک بہن بڑی کہانی رکھتی ہے واقعی شہید تو زندہ ہیں جنہوں نے اپنے ملک کی خاطر اپنی جان قربان کی بہت خوب فریب خوردہ میں یاسین صدیقی نے بڑے اچھے انداز میں ایک سبق دیا ہے اب بات ہو جائے فن پاروں کی۔ جاوید احمد صدیقی کی یکم اپریل سب سے نمبر لے گئی اس کے علاوہ غدار (سلیم اختر) اور کتنے دہشت گرد (ڈاکٹر ارشد اقبال) کی خوب رہیں محفل خوش بوئے سخن اور ذوق آگہی میں سب انتخاب ایک سے بڑھ کر ایک تھا۔ اب اجازت والسلام

عمر فاروق ارشد...... فورٹ عباس۔ السلام علیکم ورحمتہ اللہ۔ محترم مدیر صاحب کیسے مزاج ہیں امید ہے کہ اللہ کے حفظ و امان میں ہوں گے۔ فروری کا نئے افق اس وقت موصول ہوا جب موسم سرما اپنی تمام تر شدت کے ساتھ حملہ آور تھا ٹائٹل دیکھ کر ۹۰ کی دہائی کا نئے افق یاد آ گیا اگرچہ تب ہم عالم ارواح میں اپنی دنیا روانگی کا انتظار فرما رہے تھے مگر اس زمانے کے شمارے آج بھی اردو بازار میں کسی نہ کسی بک اسٹال پر رکھے مل جاتے ہیں اور ہم انہیں یوں اٹھاتے ہیں کہ گویا ایک بھی لمحہ ضائع کیا تو پھر نہ ملیں گے۔ محترم قریشی صاحب کی دستک کے بارے میں کہنے کو الفاظ نہیں کیونکہ یہ کوئی باتیں نہیں ہیں ہر وہ پاکستانی جس کی ملکی حالات پر نظر ہے وہ یہ حالیں بخوبی سمجھتا ہے بڑھتے ہیں گفتگو کی طرف، عمران بھائی اس بار آپ نے خطوط کے جوابات عنایت نہیں فرمائے، کوئی ناراضگی ہے یا پھر......؟ احسان سحر صاحب آپ کو کرسی صدارت ملنے کی بہت مبارک ہو۔ امید ہے کہ آئندہ بھی آتے رہیں گے۔ عبدالغفار عابد بھائی آپ نے بہت ہی غلط انداز میں مجید صاحب پر تنقید کی ہے یہ شاید آپ

دونوں کا کوئی ذاتی جھگڑا ہے جسے آپ نئے افق میں گھسیٹ کر لے آئے ہیں۔ ریاض بٹ صاحب خوش آمدید، آپ کے مہروں کی تکلیف دور ہوئی یا نہیں؟ ضرور بتائیے گا۔ آپ کی کہانی اس بار کافی منفرد رہی۔ اللہ کرے زور قلم اور زیادہ۔ پیارے بھائی ریاض حسین قمر غیر حاضر تھے کدھر ہیں محترم بھائی جان؟ ماشاء اللہ اس بار تو پورے شمارے میں جناب کی غزلیں جگمگا رہی تھیں آپ کا تعارف جان کر بہت متاثر ہوا ہوں۔ آپ کی غزل پاگل کہو مجھے میں نے پرنٹ کرا کر پوری یونیورسٹی میں تقسیم کی ہے۔ یقیناً یہ بے حس معاشرے سے باغیانہ خیالات کی نمائندہ غزل ہے۔ اگر آپ اب اپنی کوئی نئی کتاب شائع کریں تو ٹائٹل پر یہ غزل دیجیے گا۔ یہ میری فرمائش ہے۔ پرویز احمد صاحب میرے خیال میں اب بات کو ختم کردو تو اچھا ہے خوامخواہ آپ اور مجید احمد بحث میں الجھے ہوئے ہیں۔ ایک خط ہے میرے پیارے بھائی نیر رضوی فرام کراچی کا مجھے ان کا تبصرہ پڑھ کر دلی دکھ ہوا ہے۔ پیارے بھائی میرا خیال ہے کہ آپ ادبی میدان کارزار میں ابھی نئے ہیں یا پھر حد سے زیادہ جذباتی ہیں۔ کیا آپ کو شخصی اور مجموعی تنقید میں فرق کا بالکل بھی علم نہیں ہے میرا اشارہ آپ کی طرف یا کسی اور مخصوص فرد کی جانب ہرگز نہیں تھا بلکہ میں نے ایک زیادتی کی نشاندہی کی تھی جو کہ واقعتاً اپنا وجود رکھتی ہے جبکہ آپ نے آنچل مجھے مار والی بات کرتے ہوئے سارا ملبہ خود پر گرا کر ادبی شہید بننے کی جو کوشش کی ہے یہ ٹھیک نہیں آپ کے متعلق میرے جو خیالات ہیں اس کی گواہی آپ میرے گزشتہ خطوط سے لے سکتے ہیں میں نے ہمیشہ آپ کو ایک محنتی اور مستند شاعر کے طور پر تسلیم کیا ہے حتیٰ کہ جس ماہ میری ایک غزل انعام یافتہ قرار پائی تھی اسی ماہ آپ کی بھی ایک بہت ہی عمدہ غزل شائع ہوئی تھی جس کے بارے میں، میں نے برملا کہا تھا کہ میرے بجائے نیر رضوی کی غزل انعام کی حقدار تھی آپ نے یہ کیسے فرض کرلیا کہ میں نے آپ کو یا کسی مخصوص شاعر کو تنقید کا نشانہ بنایا ہے؟ میں نے کب کسی پر نئے افق کے دروازے بند کرنے کی بات کی؟ میرے پچھلے تبصرے کے الفاظ گواہی دیں گے کہ میں نے صرف اور صرف اعتدال کی بات کی تھی یکسانیت اور برابری کا کہا تھا میں نے صرف یہ کہا تھا کہ سب کو یکساں اور برابری کی بنیاد پر مواقع ملنے چاہیے۔ دوسرا میں نے انتخابات کو محدود کرنے کا کہا تھا اور اس پر اب بھی قائم ہوں میں نے کب نئے آنے والے شاعروں کے حقوق پر ڈاکہ ڈالنے کا مطالبہ کیا ہے آپ نے جس طرح یہ سب کچھ خود کو نشانہ پر رکھ کر دل پہ لے لیا ہے یہ بہت ہی سطحی سوچ ہے بہرحال اگرچہ میں نے وہ کچھ نہیں کہا جو آپ نے سمجھا مگر پھر بھی جو آپ نے سمجھا اور آپ کی دل آزادی ہوئی میں اس کے لیے آپ سے معذرت چاہتا ہوں آپ اسی طرح نئے افق کو چھوڑ کر جانے اور تحریریں پھاڑنے کی باتیں نہ کریں آپ ہمارے بھائی ہیں ہمارے ہم عصر لکھاری ہیں ہم نے ایک ساتھ چلنا ہے اور ایک دوسرے کو سمجھ کر آگے بڑھنا ہے۔ براہ کرم آپ نئے افق میں لکھتے رہیے۔ مجھے آپ کی شاعری کتنی پسند ہے اس کے لیے آپ میرے وہ تبصرے اٹھا کر دیکھیے جن میں آپ کی شاعری پر تبصرہ ہے تو یقیناً آپ اپنے ان موجودہ خیالات پر شرمندہ ہوجائیں گے امید کرتا ہوں کہ آپ کی غلط فہمی کسی حد تک دور ہوگئی ہوگی اس لیے بھیا جی ہمیشہ کی طرح اچھی سی غزل لے کر جلدی سے واپس آجاؤ دیگر تمام ساتھیوں کے تبصرے عمدہ تھے اب بات ہوجائے کہانیوں کی سب سے پہلے مستقل ناولوں پر نظر ڈالتے ہیں امجد جاوید صاحب بلاشبہ قلندر ذات سے بہتر ناول لے کر آئے ہیں صرف واقعات وتخیلات ہی مختلف نہیں بلکہ انداز تحریر بھی جدا ہے۔ اس لیے یہ ناول فی الحال تو بہت زبردست جارہا ہے اب آگے کیا ہوتا ہے یہ کچھ نہیں کہہ سکتے۔ ناصر صاحب کی دوسری قسط کا شدت سے انتظار تھا اور سچ پوچھیں تو سب سے پہلے اس کو ہی پڑھا ناول اٹھان میں ہے اور دل کی دھڑکنوں کو اتھل پتھل کرنا جانتا ہے یہی ناصر صاحب کے قلم کا خاصہ ہے دیگر کہانیوں میں سب سے پیاری تحریر عنقا لوگ لگی یہ ان تحریروں میں سے ہے جن کو پڑھتے ہوئے دل میں ایک نا

معلوم سا خوف سر ابھارتا ہے شاید اپنے آپنے وقت کا خوف، اللہ سب کے نصیب اچھے کرے یہ تحریر شاید کہیں سے منتخب کی گئی تھی اس مسلے کی نشاندہی گفتگو میں بھائی عامر زمان نے بخوبی کردی ہے۔ میں ان کی بات سے پوری طرح اتفاق کرتا ہوں۔ پہلی بات تو یہ کہ انتخاب ہونا ہی نہیں چاہیے ہاں مغرت سے ترجمہ شدہ انتخاب ایک مختلف صنف ہے مگر یہاں سے ہی کہانیاں نقل کر کے شائع کرانے کو انتخاب کا نام دینا درست نہیں جبکہ ہمارے ہاں تو خوشبوئے سخن سے لے کر کہانیوں تک انتخابات کے ڈھیر لگے ہوئے ہیں اور وہ بھی لوگ اپنے نام سے شائع کرا رہے ہیں اس طرح تو ادب کی اصل روح دب کر رہ جاتی ہے محترم قریشی صاحب کو اس معاملے پر سخت ایکشن لینا چاہیے تاکہ نئے افق چربہ سازی جیسی غلاظت سے پاک رہے مجموعی طور پر شمارہ بہترین رہا ادارے کے منتظمین کی کاوشوں کو سلام دعاؤں میں یاد رکھیے گا، والسلام۔

رمشا ملک...... آزاد کشمیر۔ السلام علیکم، امید کرتی ہوں بخیریت سے ہوں گے اور خیر بانٹتے ہوں گے۔ اللہ تعالیٰ اہل مسلم کی خیر فرمائے اور پاک وطن کا بول بالا فرمائے آمین ثم آمین میں نئے افق اور آنچل باقاعدگی سے پڑھتی ہوں اسکول کے زمانے سے لے کر اب ٹیچنگ تک زیر مطالعہ رہے ہیں میں نے ایم ایس سی کر رکھی ہے۔ آج قلم اور کاغذ سنبھالنے کی اہم وجہ یہ ہے کہ نئے افق کو کیا ہوگیا ہے دل غمگین اور افسردہ سا ہے کہ ادیب اور ادب سوالیہ نشان بن گیا ہے نئے افق اعلیٰ معیاری پرچہ ہے اور آپ کی محنت کا منہ بولتا ثبوت بھی ہے لیکن ماہ فروری 2016ء کے خطوط پڑھ کر مجھے شاک سا لگا کہ یہ پرچہ عمران احمد قریشی، طاہر احمد قریشی، اقبال بھٹی کی زیر صدارت نکلتا ہے ایک شخص کو اداریہ اور چند لکھاری حضرات جو جی میں آیا لکھتے چلے گئے۔ کیا اسلام کردار کشی کرنے کی اجازت دیتا ہے؟ نئے افق سے التماس ہے کہ تبصرے رسالے کے اوپر ہوں ورنہ یہ سلسلہ ہی بند کردیں۔ میرا یہ پیغام مذہب سے عاری، ادب سے ناپید لوگوں تک پہنچادیں ہمیں نئے افق سے پیار ہے ایسے ادیبوں سے نہیں جو اپنی ذات کے لیے کسی کی عزت مجروح کریں۔

عبدالغفار عابد...... چیچہ وطنی۔ محترم چیف ایڈیٹر واسٹاف اور لکھاری وقارئین کو آداب اور سلام الفت اس بار بروقت ملا یعنی فروری کا نئے افق 16 جنوری کو ہی مل گیا۔ پوری ٹیم کی محنت کو سلام سب سے پہلے مشتاق بھیا کا اداریہ پڑھا جس میں ہمارے سیاستدانوں کے لیے پیغام تھا اداریے سے سیدھے قارئین کی محفل گفتگو میں پہنچے تو وہاں ہر کسی کو اچھے موڈ میں پایا ہر کسی نے خوب صورت انداز میں اپنی رائے کا اظہار فرمایا۔ 16 جنوری کو پرچہ ملا 28 جنوری کو یہ سطریں آپ کے لیے لکھ رہا ہوں اس دوران وقفے وقفے سے پورے پرچے کا مطالعہ کیا نئے سلسلوں سے پرچے کی مقبولیت میں اضافہ ہوگا نئے افق وہ واحد ڈائجسٹ ہے یہاں پر صرف معیار کو مدنظر رکھا جاتا ہے میری ایک پروفیشنل رائٹر سے بات ہوئی ادب کی دنیا میں بہت بڑا نام ہے ان کا فرمار ہے تھے غفار بھائی نئے افق نے میری بھی چند کہانیاں یہ کہہ کر رد کردیں کہ یہ ہمارے معیار کی نہیں یہاں ادیبوں کی نورانی شکلوں کو نہیں دیکھا جاتا بلکہ معیار کو اہمیت دی جاتی ہے آج میں تبصرے کو نظر انداز کر کے اپنی سوچ آپ لوگوں تک پہنچانا چاہتا ہوں۔ معافی وتوبہ کا ریموور کسی وقت بھی کام آسکتا ہے آئیں ہم مل کر یہ عہد کریں کہ ہم نے ہر سو خوشیاں تقسیم کرنی ہیں تاکہ نفرتوں کا وجود ہی ختم ہو جائے انسانیت کو زندہ کرنا ہے یہ سب اس وقت ممکن ہوگا جب ہم اپنے اپنے حصے کی غلطی تسلیم کریں گے ہمیں میدان عرفات والا سبق یاد کرنا ہوگا کسی کی کامیابی پر حسد نہیں کرنا بلکہ اس کی حوصلہ افزائی اور تعریف کرنا ہوگی اپنی عقل ٹھیک اور دوسروں کی بات غلط لکھنا صرف منفی بات ہی پکڑ کر اس کو ظاہر کرنا اس ریت کو ختم کرنا ہوگا۔ دوسروں کے رویے کو نظر انداز کر کے خود کو بہتر سے بہتر بنانا ہوگا۔ نئے افق کا منشور سب

سے پہلے معیار اور آپس میں محبتیں تقسیم کرنا ہے۔ ہم فخر کر سکتے ہیں کہ نئے افق پاکستان میں واحد ڈائجسٹ ہے یہاں اصولوں پر سمجھوتہ نہیں ہوتا۔ آج ہم نے آپس کی نفرتوں کو بھلا کر محبتوں کا پرچار کرنا ہے اور پرچے کے لیے جو کچھ بھی لکھنا ہے معیار کو مدنظر رکھ کر لکھنا ہے تا کہ اس کی مقبولیت میں اضافہ ہوا ہم نے نئے افق کے پلیٹ فارم کے ذریعے محبت کا پیغام لوگوں تک پہنچانا ہے۔ بھائی مجید جانی سے ہماری کوئی عداوت نہیں کوئی دشمنی نہیں ہمیں تو صرف پرچے کا معیار عزیز تھا اگر ادارہ اس کو معاف کرتا ہے تو قارئین کی طرف سے میں سب سے پہلے اپنے بھائی کو معاف کرتا ہوں اللہ پاک کی رحمت اور فضل و کرم کے دروازے آپ پر ہمیشہ کھلے رکھے، آمین۔

عامر زمان عامر...... بورے والا۔ خوب صورت سرورق کے ساتھ نئے افق کا تازہ ترین شمارہ پڑھ کر دلی خوشی ہوئی ہے نہایت عمدگی سے دیہات کے فطری منظر کی خوب عکاسی کی گئی دستک میں مشتاق احمد قریشی کا نشتر قلم ملک کی معروف سیاسی جماعت کے کھلے انداز میں جراحت کر کے آئینہ دکھاتا نظر آرہا ہے، بہت خوب یہ کڑوی حقیقت جانتا ہر کوئی ہے مگر کلمہ حق کہنے کی جرات کوئی کوئی رکھتا ہے گفتگو پڑھ کر مزہ آ گیا۔ نئے ادبی سلسلے ''اس ماہ کا شاعر'' کا بھرپور خیر مقدم کرتے ہوئے اپنے مجموعہ کلام سے منتخب کلام ارسال خدمت ہے قوی امید ہے قریبی اشاعت میں جگہ دے کر حوصلہ افزائی کریں گے عرصہ دراز سے 2 عدد تحاریر افسانہ پاداش اور مکمل ناول کاغذ کی کشتی آپ کے حکم کی تعمیل کرتے ہوئے ادارہ کو ای میل کی تھیں مگر لگتا ہے آپ میل باکس چیک نہیں کرتے۔ براہ کرم بالترتیب قریبی اشاعت میں جگہ دے کر مان بڑھایے گا نامور شاعر جناب ریاض حسین قمر کا تعارف اور نمونہ کلام پڑھ کر شاعرانہ جذبوں کو تقویت میسر آئی میری ناقص رائے کے مطابق تعارف اور کلام متعدد صفحات پر بکھیرنے کی بجائے آخری صفحات پر ترتیب سے کلام یکجا شائع ہو تو کیا ہی اچھا ہے مشورے پر غور کیجیے گا امید ہے ساتھی رائٹرز و شعرا کرام بھی میری رائے سے اتفاق کریں گے۔ فروری کے شمارے میں منظور حسین، فاخر رضوی، کنول خان، عمر فاروق ارشد کی شاعری اور سعدیہ سعد اور فریحہ چوہدری کا انتخاب بے حد پسند آیا۔ خطوط میں احسان سحر میانوالی، محمد یاسر اعوان، نیر رضوی، گل مہر، عبدالغفار عابد، مہر پرویز احمد دولو اور انجم فاروق ساحلی کے خطوط شاندار تھے۔ زریں قمر کے خوب صورت قلم سے ٹماٹو کیچپ اس ماہ کی ٹاپ آف دی لسٹ تحریر تھی زبردست۔ اس کے علاوہ عمران احمد کی آشفتہ دل، نفیسہ سید کی وجود زن، خلیل جبار کی ڈائن، ثریا صغیر صدیقی کی اہرام محبت، وقار الرحمان کی چراغ راہ اور ناصر ملک کی زادراہ بہترین کہانیاں تھیں فن پارے میں لگی تمام مختصر کہانیاں اپنی مثال آپ تھیں۔ انتظار کی فہرست میں کہانیوں کو رکھ کے باری آنے پر شامل اشاعت کرنا ظاہر ہے ہر ادارے کی اپنی پالیسی ہوتی اور مجبوری ہوتی ہے مگر طویل انتظار کے انداز کرنا رائٹر کے ساتھ زیادتی ہے براہ کرم جس قدر ممکن ہو انتظار کا دورانیہ کم کر کے دو سے تین ماہ تک مشتمل کیجیے نوازش ہوگی۔

ممتاز احمد...... سیٹلائٹ ٹائون سرگودھا۔ قابل صد احترام جناب مشتاق احمد قریشی صاحب جناب عمران احمد جناب اقبال بھٹی صاحب جناب طاہر احمد قریشی صاحب السلام علیکم امید ہے کہ اللہ کے فضل و کرم سے آپ سب بخیریت ہوں گے۔ فروری کا شمارہ 19 تاریخ کو مل گیا تھا۔ اس بار سرورق بہت عمدہ اور منفرد تھا دستک میں محترم مشتاق صاحب نے سیاست کے موضوع پر مدلل بات کی۔ اقرا کا مطالعہ اور گفتگو کے آغاز میں حدیث پاک نے روح کو سیراب کیا۔ سبحان اللہ۔ گفتگو کی شروعات انصاف کے حوالے سے خوب تھی سب سے پہلے میانوالی کے محترم احسان سحر صاحب کو انعام یافتہ خط لگنے پر بہت بہت مبارک ہو۔ ماشاء اللہ خط بہت بہترین اور جامع تھا اس بار چودہ عدد خطوط اپنی آب و تاب کے ساتھ جگمگا رہے تھے۔ پچھلے دو مہینے میں نے اپنے

خطوط عام ڈاک سے بھیجے تھے لگتا ہے وہ آپ تک نہیں پہنچے یا پھر تین تاریخ کے بعد ملے ہوں گے خیر اس بار بذریعہ رجسٹرڈ ڈاک سے بھیج رہا ہوں سب سے پہلے بات کروں گا پیارے مجید احمد جائی صاحب کی اسٹوری پر تو یہ بالکل ان کی غلطی ہے کہ ایک ہی اسٹوری مختلف ڈائجسٹوں میں شائع ہوئی یہ کس وجہ سے شائع ہوئی اور کیوں ہوئی یقیناً یہ بات وضاحت طلب ہے تو مجید جائی صاحب کو اس پر معذرت اور وضاحت کرنی چاہیے بہر حال یہ غلطی تو ہے مگر کوئی اتنا سنگین نا قابل معافی جرم بھی نہیں ہے۔ میں ادارے سے پر زور اپیل اور درخواست کرتا ہوں کہ آپ نے مجید جائی کو پرچہ میں جگہ نہ دینے کا جو فیصلہ کیا ہے اس پر نظر ثانی فرمائی جائے اور ان کو آخری موقع دیا جائے کیونکہ مجید جائی صاحب اچھا ادب تخلیق کر رہے ہیں تو قارئین کرام کی کثیر تعداد کو ان کی لکھی ہوئی تحریروں سے محروم نہ کیا جائے نوازش ہوگی ہمارے فاضل دوست جناب عامر زمان عامر صاحب جناب عبدالغفار عابد صاحب اور جناب مہر پرویز احمد دولو صاحب کافی ناراض نظر آ رہے تھے آپ تینوں دوستوں کی ناراضگی بجا اگر آپ کی مجید احمد جائی صاحب کے کسی جملے سے دل آزادی ہوئی ہو رنج پہنچا ہو تو براہ کرم آپ درگزر فرمائیں میں ان کی طرف سے آپ سے معذرت کرتا ہوں۔ پیارے دوستوں ہم سب قلم قبیلہ سے تعلق رکھتے ہیں کوئی بھی انسان مکمل نہیں ہوتا بندہ بشر سے ایسی بھول ہو جاتی ہے تو وسیع القلبی کا مظاہرہ کرتے ہوئے درگزر سے کام لیں صائمہ نور، عمر فاروق ارشد، محمد یاسر اعوان، نیئر رضوی، گل مہر، ریاض بٹ، علی حسنین تابش، جاوید احمد صدیقی اور انجم فاروق ساحلی صاحبان کے خطوط اور تبصرے شاندار اور جاندار تھے سب سے پہلے محمود ظفر اقبال ہاشمی صاحب کا انٹرویو پڑھا بہت اچھا لگا ان کے بارے میں سیر حاصل معلومات حاصل ہوئیں اس ضمن میں آپ سے گزارش کروں گا کہ ہمارے شہر سرگودھا کی ایک مایہ ناز شخصیت جو کہ ماہر تعلیم، شاعر، ادیب، افسانہ نگار، مترجم اور پاکستان کے پہلے نابینا ہیں جنہوں نے ایم اے انگلش، ایم اے اردو پہلے نابینا ایم فل گولڈ میڈلسٹ پہلے نابینا پی ایچ ڈی ہیں اور نابیناؤں کی فلاح و بہبود کے لیے گزشتہ چالیس سال سے کام کر رہے ہیں۔ ان کا نام پروفیسر ڈاکٹر شیخ محمد اقبال ہے تو پلیز ان کا انٹرویو بھی نئے افق میں لگائیں۔ (آپ ان کا انٹرویو اور افسانہ ارسال کر دیں، ہم انہیں شائع کرنے کا اعزاز حاصل کریں گے) ٹماٹو کیچپ بہترین تحریر تھی آشفتہ دل بہت عمدہ اور لاجواب کہانی تھی عنقا لوگ اچھی کہانی تھی وجود زن شاندار کہانی تھی خلیل جبار صاحب ڈائن کے عنوان سے بہترین کہانی لے کر آئے۔ اہرام محبت کا اختتام زبردست تھا۔ بے وفا بیوی اور غدار دوست کا یہی انجام ہونا چاہیے تھا۔ ریاض بٹ صاحب کی کہانی الٹی آنتیں بلاشبہ زبردست کہانی تھی جرائم کی تفتیش کے سلسلے میں پیش کی جانے والی کہانیاں زبردست ہوتی ہیں دستگیر شہزاد نے بھوک کے عنوان سے بہت خوب صورت کہانی تخلیق کی جسم کی اور پیٹ کی بھوک کو بہترین انداز میں لکھا۔ چراغ راہ، فریب خوردہ اور فن پارے میں شامل تمام کہانیاں بہت پسند آئیں اچھی لگیں۔ ریاض حسین قمر صاحب کی شاعری نے تو شمارے میں چار چاند لگا دیے بہت اچھی شاعری تھی اور یہ سلسلہ بہت پسند آیا ہے اب اسے جاری رہنا چاہیے۔ خوش بوئے سخن میں نوشین اقبال نوشی کو انعام یافتہ کلام پر مبارکباد۔ کنول خان، سعدیہ سعد، فریحہ چوہدری، ڈاکٹر علی حسنین تابش، عمر فاروق ارشد، ریاض حسین قمر اور ریحانہ عامر کے انتخاب بہت اچھے تھے پسند آئے اب اجازت چاہوں گا ان شاء اللہ اگلے ماہ حاضری ہوگی اگر زندگی نے وفا کی تو۔

انجم فاروق ساحلی...... لاہور۔ آداب۔ امید ہے آپ اور ادارہ کے دیگر احباب بخیر و عافیت ہوں گے نئے افق کا ٹائٹل اس مرتبہ بڑا خوشنما اور جاذب نظر ہے عمران احمد صاحب نے اس مرتبہ گفتگو میں اہم اسباق کی طرف اشارہ کیا۔ خطوط کی محفل خوب ہری بھری تھی۔ جن قارئین نے آدھا بٹن کہانی کو پسند کیا اور سراہا ان

کا مشکور ہوں ہمارے محترم بھائی جاوید احمد صدیقی صاحب بھی اپنے بھرپور تجزیہ کے ساتھ موجود تھے۔ ان کی مختصر تحریر یکم اپریل بھی خوب تھی اس کے علاوہ غدار، دہلی میں موت اچھی کاوشیں تھیں۔ اشتیاق نامہ شائع کرنے کا شکریہ کرشن چندر کے متعلق کچھ عبارت شائع نہ ہوسکی۔ جنوری 2016ء کے اردو ڈائجسٹ میں اشتیاق احمد کے متعلق مضمون شائع ہوگیا جو دلچسپی کا سبب بنا۔ اس مرتبہ نئے افق کی اشاعت نکھری ہوئی تھی باقی تحریروں میں وجودزن، ڈائن، اہرام محبت، الٹی آنتیں، بھوک، چراغ راہ اچھی کہانیاں تھیں۔ آشفتہ بھائی عمران احمد کی تحریر طویل عرصہ کے بعد نئے افق کے صفحات پر جلوہ گر ہوئی اور خوب صورت تھی کچھ تحریریں ابھی زیر مطالعہ ہیں میرا مجرم اچھا ناولٹ تھا بھٹی صاحب اور عمران صاحب خوب سے خوب تر کی تلاش میں ہیں امید ہے باقی کہانیوں کی طرف جلد از جلد توجہ فرمادی جائے گی۔

مہر پرویز دولو...... میاں چنوں۔ محترم ایڈیٹر صاحب۔ السلام علیکم۔ محبتوں کا سورج طلوع ہوتے ہی نفرتوں کے سائے دور کہیں افق کے پار روپوش ہوجاتے ہیں جب پیار کی خیرات اپنے پرائے کی تمیز کیے بغیر بانٹی جارہی ہو تو سفید پوش اور کھاتے پیتے لوگوں کا بھی خالی کاسہ بھرنے کو جی چاہتا ہے اور جب یہ سوغات لٹانے والا حاتم طائی کی بجائے کوئی مسلمان مدبر، مفکر، مبلغ اور پارسا ہو تو اس کے خزانے کب اللہ تعالیٰ خالی ہونے دیتا ہے کیونکہ اس کا تو وعدہ ہے کہ ایک کے بدلے ستر درجے دیتا ہے۔ نئے افق کی معطر خوشبوئیں آدھا ماہ قبل ہی پورے پاکستان اور دنیا کی فضاؤں کو مہکا دیتی ہیں۔ یعنی اب اس کا انتظار صرف پندرہ دن کرنا پڑتا ہے۔ کتنے ہی لوگ جنہوں نے آنکھوں کو اس کی راہوں میں بچھایا ہوتا ہے اس کی دید سے فیضیاب ہوتے ہی من کی مرادیں پا جاتے ہیں۔ اس قافلے کے سالاروں کی خوبیاں شمار کرنے کے لیے لمبی مدت درکار ہے۔ حوصلوں کی چٹان، محبت کے کوہ ہمالیہ برداشت کے معاملے پر ماؤنٹ ایورسٹ سے بھی بلند چوٹی پر براجمان بے زبان جذبوں کو بولنے کی استطاعت دینا مجھ جیسے' جن کو ٹھیک طرح سے پڑھنا بھی نہیں آتا ان کو ادیب بنایا نکے نکے ہوتے تھے تو نئے افق پڑھتے ہی عظمت کا احساس ہوتا تھا پھر کراچی جیسے شہر کے اردو کی معراج کے عظیم شاہکاروں کے ہاتھوں باگ ڈور کافی کچھ سوچنے پر مجبور کردیتی تھی۔ آج اس نئے افق میں تحریر شائع ہوتی ہے تو سر فخر سے تن جاتا ہے آج ہم بھی اس قافلے کے راہیوں کے جوتے اٹھانے والوں میں شامل ہیں اس شمولیت کا سہرا اس قافلے کے سرسید کے سر پر ہے۔

اس ماہ کے سرورق کو دیکھتے ہی یہ شعر کہیں سے ذہن کے نہاں خانے میں آیا۔

گھنا پیڑ ہو، تیز بارش ہو اور تنہا لڑکی ہو
ایسے منظر کبھی شہروں میں تو پائے نہ گئے

گفتگو میں ادارے کی پالیسی کے بارے میں آگاہی ہوئی محمود ظفر اقبال صاحب علم کا منبع ہیں ٹماٹو کیچپ زریں قمر کی خوب تحریر تھی مگر ڈاکٹر ایم اے قریشی صاحب کی غیر حاضری خار کی طرح چبھ رہی ہے مکھڑا چھپا کر اتنا بھی دید کی پیاس کو بڑھانا نہیں چاہیے کہ کہیں سانسیں ہی بند نہ ہوجائیں۔ جناب اقبال بھٹی صاحب بھی تحریر کے معاملے میں چپ کی بکل مار کر چھپ گئے ہیں جبکہ سردی تو یہاں ہمارے ہاں کڑاکے کی پڑ رہی ہے یہ تو بھلا ہو حکومت پنجاب کا 31 جنوری تک چھٹیاں بڑھادی ہیں نفیسہ سعید کے وجودزن میں یہ جملہ "ہاجرہ نے چڑیا کے بچے کو جنم نہ دیا تھا" بالکل پسند نہیں آیا چڑیا انڈے دیتی ہے بچے نہیں اور عورت بچہ دیتی ہے چڑیا کا بچہ نہیں۔ (نفیسہ سعید لیکچرار اور سینئر استاد ہیں انہوں نے غلط نہیں لکھا یہ جملہ محاورتاً لکھا اور بولا جاتا ہے) اس دفعہ فن پارے میں پرے تو تھے فن تو سورج لے کر بھی گیا نظر نہیں آیا اس قبیلے کے لوگ سدا خود رہیں آمین۔

فلک شیر ملک...... رحیم یار خان۔ جناب قابل قدر مشتاق احمد قریشی، عمران احمد، اقبال بھٹی اور طاہر احمد قریشی صاحبان۔ سلام عقیدت قبول کریں جہاں ہر سو سرسوں کے پھولوں نے دھرتی کو پیلا لباس پہنا کر بہار کی آمد کا اعلان کیا وہیں گندم کی لہلاتی فصل کی ہریالی نے نظروں کو تراوٹ بخشی۔ ساتھ ہی نئے افق کی آمد نے دل خوش کر دیا۔ ٹائٹل ہر لحاظ سے زبردست تھا۔ تانگہ گھوڑا، بکریاں، ساتھ کتا پت جھڑ کے بعد پر بہار شجر یہ سب ہماری معاشرتی اور ثقافتی نشانیاں ہیں بڑی خوب صورت پرکاری کی گئی جتنی لذت نئے افق کے انتظار میں رہی تحریریں پڑھ کر مزہ دوبالا ہوا۔ دستک اور عمران صاحب کی گفتگو ہمیشہ سے قابل تحسین رہی ہے۔ سوئی ہوئی حکومت کو جگانا اور مردہ ضمیروں کو زندہ کرنا زبردست رہا۔ پھر طاہر قریشی صاحب کا اقرا لکھنے کا انداز کمال کی بات ہے۔ خطوط کی محفل میں احسان سحر اپنے خوب صورت تبصرے کے ساتھ نمبر ون نظر آئے مبارکباد دیتا ہوں، نیئر رضوی کا تبصرہ بھی شاندار رہا جو مثالوں سے بھرپور تھا عبدالغفار مجاہد، ریاض بٹ، مہر پرویز دولو اور جاوید صدیقی کے تبصرے بھی خوب صورت انداز میں لکھے گئے تھے۔ شاعر اور رائٹرز کے انٹرویوز اور کلام والا سلسلہ بہترین کاوش ہے اور اس کا کریڈٹ مدیران نئے افق کو جاتا ہے۔ محمود ظفر اقبال میرے ہی شہر کے باسی ہیں کینوس پر رنگ بکھیرنے والا اور سفید گلاب جیسے ناول لکھنے والا خود بھی گلاب جیسے دل کا مالک ہے۔ پہلی تحریر ٹماٹو کیچپ زرین قمر نے فرناز کی زندگی کے حالات وواقعات پر مفصل لکھا۔ آخری سطور پڑھ کر آنکھوں سے آنسوؤں کی جھڑی لگ گئی۔ عمران احمد کی افسانہ نما تحریر آشفتہ دل دلچسپ اور متاثر کرنے والی تھی صفحہ نمبر 72 پر پرنٹنگ کی غلطی سے کچھ ردھم ٹوٹا جب دروازے کے ہینڈل کو بار بار گھمایا گیا مجھے اینڈ پر تھوڑی پریشانی ہوئی جب للی نے بیکر بے چارے کو چھوڑ کر چارلس کا ساتھ دیا۔ عنقا لوگ ایک سبق آموز کہانی تھی دنیا میں اچھے لوگوں کی کمی نہیں جیسے سہیل اور ثمینہ نے بے سہارا جوڑے کو ملازمت دی اور پھر مسز عائشہ نفیس اور نفیس نے بھی یہ ثابت کیا کہ ساس بھی ماں جیسی ہوتی ہے۔ وجود زن شاندار تحریر، زندگی میں کبھی کبھی ایسے لمحے بھی آجاتے ہیں جب فیصلے کرنا مشکل ہوجاتا ہے مگر اللہ کی رہنمائی کام کر جاتی ہے ہاجرہ اور صفیہ نے راز کو راز رکھتے ہوئے عقل مندی کا ثبوت دیا اور ایک بڑے گناہ سے بچ گئیں۔ امجد جاوید کی عشق کسی کی ذات نہیں۔ پڑھ کر جی چاہتا ہے کہ یہ ناول جاری ہے۔ عورت زاد کو موخر کر کے اسی کو آگے چلائیں ادھر ناصر ملک کا زاد سفر رسالے کی جان بنا ہوا ہے۔ دونوں ناولٹ میں کچھ مماثلت ہے۔ مگر انداز اپنا اپنا جو بہت خوب صورتی سے آگے بڑھ رہے ہیں۔ ایک طرف شبانہ جو زرق شاہ کی طرف جھکتی جارہی ہے اور سعدیہ نماز روزے کی طرف آچکی ہے تو دوسری طرف بانو بے چاری دکھوں کی ماری، جو شاہ سائیں کے چنگل سے نکل کر عینی اور شہزاد کو پس آئینہ چھوڑ کر نئی منزلوں کی طرف رواں ہے۔ سمیرا اور صدف عینی کی شکل میں اسے ملی ہیں اور شہزاد کی جگہ کامران سمیرا کا بھائی لینے والا ہے۔ خوب اور دلفریب انداز میں دونوں ناول نگار لکھ رہے ہیں جو اس پیارے سے رسالے کے لیے خوش آئند بات ہے۔ ڈائن، احرام محبت اور بھوک تینوں تحریریں عورت کی نسوانی اور حیوانی خواہش پر لکھی گئی تھیں ان شوہروں کے لیے لمحہ فکریہ جو اپنی بیویوں سے غافل ہیں اور پھر بیوی کو اکیلا چھوڑ کر غیر ملک چلے جانا غیر دانشمندانہ اقدام ہے۔ رزق وہی ملتا ہے جو مقدر میں لکھا جاچکا ہے زبردست تحریریں تھیں۔ بھوک پڑھ کر تو میرے جذبات بھی برانگیختہ ہونے لگے تھے۔ دستگیر شہزاد نے جملے ہی ایسے لکھے تھے مثلاً بلاؤز کو بدن سے الگ کر دیا چراغ راہ میرے بھائی وقار الرحمان نے مختصر اور بہترین اسٹوری لکھی ایک اچھا افسانہ ہمیشہ یاد رہنے والا تھا ایسے مجاہدوں اور شہیدوں پر ضرور لکھا جانا چاہیے یہی لوگ ہمارے وطن اور قوم کا سرمایہ ہیں۔ فریب خوردہ بے عقل گنوار عورت پر لکھی گئی داستان اچھے انداز میں بیان کی گئی۔ رضیہ نے اپنی عزت گنوا کر سبق سیکھا لڑکپن کا پیار ہوتا ہی ایسا ہے شریف کا

کردار اچھا رہا جس نے رضیہ کو اپنا لیا جو دو عاشقوں کو مار چکی تھی میرا محرم میرا مجرم رشتوں کے گرد گھومتی، طویل تحریر پڑھ کر مزہ آیا اینڈ بھی شاندار ہوا۔ کبیر نے ارسل کی غلط فہمی دور کر کے اچھا کیا اور ٹوٹے ہوئے دل پھر سے جڑ گئے دلکش اسٹوری تھی۔ فن پاروں میں غدار اور یکم اپریل بہترین تحریروں کا نمونہ تھیں باقی تین کچھ رنگ نہ جما سکیں۔ سلسلہ ذوق آگہی اور خوش بوئے سخن انتہائی کامیاب جا رہا ہے۔ دلچسپ اور معیاری جواہرات سے بھر پور کلام اور اقتباسات بہت محظوظ کرتے ہیں۔ اللہ کی بادشاہت کے علاوہ بہار کا روپ پنج تن واقعہ کربلا اور انمول ہستی دلکش انداز میں موتیوں کی لڑیاں پروئی گئی تھیں نظمیں غزلیں سب ایک سے بڑھ کر ایک تھیں۔ شمارہ عروج پر ہے اور ان شاء اللہ ایسے ہی رہے گا۔ ایک تو پرنٹنگ پر توجہ کی ضرورت ہے اور دوسرا اگر ہو سکے تو نئے افق میں دس صفحات کا اضافہ کیا جائے بے شک قیمت میں بھی دس روپے کا اضافہ کریں تاکہ ایک آدھ کہانی اور شامل ہو سکے۔ دعا ہے کہ اللہ پاک اہل ادارہ اور اس کے تمام رسائل کو دن دگنی رات چگنی ترقی عطا فرمائے، آمین۔

رانا حبیب الرحمان...... سینٹرل جیل لاہور۔ جناب مشتاق احمد قریشی، محترم عمران احمد السلام علیکم۔ جناب، میں نے کئی دفعہ آپ کے ماہنامہ نئے افق میں کچھ نہ کچھ لکھنے کی کوشش کی لیکن ہر دفعہ کبھی کاغذ کی پرابلم تو کبھی خط کا لفافہ کی پرابلم اور کبھی رسالہ نہ ملنے کی اور کبھی جلد نہ ملنے کی پرابلم آڑے آتی رہی۔ اس دفعہ فروری کا شمارہ 17 تاریخ کو ملا تو اتفاق سے میرے پاس کاغذ اور خط لفافہ بھی موجود تھا اس لیے کوشش کر کے آپ کے ماہنامے نئے افق میں کچھ غزلیں جو میری اپنی ذاتی لکھی ہوئی ہیں میں شاعر تو نہیں لیکن پھر بھی کچھ کوشش سے یہ غزلیں لکھیں ہیں امید ہے کہ آپ اور خوش بوئے سخن کی انچارج نوشین اقبال نوشی کو بھی پسند آئیں گی اس کے بعد قارئین کو بھی اور ہاں چھوٹی کہانیاں ہر موضوع پر لکھ لیتا ہوں اور کئی سالوں سے میں اپنی تحریر یا تبصرہ وغیرہ یا غزل وغیرہ بھیجتا رہتا ہوں تمام رسالے بھی زیر مطالعہ رہتے ہیں اسی وجہ سے نئے افق کے سلسلہ گفتگو میں لکھنے والے تمام قارئین مجھے پہلے سے جانتے ہیں اور میرے دوست بھی ہیں۔ ظاہر ہے طویل عرصے سے ساتھ رہنے سے ایک تعلق ایک رشتہ بن جاتا ہے اور وقت کے ساتھ ساتھ اس میں مضبوطی آتی ہے اس کی سب سے بڑی وجہ ہوتی ہے اعتماد کی اگر اعتبار یا اعتماد نہ ہو تو کوئی رشتہ کامیاب نہیں ہو سکتا میں جس مقام پر ہوں یہاں تو بغیر اعتبار کے رشتہ بنانا بہت مشکل ہے کیونکہ یہ جگہ ہی ایسی ہے کہ یہاں پر ہی اپنوں اور پرائے یعنی غیروں کا پتا چلتا ہے۔ اسی جگہ تمام رشتوں کی پہچان ہوتی ہے کہ کون آپ کے ساتھ مخلص ہے یا کون نہیں ہے کون اچھا ہے یا کون برا ہے۔ میں اس وقت عرصہ 9 سال سے سینٹرل جیل لاہور میں سزائے موت کا قیدی ہوں ویسے میری رہائش ضلع ٹوبہ ٹیک سنگھ کی تحصیل گوجرہ کی ہے اگر آپ میری تمام تحریروں کو اپنے پرچے میں خصوصی طور پر جگہ دیں گے تو میں آپ کو اپنی تحریریں بمع گفتگو میں تبصرہ کے بھیج دیا کروں گا کیوں کہ یہاں کاغذ قلم اور خط لفافہ کے بعد رسالے بھی انتہائی مشکل سے ملتے ہیں اس لیے لکھی ہوئی تحریر اگر ضائع ہو جائے تو بہت دکھ ہوتا ہے آپ نے گفتگو میں مجید احمد جائی کا ذکر کیا ہے تو اس میں بھی یہی بات تھی کہ اگر کسی رسالے کو شائع کرنے کے تحریر بھیجی جاتی ہے تو اسے بلیک لسٹ میں ڈال دیا جاتا ہے یا پھر اسے ضائع کر دیا جاتا ہے یا پھر اسے ضائع کر دیا جاتا ہے۔ اب اتفاق یہ ہوا کہ ایک ہی کہانی تمام رسالوں کو بیک وقت بھیجی گئی اتفاق سے تمام رسالوں نے اس کہانی کو شائع کر دیا اس طرح تمام رسالوں میں منظر عام پر آ گئی اس لیے ہم سب لکھنے اور پڑھنے والے اس کی طرف سے معذرت کر لیتے ہیں پلیز اسے دوبارہ لکھنے کا موقع دیں آئندہ ایسی حرکت نہیں اور ہاں ہمیں تمام لکھنے والوں خصوصاً جو آپ کو اپنی محنت کر کے فری مواد شوقیہ بھیج رہے ہیں پہلے ہی بتا دیا جایا کرے کیونکہ شوقیہ فری لکھنے والے ابھی نئے نئے ہوتے ہیں اس لیے ان کی تحریروں میں آپ کو اصلاح

کے لیے تھوڑی سی محنت زیادہ کرنا پڑے تو بھی آپ کو فرق نہیں پڑتا کیونکہ اگر اصلاح کر کے ان کا حوصلہ بڑھایا جائے گا تو آئندہ یہ چھوٹے رائٹرز آنے والے وقت میں بڑے رائٹروں میں شامل ہوں گے لیکن جو چیز مفت کی ملے اس کی قدر نہیں کی جاتی۔ خوش بوئے سخن میں غزلوں کے ساتھ حاضر ہوں آپ اس خط کو گفتگو میں شامل کر کے بھی مجھے ان تمام باتوں کے بارے میں اپنے مشورے سے نواز سکتے ہیں یہ پہلی دفعہ لکھ رہا ہوں امید ہے مایوس نہیں کریں گے۔ نئے افق میں آپ نے جو انعامی سلسلہ شروع کیا ہے یہ بے حد پسند آتا ہے اس سے لکھنے والوں کا حوصلہ بلند ہوتا ہے اور لکھنے والا اچھا اور اچھا مزید اچھا لکھنے کی کوشش کرتا ہے۔ گفتگو میں اس ماہ کا انعام یافتہ خط ہمارے دوست احسان سحر کا ہے احسان سحر بھائی کیسے ہیں آپ اور کیا بات ہے آپ کی کسی پرچے میں کہانی کیوں نہیں آرہی صرف ایک دو بار روزنامہ دنیا میں آپ کے چھوٹے کالم پڑھے تھے اب وہ سلسلہ بھی رکا ہوا ہے۔ جلد ہی نئے افق کو کوئی کہانی ارسال کریں صائمہ نور صاحبہ آپ کا نہایت ہی پیار سے اور عاجزانہ یعنی مودبانہ سلام قبول کرلیا ہے صائمہ جی قسم سے آپ نے اتنا اچھا لکھا ہے کہ کیا بات ہے۔ عمر فاروق بھائی واضح بات ہی اچھی ہوتی ہے ہمیں ہر بات نئے افق میں اور ہر طرح کا اظہار خیال کھل کر کرنا چاہیے۔ یاسر اعوان صاحب آپ کے خیالات بھی اچھے ہیں مگر...... عامر زمان عامر صاحب اگر کوئی لکھنے والا غلطی کرتا ہے تو سب مل کر پہلے اسے وارننگ دیں پھر ادارہ کو رپورٹ کریں یعنی اگر پھر بھی لکھنے والا ویسی ہی حرکت کر رہا ہے تو رپورٹ ادارہ کو ملنی چاہیے جو فیصلہ سب کا ہو وہ ادارہ کرے گا۔ باقی اس طرح آپ کا مشورہ ہمیں پسند نہیں آیا غور ضرور کریں۔ نیئر رضوی بھائی آپ کا خط پڑھ کر دکھ ہوا کیونکہ میں کم از کم پانچ ماہ بعد نئے افق پڑھ رہا ہوں اور پہلی بار اس میں لکھ رہا ہوں اس لیے مجھے پچھلے چار یا پانچ ماہ میں ہونے والی کسی بات کا پتا نہیں ہے اس لیے آپ میرے کہنے پر بلکہ سب کی رائے ہی ہوگی کہ دل پر مت لیں زندہ دل بننے کی کوشش کریں گل مہر صاحبہ آپ کا خط پڑھ کر ہنسی آئی کہ کیا خیالات ہیں موصوفہ کے گل مہر صاحبہ آپ کے خط کا جواب یہ ہے کہ کچھ کام ایسے ہوتے ہیں جن کے لیے صرف بولنا پڑتا ہے تو وہ ہو جاتے ہیں کچھ کام ایسے ہوتے ہیں جن میں احتجاج کی بجائے کچھ عمل بھی کرنا پڑتا ہے آج کل کے زمانے میں وہ عمل ہے ایڈونچر کچھ کرنے سے ہی سب کچھ ہوتا ہے ویسے آپ نے فقرہ اس طرح لکھنا تھا کہ بلی کے گلے میں گھنٹی کون باندھے باقی بات رہی صرف تین بندوں کی 65 بندوں کو یرغمال بنانے کی دنیا میں تو ہزاروں دلیر اور پہلوان ہیں صرف نام کے اور ہاں یہاں اپنی مثال دیتا ہوں کہ جیلوں میں ایک بارک میں کم از کم 250 قیدی ہوتے ہیں جنہیں ملک میں خطرناک ترین کہا جاتا ہے لیکن اپنی بارک میں اندر لے جانے کے لیے یا کہیں اور لے جانے کے لیے صرف ایک ملازم پولیس کی وردی میں ہوتا ہے۔ اب 250 دلیر بندوں کے لیے ایک ملازم کیا حقیقت رکھتا ہے میرا خیال ہے اگر اس کے حصے بانٹے جائیں تو قیدی حصہ نہ ملنے پر آپس میں جھگڑ پڑیں آپ تین بندوں کے 65 کو یرغمال کی بات کر رہی ہیں بس کچھ مجبوری کچھ احساسات اور کچھ نہیں ہوتا انسان کے لیے مسکان بھٹی صاحبہ کن عورتوں کو جو دوپٹہ ڈال کر دفتر آتی ہیں اگر زیادہ رش والی جگہ پر وہ دوپٹہ ذرا سا دوسری طرف کھسک جائے تو میڈیا پر شور کرنا کہ ہمارا دوپٹہ سر پر سے کھینچ لیا یا پھر کوئی اور ضرور بتائے گا۔ عبدالغفار عابد بھائی آپ والی بات عامر زمان نے کی لیکن بری لگی اور آپ نے کی تو اچھی لگی اس کی وضاحت کردیں پلیز۔ علی حسنین صاحب آپ نے جو کچھ لکھا ہے کیا اگر آپ کو اس پر موقع ملے تو آپ عمل کریں گے۔ اگر کر سکتے ہیں تو ضرور بتائیے گا۔ باقی رسالہ زیر مطالعہ ہے اس لیے تبصرہ کرنے سے معذرت خواہ ہوں۔ آئندہ اگر موقع دیا گیا تو ضرور تبصرہ بھی کروں گا ویسے بھی میری عادت ہے جو بات تعریف کے قابل ہو کھلے دل سے تعریف کرو ورنہ چپ بھلی۔ آخر میں سب سے کہتا چلوں کہ اگر کسی کا دل

چاہے تنقید یا مزاح کرنے کو تو ضرور کرے اور دل کھول کر مجھے جواب دینا آتا ہے یوں دوسروں کو تنگ نہ کریں۔

ریاض حسین قمر..... منگلا ڈیم۔ محترم و مکرم جناب عمران احمد صاحب السلام علیکم امید ہے آپ مع اپنے اسٹاف کے بالکل خیریت سے ہوں گے ماہ فروری کا نئے افق باصرہ نواز ہوا ایک دیہاتی ماحول کا تاثر دیتا خوب صورت ٹائٹل دل کو بہت بھلا لگا ٹائٹل والی حسینہ اس منظر کو خوشگوار حیرت سے ملاحظہ فرما رہی ہیں۔ محترم مشتاق احمد قریشی صاحب نے دستک میں جس سیاسی سٹرانڈ کا ذکر فرمایا ہے وہ ان کا ہی کا کام ہے۔ ان کے قلم سے نکلا ہوا ایک ایک لفظ بہت قیمتی ہوتا ہے ہمارے سیاسی رہنماؤں کا حال چور مچائے شور والا ہے اس معاملے میں ہم من حیث القوم بہت ہی بدقسمت لوگ ہیں خدا ہمارے حال پر رحم فرمائے، آمین۔ گفتگو کے آغاز میں آپ نے بہت پیاری حدیث پاک کوڈ کی ہے۔ گفتگو سے پہلے اپنی بات میں آپ نے مختصر الفاظ میں بہت کچھ فرمادیا۔ آپ نے مجید احمد جائی صاحب کے بارے میں جو فیصلہ فرمایا ہے۔ وہ تعریف کے قابل ہے۔ عمران صاحب آپ نے ماہ فروری کے شمارے میں میرا تعارف اور چیدہ چیدہ کلام شائع فرما کر میری بہت زیادہ حوصلہ افزائی فرمائی ہے میرے پاس اس کا شکریہ ادا کرنے کے لیے الفاظ موجود نہیں ہیں آپ نے ایک اچھا سلسلہ شروع کیا ہے اور اس سلسلے میں آپ نے مجھے جو اولیت عطا فرمائی ہے اس کے لیے میں آپ کا دوبارہ شکریہ ادا کرتا ہوں میں سمجھتا ہوں کہ مجھے نئے افق کے ساتھ بے لوث لگاؤ کا صلہ مل گیا ہے سچی یاری سب پر بھاری۔ گفتگو میں پہلا اور انعام یافتہ خط جناب احسان سحر کا ہے محترم بہت بہت مبارک آپ کا خط واقعی انعام حاصل کرنے کے قابل تھا آپ نے جنوری کے شمارے میں شائع ہونے والے میرے خط کو پسند فرمایا میری طرف سے شکریہ قبول فرمائیے۔ محترمہ صائمہ نور صاحبہ نے اپنے خط میں قیمتی خیالات کا اظہار فرمایا ہے محترمہ آپ نے میرے خط کو پسند فرمایا جس کے لیے بہت بہت شکریہ۔ محترم عمر فاروق ارشد کا خوب صورت خط پڑھنے کو ملا آپ واقعی دل کے صاف آدمی ہیں جو آپ کے دل میں ہوتا ہے وہی آپ کے قلم سے نکلتا ہے عمر بھائی آپ بھی تو مجھے اپنی دعاؤں میں یاد رکھتے ہیں نا۔ محترم یاسر اعوان کا خط اور تبصرہ خوب صورت اور جاندار ہے یاسر بھائی تبصرہ پسند فرمانے کا بہت بہت شکریہ۔ محترم عامر زمان صاحب میں آپ کی تجویز کی تائید کرتا ہوں ادب کی کالی بھیڑوں کو کم از کم نئے افق جیسے جریدہ سے دور رکھا جائے اس کے لیے عمران صاحب کا فیصلہ بروقت ہے۔ امید ہے اس پر مستقل طور پر عمل درآمد ہمیشہ جاری رکھا جائے گا۔ محترم نیر رضوی کا خط پڑھ کر دکھ ہوا۔ محترم کسی قاری کے تبصرہ سے اس قدر دل برداشتہ ہوئے ہیں کہ انہوں نے نئے افق سے قلمی بائیکاٹ کا لکھ دیا ہے نا بھئی ہر قاری کو اپنی سوچ اور سمجھ کے مطابق لکھنے اور تبصرہ کرنا کا حق حاصل ہے۔ میرے خیال میں موصوف نے ایک جنرل بات کی تھی اس میں کسی خاص شخص کا نام لے کر یہ نہیں کہا کہ فلاں کا کلام زیادہ شائع ہوتا ہے۔ پیارے نیر رضوی ایسے فیصلے نہیں کرتے۔ آپ اپنی تحاریر باقاعدگی سے نئے افق کو بھیجیں شائع تو معیار اور میرٹ پر ہونا ہوتا ہے جو نئے افق کی بڑی واضح پالیسی ہے محترمہ گل مہر صاحبہ نے میری لکھی بات پر جس طرح سیر حاصل تبصرہ فرمایا ہے میں اس کے لیے ان کا بہت شکر گزار ہوں آپ نے سچ فرمایا ہے کہ جھیل میں ارتعاش پیدا کرنے کے لیے ایک ننھا سا پتھر پھینکنے کی ضرورت ہے اور وہ پتھر کسی کو تو پھینکنا چاہیے میں اس کے لیے ان کا بہت بہت شکر گزار ہوں کہ انہوں نے میری لکھی باتوں کو غور سے پڑھا اور اس کی وضاحت فرمائی ہے۔ محترم ریاض بٹ بھائی آپ کی کہانی اگر چھپے تو میں سب سے پہلے اسے پڑھتا ہوں۔ آپ کا تحریر کردہ خط اور کہانی الٹی آنتیں دونوں ہی لاجواب ہیں آپ کے میرے بارے میں جو احساسات ہیں وہ قابل قدر ہی ہیں ایسے احساسات پر بہت شکر گزار ہوں۔ علی حسنین تابش بھائی کا طویل خط بھی خوب صورت اور بامعنی ہے۔ انہوں نے خط میں بڑی پیاری اور

کار آمد باتیں لکھیں ہیں کاش ہم اس پر عمل کر سکیں۔ مہر پرویز احمد دولو صاحب نے نام نہاد ادیب کو آئینہ دکھا دیا ہے۔ پیارے بھائی جاوید احمد صدیقی صاحب اپنے پیارے خط کے ساتھ تشریف لائے ہیں۔ پیارے بھائی میری شاعری اور خط پسند فرمانے کا بے حد شکریہ۔ خدا تعالیٰ آپ کو صحت مند اور خوش وخرم رکھے، آمین۔ محترم جناب انجم فاروق ساحلی صاحب بھی اچھے تبصرے کے ساتھ تشریف لائے۔ اقرا میں جس طرح طاہر قریشی صاحب اللہ کریم کے بارے میں ہمیں معلومات فراہم فرما رہے ہین۔ اس کے بدلے رب کریم ان کے علم وعمل میں برکت عطا فرمائے آمین۔ ذوق آگہی اور خوش بوئے سخن میں آپ نے محترم خواتین سباس گل صاحبہ اور نوشین اقبال نوشی صاحبہ کے ذمہ لگایا ہے۔ دونوں خواتین کا ادبی دنیا میں نام اور مقام ہے خدائے لم یزل ان کی کاوشوں کو قبول فرمائے۔ دونوں سیکشنز میں انتخاب بہت ہی اچھا ہے۔ سلسلہ وار کہانیاں اور دوسری کہانیوں کا انتخاب خوب ہے۔ اپنے پیارے جریدے کی ترقی کے لیے دعا گو ہوں۔

ایم حسن نظامی...... قبولہ شریف۔ سلام عقیدت امید ہے آپ اور نئے افق سے وابستہ سبھی احباب بخیریت ہوں گے۔ فروری 2016ء کا پرچہ ہاتھوں میں ہے سرورق معیاری اور جاذب نظر پایا پھر ذرا آگے بڑھے جہاں سر مشتاق احمد قریشی صاحب دستک میں اپنے انمول اور منفرد انداز میں خوب صورت لفظوں کی مالا بکھر رہے تھے ان کے جاندار قلم سے لفظ قوس وقزاح کے رنگوں کی صورت جلوہ گر ہو رہے تھے اور انمول رنگوں کی قوس قزح بھلا کسے پسند نہیں۔ پرچے کی پرنٹنگ، پروف ریڈنگ اور بائنڈنگ بھی کچھ عمدہ معیاری اور لاجواب پایا یہ بھی کچھ آپ کی کامیابیوں کا منہ بولتا ثبوت ہے اور بلاشبہ سراہنے کے قابل بھی۔ گفتگو، لاجواب، معیاری اور منفرد سلسلہ ہے۔ یوں محسوس ہوتا ہے جیسے سبھی آنگن کی پھلواری میں بیٹھ کر ایک دوسرے سے اپنے اپنے دکھ سکھ شیئر کر رہے ہوں۔ احسان سحر، صائمہ نور، عمر فاروق ارشد، محمد یاسر اعوان، عامر زمان عامر، گل مہر، مسکان ظفر بھٹی، عبدالغفار عابد، ریاض بٹ، علی حسنین تابش، مہر پرویز احمد دولو، جاوید احمد صدیقی، انجم فاروق ساحلی، سبھی اس خوب صورت پھلواری کی مہکتی مہکتی کلیاں ہیں جن کے دم سے اس آنگن کی شان وشادمانی برقرار ہے۔ سبھی احباب نے اپنی خوب صورت باتوں سے محفوظ کیا۔ اقرا طاہر قریشی صاحب نے فرمان باری تعالیٰ اور احادیث کی روشنی میں مفصل اور ایمان افروز باتیں کیں جن سے ایمان تازہ ہوگیا۔ محمود ظفر اقبال ہاشمی سے ملاقات اچھی رہی، ان کی تحریر میں اصلاحی معاشی اور معاشرتی رویوں پر مبنی ہوا کرتی ہیں وہ اپنے جذبات کی عکاسی لفظوں کی ادائیگی سے کرنا بخوبی جانتے ہیں۔ تحریروں میں ٹماٹو کیچپ اور آشفتہ دل ایک دوسرے کے مقابل پائیں تو وجود زن کی تعریف نہ کرنا بھی لکھاری کے ناانصافی ہوگی۔ تینوں اچھے اور لاجواب فقرات کے عکاس پائے۔ عشق کسی کی ذات نہیں امجد جاوید کسی تعارف کے محتاج ہرگز نہیں وہ قارئین کو اپنے لفظوں کے سحر میں اس قدر جکڑ لیتے ہیں کہ دل عش عش کر اٹھتا ہے اور انہیں داد دیے بنا نہیں رہ سکتا۔ سعدیہ کے جذبات اچھے لگے۔ ڈائن معاشرے کے منفرد موضوع پر اچھے انداز سے قلم چلایا گیا۔ اہرام محبت الٹی آنتیں دونوں لکھاری ایک دوسرے پہ سبقت کے چکر میں تھے۔ فن پارے ایڈیٹر صاحب بلاشبہ نامور لکھاریوں کے واقعات پر مبنی منتخب تحریریں صفحہ قرطاس پر منفرد انداز سے سجا کر انمول کہلائے۔ میرا محرم میرا مجرم اپنے آپ کو خدا فرعون نے بھی کہلوایا تھا مگر جب بھی اس زمین پر ایسا کوئی پیدا ہوا خداوند کریم موسیٰ پیدا کر دیتے ہیں۔ ذوق آگہی معیاری اقتباسات سے مزین سلسلہ سراہنے کے قابل ہے۔ فلک شیر ملک، ریاض بٹ، حسین خواجہ، عائشہ اعوان اور جاوید احمد صدیقی کی تحریریں ٹاپ رہیں۔ خوش بوئے سخن میں فاخرہ رضوی، منظور احمد، شہزاد شاہ، عائشہ اعوان فلک شیر ملک، ریاض حسین قمر اور ریحانہ عامر کے خیالات دل کو بھا گئے

زادسفر کے دوسرے حصے میں لکھاری نے اپنے اندازتحریر کے سحر میں اس قدر جکڑا کہ دل باغ باغ ہوگیا لفظ اور فقرات چاشنی سے بھرپور پائے سائیں بابا کے کردار پر دلی افسوس ہوا۔لو جی پرچہ تمام ہوا پہلی انٹری کے جواب میں ویلکم کیا گیا تو لگا ہے لگا ہے حاضری ہوتی رہے گی ورنہ......؟

علی حسنین تابش...... بھاولنگر۔ محترم جناب چیف ایڈیٹر، ایڈیٹر تمام اسٹاف اور دوستوں کو میرا عقیدت بھرا اسلام قبول ہو۔ جہاں دسمبر سے وصل کی یادیں وابستہ ہیں وہاں جنوری کی شام تنہائی، سرد ہوائیں، رگوں میں خون جما دینے والی خشک سردی بھی یاد ماضی کے دریچے کھول دیتی ہے۔ 19 جنوری کو نئے افق کا دیدار ہوا۔ٹائٹل دیکھ کر دل کو سرور آ گیا جانے کس کے انتظار میں بیٹھی ہے یہ حسین دلہن، اس کی دل کش نگاہیں اک مے کدا ہو جیسے دور تک جانے کس کی منتظر تھیں ٹائٹل لاجواب تھا مثل آفتاب چمکتے جبیں پر سجی بندیا حسینہ کے ظالمانہ حسن میں اور اضافہ کر رہی تھیں۔شاید ہی کوئی اس کے وار حسن بچ پایا ہو، رب سے دعا ہے اسے وہ ہمسفر مل جائے جس کی متلاشی ہیں یہ دلکش نگاہیں دستک میں مشتاق صاحب کے قلم سے نکلے الفاظ نے مالا الماس بنا رکھی تھی سب اچھا لکھا۔احوال کی محفل گفتگو میں جھانکا تو محترم جناب عمران قریشی صاحب صدارت کی کرسی پر براجمان تھے چند سطور پڑھنے کے بعد دل کو اک عجیب شاک لگا محترم جناب نیئر رضوی صاحب آپ دل تو چھوٹا مت کریں۔ایسے چھوٹے موٹے دکھ تو زندگی کا حصہ ہیں ایسی باتوں کو دل پر مت لگائیں آپ اپنا کام کریں آپ اپنی تخلیق پر مطمئن ہوں گے تو بس یہ ہی کافی ہے۔ہر رائٹر کا لکھنے میں اپنا انداز ہوتا ہے آپ اپنے قلم کا جہاد جاری رکھیں محترمہ صائمہ نور صاحبہ کا خط بہت اچھا لگا جن دوستوں نے میرے خط کو سراہا ان کا بے حد مشکور ہوں ریاض بٹ صاحب جی ضرور یہ سلسلہ جاری رہے گا محترم جناب عبدالغفار عابد صاحب کچھ زیادہ ہی گرم ہوگئے ہیں آپ؟ کسی کو نیچ نہیں سمجھنا چاہیے۔اقرا میں محترم جناب طاہر قریشی صاحب نے بہت اچھا لکھا، ایمان تازہ کر دینے والی تحریر تھی۔سر آپ کو عمرے کی بہت بہت مبارک ہو، قبول فرمائیں۔محمود ظفر اقبال صاحب کا انٹرویو زبردست رہا۔کہانیوں میں آشفتہ دل، وجود زن، ڈائن ہی ابھی پڑھ سکا۔اچھی تحریریں تھیں باقی شمارہ ابھی زیر مطالعہ ہے آخر پر یہ کہنا چاہوں گا جو لکھا حق کی بنا پر لکھا میری نہ تو کسی سے ناراضگی ہے نا ہی کسی کی حمایت جو ٹھیک لگا لکھ کر بھیج دیا ادارے سے یہ ریکویسٹ کرنا چاہوں گا کہ براہ کرم اس طرح کے احوال سے ذرا پرہیز کریں۔ گفتگو میں صرف کہانیوں پر اصلاحی تنقید کی جائے نا کہ رائٹر کی عزت کو مجروح کیا جائے اب تک کے لیے اتنا ہی، اللہ نگہبان۔

احسان سحر...... میانوالی۔ السلام علیکم، اللہ پاک تمام اہل پاکستان اور امت مسلمہ کو اپنی حفظ و امان میں رکھے، آمین۔ دن اپنی آخری سانسیں لے رہا تھا گزرتی اور ڈھلتی شام کی دم توڑتی سسکیاں آہ فریاد کر رہی تھیں انہیں دکھ تھا ان سے بچھڑنے کا اور کسی سے بچھڑنے کا دکھ تو تکلیف دیتا ہی ہے۔انسان میں دکھ اگر دل میں سما جائے تو وہ آنسوؤں کی صورت میں ٹوٹ ٹوٹ کر ڈھیرے نکلتا ہے اور بچھڑنے کا دکھ وہی جانیں جو کسی اپنے سے بچھڑیں ہوں نئے افق بھی اسی بچھڑتی سسکتی اور ڈھلتی شام کو ملا اپنے دوست کو گلے لگا لیا پیار بھری ایک پیاری سی نظر ڈالی اس نظر میں خوشی بھی تھی اور پیار کا ابھرتا ہوا جذبہ بھی سانسوں کی خوشبو بھی۔پھولوں کو مسکرانا سکھایا نہیں جاتا سیکھ جاتے ہیں پھولوں کی خوب صورتی خوشبو سے ہے اور دل کی دھڑکن سے۔شاہکار ٹائٹل سے آنکھوں کی روشنی ٹکرائی جہاں روشنی ٹکراتے وہاں سب کچھ نظر آتا ہے۔سحر زدہ کر دینے والا دیہاتی ماحول اور بکریاں، چراتا مرد اور اپنی منزل کو جاتے ہوئے مردوں کے درمیان خوب صورت سی صنف نازک کسی پیا کے انتظار میں نظریں وا کیے بیٹھی نظر آئی شاعرانہ دل کے دماغ میں کچھ شاعرانہ لفظ پیدا ہوتے جنہیں یہاں پر اتارنا چاہتا ہوں اجازت ہے۔

نیلم جیسی آنکھیں شبنم کی مانند چہرہ
اداس ہوں میں کیا ہے جوڑ تیرا میرا

رنگین رنگین اشتہارات کو پھلانگ کر سیدھی دستک دی مشتاق احمد قریشی صاحب کی دستک پر جہاں سندھ کے قائم علی شاہ اور زرداری کے کرتوت واضح کر رہے تھے۔ اپنی حکومت میں کیا کچھ نہیں کیا ان لوگوں نے پاکستان کے ساتھ جو انسان اپنے آپ سے مخلص نہ ہو اس کو ضمیر اور بے ضمیری کا بھلا کیا طعنہ دیں۔ کرپشن کا جو بازار ان لوگوں نے گرم کیا ہے اس کو ٹھنڈا ہونے میں کئی نسلیں برباد ہوں گی۔ گفتگو میں عمران صاحب اس دفعہ موضوع گفتگو انصاف کو چنا۔ انصاف معاشرے میں مشکل سے ہی پیدا ہوتا ہے۔ مجید احمد جائی بھائی کے حوالے سے جان کر افسوس ہوا۔ ایسے سمجھدار انسان سے ایسی غلطی کا سرزد ہونا حیرت سے دوچار کر گیا۔ میں یہاں پر ایک چانس دینے کے حق میں بات کروں گا۔ شاعری کے حوالے سے تبدیلی خوشگوار رہی۔ شاعر پر بات آخر میں کروں گا۔ گہرائی میں چلا گیا تو گفتگو کا ٹاپک متاثر ہوگا کام وہی کیا جائے جو پہلے کیا جا رہا ہو۔ دوسرا خط صائمہ نور صاحبہ کا اچھا لگا آپ کی باتیں واقعی توجہ طلب ہیں۔ دین کے نام نہاد مولویوں اور علما کو سوچنا چاہیے جو چہرے پر سنت رسول ﷺ سجا کر پیٹ کے چکر میں لوگوں کو گمراہ کر رہے ہیں سیاہ چہرے اور دل سے عبادت یہ مولوی پیٹ کے پجاری ہیں صرف۔ عمر فاروق میں آپ کی بات سے اتفاق کرتا ہوں۔ جذباتی آدمی کی باتیں واقعی ایسی ہوتی ہیں اور جہاں تک کہانیوں کی بات ہے تو میں یہاں بتادوں کہ نئے افق میں سوائے چند رائٹرز وں کے باقی سب میں ناپختگی پائی جاتی ہے کہانی کو اس انداز میں پیش نہیں کر پاتے جیسا کرنا چاہیے موضوع اچھا ہوتا ہے اس موضوع کی پسندیدگی تعریف پر مجبور کرتی ہے لیکن بہت سے رائٹرز کو لکھنے کا خاص تجربہ نہیں ہے۔ حسام بٹ کو ہر ماہ لایا کریں اچھا لکھتے ہیں باقی تقریباً بھی خطوط میں مجید احمد جائی کی ذات پر تبصرہ نگار اپنی اپنی سوچ کے لحاظ سے تنقید کرتے نظر آئے ریاض بٹ صاحب کا اچھا تبصرہ تھا مہر پرویز، گل مہر اور علی حسنین اور باقی سب لوگوں نے محفل کو دھنک رنگ بنایا اقرا کا سلسلہ سکون بخش گیا۔ انٹرویو میں محمود ظفر اقبال کا انٹرویو اچھا لگا سفید گلاب ڈھونڈنا شروع کر دیا ہے۔ بھئی پھول نہیں ناول کی بات کر رہا ہوں۔ پہلی کہانی یا ناول کی توقع میں ٹماٹو کیچپ مضمون ہمارا منتظر تھا کوفت تو بہت ہوئی پر خیر ایک ایسی عظیم شاعرہ کی روداد جس کی ہم قدر نہ کر سکے والدین کی بے حسی اور مجبوری پر حیرت ہوئی عزت بچانے کے ڈر سے اولاد کی زندگی ہی برباد کر ڈالی۔ ایک دفعہ جب دکھ، نفرت اور مایوسی کے کانٹے جب عورت کی ذات روح کو گھائل کر جائیں تو صدیوں تک نہیں بھرتے پھر چاہے یوسفی جیسے مرد یا اقبال جیسے دلاسہ دیتے رہیں لیکن گزارش ہے کہ ابتدائی صفحات پر ہر ماہ پیش کیا کریں اس طرح کے مضمون کو اندر کے صفحات پر منتقل کر دیں، شکریہ۔ آشفتہ دل للی کی بے چارگی بھی دیکھنے کو ملی اور کبیر کا سچا اور خلوص بھرا پیار بھی۔ پر جیت آخر دولت کی ہوئی اور پیار پھر ہار گیا۔ عنقا لوگ واقعی ایسے لوگ بہت کم معاشرے میں نظر آتے ہیں جن کے وجود میں خلوص اور حقیقی ہمدردی ہو سہیل اور ثمینہ اچھائی کا اعلیٰ نمونہ تھے۔ وجود زن سے ہے تصویر کائنات میں رنگ دونوں وجود زن اپنی اپنی مجبوریوں کے ہاتھوں جھوٹ بولنے پر مجبور ہوئیں ایک ممتا کے ہاتھوں مجبور تو دوسری رشتوں کے بچانے کے ہاتھوں۔ عشق کسی کی ذات نہیں کی دوسری قسط بھی عورت کا اسلام میں کیا مقام ہے کو اجاگر کرتی نظر آئی حجاب ہی اس عورت کی پہچان اور خوب صورتی ہے۔ شاہ کے انتقام لینے کی خواہش کامیاب ہوتی ہے یا نہیں سعدیہ میں تبدیلی بھی خوشگوار رہی۔ ڈائن ایک اور بگڑا ہوا معاشرے کا کریہہ کردار، جو یہاں وہاں بکھرے پڑے ہیں انسان میں موجود ہوس اچانک ہی بیدار ہو جاتا ہے کردار کے مضبوط انسان کچھ تو خود کو بچا لیتے ہیں اور کچھ شیطان کی پیروی کر کے دنیا و آخرت کو بگاڑ بیٹھتے ہیں۔

اہرام محبت مغرب کا کریہہ کردار اور یہی چلن یہاں بھی عام ہے یہاں بھی بہت سے شادی شدہ خواتین اپنے مردوں سے بے وفائی کرتی نظر آ جاتی ہیں انجام کافی بھیانک رہا۔ الٹی آنتیں ریاض صاحب ایک اور سبق آموز کاوش لائے کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے جو مارنے جاتا ہے مرخود جاتا ہے۔ فرصت کے ساتھ بھی ایسا ہی ہوا۔ امتیاز کی شرافت نیک فطرت طبیعت نے بچالیا۔ بہر حال جرم تو جرم ہوتا ہے چاہے دانستگی میں ہو یا نادانستگی میں۔ بھوک واقعی پیٹ کی بھوک بہت مشکل ہے برداشت کرنا اسی بھوک نے تو انسان کو خوار کرنے پر مجبور کیا ہوا ہے اور جسم کی بھوک بڑھ کر بھی خوار کرتی ہے اور ختم ہو کر بھی۔ چراغ راہ شہید ہونے کا جذبہ ایسا جذبہ ہے جو مسلمانوں کو دنیا کا خطرناک اور نڈر انسان بناتا ہے اور پاک فوج کے ہر جوان میں ایسا ہے جذبہ بھرا ہوا ہے جس کی بہادری کی دنیا میں مثال نہیں ملتی۔ فریب خوردہ، عورت جو پھول کی پتیوں سے بھی نازک ہے انتقام لینے پر آئے تو پتھر ہے تالی دونوں ہاتھوں سے بجتی ہے یہاں عابد گناہ گار تو رضیہ کون سی پارسا تھی۔ یہ محبت نہیں کہ گھر والوں کو دھوکہ فریب دے کر غیر مردوں سے تنہائی میں ملا جائے۔ محبت ایک پاکیزہ جذبہ ہے جسے آج کل کی نوجوان نسل نے اپنی غلیظ حرکتوں سے غلیظ بناڈالا۔ فن پاروں میں کتنے دہشت گرد ایک حساس اور دکھی کہانی رہی جو عمدہ سبق دے گئی۔ فیم اپریل ایک چھوٹی سی اور نا قابل معافی خطا نے ایک دوست کی جان لے لی۔ اللہ پاک ہمیں ایسی خطاؤں سے دور رکھے۔ غدار ایک محب وطن کہانی۔ باقی پہلی دو کاوشیں بور اور نا سمجھ میں آنے والی تھیں۔ پلیز کوشش کریں پاکستانی کہانیاں شامل کریں یا ایک دو انگریزی اور سائنس فکشن ہوں تو اچھی بات ہے۔ میرا محرم میرا مجرم بہت ہی خوب صورت ناولٹ تھا اپنے ٹھنڈی چھاؤں کی مانند ہوتے ہیں ارسل کی ایک غلط فہمی نے سات سال تک ماں باپ اور بیوی کو جو اذیت میں رکھا اس کا مداوا ایک درست اور خوب صورت فیصلے کی صورت میں ہو گیا۔ ہر کردار اپنی جگہ ہیروں کی مانند جگمگاتا نظر آیا سحر انگیز واقعات دل میں جذب ہو کر دل کو گدگداتے رہے۔ آنسو آنکھوں کا سرمایہ ہیں ان کے بنا آنکھیں بے کشش ہیں اور دعا ہے کہ اللہ پاک آپ کی آنکھوں میں آنسو خوشی کے عطا کرے غم کے نہ ہوں، آمین۔ اللہ کی بادشاہت اقتباس جو کہ انعام یافتہ بھی تھا بہت ہی پیارا اقتباس تھا۔ دوسرا کربلا کی جھلک نے متاثر کیا۔ تیسرا انمول ہستی رہی۔ باقی سب خوب صورت انتخاب رہے۔ خوش بوئے سخن میں انعام یافتہ غزل اچھی لگی۔ زادِ سفر کا حصہ دوئم جعلی ڈبہ پیر کے کریہہ اور مکروہ کرتوتوں نے بہت دکھی کیا۔ شہزاد اور سعدیہ نے دوستی کا حق ادا کیا۔ پر شہزاد کی منگنی ختم کرنے والی بات ابھی تک سمجھ میں نہیں آئی خیر آگے کا شدت سے انتظار ہے۔ ریاض حسین قمر کے تلخ اور حالات حاضرہ کے حوالے سے غزلیات اچھی لگیں جو غصہ، غم، فکر و پریشانی ان غزلوں میں دیکھنے کو ملی وہ بہت کم آج کل کے شاعروں مین نظر آتی ہے۔ اک درد تھا تلخی سے بھرپور دیگر اسٹوریز کے ساتھ چلتے اقتباسات اچھے رہے اب اجازت زندگی نے وفا کی تو آگے رہیں گے۔ دعاؤں میں یاد رکھیے گا۔ اللہ حافظ۔

عبدالجبار رومی انصاری...... شاداب کالونی، لاہور۔ دیہاتی پس منظر میں سرورق بہت خوب صورت لگ رہا تھا لیکن اس کے برعکس اگر ہم سندھ کے تھر میں پہنچ جائیں تو دیکھ سکتے ہیں اہاں زندگی کتنی سنگین صورت حال سے دوچار ہے۔ پچھلے کئی سالوں سے وہاں کے حالات ابتر ہیں آئے روز معصوم بچوں کی اموات ہو رہی ہیں لیکن شاید حکومت سندھ اس کی طرف سے بے پرواہ ہے اگر وہاں کوئی فنڈ ریزنگ ہوتی بھی ہے تو وہ بڑے لوگ آپس میں بانٹ لیتے ہیں اور غریب لوگوں کا کوئی پرسان حال نہیں دستک اداریے میں جو باتیں بھی ہوتی ہیں وہ صاحب اقتدار کے لیے آنکھیں کھولنے کو کافی ہیں دعا کرتے ہیں کہ ضرب عضب کے ساتھ ساتھ کراچی میں ہونے والے تمام آپریشن بخیر و خوبی پایا تکمیل کو پہنچیں اور ایک دوسرے کو تحفظ فراہم کرنے والے

کرپٹ عناصر کے گرد بھی شکنجا کسا جائے تب ہمارا پیارا وطن صحیح معنوں میں ہر طرح کے مسائل اور مذموم عزائم رکھنے والے لوگوں سے پاک ہوگا اور تب امن ومحبت اور اخوت کا بول بالا ہوگا۔شاعر کے عنوان سے نیا سلسلہ خوش آئند ہے اس میں ضرور حصہ لیں گے ریاض حسین قمر کا کلام بہت پسند آیا ہے احسان سحر کا تبصرہ انعام یافتہ ٹھہرا بہت بہت مبارک ہو بھائی آپ کا بھرپور تبصرہ شاندار رہا۔صائمہ نور نے بہت اہم نقطے کو اٹھایا ویلن ٹائن کی آڑ میں مغربی کلچر کو فروغ دینا کسی صورت بھی ٹھیک نہیں ہے اور پھر پیارے نبی ﷺ کے فرمان کو بھی یاد رکھیں آپ ﷺ نے فرمایا ''جس شخص نے جس قوم کی مشابہت اختیار کی وہ اسی میں سے ہوگا۔'' سو اس سے اجتناب کرنا چاہیے۔صائمہ نور کا تبصرہ بہت پسند آیا محمد یاسر اعوان کا دلجمعی سے لکھا تبصرہ بھی اچھا لگا نیر رضوی کا تفصیلاً تنقیدی خط اپنی جگہ اچھا تھا لیکن اگر کوئی نفسیاتی مریض ہے تحریریں بھیجنے والا تو بھی ادارے والے تو ایسے نہیں ہیں نا وہ تو کانٹ چھانٹ کرکے معیاری تحریریں ہی شائع کریں گے۔چاہے آپ کی ہوں یا کسی اور کی گل مہر کا خط بھی بہت اثر انگیز تھا ہمارے مقتدر طبقے کے سب لوگ ہی کرپٹ ہی تو تبدیلی اور انقلاب کی بات کون کرے؟ کیونکہ ایسا کرنے سے وہی لوگ کٹہرے میں آجاتیں اس لیے سب ایک دوسرے کا تحفظ کرتے ہیں اور اسی بنا پہ تبدیلی لانے کی بجائے لوٹ مار کرکے یہ جا اور وہ جا اور بے چاری عوام بس صبر کے گھونٹ پی کے رہ جاتی ہے۔مسکان ظفر بھٹی نے مختصر مگر بہت اہم لکھا ہے۔ریاض بٹ کا انداز تحریر بھی بہت پسند آیا علی حسنین تابش آپ کا خط بھی تو برفی کی طرح سویٹ تھا نامہر پرویز احمد دولو کی حقیقت شناش بھی اچھی لگی۔جاوید احمد صدیقی کا تبصرہ بھی آنکھوں کو ٹھنڈک دے گیا۔انجم فاروق ساحلی کا معلوماتی تبصرہ بھی دل خوش کر گیا۔زاد سفر کا بے چینی سے انتظار تھا پہلے وہی پڑھی بالی کی کم عقلی پر بہت افسوس ہوا اتنی ہی باتوں کی بہادری اور ہٹ دھرمی اچھی لگی۔دونوں بہن بھائی ایک دوسرے کے متضاد میں شاہ سائیں کا کمینہ پن بھی سامنے آہی گیا نئی جگہ یہ لگتا ہے سمیرا اور کامران عینی اور شہزاد کی جگہ لے رہے ہیں۔باقی ناصر ملک کی تحریر کا لفظ لفظ متاثر کن ہے۔ماضی اور حال کی گتھیوں میں الجھی تحریر میرا محرم میرا مجرم بھی آخری سلجھ گئی۔حریم یوسف کی تو نہ بن سکی البتہ تیمور کی دلہن بن گئی اور شہزانے بھی ارسل کو معاف کردیا ملک شمشیر کی کہانی بھی بیسٹ رہی پردہ ایک اچھے کردار کی علامت ہے تاکہ پہچان لی جائیں کہ یہ اچھے کردار کی مسلمان عورتیں ہیں۔معاشرتی برائیوں سے نبرد آزما شبانہ اور سعدیہ کی عزم ہمت سے بھرپور کہانی بہت اچھی لگی خاص کر سعدیہ کا اپنے آپ کو بدلنا متاثر کن رہا۔عشق کسی کی ذات نہیں بہترین جا رہی ہے انسانیت کے ناطے اور راز کو راز رکھنے میں صفیہ نے بہت بڑی کامیابی حاصل کی تھی اور اس نے محب اللہ اور اپنے خاندان کو ایسی سچائی سے بچالیا تھا جو آگے چل کر کسی تباہی کا موجب بنتی۔وجود زن نفیسہ سعید کی اسٹوری بہترین رہی۔فرحت کو واقعی الٹی آنتیں گلے پڑ گئی تھیں یہ تو وہی بات ہوئی جو کسی کے لیے گڑھا کھودتا ہے وہ خود ہی اس میں گرتا ہے فرحت امتیاز کو ٹرین سے نیچے پھینکنا چاہتا تھا لیکن خود جا گرا برائی کا انجام برا ہی ہوتا ہے ریاض بٹ کی تحریر الٹی آنتیں زبردست رہی۔زریں قمر کی ٹماٹو کیچپ بہت زیادہ اچھی لگی جنہوں نے ماضی کی گمنام شاعرہ کو منظر عام پر لایا گیا فرناز کی اپنی غلطیاں بھی تھیں وہ مشاعروں کے ساتھ ساتھ اگر اپنے گھر پر بھی توجہ دیتی تو ایسے برباد نہ ہوتی۔پروین شاکر نے سچ کہا اگر وہ اپنے ساتھ ہونے والی زیادتیوں کی وضاحت کرتی تب بھی وہ زندگی میں کامیاب ہوتی اور ایک کامیاب شاعرہ ہوتی لیکن اسے وضاحت کرنا بھی پسند نہیں تھا افسوس لوگوں نے اسے ٹماٹو کیچپ کی طرح ہی استعمال کیا۔للی آشفتہ دل تھی ایک طرف ہمدردیاں تھیں تو دوسری طرف پیار آخر اس نے پیار کو پانا ضروری سمجھا عمران احمد کی آشفتہ دل بھی غمزدہ تحریر بھی اچھی لگی...... پگلی اس پیار کے کام پورے نہیں ہوئے جب ہو گئے تو خود ہی راستہ پالو گی اور پھر مریم نے چراغ راہ پالیا تھا وقار الرحمان کی کہانی

مختصر مگر اچھی تھی ہوس انسان کو بہت گھٹیا بنا دیتی ہے نازلی نے کاشی کو اپنے ناجائز مقصد کے لیے استعمال کیا اور پھر اپنے شوہر سے مروا بھی دیا ایک بات ہے جب کاشی نے خط لکھ کر رکھ چھوڑا تو پھر ایسی صورت میں اپنے بچاؤ کے لیے بھی کچھ کرنا چاہیے تھا بہر حال جو تقدیر میں لکھا ہوتا ہے وہ ہو کر رہتا ہے معاشرتی المیے پر خلیل جبار کی کہانی بیسٹ رہی۔ فن پارے میں سب کہانیاں ہی زبردست تھیں خاص کر دہلی میں موت، غدار اور یکم اپریل متاثر کن رہیں۔ ذوق آگہی میں فلک شیر ملک، عائشہ اعوان اور ایمان فاطمہ کی تحریریں اچھی تھیں۔ خوش بوئے سخن سے شہزاد شاہ، عمر فاروق ارشد اور فریحہ چوہدری کا انتخاب پسند آیا۔ باقی سب نے بھی بہت اچھا لکھا۔ اب اگلے ماہ تک کیلئے اجازت زندگی رہی تو پھر ملیں گے، والسلام

غلام یاسین نوناری......چوک سرور شہید۔ السلام علیکم! محترم عمران بھائی، طاہر بھائی اور جملہ اسٹاف نئے افق کو میری طرف سے سلامتی کی دعا۔ اللہ پاک آپ سب کو خوش رکھے۔ فروری کا شمارہ لیٹ ملا جس میں سراسر میری کوتاہی کا دخل تھا۔ بس کچھ مصروفیات اور کچھ سستی کی وجہ سے تاخیر طوالت اختیار کرتی گئی۔ سرورق بہت خوبصورت ہے۔ دیہاتی پس منظر کی عکاسی عمدہ لگی۔ دستک میں مشتاق احمد صاحب کی سیاست پر سیر حاصل گفت وشنید خوب رہی۔ گفتگو میں عمران احمد صاحب مجید احمد کو بلیک لسٹڈ کرتے نظر آئے بہت اچھا اقدام ہے۔ احسان سحر فرام میانوالی میرے دوست کو صدارت کی انعامی کرسی پہ براجمان پایا۔ بھئی تبصرہ اے ون کلاس کا ہے۔ احسان بھائی! بہت ہی خوب ڈھیروں داد اور سلامتی کی دعا۔ صائمہ نور، عمر فاروق ارشد، گل مہر، انجم فاروق ساحلی کے خطوط جان محفل ہیں۔ گفتگو سے فارغ ہوئے تو لمبی چھلانگ لگا کر زادسفر پہ جا پہنچے۔ ناصر ملک صاحب کا انداز تحریر ازحد متاثر کن ہے اور منظر نگاری تو کمال کی ہوتی ہے۔ بانو کے ساتھ اس بار بہت برا ہوا۔ پیری کا چولہ پہن کر شیطان صفت انسان نے بانو کی عصمت تار تار کرنے کا پورا بندوبست کرلیا تھا مگر قدرت نے بانو کو بچالیا۔ شہزاد پہ بے حد غصہ آیا کہ اس نے بانو کو ان کے ماضی کی وجہ سے چھوڑ دیا۔ اب دیکھتے ہیں کامران کیا کرتا ہے سچ میں اس قسط نے بہت رلایا۔ دستگیر شہزاد کی کہانی بھوک اہم نصیحت پر مبنی ہے۔ یاسین صدیق نے فریب خوردہ میں آخر میں مایوس کیا۔ بدلے لینے کے سو طریقے ہیں انہیں ایسا نہیں لکھنا چاہیے تھا۔ محمود صاحب کا انٹرویو بہت اچھا لگا۔ اگلے ماہ تک کے لیے اجازت اللہ نگہبان۔



سانحۂ ارتحال

اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّآ اِلَیْہِ رٰجِعُوْنَ۝

ماہ فروری ہمارے لیے پے در پے صدمات لے کر آیا ہے ابھی ہم نے اپنے معروف لکھاری محترم محمد اعظم اور برصغیر کے نامور قلمکار محی الدین نواب کے سانحہ ارتحال سے سنبھلنے بھی نہ پائے تھے کہ اچانک معروف ڈرامہ نگار فاطمہ ثریا بجیا کے انتقال کی خبر پر ہل کر رہ گئے۔ تینوں شخصیات نے اپنی تحریروں سے کئی نسلوں کو متاثر کیا ہے۔ ادارہ نئے افق گروپ آف پبلی کیشنز مرحومین کے خاندان کے غم میں برابر کا شریک ہے اور دعا گو ہے کہ اللہ تعالیٰ جو رحیم و کریم ہے محمد اعظم، محی الدین نواب اور پیاری فاطمہ ثریا بجیا کی مغفرت کرے اور انہیں جنت الفردوس میں جگہ عطا فرمائے۔ آمین

اقرأ

ترتیب: طاہر قریشی



قرآن کریم نے قلم کو علم کی نشرواشاعت کا موثر اور بے مثال ذریعہ کہا ہے اس کی عظمت کو ظاہر کرنے کے لئے ہی قلم کی قسم کھائی گئی ہے۔ تا کہ قرآنِ حکیم کے ماننے والے قیامت تک اس قلم کے ذریعے حکمت ودانش کے کارواں کی قیادت کرتے رہیں اور تحریر کی روشنی سے علمِ انسانیت کو منور کرتے رہیں۔

قلم سے لکھی گئی تحریر کے بارے میں قرآن حکیم میں ارشاد باری تعالیٰ ہے۔

ترجمہ:۔ اور آپ کے رب سے کوئی چیز ذرہ برابر بھی غائب نہیں' نہ زمین میں اور نہ آسمان میں اور نہ کوئی چیز اس سے چھوٹی اور نہ کوئی چیز بڑی' مگر یہ سب کتاب مبین میں ہے۔ (یونس۔۶۱)

آیت مبارکہ کے اس حصے میں اللہ تعالیٰ کا ارشادِ گرامی ہے کہ وہ تمام مخلوقات کے احوال سے پوری طرح واقف ہے' اور ہر لحظہ' ہر گھڑی انسانوں پر اس کی نظر ہے' زمین وآسمان کی کوئی بڑی سے بڑی اور چھوٹی سے چھوٹی چیز اس سے پوشیدہ نہیں ہے۔ ایسا ہی مضمون قرآن میں سورۂ انعام کی آیت ۵۹ میں آچکا ہے' جس میں ارشاد ہوا ہے۔ ''اس کے پاس غیب کے خزانے ہیں جنہیں وہی جانتا ہے۔ اسے جنگلوں اور دریاؤں کی سب چیزوں کا علم ہے' اور کوئی پتا نہیں جھڑتا مگر وہ اس کو جانتا ہے' اور زمین کے اندھیروں میں کوئی دانہ اور کوئی ہری اور سوکھی چیز نہیں مگر کتاب مبین میں (لکھی ہوئی) ہے۔'' ایسے ہی سورۂ انعام کی آیت ۳۸ اور سورۂ ھود کی آیت ۶ میں بھی اسی مضمون کو بیان کیا گیا ہے۔ جب یہ واقعہ ہے کہ اللہ تعالیٰ زمین وآسمان میں موجود ایک ایک ذرے اور ہر شے کی حرکت تک سے باخبر وواقف ہے تو وہ انسانوں اور جنوں کی حرکات واعمال' اقوال سے کیسے اور کیونکر بے خبر رہ سکتا ہے جو اللہ کی اطاعت وعبادت کے پابند ومامور ہیں۔

یہی بات سورۂ النمل کی آیت نمبر ۷۵ میں اس طرح آئی ہے۔

ترجمہ:۔ آسمان وزمین میں کوئی پوشیدہ چیز ایسی نہیں جو روشن اور کھلی کتاب (لوحِ محفوظ) میں نہ ہو۔ (النمل۔ ۷۵)

اللہ تبارک وتعالیٰ نے ہر چیز کی تقدیر اور اس کا ہر ہر عمل اپنے قانونِ الٰہی کے مطابق پوری منصوبہ بندی کے ساتھ لوحِ محفوظ پر تحریر فرمادیا ہے۔ ازل سے لے کر ابد تک کے تمام احکام بطور تقدیر تحریر فرمادیئے ہیں کہ کون کب اور کیسے پیدا ہوگا اور کیسے اس کی واپسی ہوگی' یعنی کب مرے گا کون کیا کرے گا' کیا نہیں کرے گا۔ کیسے جئے گا کیسے مرے گا' یہ سب یہاں تک کہ کسے کتنا اور کیسے رزق مہیا کیا جائے گا۔ پورے اہتمام وانتظام کے ساتھ تحریر شدہ ہے' یقیناً یہ اللہ تعالیٰ کے تدبر' حکمت ودانائی اور قدرت واختیار کا مظہر ہے' اُس کی ذاتِ عالی شان بڑی بلند وبرتر ہے' سب کچھ اس کے ہی اختیار واقتدار میں ہے۔ ایک معمولی حقیر ترین ذرّے سے لے کر پورا نظامِ کائنات اسی کے قبضہ قدرت میں ہے۔ اللہ تعالیٰ کی وحدانیت کے بارے میں قرآن میں ارشاد ہوا ہے۔

ترجمہ:۔ آپ کہہ دیجئے کہ اگر اللہ کے ساتھ اور معبود بھی ہوتے جیسا کہ لوگ کہتے ہیں' تو وہ ضرور مالکِ عرش کے مقام تک پہنچنے کی کوشش کرتے۔ (بنی اسرائیل' ۴۲)

تفسیر:۔ اگر اُس کی اس بے پناہ اور بے حد وسیع سلطنت کا انتظام واقتدار سنبھالنے میں کوئی کسی بھی طرح اُس کا شریک ہوتا یا اس کے اقتدار واختیار میں حصہ دار ہوتا تو کسی نہ کسی وقت کسی نہ کسی معاملے یا بات پر اختلاف بھی ہوسکتا تھا

جیسے دو بادشاہوں میں دو سلطنتوں کے حکمرانوں میں اختلاف ہو جاتا ہے تو وہ ایک دوسرے پر لشکر کشی کرتے ہیں اور دوسرے حکمران کے اقتدار کو اس کے اختلاف کی وجہ سے ختم کر دیا یا اس پر قبضہ کر لینا چاہتے ہیں۔ (جیسے آج کی دنیا میں امریکہ جو خود کو سپر پاور مانتا ہے۔ ذرا سے اختلاف پر اس کا کہا نہ ماننے پر اس نے عراق پر قبضہ کر کے اس کے حکمران کو ختم کر دیا) ایسے ہی یہ دوسرے معبود بھی اللہ پر غلبے کی کوئی نہ کوئی راہ ڈھونڈنے نکلتے لیکن ہزاروں سال گزرنے کے باوجود اب تک ایسا نہیں ہوا۔ جبکہ اللہ کے ساتھ اشرف المخلوق انسان اپنی نا سمجھی کم فہمی کے باعث آج بھی طرح طرح کے معبودوں کی پوجا و پرستش کر رہا ہے ان معبودان باطل کی پرستش کو بھی صدیاں بیت رہی ہیں۔ تو کیا ان مشرکین نے ان کے ذریعے اللہ تعالیٰ کا قرب حاصل کر لیا ہے یا کر سکتے ہیں۔

سورۃ الانبیاء میں بھی رب کائنات اس بات کو اس طرح دہرا رہا ہے۔

ترجمہ:۔ اگر آسمان و زمین میں ایک اللہ کے سوا اور بھی معبود ہوتے تو دونوں کا نظام درہم برہم ہو جاتا۔ پس اللہ تعالیٰ عرش کا رب ہر وصف سے پاک ہے جو یہ مشرکین بیان کرتے ہیں۔ (الانبیاء۔۲۲)

یعنی اگر کائنات کا نظام واقعی دو معبود چلاتے اور کائنات میں تصرف کرنے والی دو ہستیاں ہوتیں ان کی مرضی اور شعور کارفرما ہوتی تو نظام کائنات اس طرح قائم رہ ہی نہیں سکتا تھا جو ابتدائے آفرینش سے بغیر کسی ادنیٰ توقف کے قائم ہے اور چلا آ رہا ہے۔ اگر دو یا کئی شریک ہوتے تو ان کی مرضی کا آپس میں تصادم ہوتا اختیارات ایک دوسرے کے خلاف استعمال ہوتے جس سے سارا نظام متاثر اور درہم برہم ہو جاتا لیکن ایسا کچھ نہیں ہوا نہ ہو سکتا ہے۔ اس کے صاف اور سیدھے معنی یہ ہوئے کہ کائنات صرف ایک ہی ہستی کے زیر اقتدار اور اختیار ہے وہی جس نے اس کائنات کو پیدا کیا اس کی منصوبہ بندی کی اور اس کے لئے تمام قوانین نافذ کئے۔ اور اگر اللہ کے شریک ہوتے تو ایسا ہی ہوتا جیسا کہ قرآن کریم میں ارشاد ہوا ہے۔ نہ تو اللہ کا کوئی کسی طرح سے شریک ہے نہ ہی اس کی کوئی اولاد ہے جیسا کہ یہود و نصاریٰ نے بنا رکھا ہے۔

ترجمہ:۔ نہ تو اللہ نے کسی کو بیٹا بنایا اور نہ اس کے ساتھ اور کوئی معبود ہے ورنہ ہر معبود اپنی مخلوق کو لئے لئے پھرتا اور ہر ایک دوسرے پر چڑھ دوڑتا۔ جو اوصاف یہ بتلاتے ہیں ان سے اللہ پاک (اور بے نیاز) ہے۔ (المومنون۔۹۱)

تفسیر:۔ آیت کریمہ میں اللہ تعالیٰ نے اپنی وحدانیت کی ایک مضبوط دلیل کے ذریعے اہل ایمان کے یقین اور ایمان کو پختہ فرمایا ہے کیونکہ یہ بات ہرگز ہرگز ممکن ہی نہیں ہے کہ کائنات کی مختلف قوتوں اور مختلف حصوں کے الگ الگ خالق و مالک ہوتے اگر ایسا ہوتا تو ان کے درمیان باہمی تعاون اور اتحاد کیسے ممکن تھا۔ کائنات جس میں کروڑوں کہکشائیں موجود ہیں اور بے حد و حساب چیزیں جن میں ان گنت ستارے و سیارے گردش کر رہے ہیں جن کی وسعت سے آج بھی انسان آشنا نہیں ہو سکا۔ انسان صرف اپنی ہی ایک کہکشاں جس میں چاند سورج اور دیگر سیاروں کے ساتھ زمین بھی محو گردش ہے کو پوری طرح نہیں سمجھ سکا ہے جبکہ دیگر کہکشاؤں کے نظام بھی قائم اور متحرک ہیں۔ ان سب نظاموں کی ہم آہنگی باقاعدگی اور ان سب اجزائے نظام کی ہم آہنگی اقتدار کی مرکزیت و وحدت اس بات کا واضح اعلان ہے کہ کائنات کا نظام کسی طرح سے بھی بٹا ہوا یا تقسیم نہیں ہے یہ دلائل اللہ کے ایک اکیلے ہونے کے روشن اور تابندہ دلائل ہیں۔ توحید الٰہی کے جیسے انسان تمام تر ادراک و فہم ہونے کے باوجود نہیں سمجھتا اور راہ حق سے بھٹک کے گمراہی کی راہ اپنا کر اپنی آخرت خراب کر لیتا ہے۔ اس امر کی تو اللہ تعالیٰ نے خود قرآن عظیم میں اپنے ارشادات سے وضاحت فرما دی ہے کہ اس کا کسی طرح سے کوئی شریک نہیں ہے۔

(جاری ہے)



تجزیہ

عبدالحمید

محترم عبدالحمید فرام ہری پور کا شمار نئے افق کے دیرینہ قارئین میں ہوتا ہے۔ ان کے بارے میں ہم برملا کہہ سکتے ہیں کہ ہم ان کا شمار ان دوستوں میں کرسکتے ہیں جو نئے افق کا مطالعہ دل کی آنکھوں سے کرسکتے ہیں۔ یہ خط انہوں نے گفتگو کے لیے لکھا ہے اگر ہم اسے گفتگو میں شامل کرتے تو یقیناً یہ خط پانچ سو روپے انعام کا حق دار ٹھہرتا لیکن ہمارے نزدیک یہ انعامی رقم ان کے لیے محض مذاق ہوتی اس لیے ہم اس خط کو مضمون کے طور پر شائع کر رہے ہیں تاکہ قارئین کو بھی اندازہ ہوسکے کہ نئے افق کو کیسے کیسے ہیرے جیسے بزرگوں کی سرپرستی حاصل ہے۔

جناب محترم مشتاق احمد قریشی صاحب السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ۔ آج سولہ سال بعد آپ سے مخاطب ہورہا ہوں پہلا تبصرہ نوے کی آخری دہائی میں بھیجا جو کہ خاصا طویل تھا وہ آپ نے اگلے شمارے میں لگادیا تھا چار صفحات سے زیادہ پر محیط تھا۔ اس لیے شمارے میں میرا اور دوسرا کسی اور قاری کا تھا نام معلوم نہیں، کل دو ہی تبصرے تھے جناب عالی میرا آپ کے ساتھ بہت پرانا تعلق ہے۔ یہ تعلق ابن صفی مرحوم (اسرار احمد) کے توسط ہوا۔ مرحوم میرے پسندیدہ رائٹر تھے۔ وہ سری ادب کے بے تاج بادشاہ تھے۔ ان کے پائے کا کوئی دوسرا نہیں تھا۔ اس کا پہلا ناول "دلیر مجرم" 1952ء کو آیا اس وقت یہ انڈیا (الٰہ باد) سے شائع ہوتا تھا۔ کچھ عرصہ بعد وہ پاکستان آگئے اور لالوکھیت میں رہائش پذیر ہوئے۔ "جاسوسی دنیا" اور "عمران سیریز" پاکستان اور انڈیا سے مشترکہ شائع ہونے لگے۔ میں نے "جاسوسی دنیا" اور "عمران سیریز" پہلے ناول سے ان کی وفات تک کوئی ناول مس نہیں کیا۔ لائبریری سے کرائے پر نہیں بلکہ خرید کر پڑھتا تھا اور گھر میں اسٹاک کرتا تھا۔ ان کی وفات کے بعد دوبارہ پڑھنا شروع کیے آج تک نہ جانے کتنی مرتبہ پڑھ چکا ہوں۔ جب بھی ان کے ناول پڑھتا ہوں یوں محسوس ہوتا کہ پہلی مرتبہ پڑھ رہا ہوں۔ جناب عالی ایک دور ایسا آیا کہ ہر گلی، کوچے سے نام نہاد لکھنے والوں نے ان کے ناولوں کی نقالی شروع کردی۔ جعلی ناموں سے ابن صفی کے کرداروں کا حشر نشر کرنا شروع کردیا پھر کیا ہوا ان کا منہ کالا ہوا ایسے غائب ہوئے کہ آج تک ان کا نام ونشان بھی نہیں ملا یہاں پر میں بریک لیتا ہوں۔

ابن صفی نے عمران سیریز کے ناول "لڑکیوں کا جزیرہ" میں ان نام نہاد لکھاریوں کے متعلق پیش رس میں کیا لکھا۔ ملاحظہ ہو، آپ نے ان لوگوں کی طرف اشارہ کیا ہے جنہوں نے غیر قانونی طور پر میرے چند ناول چھاپ دیے ہیں۔ ان میں کچھ ناول ایسے ہیں جن کے نام بدل کر دھوکے سے آپ کی جیبیں خالی کرائی گئی ہیں۔ مجھے اس المیہ پر افسوس ہے مگر آپ مطمئن رہیں۔ "خالد میر وزیر آبادی" کے خلاف میرے مشیر قانونی "نجم الدین قریشی" ایم اے ایل ایل بی (ایڈووکیٹ) سخت ترین کارروائی کررہے ہیں۔ خالد میر نے دہرا جرم کیا ہے۔ ایک تو میری اجازت حاصل کیے بغیر میرے ناول چھاپ لیے دوسرے ناول کا نام بدل کر پبلک کو دھوکا دیا۔ یعنی آپ جو ناول پہلے خرید کر پڑھ چکے تھے اسے آپ نے میرا کوئی اور ناول سمجھ کر دوبارہ خرید لیا۔ اس طرح پبلک کو دھوکا دینا بہت بڑا جرم ہے اور یقین رکھیے کہ خالد میر وزیر آبادی کو اس کے لیے بھگتنا پڑے گا (ابن صفی 15 جولائی 1956)

قریشی صاحب آپ نے صحیح معنوں میں ابن صفی کی شاگردی کا حق ادا کردیا ہے آپ نے ان کے مشن کو جاری رکھا ہوا ہے۔ آپ نے ان کے ناولوں کو "نئے افق" میں لگا کر دوبارہ ان میں روح پھونک دی تھی۔ اس کے علاوہ آپ نے بھی عمران سیریز لکھ

کر ''نئے افق'' میں لکھنا شروع کیا۔ ابن صفی اور آپ کی تحریر کوئی فرق نہیں ہوتا۔ وہی مزاح، وہی چاشنی ویسے ہی کرداروں کی نوک جھونک وہی لکھنے کا انداز۔ محسوس نہیں ہوتا تھا یہ ان کے شاگرد خاص کی تحریر ہے۔ ابن صفی کی ہے آپ نے ابن صفی کے مشن کو بام عروج پر پہنچایا ہے۔ ابن صفی میگزین کے نام سے ایک ڈائجسٹ نکالا گیا۔ مارکیٹ میں آتے ہی چھا گیا۔ بہت خوب صورت پرچہ تھا کامیاب ہوا، مانگ میں اضافہ ہوتا گیا پرچہ کامیاب ہوا تو حکومت وقت کے پیٹ میں مروڑ اٹھنے لگے میگزین کے نام سے ان پر خوف طاری ہوگیا کہ کہیں ابن صفی کا میگزین ہم پر برسنا نہ شروع ہو جائے وہ بند ہوگیا۔ نئے افق کے نام سے نومبر 1976ء کو دوبارہ ظہور پذیر ہوا میں نے ابن صفی میگزین سے پڑھنا شروع کیا آج نئے افق میرا ساتھی ہے باقاعدگی سے خریدتا ہوں۔ آپ کی ادارت میں نئے افق نے بہت ترقی کی ہے۔ اللہ تعالیٰ اس کو دن دگنی رات چوگنی شہرت کی بلندیوں پر پہنچائے آمین۔ ہر موضوع پر اس میں کہانیاں ہوتی ہیں۔ ایکشن، مہم جوئی، ناول، سلسلے وار اور وہ سب کچھ جو قارئین پسند کرتے ہیں۔ گاؤں میں ریٹائرڈ زندگی بسر کر رہا ہوں پرچہ لاتے ہی پڑھنا شروع کر دیتا ہوں۔ جب تک مکمل پڑھ نہ لوں چین نہیں آتا۔ ایک دن میں مکمل پڑھ لیتا ہوں۔ کچھ نہیں ہوتا پڑھنے کے لیے ابن صفی کے ناول پرانے نئے افق پڑھتا ہوں نئے افق فروری 2015ء میں دو بڑے کا اشتہار ہے اس کے متعلق سرشار صدیقی (ادیب، شاعر، نقاد) نے کیا خوب صورت حوالہ دیا ہے۔ ملاحظہ ہو فرماتے ہیں کہ دو بڑے کے حوالے سے ڈاکٹر ابوالخیر کشفی اور ابن صفی کی بڑائی کا اعتراف کرنے والا بھی اس زور خراش زمانے میں بھی بڑا آدمی قرار پائے گا۔ اس لیے میں برادرم مشتاق احمد قریشی کو تیسرا بڑا آدمی تسلیم کرتا ہوں، (برادرم قریشی صاحب میں بھی آپ کو تیسرا بڑا تسلیم کرتا ہوں) یادش بخیر، دو بڑے اور ابن صفی کون میرے پاس موجود ہیں۔ اگست 1994ء میں انگریزی ناول اردو نئے افق میں شروع کیے گئے اور نومبر 1997ء میں آپ کی لکھی ہوئی عمران سیریز نئے افق کی زینت بنی (ان کی تفصیل دوسرے صفحے پر سالانہ رپورٹ کے ساتھ موجود ہے) سب سے پہلے دستک پڑھتا ہوں پھر گفتگو میں قارئین کے خطوط جو کہ بڑے دلچسپ ہوتے ہیں پھر برخوردار طاہر احمد کا ایمان افروز اقرا پڑھتا ہوں آپ نے جو کچھ لکھا ہے وہ سچ ہے مگر ہم کیا کر سکتے ہیں۔ یہ ہمارے اعمالوں کی سزا ہے ہم وہ لوگ ہیں جو پہلے سوراخ سے ڈسے جاتے ہیں مگر عبرت حاصل نہیں کرتے۔ دوسری، تیسری بار بھی ڈسوا کر آرام سے آنکھیں بند کر کے سو جاتے ہیں۔ ہم نے خود اپنی تکیل کرپٹ اور نالائق ترین لوگوں کے ہاتھ میں دے رکھی ہے آپ نے وزیر اعلیٰ سندھ کے متعلق لکھا ہے بالکل سچ لکھا ہے اس شخص کو ڈھنگ سے بات کرنے کا بھی سلیقہ نہیں۔

17 جنوری 2016ء کے اخبار ایکسپریس میں خبر لگی ہے۔ ایلیٹ پولیس کے 28 ویں بیچ کی پاسنگ آؤٹ کی تقریب میں علامہ اقبال کا شعر پڑھنے کی کوشش کی ایک ہی صف میں کھڑے ہوگئے...... یہاں ان کو بریک لگ گئی ایک دوسرے کا منہ دیکھنا شروع کر دیا اس دوران ان سیکورٹی اسٹاف محمود و ایاز یاد دلایا دوسرا مصرعہ نہ کوئی بندہ رہا نہ کوئی بندہ نواز یاد دلایا۔ اس نالائق ترین شخص جس کو بات کرنے کا ڈھنگ نہیں اس شخص کو بلدیات میں کسان پارٹی میں بھی جگہ نہیں ملے گی۔ جب پاکستان بنا اس وقت میری عمر بارہ سال تھی میں نے قائداعظم کی نیشنل گارڈ میں شمولیت اختیار کی۔ باقاعدہ پریڈ ہوتی قائد کو گارڈ آف آنر پیش کیا تھا بہت ڈسپلن ہوتا تھا خاکی وردیوں میں ملبوس سر پر کیپ کے ساتھ ہرے رنگ کا پھندنا کیا خوش نما منظر پیش کرتا تھا وہ ایک جذبہ تھا شوق تھا ایک لگن تھی قائد سے محبت کا اظہار تھا جب پریڈ ہوتی تو لوگوں کا جمگھٹا لگ جاتا ایک جشن کا سماں ہوتا تھا جوش اور جذبے کے ساتھ پاکستان زندہ باد اور قائداعظم زندہ باد کے نعروں سے پنڈال گونج اٹھتا۔ افسوس کہ قائد زیادہ عرصہ زندہ نہ رہے اپنا مشن مکمل کر کے خالق حقیقی کے پاس چلے گئے اس وقت میں نے میرے رشتہ داروں، دوستوں اور عوام کی بڑی تعداد میں مسلم لیگ میں شمولیت اختیار کی پھر چھیاسٹھ 66 سال بعد الیکشن 2013ء میں مسلم لیگ سے کنارہ کشی اختیار کر لی نہ ووٹ دیے نہ سپورٹ کیا آج مسلم لیگ ٹکڑوں میں تقسیم ہوگئی کوئی بھی وڈیرہ دس پندرہ آدمیوں کو ساتھ رکھ کر اپنے نام سے مسلم لیگ بنا دیتا۔ آج مسلم لیگ بھان متی کا کنبہ بنی ہوئی ہے پہلی بار میں ن لیگ کے سربراہ وزیراعظم بنے۔ قرض اتارو، ملک سنوارو کا نعرہ لگایا عوام نے بھرپور ساتھ دیا کروڑوں روپے جمع ہوئے وہ پیسہ کہاں گیا آج تک نہیں معلوم ہوسکا۔ وزیراعظم نے مدت پوری نہ کی صدر اسحاق خان کے ساتھ

ان بن ہوگئی۔ صدر اسحاق خان مرحوم نے خود صدارت کے ساتھ ن لیگ کو وزارت کے ساتھ رخصتی اختیار کی۔ دوسری بار میں بھی ن لیگ کو حکومت ملی مگر وہ بھی زیادہ عرصہ نہ چل سکی۔ اس کے اپنے منتخب کردہ آرمی چیف پرویز مشرف نے وزیراعظم کو ڈس مس کیا اور جیل میں ڈال دیا سعودی بادشاہ کی مہربانی کہ انہوں نے ایک ڈیل کر کے انہیں اپنے پاس بلالیا۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو بھٹو کی طرح ان کا انجام بھی ہوتا۔ آج وہ کنگ بنے ہوئے ہیں ابھی تک انہوں نے عبرت حاصل نہیں کی۔ اللہ کی لاٹھی بے آواز ہے کبھی بھی حرکت میں آسکتی ہے جھوٹ ان کی گھٹی میں پڑا ہوا ہے۔ الیکشن 2013ء کی رات ابھی ووٹوں کی گنتی بھی مکمل نہیں ہوئی کہ ن لیگ کا سربراہ لاؤ لشکر کے ساتھ ہاتھ میں مائک پکڑے محل سے باہر آیا اور اپنی وزارت کا اعلان کردیا (ٹیلی ویژن لائیو دکھا رہا تھا) ان کا بھائی بھی چنگھاڑ رہا تھا۔ اس نے اپنے کو وزیراعظم اور خود کو وزیر اعلیٰ پنجاب ڈکلیئر کردیا اور جوش خطابت میں چھ ماہ میں بجلی کی لوڈشیڈنگ ختم کرنے کا اعلان کردیا۔ آج ڈھائی سال سے زیادہ عرصہ ہوگیا ہے لوڈشیڈنگ میں مزید اضافہ ہوا کمی نہیں ہوئی ان کے نالائق وزرا بھی وقفے وقفے سے لوڈشیڈنگ کے متعلق لب کشائی کرتے رہتے ہیں کوئی کہتا ہے کہ 2014ء میں ختم ہوجائے گی کوئی 2015ء اور 2016ء میں لوڈشیڈنگ ختم کرنے کا اعلان کردیتا ہے۔ اب تو یہ کہا جارہا ہے کہ یہ 2018ء میں بھی جاری رہے گی۔ ایک نمبر کے جھوٹے ہیں صرف عوام کو تنگ کررہے ہیں۔ عوام کو سبز باغ دکھا رہے ہیں جھوٹ ان کی گھٹی میں پڑا ہوا ہے اہم عہدوں پر اپنے رشتہ داروں کو فائز کیا ہوا ہے۔ سابقہ وزیراعظم کے متعلق کیا جاتا ہے کہ اس نے بہت دورے کیے ہیں غلط ہے موجودہ حکمرانوں کی غیر ملکی دوروں کی سلور جوبلی ہوچکی ہے۔ اب گولڈن جوبلی کی طرف گامزن ہیں جب بھی دورے پر جاتے ہیں لاؤ لشکر کے ساتھ جاتے ہیں سب سے اچھا دور مرحوم صدر ایوب خان کا تھا زرداری کا دور بھی قدرے بہتر تھا۔ اس کا کردار جیسا بھی تھا لیکن عوام کا خیال رکھتا تھا مشرف کا دور بھی اچھا تھا ملک ٹھیک راستے پر گامزن تھا زرداری نے تنخواہ دار اور پنشنروں کا بہت خیال رکھا بیس فیصد تنخواہ اور پنشن میں اضافہ کیا اور میڈیکل الاؤنس میں 25 فیصد اضافہ کیا مشرف صاحب نے بھی دونوں طبقوں کا خیال رکھا۔ ن لیگ کے تیسرے دور میں کوئی اضافہ نہیں کیا گیا۔ صرف 10 فیصد اضافہ کیا گیا اونٹ کے منہ میں زیرے والی کہاوت ہے جواز یہ دیا گیا کہ خزانے میں پیسہ نہیں ہے دوسرے بجٹ 2015ء میں ساڑھے سات فیصد تنخواہوں اور پنشن میں اضافہ کرکے اس طبقے کو منہ میں لولی پاپ دے دیا۔ اپنے نورتنوں اور رشتہ داروں کی تنخواہوں میں 100 فیصد اضافہ کیا۔ اخباری خبر کے مطابق ان کے کابینہ میں رشتہ داروں کی تعداد گیارہ ہے جو کہ اہم عہدوں پر فائز ہیں ہر غیر ملکی دورے میں یہ ان کے ساتھ جاتے ہیں اخباری خبر ہے کہ رائے ونڈ میں وزیراعظم کے محل میں سیکورٹی اسٹاف کو مزید وسعت دی جارہی ہے چالیس کروڑ خرچ ہوں گے جو کہ سرکاری خزانے سے لیا جائے گا یہ بوجھ بھی عوام پر ڈالا جائے گا وزیراعظم کے پاس پیسے نہیں ہیں بہت غریب آدمی ہے اس کا پیسہ اس سے بہت دور غیر ملکی بینکوں میں رکھا ہوا ہے اور محفوظ ہے ابھی ایک لیڈر کا قول یاد آگیا اس نے کہا تھا کہ کسی بزنس مین کو سربراہ نہ بنانا وہ جب حکمران بن جاتا ہے تو اپنے بزنس کو بڑھانے پر توجہ دیتا ہے عوام کو بھول جاتا ہے۔

یکم 2015ء اخبار ایکسپریس میں خبر ہے کہ چالیس ارب کے نئے ٹیکس لگائے جارہے ہیں یہ ن لیگ کا بم (مہنگائی) عوام پر گرایا جارہا ہے۔ 3 دسمبر 2015ء اخبار ایکسپریس میں ایک خبر ہے کرپشن کی وجہ سے ملک تباہی کے دہانے پر پہنچ گیا (چیف جسٹس انور ظہیر جمالی) اس حکومت نے کرپشن کا ریکارڈ قائم کردیا ہے اب آئی ایم ایف سے نیا قرضہ لیا جائے گا یہ بوجھ بھی عوام پر لادا جائے گا اللہ تعالیٰ سے دعا گو ہیں اور معافی چاہتے ہیں اپنے گناہوں پر پشیمان ہیں ہم سے غلطی ہوگئی کہ ہم نے لگاتار تین مرتبہ ایسے آدمی کو اپنے اوپر مسلط کیا جو کہ دروغ گو، جھوٹا، مطلب پرست تھا ہم نے اس کے گناہوں میں شمولیت اختیار کی اس وجہ سے ہم بھی شریک ہیں۔ معافی کے خواستگار ہیں آئندہ کے لیے توبہ کرتے ہیں آئندہ احتیاط کریں گے۔ عوام کو میٹرو بسیں، جنگلہ بسوں، بلیو ٹرینوں، پل، سڑکیں نہیں چاہیے یہ خرافات نہیں چاہیے عوام کو دو وقت کی روٹی اور سکون چاہیے (جو اس دور میں نہیں ہے) ہم اللہ تعالیٰ سے التجا کرتے ہیں کہ ایسا حکمران دے جو نیک، ایماندار، دیانتدار، غریب پرور اور عوام کے دکھ درد میں شریک ہو ایسا کب ہوگا۔ کون اس ملک کو سنوارے گا اس ملک میں عوام کی کب حکومت ہوگی غربت کب ختم ہوگی، ہم کب غیر ملکی قرضوں سے نجات پائیں گے کب ہم کو اس گندے نظام سے رہائی ملے گی کب بزنس مین سربراہوں سے چھٹکارا ملے گا کب ملک کا نظام بہتر ہوگا

محترم ریاض حسین قمر صاحب کے کلام (صحراؤں) میں سے چند اشعار کے بعد خط کو اختتام پذیر کر رہا ہوں۔
ادھر فاقہ کشی ہے خود کشی ہے رونا دھونا ہے، ادھر اشراف کی من مانیوں کا رقص جاری ہے۔ جہاں غربت گزیدہ لوگ روٹی، دال کو ترسیں وہیں پر قورمے، بریانیوں کا رقص جاری ہے۔ جہاں آلو، ٹماٹر، پیاز، مہنگے داموں بکتے ہیں وہیں انسان کی ارزانیوں کا رقص جاری ہے ادھر بھر مار ہے چاروں طرف اونچے پلازوں کی ادھر کیٹاؤں میں قربانیوں کا رقص جاری ہے۔ (نئے افق فروری 2016ء سے لیا گیا ہے)
مشتاق احمد قریشی صاحب اگر خط میں کوئی بات غلط ہو تو اس کی تصیح کر دیں انسان ہوں غلطی ہو سکتی ہے۔

نئے افق جنوری 2015 تا دسمبر 2015 میں خطوط کی تعداد اور تفصیل

عمر فاروق (فورٹ عباس) پہلے نمبر پر ہیں فروری تا دسمبر تک مسلسل خطوط بھیجے ان کی تعداد گیارہ ہے۔
ابن مقبول صدیقی (پنڈی) دوسرے نمبر پر ہیں مارچ، اپریل، مئی، جولائی، اگست، ستمبر، اکتوبر، نومبر تعداد آٹھ ہوتی ہے۔
ریاض احمد بٹ (حسن ابدال) جنوری، مارچ، مئی، جولائی، اگست، اکتوبر، نومبر، دسمبر تعداد آٹھ ہوتی ہے۔
ریاض حسین قمر (منگلا ڈیم) فروری، مئی، جون، اکتوبر، دسمبر تعداد پانچ ہوتی ہے۔
مہر پرویز (میاں چنوں) مارچ، ستمبر، اکتوبر، نومبر تعداد 4 ہوتی ہے۔
محمد اسلم جاوید (فیصل آباد) جنوری، فروری، اکتوبر تعداد تین ہوتی ہے۔
ملک فلک شیر (رحیم یار خان) ستمبر، اکتوبر، دسمبر تعداد 3 ہوتی ہے۔
ممتاز احمد (سرگودھا) اکتوبر، نومبر، دسمبر تعداد 3 ہوتی ہے۔
اشفاق حسین (کراچی) جولائی، ستمبر، اکتوبر، دسمبر تعداد 4 ہوتی ہے۔
عبدالغفار عابد (چیچہ وطنی) ستمبر، اکتوبر، نومبر تعداد 3 ہوتی ہے۔
عامر زمان عامر (لاہور) اپریل، ستمبر، اکتوبر تعداد تین ہوتی ہے۔
ادیب سمیع چمن (حیدرآباد) جنوری، فروری، مارچ تعداد تین ہوتی ہے۔
انجم فاروق ساحلی (لاہور) اپریل، جون تعداد 2 ہوتی ہے۔
مجید احمد جائی (ملتان) نومبر، دسمبر تعداد 2 ہوتی ہے۔
ظہور احمد صائم (لاہور) اپریل، اکتوبر تعداد 2 ہوتی ہے۔
منشی محمد عزیز مئے (حیدرآباد) نومبر، دسمبر تعداد 2 ہوتی ہے۔
بشیر احمد بھٹی (بہاولپور) نومبر دسمبر تعداد 2 ہوتی ہے۔
صائمہ نور (ملتان) نومبر، دسمبر تعداد 2 ہوتی ہے۔
ریحانہ سعیدہ (لاہور) فروری، اگست تعداد 2 ہوتی ہے۔
ساحل ابڑو (بلوچستان) اگست، دسمبر تعداد 2 ہوتی ہے۔

ذیل میں ان قارئین کی تفصیل ہے جنہوں نے صرف ایک ہی خط لکھا ہے

جنوری: ماریہ اقرا وسیم (کراچی) ساحل دعا بخاری (بصیر پور)
فروری: میں کوئی نہیں مارچ میں بھی نہیں ہے۔
اپریل: حسن اختر پریم (ناظم آباد)
مئی: عالیہ انعام الٰہی (کراچی) زریں قمر (کراچی) محترمہ عالیہ انعام الٰہی (شاید کچھ ناراض ہیں)
جون: محمد عمران (فیصل آباد) دستگیر شہزاد (ٹوبہ ٹیک سنگھ) عبدالمالک کیف (صادق آباد) محمد اقبال جعفری (پنڈی)
جولائی: خادم حسین کھیڑا (رجب والا) ایم کاشف (جعفرآباد)

اگست: ساحل ابڑو (بلوچستان)
ستمبر: طاہرہ جبیں تارا (لاہور) سلیم اختر (پنڈی) منعم اصغر (ڈی جی خان) ایم ارشد (گوجرانوالہ)
اکتوبر: ریحانہ عامر (وہاڑی) نازسلوش ذشے (میر پور آزاد کشمیر)
نومبر: نازیہ خانم (لاڑکانہ) حافظہ لائبہ قریشی (فورٹ عباس)
دسمبر: محمد یاسر (رحیم یارخان) علی حسین تابش (چشتیاں) گل مہر (کراچی)

انعام یافتہ خطوط:

ابن مقبول صدیقی (جولائی)
ساحل ابڑو (اگست)
طاہرہ جبیں تارا (ستمبر)
ممتاز احمد (اکتوبر)
ریاض حسین قمر (دسمبر)

لکھاریوں کی لکھی ہوئی کہانیوں کی تفصیل

ماہ و سال	نام رائٹر	کہانی
مارچ 2015	زریں قمر	لارنس آف افغانستان
مئی 2015	زریں قمر	باغ عدن
جولائی 2015	زریں قمر	گمنام سپاہی
اگست 2015	زریں قمر	عروس آزادی
ستمبر 2015	زریں قمر	بنت غزہ
اکتوبر 2015	زریں قمر	ضرب عضب
دسمبر 2015	زریں قمر	اغوابرائے تاوان
جنوری 2015	خلیل جبار	آتش انتقام
فروری 2015	خلیل جبار	ندامت
مئی 2015	خلیل جبار	آشفتہ سر
جون 2015	خلیل جبار	ماسی
جولائی 2015	خلیل جبار	پراسرار قتل
ستمبر 2015	خلیل جبار	رقابت
اکتوبر 2015	خلیل جبار	قاتل حسینہ
جون 2015	مشتاق احمد قریشی	ڈبل گیم
جولائی 2015	مشتاق احمد قریشی	اجنبی
اگست 2015	مشتاق احمد قریشی	کیچڑ کے کنول
اگست 2015	مشتاق احمد قریشی	دلی کے بانکے
ستمبر 2015	مشتاق احمد قریشی	سرگوشیاں
اکتوبر 2015	مشتاق احمد قریشی	دلی کے بانکے

فروری 2015	ریاض بٹ	کوہ نور
جون 2015	ریاض بٹ	چراغ
جولائی 2015	ریاض بٹ	ملاپ
ستمبر 2015	ریاض بٹ	تیسرا راستہ
اکتوبر 2015	ریاض بٹ	نیکی کا دریا
نومبر 2015	ریاض بٹ	حفظ ماتقدم
جنوری 2015	محمد سلیم اختر	تریاق
فروری 2015	محمد سلیم اختر	نیا جنم
اپریل 2015	محمد سلیم اختر	اجلے لوگ
مئی 2015	محمد سلیم اختر	بلا عنوان
جون 2015	محمد سلیم اختر	جھوتا
جون 2015	حسام بٹ	ماتم بہار
جولائی 2015	حسام بٹ	تکمیل تمنا
اگست 2015	حسام بٹ	نظر فریب
دسمبر 2015	حسام بٹ	نظم قدرت
جنوری 2015	راحیلہ ناز	نایافت
فروری 2015	راحیلہ ناز	دو جمع دو
مارچ 2015	راحیلہ ناز	غلط فہمی
مئی 2015	راحیلہ ناز	شکاری
نومبر 2015	راحیلہ ناز	پری گل
جنوری 2015	حسیب جواد علی	دوسری دُنیا
مئی 2015	حسیب جواد علی	دائرہ
جون 2015	حسیب جواد علی	طلب
دسمبر 2015	حسیب جواد علی	راہ شناس
مارچ 2015	عمر فاروق ارشد	ننگ وطن
اکتوبر 2015	عمر فاروق ارشد	عشق نامراد
دسمبر 2015	عمر فاروق ارشد	لغزش
جنوری 2015	انجم فاروق ساحلی	مسٹر دلچسپ
مارچ 2015	انجم فاروق ساحلی	کالے چہرے
اکتوبر 2015	انجم فاروق ساحلی	تعاقب
جنوری 2015	محمد اعظم خان	کھلاڑی اناڑی
اپریل 2015	محمد اعظم خان	بلندی

مئی 2015	محمد اعظم خان	برائے فروخت
جنوری 2015	آلیشبہ مخدوم	پتایا میں تین دن
مارچ 2015	آلیشبہ مخدوم	سیاست کی کوکھ
اپریل 2015	آلیشبہ مخدوم	الٹی لکیریں
فروری 2015	اسرار احمد	روشن کتاب
جنوری 2015	اسرار احمد	نوآموز
اپریل 2015	اسرار احمد	اشتراک
فروری 2015	جاوید احمد صدیقی	پراسرار ہوٹل
مئی 2015	جاوید احمد صدیقی	جرم وسزا
مئی 2015	ابن حق	توبہ
جولائی 2015	ابن حق	بھرم
نومبر 2015	ناصر ملک	معتبر (۱)
دسمبر 2015	ناصر ملک	معتبر (۲)
جولائی 2015	اقبال بھٹی	بیگم شیطان
ستمبر 2015	اقبال بھٹی	انصاف
مارچ 2015	علی اختر	بھینٹ
اپریل 2015	علی اختر	ریس کا گھوڑا
ستمبر 2015	دستگیر شہزاد	ساتواں قتل
دسمبر 2015	دستگیر شہزاد	آگ
جون 2015	سید احتشام	ڈبل کراس
نومبر 2015	سید احتشام	نکما
فروری 2015	طاہرہ جبیں تارا	عشق لاحاصل
جولائی 2015	طاہرہ جبیں تارا	ستم
جنوری 2015	اسد علی	مارگزیدہ
جنوری 2015	ریحانہ سعیدہ	عزت نفس
فروری 2015	محمد ندیم	وہ کون تھے
فروری 2015	قیصر عباس	وقت ناتمام
فروری 2015	ساحل جمیل سید	انتقام گزیدہ
فروری 2015	عارف رضا جتوئی	رشتوں کی پہچان
مارچ 2015	انور گریوال	ضرب پلس
مارچ 2015	خورشید پیرزادہ	غیر سیاسی انٹرویو
مارچ 2015	شہناز نسیم	دیپک تان

اپریل 2015	احمد صغیر صدیقی	تخلیق
اپریل 2015	خان شفیق	وہم کے سائے
اپریل 2015	فرحان ولایت بٹ	اشک خجلت
اپریل 2015	احسن طارق چوہدری	بدلتے خواب
اپریل 2015	فوزیہ کنول	چھاپ
مئی 2015	مجید احمد جائی	حقیقی مسیحا
مئی 2015	ریاض حسین شاہد	بچولیا
مئی 2015	وقار الرحمان	میں ابھی زندہ ہوں
جون 2015	احمد سجاد بابر	گلیڈی ایٹر
جون 2015	ساحل ابڑو	ویران شام
جولائی 2015	کے ایم خالد	ایجنسی
جولائی 2015	حنا سعید	تھپڑ
جولائی 2015	مہر پرویز	اسیر غم
اگست 2015	عامر زمان عامر	کاغذی رشتے
اگست 2015	نسیم سکینہ صدف	احساس
اگست 2015	محمد جاذب	منک کوٹ
ستمبر 2015	مہر افروز	پھانگنی
ستمبر 2015	شاہد جمیل احمد	زندگی
ستمبر 2015	کشاف اقبال	زلیخاں
اکتوبر 2015	ابن عرب	فیصلہ عوام کا
اکتوبر 2015	راجپوت اقبال احمد	خوددار
اکتوبر 2015	آغاز الدین	رشتہ خون کا
نومبر 2015	ناصر بیگ چغتائی	بے نام چہرہ
نومبر 2015	نازش سلوش ذشے	سرد ہوا
نومبر 2015	وقار الرحمان	تاش کے پتے
دسمبر 2015	شاہدہ صدیقی	کلید
دسمبر 2015	محمد یاسین صدیقی	ناتمام عشق
دسمبر 2015	منعم اصغر	شکاری
دسمبر 2015	ریحانہ عامر	کشکول
دسمبر 2015	شاہدہ صدیقی	کہانی کار

نئے افق میں شائع ہونے والی انگریزی فلمیں

اگست 1994	ڈیتھ ٹرین

ستمبر 1994	ہارڈ ٹارگٹ
اکتوبر 1994	پسنجر
نومبر 1994	دی اسپیس
دسمبر 1994	گھوسٹ
جنوری 1995	بوائے اسکاؤٹ
فروری 1995	اسپیڈ
مارچ 1995	فار ایور ینگ
مئی 1995	اندسنٹ بکڈ
جون 1995	ٹین ایجنٹ
جولائی 1995	رابن ہڈ
اگست 1995	رنگ مین
ستمبر 1995	ڈائی ہارڈ
اکتوبر 1995	نو کو بیسٹ
نومبر 1995	دی گیٹا ایوے
دسمبر 1995	زیرو ٹولرینس
مارچ 1996	ٹرمینیٹر (۱)
اپریل 1996	ٹرمینیٹر (۲)
مئی 1996	انڈر ریچ
جون 1996	نیور ریچ
جولائی 1996	ڈسپرڈو
اگست 1996	کلائنٹ (۱)
ستمبر 1996	کلائنٹ (۲)
اکتوبر 1996	مڈنائٹ ہیٹ
نومبر 1996	ڈارک مین (۱)
دسمبر 1996	ڈارک مین (۲)
جنوری 1997	اسٹیٹ فائر
فروری 1997	ہیمر ہیڈ
مارچ 1997	ڈائمنڈ سولسٹری
اپریل 1997	دی مین ہوسولڈ ڈیتھ
مئی 1997	ساؤتھ بائی چائنا ہیڈ
جون 1997	ان لکی آئی
جولائی 1997	وائٹ ہل

اگست 1997	بروکن ایرو
ستمبر 1997	دی مارک
اکتوبر 1997	سڈن ڈیتھ
نومبر 1997	دی مورٹل
دسمبر 1997	دی بگ سن
جنوری 1998	سیون سسٹر
فروری 1998	دی شارک
مارچ 1998	دی سکریم
اپریل 1998	مین ان بلیک
مئی 1998	انڈیپنڈینٹ
جون 1998	کون ایئر
جولائی 1998	فیس آف
ستمبر 1998	رف لائف
اکتوبر 1998	ناک آف
نومبر 1998	منیٹر
دسمبر 1998	ڈارک
جنوری 1999	لائف لو
فروری 1999	لانگ لائٹ
مارچ 1999	ڈے آف جیکال
اپریل 1999	اسکیپ
مئی 1999	نائف
جون 1999	تھیف
جولائی 1999	رومانس
اگست 1999	شیڈ آف لو
ستمبر 1999	بلڈ اسٹریٹ
اکتوبر 1999	اینجل آف ڈیتھ
نومبر 1999	بلیوناکس
دسمبر 1999	پلنڈر
جنوری 2000	ریونج
فروری 2000	دی لاسٹ ٹرین
مارچ 2000	ایول اسٹریٹ
اپریل 2000	امیت ولا II

آتھم	مئی 2000
مونسٹر	جون 2000
دی روک	مئی 2001
پرفیکٹ مرڈر	ستمبر 2001
ویلنیس	نومبر 2001
فائنل انالائس	دسمبر 2001

سلسلے وار ناول

قلندر ذات (امجد جاوید) اپریل 2013 تا دسمبر 2015 اقساط 33 مکمل ناول۔
جگت سنگھ (شمیم نوید) اگست 2013 تا مارچ 2015 اقساط 4 مکمل ناول۔
ہدف (نوشاد عادل) مارچ 2015 تا جون 2013 اقساط 4 مکمل ناول۔
یارب (غلام میراں) جنوری 2013 تا اپریل 2015 اقساط 4 مکمل ناول۔
روپ بہروپ (محمد سلیم اختر) اگست 2015 تا نومبر 2015 اقساط 4 مکمل ناول۔
فلسطین (الماس ایم اے) اپریل 2013 تا ستمبر 2013 اقساط 4 مکمل ناول۔

جناب مشتاق احمد قریشی کے نئے افق میں شائع ہونے والے "عمران سیریز" کے اوریجنل شاہکار ناول

تین تیرہ	نومبر 1997
غرور کا سرنیچا	دسمبر 1997
نادم تیشہ	جنوری 1998
بلک فورس	فروری 1998
پروجیکٹ بی	مارچ 1998
ڈبلی کیٹر پلانٹ	اپریل 1998
اسپیس ڈیک	مئی 1998
سبز طوفان	جون 1998
فائنل پنچ (۱)	جولائی 1998
فائنل پنچ (۲)	اگست 1998
پہاڑوں کی سازش	ستمبر 1998
برف کی آگ	اکتوبر 1998
بلڈ ہاؤنڈ	نومبر 1998
کمانڈرون	دسمبر 1998
ڈیڈ پوائنٹ	جنوری 1999
خاور کا فرار	فروری 1999
ٹنل تھری	مارچ 1999
انکل ڈارون	اپریل 1999

مئی 1999	دم دار ستارے
جون 1999	خون کی پیاس
جولائی 1999	خوفناک دشمن
اگست 1999	جوزف کا چچا
ستمبر 1999	گرانڈ، سسٹر
اکتوبر 1999	ڈائمنڈ ہول
نومبر 1999	خونی نشانی
دسمبر 1999	تاریکیوں کا راز
جنوری 2000	جنجال لمیٹڈ
فروری 2000	موت کا چہرہ
مارچ 2000	روشنی کے شکار
اپریل 2000	سرد شعلہ
مئی 2000	ڈیفنڈ میزائل
جون 2000	میڈم عمران
جولائی 2000	عمران کے شکار
اگست 2000	چک چک بم
ستمبر 2000	بلیک تھرٹین
اکتوبر 2000	حکم کی ملکہ
نومبر 2000	قاتل دستاویز
جنوری 2001	ٹریک (۱)
فروری 2001	ٹریک (۲)
مارچ 2001	ڈبل فیس (۱)
اپریل 2001	ڈبل فیس (۲)
مئی 2001	سیکرٹ لائن
جون 2001	پلاٹینم پلتھرز
جولائی 2001	زہریلے راستے (۱)
اگست 2001	زہریلے راستے (۲)
ستمبر 2001	درندوں کا نشیمن (۱)
اکتوبر 2001	درندوں کا نشیمن (۲)



سلگتے چنار

زرین قمر

"آپ ہی بتائیں کہ اگر میں اور مجھ جیسے دوسرے کشمیری نوجوان صرف اپنی اپنی فیملی کی حفاظت کے لیے اپنے گھروں میں آکر بیٹھ جائیں گے تو آزادی کی جدوجہد کون کرے گا؟ کسی بڑے مقصد کو حاصل کرنے کے لیے چھوٹی چھوٹی قربانیاں دینا پڑتی ہیں۔ میں مجبور ہوں اور اس دھرتی کا بیٹا ہوں۔ میں نے اپنے ملک کو کافروں سے آزاد کروانے کا ارادہ کر لیا ہے اور میں اپنے اس مقصد سے کبھی پیچھے نہیں ہٹوں گا۔"

پروفیسر سلیم احمد اسپتال کے آپریشن تھیٹر کے باہر بے چینی سے ٹہل رہا تھا۔ اس کے سرخ وسفید ماتھے پر پسینے کے قطرے نمایاں تھے اور چہرے سے پریشانی جھانک رہی تھی دیکھنے میں وہ خاصا صحت مند تھا اور توانا اعصاب کا مالک نظر آرہا تھا لیکن اس کی پریشانی سے عیاں تھا کہ اتنے توانا اعصاب کے باوجود بھی کسی چیز نے اسے بہت پریشان کیا ہوا ہے وہ آپریشن تھیٹر کے باہر راہداری میں ٹہلتے ہوئے بے چینی سے اپنے ہاتھوں کو مل رہا تھا کبھی راہداری میں رکھی بینچ پر بیٹھ جاتا تھا اور کبھی اٹھ کر پھر ٹہلنے لگتا تھا وہ اپنی بیوی سے بہت محبت کرتا تھا جو اس وقت آپریشن تھیٹر میں موجود تھی اور اس کے بچے کو جنم دینے والی تھی اچانک آپریشن تھیٹر سے ایک نرس کسی کام سے باہر آئی اور وہ تیزی سے اس کی طرف لپکا۔

''سسٹر، وہ کیسی ہے؟'' اس نے بے چینی سے پوچھا۔

''وہ ٹھیک ہیں بس اب ہم آپریشن شروع کرنے ہی والے ہیں، آپ پریشان مت ہوں، آپ آرام سے بیٹھیں جلد ہی آپ خوش خبری سنیں گے۔'' سسٹر نے اسے تسلی دی۔

''جی۔'' سلیم احمد نے کہا لیکن اس کے چہرے سے پریشانی عیاں تھی۔

اس کی بیوی خالدہ اسے اپنی جان سے بھی پیاری تھی وہ اس کے دوست یونس بٹ کی بہن تھی اور یونس بٹ اس کے لڑکپن کا ساتھی تھا انہوں نے ایک ساتھ پاکستان کی اسلام آباد یونیورسٹی میں تعلیم حاصل کی تھی اور بہت عرصہ ساتھ گزارا تھا یونس بٹ جموں کشمیر کا رہنے والا تھا اور اسلام آباد یونیورسٹی میں تعلیم حاصل کرنے آیا تھا تب ہی سلیم احمد سے اس کی ملاقات ہوئی تھی اور پھر ان کی یہ ملاقات گہری دوستی میں تبدیل ہوگئی تھی اس وقت سلیم احمد کی پریشانی کی وجہ کچھ تو اس کی بیوی خالدہ کا آپریشن تھا اور کچھ ایک دل ہلا دینے والی خبر تھی جب وہ خالدہ کو اسپتال لے کر آرہا تھا تو اسے راستے میں یونس بٹ کا فون آیا تھا جس نے اسے اپنے بیٹے احتشام بٹ کے مرنے کی اطلاع دی تھی۔ احتشام بٹ اس کے دوست کا بڑا بیٹا تھا اور خالدہ کا چہیتا بھتیجا وہ سوچ رہا تھا کہ خالدہ کو یہ افسوس ناک خبر کیسے سنائے گا۔

اسے یاد تھا 1991ء میں وہ پہلی بار یونس بٹ سے ملا تھا اس لیے بھی اسی سال اسلام آباد یونیورسٹی میں ماسٹرز میں داخلہ لیا تھا اور یونس سے اس کی ملاقات داخلے کا فارم جمع کراتے ہوئے کلرک آفس کے باہر ہوئی تھی یونس بٹ یہاں اجنبی تھا وہ کشمیر کا رہنے والا تھا اور تعلیم مکمل کرنے کے لیے اسلام آباد آیا تھا سلیم احمد نے داخلے کے معاملات میں اس کی بھرپور مدد کی تھی۔ اس نے بچپن ہی سے کشمیریوں کے بہادری کے جو کارنامے سنے تھے ان کی وجہ سے اس کے دل میں کشمیریوں کے لیے بہت عقیدت و احترام تھا اور وہ ان کی جدوجہد آزادی کی کامیابی کی دل سے دعائیں کرتا تھا پھر جب اسے یونس بٹ جیسا کشمیری دوست میسر آیا تو اس نے اکثر اس سے کشمیر کی جدوجہد آزادی پر بات کی یونس بٹ اسے ایسے بہت سے واقعات سناتا تھا جنہیں سن کر پتا چلتا تھا کہ نا صرف یونس بٹ کی فیملی بلکہ سارے ہی کشمیری کس طرح ہندو فوجیوں کا مقابلہ کرتے ہیں اور کن مشکلات میں زندگی گزار رہے ہیں۔

''جناب اللہ تعالیٰ نے آپ کو خوب صورت سا بیٹا دیا تھا۔'' اچانک نرس کی آواز نے اسے خیالات سے چونکا دیا اور وہ نرس کی طرف متوجہ ہوا۔

''کیا کیا؟'' اس نے خوشی سے پوچھا۔

''جناب، آپ ایک خوب صورت سے بیٹے کے باپ بن گئے ہیں۔'' نرس نے دوبارہ بتایا تو وہ خوشی سے اپنی کرسی سے کھڑا ہوگیا اور تیزی سے آپریشن تھیٹر کی طرف بڑھا۔

''ارے نہیں...... رکیں...... آپ وہاں نہیں جا سکتے، ہم ابھی کچھ دیر میں انہیں ان کے کمرے میں پہنچا دیں گے پھر آپ ان سے ملیے گا۔'' نرس نے سمجھانے والے انداز میں کہا اور سلیم احمد اپنی بے چینی پر کھسیانی سی ہنسی ہنس دیا۔

''دراصل میں اسے بہت چاہتا ہوں۔'' سلیم احمد نے شرمندگی چھپاتے ہوئے کہا۔

''میں سمجھ سکتی ہوں بس تھوڑی دیر کی بات ہے۔'' نرس نے کہا اور پھر آپریشن تھیٹر میں چلی گئی۔

کچھ دیر بعد خالدہ کو اس کے کمرے میں پہنچا دیا گیا تھا وہ بے ہوشی کی سی کیفیت میں تھی سلیم احمد اس کے اسٹریچر کے ساتھ ساتھ چلتا ہوا ہی کمرے میں آگیا تھا اور سسٹرز خالدہ کو بیڈ پر لٹا کر چلی گئی تھیں۔ وہ بیڈ کے قریب رکھی کرسی پر بیٹھ گیا تھا اور اس نے پیار سے خالدہ کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں تھام لیا تھا خالدہ نے آہستہ سے آنکھیں کھولی تھیں۔

''سلیم۔'' اس نے نقاہت سے اس کا نام پکارا تھا۔
''تم ٹھیک ہو خالدہ، تمہیں پتا ہے ہمیں اللہ نے چاند سا بیٹا دیا ہے۔'' اس نے اپنی بیوی کو بتایا وہ اس وقت احتشام کا غم بالکل بھول گیا تھا جس کے لیے کچھ دیر پہلے بہت پریشان تھا خالدہ نے اس کی بات سن کر پھر آنکھیں بند کرلی تھیں۔ وہ اس کی کیفیت کو سمجھ سکتا تھا اس لمحے نرس کمرے میں داخل ہوئی تھی جس نے اسے بچے کی خوشخبری دی تھی۔
''بس تھوڑی دیر میں یہ آپ سے باتیں کرنے کے قابل ہوجائیں گی اور بچے کو بھی ہم لے آئیں گے ماشاء اللہ وہ صحت مند ہے آپ پریشان نہ ہوں۔'' نرس نے کہا۔
''جی کیا میں آپ کا نام جان سکتا ہوں۔'' سلیم نے کہا۔ اس نے اپنی پریشانی میں اب تک اس کا نام بھی نہیں پوچھا تھا۔
''جی میرا نام نجمہ ہے۔'' نرس نے مختصر سا جواب دیا اور چلی گئی سلیم پھر سے احتشام کے بارے میں سوچنے لگا تھا۔
اسے یاد تھا اس کے دوست کا بڑا بیٹا احتشام جب پیدا ہوا تو اس وقت سلیم احمد بھی اسپتال میں یونس بٹ کے ساتھ موجود تھا اور اس نے احتشام کو پیار سے گود میں اٹھایا تھا' اس کے کان میں اذان دی تھی اور اسے شہد چٹایا تھا اسے احتشام اپنے بچوں کی طرح عزیز تھا کیونکہ احتشام کا بچپن اس کے ساتھ گزرا تھا اسے اب بھی یاد تھا کہ وہ احتشام کا ہاتھ پکڑ کر اسے چلنا سکھاتا تھا اور احتشام اپنے ننھے ننھے قدموں سے لڑکھڑاتا ہوا اس کا ہاتھ تھام کر چلنے کی کوشش کرتا تھا۔
اسے یاد تھا جب پہلی ملاقات پر اس نے یونس بٹ کی مدد کرتے ہوئے اس کا داخلہ فارم جمع کردیا تھا تب اس کو یونس بٹ نے بتایا تھا کہ وہ آزاد کشمیر کے علاقے مظفرآباد کا رہنے والا ہے۔ یہ جان کر سلیم کو بہت خوشی ہوئی تھی اور وہ کاغذات جمع کرا کر یونس کے ساتھ کیفے ٹیریا میں آ بیٹھا تھا۔
''یونس مجھے تم سے مل کر بہت خوشی ہوئی ہے۔ میں نے بچپن سے سنا ہے کہ کشمیر کے رہنے والے بہت خوب صورت اور بہادر ہوتے ہیں..... تو وہ میں نے دیکھ ہی لیا تمہیں دیکھ کر وہاں کی خوب صورتی کا تو میں قائل ہوگیا۔'' سلیم نے یونس کے سرخ و سفید چہرے کی طرف دیکھتے ہوئے کہا اور یونس مسکرانے لگا۔
''انسان ہی خوب صورت نہیں سلیم وہاں کی زمین، آسمان، مناظر سب خوب صورت ہیں کشمیر کو یونہی تو وادی جنت نظیر نہیں کہا جاتا۔'' یونس نے ہنستے ہوئے کہا۔
''لیکن ہماری خوب صورت وادی پر ایک بدنما سیاہ داغ لگا ہوا ہے اور وہ ہے بھارتی سامراج کا وہاں قبضہ..... میں تو آزاد کشمیر میں ہوں لیکن میرے اور دوسرے لوگوں کے بہت سے رشتہ دار جموں کشمیر میں رہتے ہیں جہاں بھارت کا ناجائز قبضہ ہے اور جہاں کے مسلمانوں کا ان کے ہندو فوجیوں نے جینا حرام کیا ہوا ہے۔'' یونس بٹ نے کہا۔
''ہاں میں جانتا ہوں۔'' سلیم احمد نے کہا ''ہم لوگ تمہاری جدوجہد سے بے خبر نہیں ہیں ٹی وی، ریڈیو اور اخبارات پر ساری خبریں پتا چل جاتی ہیں وہاں آئے دن کیا ہوتا ہے پل پل کی خبر رہتی ہے اور لوگ کشمیریوں کا ساتھ دینے کے لیے پوری طرح تیار ہیں۔'' سلیم احمد نے کہا۔
''ہاں میں جانتا ہوں ایک مسلمان ہونے کے ناتے دوسرے مسلمان پر ہونے والے ظلم کو روکنا اور اس کی جدوجہد میں اس کا ساتھ دینا ہمارے مذہب کا حصہ ہے۔'' یونس نے جواب دیا۔
''یونس، تم آج سے میرے بہترین دوست ہوا اور ایک کشمیری مسلمان ہونے کے ناتے میرے بھائی بھی۔'' سلیم نے اپنا دایاں ہاتھ دوستی کے لیے یونس بٹ کی طرف بڑھایا جسے اس نے گرم جوشی سے تھام لیا۔
''ان شاء اللہ تعالیٰ ہماری دوستی مثالی دوستی ہوگی۔'' یونس بٹ نے کہا تو سلیم احمد نے اثبات میں سر ہلایا۔
پھر یونس نے اسے بتایا تھا کہ اس کے والد کی خواہش تھی کہ وہ الیکٹریکل انجینئر بنے اور ان کی یہ خواہش پوری کرنے کے لیے اس نے اسلام آباد یونیورسٹی میں داخلہ لیا ہے اس نے بتایا کہ اس کے تین بہن بھائی ہیں وہ سب سے بڑا ہے اس کے بعد اس کا بھائی موسیٰ بٹ ہے جو کالج میں سیکنڈ ایئر کا طالب علم ہے پھر اس کی بہن زاہدہ اور خالدہ ہیں جو بالترتیب فرسٹ ایئر اور میٹرک میں ہیں اس کے والد ایک مقامی تاجر ہیں اور کپڑے کا کاروبار کرتے ہیں پھر سلیم نے بھی اسے اپنی فیملی کے بارے میں بتایا تھا اور یوں ان کی بے لوث دوستی کا آغاز ہوگیا تھا۔
ان کی دوستی آہستہ آہستہ اتنی بڑھی کہ کلاس لینے کے بعد وہ دونوں ہر وقت ساتھ ہی دیکھے جانے لگے اکثر وہ دونوں اپنے اور دوستوں کے ساتھ باہر گھومنے بھی چلے

جاتے یونس بٹ کا قیام تو یونیورسٹی کے ہاسٹل میں تھا لیکن سلیم احمد چونکہ اسلام آباد میں ہی رہتا تھا چنانچہ روزانہ اپنے گھر سے ہی یونیورسٹی آتا تھا اس نے اپنے والدین سے بھی یونس کو ملوایا تھا۔ جنھوں نے اسے خاصا پسند کیا تھا۔

ایک روز یونس بٹ نے سلیم کو بتایا کہ وہ یونیورسٹی ہی کی ایک لڑکی طاہرہ کو پسند کرنے لگا ہے یہ بات سلیم نے خود بھی محسوس کی تھی لیکن اسے یقین نہیں تھا چنانچہ اس نے اس سلسلے میں یونس سے کبھی کوئی بات نہیں کی تھی لیکن جب یونس نے اسے خود بتایا تو وہ بھی کھل گیا۔

"ہاں، میں نے بھی مختلف مواقع پر محسوس تو کیا تھا لیکن میں سمجھا کہ یہ میرا شک ہوسکتا ہے۔" سلیم نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"مجھے خود بھی یقین نہیں تھا کہ میں اسے چاہتا ہوں۔" یونس بٹ نے کہا۔ "لیکن کئی دن سے محسوس کر رہا ہوں کہ اگر وہ مجھے کسی دن نظر نہ آئے تو میری نظریں اسے ڈھونڈتی ہی رہتی ہیں، جب وہ نظر نہیں آتی تو میں اداس ہو جاتا ہوں...... میں اس کے بارے میں بس اتنا جانتا ہوں کہ وہ اردو ڈپارٹمنٹ میں پڑھتی ہے اور بہت خوب صورت ہے روزانہ ایک نیلے رنگ کی کار اسے گیٹ پر چھوڑ جاتی ہے اور چھٹی کے وقت واپس لے جاتی ہے جسے ایک ادھیڑ عمر شخص ڈرائیونگ کر رہا ہوتا ہے جو حلیے سے ڈرائیور نہیں لگتا شاید اس کے والد ہوں۔

"ہوں تو تم نے باقاعدہ جاسوسی شروع کر دی ہے۔" سلیم نے ہنستے ہوئے اسے چھیڑا۔

"ارے نہیں جاسوسی تو نہیں اسے تو روز ہی آتے جاتے میں دیکھتا ہوں۔" یونس نے کہا۔

"اچھا دوست، پتا کرتے ہیں پھر وہ محترمہ کون ہیں کس فیملی سے تعلق ہے۔ ان کے مشاغل کیا ہیں۔" سلیم نے ہنستے ہوئے کہا پھر اس نے اپنے دوستوں کی مدد سے طاہرہ کے بارے میں معلومات جمع کی تھیں اور آہستہ آہستہ اس سے شناسائی بڑھائی تھی یہاں تک کہ کچھ ہی عرصے میں طاہرہ ان کی دوست بن گئی تھی اور ان کے گروپ کا حصہ بھی جانے لگی تھی لیکن وہ یونس کی خود میں دلچسپی کے بارے میں کچھ نہیں جانتی تھی۔

"کیا خیال ہے یونس تمہاری دیوانگی کے بارے میں اسے بتا دوں۔" ایک دن سلیم نے شرارت سے کہا۔

"ارے نہیں...... وہ کیا سوچے گی۔" یونس نے ڈرتے ہوئے کہا۔

"بھائی جب پیار کیا تو ڈرنا کیا؟" سلیم نے گنگناتے ہوئے کہا اور سلیم ہنسنے لگا۔

"ہنس ابھی نہیں۔" یونس نے اسے منع کیا "میں خود کوئی مناسب موقع دیکھ کر اس سے بات کرلوں گا۔"

"ٹھیک ہے جیسی آپ کی مرضی۔" سلیم نے کہا اور شرارت سے یونس کی طرف دیکھ کر گنگنانے لگا۔

"یہ عالم شوق کا دیکھا نہ جائے"

اور یونس ہنس کر دوسری طرف دیکھنے لگا تھا۔

پھر اچانک خالدہ کے کراہنے کی آواز سے سلیم احمد اپنے خیالوں سے چونکا تھا اور اس کی طرف متوجہ ہو گیا تھا۔

"تم کیسی ہو خالدہ؟" اس نے پیار سے اس کے بال سنوارتے ہوئے پوچھا۔

"میں ٹھیک ہوں میرا بیٹا کہاں ہے؟" خالدہ نے پوچھا۔

"ابھی سسٹر اسے لے کر آئے گی تم ٹھیک تو ہو نا؟" سلیم نے پھر اس سے پوچھا۔

"ہاں...... میں ٹھیک ہوں۔" خالدہ نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔ سلیم اسے بغور دیکھ رہا تھا وہ بہت خوش تھا خدا نے اسے چاند سے بیٹے سے نوازا تھا جس کی اسے بہت تمنا تھی سلیم کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ اس کے بھانجے احتشام کی موت کے بارے میں اسے کیسے بتائے اس نے کچھ عرصے کے لیے خاموشی اختیار کرنے کا فیصلہ کیا۔ اس نے سوچا کہ جب خالدہ اسپتال سے گھر منتقل ہو جائے گی تب وہ اسے سب کچھ بتا دے گا۔

"خالدہ تم خوش تو ہو نا؟" سلیم نے پوچھا تو خالدہ مسکرانے لگی۔

"ہاں میں خوش ہوں اور اللہ تعالیٰ کی بہت مشکور ہوں کہ اس نے ہمیں اولاد نرینہ سے نوازا۔" خالدہ نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"اب دعا کرو کہ ہمارا بیٹا اچھے انسانوں میں شامل ہو اور اللہ تعالیٰ اسے فرمانبردار اولاد بنائے۔" سلیم نے کہا۔

"ہم اس کی بہت اچھی تربیت کریں گے اسے خوب پڑھائیں گے یہ ایک دن ہمارا اور خاندان کا نام روشن کرے گا۔" خالدہ بہت خوش تھی۔

"خالدہ احتشام کی طبیعت کچھ ناساز ہے۔" سلیم نے کہا۔ اس نے سوچا کہ وہ تھوڑا تھوڑا کر کے خالدہ کو احتشام کے بارے میں بتائے گا تو اسے زیادہ صدمہ نہیں ہوگا۔"

"اچھا کیا ہوا، اس کی کیا طبیعت خراب ہے۔" خالدہ نے جلدی سے پوچھا وہ اپنے بھتیجے کو بہت چاہتی تھی۔

"کچھ نہیں یونس کا فون آیا تھا۔ وہ بتا رہا تھا کہ احتشام کچھ بیمار ہے زیادہ تفصیل میں بات نہیں ہوئی۔" سلیم نے جھوٹ بولا۔

"ہوں اللہ کرے گا تو جلد ٹھیک ہو جائے گا۔" خالدہ نے قدرے اطمینان سے جواب دیا۔

کچھ ہی دیر میں سسٹر نجمہ ان کے بیٹے کو نئے کپڑے پہنا کر لے آئی تھی وہ گلابی گلابی رنگت کا صحت مند اور خوب صورت بچہ تھا ہلکے نیلے لباس میں بہت ہی پیارا لگ رہا تھا سسٹر نے اسے خالدہ کے برابر لیٹا دیا۔ خالدہ نے اٹھنے کی کوشش کی کہ اسے اچھی طرح دیکھ سکے تو سسٹر نے اسے روک دیا۔

"ارے آپ ٹھہریں اٹھنے کی کوشش نہ کریں۔ آپ کے آپریشن کے ٹانکے تازہ ہیں میں دکھاتی ہوں۔" اس نے بچے کو تھوڑا اونچا کر کے خالدہ کو دکھایا اور پھر سلیم نے آگے بڑھ کر گود میں لے لیا۔

"آپ اس کے کان میں اذان دے دیں پھر اسے شہد چٹائیں گے۔" خالدہ نے کہا تو سلیم نے اثبات میں سر ہلایا۔

"ہونہہ۔" اس نے کہا پھر اس نے اپنا منہ بچے کے دائیں کان کے قریب کر کے اذان دی تھی اور اسے وہ منظر یاد آ گیا تھا جب کافی سال پہلے اس نے یونس بٹ کے بیٹے احتشام کے کان میں اذان دی تھی جب سے اسے احتشام کے انتقال کی خبر ملی تھی اسے بار بار احتشام کا خیال آ رہا تھا اس وقت بھی جب وہ اپنے بیٹے کے کان میں اذان دے رہا تھا اس کی آنکھوں میں آنسو تیر رہے تھے۔

"اس کا نام ہم فرقان رکھیں گے، فرقان سلیم۔" سلیم احمد نے خالدہ کی طرف دیکھتے ہوئے کہا اور خالدہ نے اثبات میں سر ہلایا یہ بات وہ فرمان کی پیدائش سے بہت پہلے سے جانتی تھی کہ اس کے شوہر کو فرقان نام پسند ہے اور اس کی خواہش ہے کہ اللہ جب اسے بیٹا دے گا تو وہ اس کا نام فرقان رکھے گا۔ خالدہ اور سلیم کی پہلے سے دو بیٹیاں تھیں عائشہ اور زینب اب فرقان کا نمبر تیسرا تھا۔



زریں قمر اردو ادب کی ایک کہنہ مشق فنکار اور شاعرہ ہیں ہمارے قارئین ایک عرصے سے ان کی تحریریں مختلف اخبارات اور رسائل میں پڑھتے چلے آ رہے ہیں اور انہیں سراہتے بھی ہیں آج نئے افق کے صفحات میں ہم زریں قمر صاحبہ کا جو پہلو آپ کے سامنے اجاگر کر رہے ہیں وہ بحیثیت شاعرہ کا ہے وہ کراچی میں پیدا ہوئیں ابتدائی تعلیم سے لے کر یونیورسٹی تک کراچی ہی میں تعلیم حاصل کی اور صحافت میں ماسٹرز کی ڈگری حاصل کی۔ انہوں نے اپنی پہلی نظم "خوں اگر امن کی سرخی ہے تو کچھ زیادہ نہیں۔" 1965ء میں لکھی جس وقت وہ چھٹی کلاس کی طالبہ تھیں اور بھارت سے جنگ ہو رہی تھی اس وقت کے سربراہ فیلڈ مارشل محمد ایوب خان نے اپنی ولولہ انگیز تقریروں سے قوم میں ایک نئی روح پھونک دی تھی اور پوری قوم ایک سیسہ پلائی ہوئی دیوار کی طرح فوج کے شانہ بشانہ کھڑی ہو گئی تھی ہر پاکستانی کی طرح زریں قمر کے دل میں بھی حب الوطنی کا جذبہ کارفرما تھا کم عمری کے باعث زیادہ کچھ تو نہیں کر سکتی تھیں لیکن انہوں نے اپنے جذبات کا اظہار اس نظم میں کیا تھا جو ساحر لدھیانوی کے ایک مصرعے سے متاثر ہو کر لکھی تھی اور یہ نظم روزنامہ "امن" کراچی میں شائع ہوئی تھی۔

تیسرے دن اسپتال سے خالدہ رخصت ہو کر گھر آ گئی تھی۔ سلیم اپنی بیٹیوں کو بھی اپنے والدین کے گھر سے واپس لے آیا تھا جنھیں اسپتال جاتے وقت وہ ان کے پاس چھوڑ گیا تھا اس کی والدہ بہت ضعیف اور بیمار ہونے کی وجہ سے خالدہ کے ساتھ اسپتال نہیں جا سکی تھیں

''اوہ، امی ہمیں اللہ تعالیٰ نے کتنا اچھا بھائی دیا ہے۔'' عائشہ جو سات سال کی تھی خوشی سے بولی۔

''یہ میرا ہے۔'' چھوٹی زینب جو پانچ سال کی تھی جلدی سے بولی۔

''بھئی یہ سب کا ہے۔ خالدہ نے دونوں بہنوں سے سمجھوتہ کرانے کے انداز میں کہا وہ جانتی تھی کہ اس کی چھوٹی بیٹی زینب ہر چیز پر اپنا حق جتانے کی طرح فرمان پر بھی حق جتانے لگی اور پھر عائشہ کو اسے ہاتھ بھی نہیں لگانے دے گی۔

''جی امی۔'' زینب نے فرمانبرداری سے کہا۔

اسپتال سے گھر آنے کے تین چار دن کے بعد سلیم نے خالدہ کو احتشام کے بارے میں بتا دیا تھا جب خالدہ کو احتشام کی موت کے بارے میں علم ہوا تو وہ بہت روئی تھی۔

''اس کی موت کیسے ہوئی؟'' اس نے سلیم احمد سے پوچھا۔

''تم جانتی ہو کشمیری اپنی آزادی کی جدوجہد میں بڑھ چڑھ کر حصہ لے رہے ہیں۔ احتشام نے بھی جدوجہد آزادی کی ایک تنظیم کو جوائن کر لیا تھا وہ اکثر جلسے جلوسوں میں بھی شرکت کرتا تھا۔ 16 اپریل 2015ء کو اس نے مظفر آباد میں حریت لیڈر مسرت عالم کے جلسے میں شرکت کی تھی جلسے میں پاکستانی پرچم بھی لہرائے گئے اور پاکستان کے حق میں اور انڈیا کے خلاف نعرے لگائے گئے اس موقع پر بھارتی فوجیوں نے عوام پر اندھا دھند فائرنگ کر دی اس کے نتیجے میں کئی لوگ مارے گئے اور بہت سے شدید زخمی ہوئے مرنے والوں میں ایک احتشام بھی تھا۔'' سلیم احمد نے کہا اور پھر چپ ہو گیا خالدہ آہستہ آہستہ سسکیاں لے رہی تھی۔

''جب کشمیری بچہ پیدا ہوتا ہے تو بات سمجھ لی جاتی ہے کہ اسے اپنے وطن کی آزادی کی جدوجہد میں حصہ لینا ہے اور اگر ضرورت پڑے تو جان بھی دینی ہے وہ شہید ہوا ہے۔'' خالدہ نے روتے ہوئے کہا۔

''میں یونس بھائی سے ملنے جاؤں گی، آپ مجھے ان کے پاس لے چلیں۔'' خالدہ نے سلیم سے التجا کی۔

''نہیں خالدہ ابھی تمہاری حالت بھی ٹھیک نہیں ہے اور وہاں کے حالات بھی بہتر نہیں ہیں تم جانتی ہو یونس بھائی تو سرینگر میں رہتے ہیں احتشام تو جلسے میں شرکت کے لیے مظفر آباد تک گیا تھا۔ سرینگر میں حالات زیادہ خراب ہیں لیکن تمہاری بجائے میں یونس سے ملنے جاؤں گا۔'' سلیم نے اسے سمجھایا۔

''یونس بھائی کا کیا حال ہوگا۔ وہ غم سے نڈھال ہوں گے۔'' خالدہ نے روتے ہوئے کہا۔

''جو اللہ کی مرضی ہوتی ہے ہوتا وہی ہے احتشام کی قسمت میں اسی طرح جانا لکھا تھا اللہ تعالیٰ اس کی فیملی کو صبر جمیل عطا کرے میں چند روز ہی میں سرینگر جا کر یونس سے ملوں گا تم فکر مت کرو۔'' سلیم نے اسے پھر دلاسہ دیا۔

پھر سلیم نے جلد از جلد سرینگر جانے کے انتظامات مکمل کیے تھے اور 2 مئی کو سرینگر پہنچ گیا تھا اسٹیشن پر ایک جم غفیر جمع تھا لوگوں کے ہاتھوں میں پاکستانی اور کشمیری پرچم تھے حریت لیڈر علی شاہ گیلانی تقریر کر رہے تھے اور لوگ پاکستان کے حق میں نعرے لگا رہے تھے جلوس کے اطراف میں بھارتی پولیس قطار در قطار کھڑی تھی اور کچھ فاصلے پر مسلح فوج بھی موجود تھے جن کے ہاتھوں میں گنیں تھیں۔

''خیریت ہے یہ جلوس کس سلسلے میں نکالا گیا ہے۔'' سلیم نے ایک شخص سے پوچھا جو اس جلوس میں موجود تھا اور اس کے ہاتھ میں کشمیری پرچم لہرا رہا تھا۔

''یہ امن ریلی ہے یہ علی شاہ گیلانی اور مسرت عالم نے مل کر نکالی ہے۔'' اس شخص نے اپنے حریت لیڈرز کے نام لیتے ہوئے کہا۔

سلیم نے اس کی بات کا جواب نہیں دیا تھا اور آٹو اسٹینڈ کی طرف بڑھ گیا تھا وہاں سے آٹو لے کر وہ یونس بٹ کے گھر کی طرف روانہ ہو گیا تھا راستے میں جگہ جگہ لوگوں کی بھیڑ لگی ہوئی تھی اور ہر کوئی بہت جوش میں نظر آ رہا تھا کچھ ہی دیر میں وہ یونس بٹ کے گھر پہنچ گیا وہ اس کا منتظر ہی تھا کیونکہ سلیم نے اسے اپنے آنے کے بارے میں پہلے ہی بتا دیا تھا۔

''کافی عرصے بعد تمہیں دیکھ رہا ہوں۔'' سلیم نے

یونس کے گلے ملتے ہوئے کہا۔
''اللہ کا شکر ہے...... میں تو سمجھتا تھا کہ شاید اب ملاقات نہ ہو۔'' یونس نے اداسی سے کہا۔
''کیوں تم ایسا کیوں سوچتے تھے۔''
''یہاں کے حالات ہی ایسے ہیں دیکھا تم نے میرا جوان بیٹا۔'' یونس نے سسکی لی۔
''صبر کرو یونس۔'' سلیم نے اس کا کاندھا تھپکا
''ایک نہ ایک دن تمہاری جدوجہد رنگ لائے گی ابھی میں اسٹیشن سے آ رہا ہوں وہاں بہت بڑا جلسہ ہو رہا ہے شاید وہاں سے وہ لوگ ریلی نکال رہے ہیں۔'' سلیم نے کہا۔
''ہاں آج امن ریلی نکالی جا رہی ہے۔ یہ 16 اپریل کو شہید ہونے والوں کے لیے ہے۔ ان کی یاد میں نکالی جا رہی ہے۔'' یونس نے بتایا۔
''طاہرہ اور بچے کیسے ہیں؟'' سلیم نے پوچھا۔
''آؤ اندر آؤ خود ہی مل لو۔'' یونس نے اسے گھر میں لے جاتے ہوئے کہا۔
ڈرائنگ روم میں طاہرہ بیٹھی ٹی وی دیکھ رہی تھی اس میں بھی ریلی کے مناظر دکھائے جا رہے تھے طاہرہ کی آنکھوں میں آنسو تھے وہ اس طاہرہ سے بہت مختلف تھی جسے وہ یونیورسٹی سے جانتا تھا۔
''تم تو بالکل بدل گئیں طاہرہ۔'' سلیم نے صوفے پر بیٹھتے ہوئے کہا۔
''کب تک نہیں بدلوں گی، شادی کو بیس سال ہو گئے ہیں۔'' طاہرہ نے جواب دیا۔
''میں جب پہلے سرینگر آیا تھا۔'' سلیم نے بات کا آغاز کرتے ہوئے کہا۔
''پہلے نہیں...... بہت پہلے سلیم...... تم تو ایسے کہہ رہے ہو کہ چند سال پہلے آئے تھے بھئی تم خالدہ سے شادی کرنے آئے تھے کتنے سال ہو گئے؟'' یونس نے یاد دلایا۔
''تقریباً آٹھ سال......!'' سلیم نے ہنستے ہوئے کہا ''لیکن اس وقت حالات اتنے خراب نہیں تھے۔''
''ہاں پچھلے آٹھ، نو سالوں میں حالات بہت خراب ہو گئے ہیں اب کسی مسلمان کی عزت محفوظ نہیں۔'' یونس نے افسوس سے کہا۔
''احترام کا کیا حال ہے۔؟'' سلیم احمد نے اداسی سے

کہا اسے اپنا بیٹا احتشام یاد آ گیا تھا۔
"مجھے احتشام کی موت کا بہت افسوس ہے، خالدہ بھی بہت رو رہی تھی وہ میرے ساتھ آنا چاہتی تھی لیکن اس کو میں نے سمجھا دیا ابھی چند دن پہلے خدا نے ہمیں بیٹے سے نوازا ہے اس کی حالت آنے والی نہیں تھی پھر یہاں کے حالات بھی۔" سلیم نے بات ادھوری چھوڑ دی۔
"ہاں...... تم نے اچھا کیا...... یہاں تو کچھ پتا نہیں ہوتا کسی بھی وقت چاہے دن ہو یا رات فوجی دندناتے ہوئے تلاشی کے بہانے گھروں میں گھس جاتے ہیں اور لڑکیوں اور عورتوں کو ظلم کا نشانہ بناتے ہیں اور مردوں کو پکڑ کر لے جاتے ہیں وہ کسی بھی مسلمان پر کوئی بھی بھیانک الزام لگا کر اسے چاہیں تو گولی مار دیتے ہیں یا جیل میں ڈال دیتے ہیں جن پر کوئی مقدمہ بھی نہیں چلتا اور وہ برسوں جیلوں میں سڑتے رہتے ہیں۔" سلیم احمد نے بتایا۔
کچھ ہی دیر میں طاہرہ کی بیٹیاں ڈرائنگ روم میں داخل ہوئیں ایک کے ہاتھ میں ٹرے تھی جس میں چائے کا سامان رکھا تھا۔
"انکل السلام علیکم۔" دونوں نے باری باری سلام کیا۔
"خوش رہو۔" سلیم احمد نے جواب دیا۔
"یہ بڑی والی شہناز ہے اور چھوٹی مہناز۔" طاہرہ نے بتایا۔
"ہاں میں نام تو جانتا ہوں لیکن یہ پتا نہیں تھا کہ شہناز کون ہے اور مہناز کون ہے دونوں ماشاء اللہ بہت خوب صورت بچیاں ہیں۔" سلیم نے تعریف کی۔
"ہاں دعا کریں کہ ان کا نصیب بھی اچھا ہو۔" طاہرہ نے کہا۔
"ضرور...... ضرور...... کیوں نہیں...... ان شاء اللہ تعالیٰ نصیب بھی اچھا ہوگا۔" سلیم نے کہا اور پھر یونس کی طرف مڑا۔
"احتشام کے ساتھ کیا ہوا تھا؟" اس نے پوچھا۔
"وہی جو یہاں ہر دوسرے مسلمان کے ساتھ ہو رہا ہے۔" یونس نے اداسی سے کہا۔ اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے تھے۔
"وہ ایک احتجاجی ریلی میں شرکت کرنے گیا تھا اس نے کچھ عرصہ پہلے ہی ایک جدوجہد آزادی تنظیم جوائن کی تھی بس وہ ریلیوں اور احتجاجی جلوسوں میں شرکت کرتا تھا لیکن جیسا جلسہ آج ہوا ہے اس روز بھی ایسا ہی جلسہ ہوا تھا جس کے اختتام پر بھارتی فوجیوں نے بے دریغ فائرنگ کردی تھی جس میں کئی لوگ مارے گئے انہیں میں سے ایک احتشام بھی تھا۔" یونس بٹ نے روتے ہوئے کہا۔
"مجھے افسوس ہے، لیکن وہ جدوجہد آزادی کا مجاہد تھا وہ شہیدوں میں شامل ہوگا تم صبر کرو...... اللہ تعالیٰ مسلمانوں کی قربانیاں رائیگاں نہیں جانے دے گا۔ تم دیکھنا ایک نہ ایک دن یہ قربانیاں رنگ لائیں گی اور جموں کشمیر آزاد ہوگا...... ایسا ضرور ہوگا۔" سلیم نے کہا۔
"میں احتشام کی قبر پر جانا چاہتا ہوں تاکہ فاتحہ پڑھ سکوں۔" سلیم نے کہا۔
"ہاں ٹھیک ہے تم چائے پی لو...... پھر کچھ دیر میں چلتے ہیں۔" یونس نے کہا۔
چائے پینے کے بعد کچھ دیر سلیم شہناز اور مہناز سے باتیں کرتا رہا تھا اور پھر یونس کے ساتھ قبرستان چلا گیا تھا وہاں سے واپسی پر یونس اسے اپنے بھائی مونس کے گھر لے گیا تھا اس کی شادی ہوگئی تھی لیکن وہ اپنے والدین کے ساتھ ہی رہتا تھا سب ہی سلیم سے مل کر بہت خوش ہوئے تھے اور اس کی بڑی آؤ بھگت کی تھی آخر وہ ان کا داماد تھا کچھ دیر وہاں بیٹھنے کے بعد سلیم پھر آنے کا وعدہ کر کے یونس کے ساتھ واپس اس کے گھر آ گیا تھا۔
رات کے کھانے سے فارغ ہونے کے بعد گھر کے افراد ڈرائنگ روم میں جمع ہو گئے تھے اور ٹی وی پر آج کی خبریں دیکھنے میں مصروف ہو گئے تھے اس وقت تک احترام بھی ملازمت سے واپس گھر آ چکا تھا اور ڈرائنگ روم میں ہی موجود تھا۔
"انکل مجھے بھائی کے جانے کا بہت دکھ ہے، وہ میرے بھائی کے ساتھ ساتھ میرے دوست بھی تھے ہمیشہ مجھے گائیڈ کرتے تھے۔" احترام نے اداسی سے کہا۔
"میں جانتا ہوں احترام...... لیکن اب تمہیں احتشام کی جگہ لینا ہے اور کوشش کرنا ہے کہ اس کی کمی کو محسوس نہ ہونے دو۔" سلیم نے اسے سمجھاتے ہوئے کہا۔
"جی۔" احترام نے سعادت مندی سے کہا، اسی وقت ٹی وی پر نشر ہونے والا پروگرام روک دیا گیا اور ایک بریکنگ نیوز نشر ہونے لگی۔

''سری نگر، سارے شہر میں کرفیو لگا دیا گیا ہے، کوئی بھی فرد اگر گھر کے باہر سڑکوں پر نظر آیا تو گولی ماردی جائے گی، دہشت گردوں کی تلاش کے لیے گھر گھر تلاشی شروع کی گئی ہے۔''

''یہ کیا، ابھی تو ہم قبرستان سے آئے ہیں سب کچھ ٹھیک تھا۔'' سلیم نے حیرت سے کہا۔

''یہاں یہی ہوتا ہے کہیں کسی نے فوجیوں کو پتھر مار دیے ہوں گے یا تھوڑا بہت ہنگامہ کردیا ہوگا کیونکہ جلسے کے بعد ایسا ہوتا ہی ہے تو انہوں نے کرفیو لگا دیا انہیں تو بہانہ چاہیے۔'' یونس نے کہا۔

''اب پھر گھروں میں رہنے والے مسلمانوں کی بھی خیر نہیں ہوگی۔'' طاہرہ نے فکر مندی سے کہا ایک نظر اپنی بچیوں پر ڈالی جو پریشان نظر آرہی تھیں۔

''اللہ مالک ہے، وہی حفاظت کرنے والا ہے۔'' یونس نے کہا اس وقت ٹی وی پر آج کے جلسے کا حال دکھایا جانے لگا جس کے اختتام پر بھارتی فوج نے فائرنگ شروع کردی تھی نیوز اینکر بتارہی تھی کہ اس موقع پر 29 افراد گولی لگنے سے ہلاک ہوگئے اور بہت سے زخمی ہوگئے ہیں اسپتالوں میں ایمرجنسی نافذ کردی گئی ہے اور شہر میں کرفیو لگا دیا گیا ہے کیونکہ مشتعل ہجوم نے کئی مقامات پر سرکاری عمارتوں کو آگ لگادی ہے اور فوج پر پتھراؤ بھی کیا ہے لوگوں کو سختی سے گھروں میں رہنے کی ہدایت کی گئی ہے اور کرفیو لگا دیا گیا ہے۔

''ابو میں چلتا ہوں...... یہاں گھر میں قیدیوں کی طرح مرنے سے بہتر ہے کہ اپنے ساتھیوں کے ساتھ جدوجہد میں حصہ لوں...... میں تنظیم کے دفتر جارہا ہوں۔'' احترام نے کہا یونس نے اسے روکنے کی کوشش نہیں کی تھی۔

''تم نے اسے روکا نہیں؟'' سلیم نے پوچھا۔

''کوئی فائدہ نہیں وہ میرے روکنے سے رکے گا نہیں وہ بھی ٹھیک کہہ رہا ہے یہاں بند ہوکر مرنے سے بہتر ہے کہ باہر جدوجہد کرتا ہوا شہید ہو۔'' یونس نے کہا۔ ''ہمارے پاس دوسرا کوئی راستہ نہیں۔''

''میری دعا ہے کہ تمہاری جدوجہد رنگ لائے اور تم لوگ اپنے وطن کو آزاد کرواسکو۔'' سلیم نے دعا دی۔

''مجھے تو افسوس ہے کہ تم اس موقع پر آئے ہو سلیم جب ہماری جانیں بھی محفوظ نہیں اگر تم مجھے بتا کر آئے تو میں تمہیں ابھی آنے سے منع کردیتا۔'' یونس نے کہا۔

''نہیں یونس یہ بات نہیں...... موت برحق ہے اور جب آنا ہے تب ہی آئے گی ہم موت سے بھاگ نہیں سکتے۔ اس کا اللہ تعالیٰ نے وقت مقرر کردیا ہے اگر میری موت آگئی ہے تو مجھے کوئی نہیں بچا سکتا اور اگر نہیں آئی تو کوئی مار نہیں سکتا۔'' سلیم نے کہا۔

''ہاں...... تم بھی ٹھیک کہتے ہو۔'' یونس نے کہا۔

''ٹھہرو، میں گھر کے دروازے کھڑکیاں ٹھیک سے بند کردوں۔'' یونس نے کہا اور اپنی جگہ سے اٹھ گیا کچھ دیر بعد وہ گھر کی تمام کھڑکیاں دروازے بند کرکے پھر ڈرائنگ روم میں آگیا تھا پھر وہ لوگ کافی دیر تک وہاں بیٹھے باتیں کرتے رہے تھے کچھ دیر بعد ٹی وی پر پارلیمنٹ کا اجلاس دکھایا جانے لگا تھا جو ہنگامی طور پر آج ہی ہوا تھا اور جس میں انڈیا کے ہوم منسٹر پلانی چدم برم تقریر کررہے تھے۔

''مجھے افسوس کے ساتھ کہنا پڑ رہا ہے کہ سری نگر میں Mindless Violence ہو رہی ہے اور پبلک پراپرٹی کو تباہ کیا جارہا ہے ایسا کرنے سے کچھ حاصل نہیں ہوگا اس سے صرف لوگوں کی زندگیاں جائیں گی اور اس بات کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔''

''ہونہہ کیسی باتیں بتا رہا ہے جیسے اسے لوگوں کی جانوں کی بڑی پرواہے۔'' طاہرہ نے کہا۔

''پروا نہیں وہ دھمکی دے رہا ہے تاکہ جب وہ کارروائی کرکے لوگوں کو موت کے گھاٹ اتاریں تو کوئی یہ نہ کہے کہ ان کی غلطی ہے سب یہی کہیں کہ انہوں نے جوابی کارروائی کی ہے۔'' یونس نے تصحیح کی۔

''میں والدین سے درخواست کرتا ہوں کہ وہ اپنے بچوں کو ان مظاہروں میں شرکت کرنے سے روکیں۔'' پارلیمنٹ ممبر کہہ رہا تھا اور یونس کی فیملی کی توجہ پھر اس کی طرف ہوگئی تھی۔

''پچھلے دو ماہ میں بہت سے سیکورٹی اہلکار زخمی ہوئے ہیں فوج کو اس وقت تک کارروائی کی اجازت نہیں جب تک کہ کارروائی ناگزیر نہ ہو۔ فوج صرف اپنے دفاع میں فائر کھولتی ہے۔'' پارلیمنٹ ممبر نے پھر کہا۔

''سب جھوٹ، بکواس، انہیں شرم بھی نہیں آتی جب یہ بغیر اجازت کے اور بغیر اطلاع دیے لوگوں کے گھروں میں گھستے ہیں اور ان پر ظلم کرتے ہیں۔'' طاہرہ نے کہا۔

پھر وہ سب کافی رات تک ڈرائنگ روم میں بیٹھے باتیں

کرتے رہے تھے۔ تقریباً رات بارہ بجے کے قریب طاہرہ بچیوں کے ساتھ اپنے کمرے میں سونے چلی گئی تھی احترام پہلے ہی اپنے تنظیمی دفتر جاچکا تھا پھر یونس بھی سلیم کے ساتھ ڈرائنگ روم میں ہی لیٹ گیا تھا وہ دونوں کافی دیر لیٹے موجودہ حالات پر بات کرتے رہے تھے پھر انہیں نیند آ گئی تھی۔

چند گھنٹے بعد سلیم کی آنکھ ایک بے ہنگم شور سے کھلی تھی ابھی وہ سمجھ بھی نہیں پایا تھا کہ کیا معاملہ ہے کہ اچانک بھاری جوتوں کی آواز ڈرائنگ روم کے باہر سنائی دی تھی اور پھر چند فوجی ہاتھوں میں گنیں لیے کمرے میں داخل ہوئے تھے سلیم حیران تھا یونس نے سارے دروازے اور کھڑکیاں مضبوطی سے بند کیے تھے پھر یہ فوجی کہاں سے آ گئے اسی وقت گھر کے دوسرے حصے سے طاہرہ اور بچیوں کے چیخنے کی آوازیں آئی تھیں اور اس کے قریب لیٹا ہوا یونس نیند سے جاگ گیا تھا پھر وہ تیزی سے باہر کی طرف بھاگا تھا لیکن ایک فوجی نے آگے بڑھ کر اسے دبوچ لیا تھا۔

''ٹھہرو سرکار کدھر بھاگ رہے ہو؟'' اس فوجی نے طنزیہ لہجے میں کہا تھا اور یونس خود کو چھڑانے کی کوشش کر رہا تھا۔

''یہ دوسرا کون ہے، یہ اس کا بیٹا تو نہیں۔'' ایک دوسرے فوجی نے کہا اور سلیم کو اندازہ ہوا کہ انہیں گھر کے افراد کا بھی علم تھا۔

''اوئے...... تیرا بیٹا کہاں ہے؟'' ایک اور فوجی نے گن کی نال سلیم کی کمر میں چبھوتے ہوئے کہا۔ اب طاہرہ اور بچیوں کی آوازیں آنا بند ہوگئی تھیں۔

''وہ گھر میں نہیں ہے۔'' سلیم نے یونس کی جگہ جواب دیا۔

''اوئے...... یہ کون ہے؟''

''یہ میرا بہنوئی ہے۔'' سلیم نے جواب دیا۔

''یہاں کیا کر رہا ہے۔''

''یہ پاکستان سے آیا ہے۔ مجھ سے ملنے۔''

''اوہو...... پاکستانی جاسوس ہے۔'' فوجی نے چہک کر کہا۔ ''اوئے یہ پاکستانی جاسوس ہے اسے پکڑو...... یہی لوگ یہاں ہنگامے کراتے ہیں۔'' یہ کہتے ہیں وہ فوجی یونس کی طرف بڑھا اور اسے دبوچ لیا۔

''ارے بھئی میں جاسوس نہیں ہوں...... میں اس کا بہنوئی ہوں۔'' سلیم نے وضاحت کی۔

''وہ تو لگ پتا جائے گا سرکار کہ تم کون ہو۔'' ایک فوجی نے مضحکہ خیز انداز میں کہا۔

پھر وہ یونس اور سلیم کو گھسیٹتے ہوئے گھر سے باہر لے گئے تھے باہر گلی میں بھی عجیب منظر تھا فوجی مختلف گھروں میں گھس رہے تھے اور کئی افراد کو پکڑ کر گاڑیوں میں بٹھا رہے تھے ساتھ ہی ساتھ گالیوں سے بھی نواز رہے تھے۔

''تم لوگوں کو چین نہیں ہے نا اب چھترول ہوگی تو سیدھے ہوں گے۔'' ایک فوجی نے کہا نعرہ مارنے کے انداز میں کہا۔

عورتیں گھروں سے نکل آئی تھیں اور اپنا سر اور سینے پیٹ رہی تھیں۔

''تمہیں خدا غارت کرے۔''

''ظالموں باز آ جاؤ...... تم پر خدا کا قہر نازل ہوگا۔''

''ہمارے بچوں کو چھوڑ دو...... یہ بے قصور ہیں۔''

''رحم کرو ظالمو...... رحم کرو۔''

''ہائے میرا بیٹا...... میں برباد ہوگئی...... کوئی انہیں روکو۔'' مختلف سمتوں سے مختلف آوازیں آ رہی تھیں فوجی چیختی ہوئی عورتوں کو گنوں کے بٹوں سے مار مار کر پیچھے دھکیل رہے تھے جو اپنے گھر کے مردوں کو چھڑانے کی کوشش کر رہی تھیں سلیم کو طاہرہ اور اس کی بچیاں اس مجمع میں نظر نہیں آئیں فوجیوں نے سلیم اور یونس کو الگ الگ گاڑیوں میں بٹھا دیا تھا اور کچھ ہی دیر بعد گاڑیاں وہاں سے روانہ ہوگئی تھیں۔

سلیم کو جس جیل میں ڈالا گیا تھا وہ ایک چھوٹی سی جیل تھیں اور یوں لگتا تھا کہ اس پر مزید چارجز لگائے جائیں گے کیونکہ اس سے جس قسم کے سوالات کیے گئے تھے اس سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ اسے کوئی خطرناک پاکستانی جاسوس ثابت کر کے رہیں گے سلیم کو اندازہ نہیں تھا یونس کے ساتھ کیا ہوا اور ان بھارتی فوجیں نے یونس کو کہاں رکھا لیکن اسے یہ امید تھی کہ اگر یونس کی بیوی طاہرہ کسی طرح گھر سے نکلنے میں کامیاب ہوگئی ہوگی تو اس نے اس واقعے کی اطلاع پاکستان میں خالدہ کو ضرور دی ہوگی لیکن سلیم کو یہاں سے اپنا بچ کر نکل جانا ناممکن لگ رہا تھا وہ کئی دن تک فوجیوں کے مختلف بے سروپا سوالوں کا جواب دیتا رہا تھا وہ اس پر تشدد بھی کر رہے تھے کہ کس طرح وہ قبول لے کہ وہ پاکستانی جاسوس ہے لیکن سلیم یہ حماقت نہیں کرنا چاہتا تھا اگر وہ تکلیف سے گھبرا کر یہ جھوٹا الزام قبول کر لیتا

تو اس کا انجام بہت بھیانک ہو سکتا تھا۔
سلیم چھ ماہ تک ان بھارتیوں کی قید میں رہا اس عرصے میں خالدہ نے پاکستان میں بہت سے سرکاری افسروں سے ملاقات کی اور ان سے درخواست کی کہ وہ سلیم کو واپس پاکستان لانے میں اس کی مدد کریں پاکستان سے اس سلسلے میں کارروائیاں کی جاتی رہیں سلیم کے مختلف ڈاکومینٹس کی کاپیاں بھارتی حکومت کو فراہم کی گئیں اور اسلام آباد میں بھارتی سفارتخانے سے مستقل رابطہ رکھا گیا تھا چنانچہ چھ ماہ کے عرصے کے بعد خالدہ کو کامیابی نصیب ہوئی اور سلیم واپس پاکستان آ گیا۔
''میں تو سمجھتی تھی کہ آپ کو اب نہیں دیکھ سکوں گی۔'' خالدہ نے روتے ہوئے کہا۔ سلیم بہت کمزور ہو گیا تھا اس کی آنکھوں کے گرد سیاہ حلقے پڑ گئے تھے۔
''خدا کا شکر ہے کہ اس نے مجھے واپس تم لوگوں کے پاس بھیج دیا ورنہ امید تو مجھے بھی نہیں تھی۔'' سلیم نے کہا اس کی بیٹیاں دوڑ کر اس سے لپٹ گئی تھیں۔
''ابو ہم آپ کو بہت یاد کرتے تھے...... اب آپ نہیں جائیے گا۔'' اس کی بیٹی شہناز نے کہا۔
''ہاں...... نہیں جائیں گے...... چلو ابو کو آرام کرنے دو...... بعد میں بات کریں گے۔'' خالدہ نے بچیوں کو سمجھایا۔
''آپ فریش ہو جائیں میں کھانا لگاتی ہوں...... باتیں کرنے کو تو بہت باتیں ہیں وہ تو کرتے ہی رہیں گے۔'' خالدہ نے کہا تو سلیم اثبات میں سر ہلا کر اپنے کمرے میں چلا گیا اور خالدہ اس کے لیے کھانا تیار کرنے میں مصروف ہو گئی۔
پھر کھانے کی میز پر اس کی بات تفصیل سے سلیم سے ہوئی تھی اور سلیم نے اسے اپنے سرینگر کے روز و شب کی ساری داستان سنائی تھی۔
''وہاں حالات بہت خراب ہیں، کوئی مسلمان محفوظ نہیں...... کسی بھی شخص پر کوئی بھی الزام لگا کر اسے پکڑ کر جیل میں ڈال دیا جاتا ہے۔ قصور صرف یہ ہے کہ وہ آزادی چاہتے ہیں۔'' سلیم نے کہا۔
''ابھی تک یونس بھائی کے بارے میں بھی کوئی اطلاع نہیں آئی۔'' طاہرہ نے سلیم کو بتایا۔
''کیا تمہاری بات خالدہ سے ہوئی۔''
''ہاں اکثر ہوتی ہے۔'' طاہرہ نے جواب دیا۔
''مجھے اور سلیم کو فوجی پکڑ کر لے گئے تھے ہمیں پتا نہیں کہ خالدہ اور بچیوں کے ساتھ کیا ہوا بس ایک لمحے کو ان کی چیخیں سنی تھیں۔''
''خالدہ مجھے بتا رہی تھی کہ جب بھارتی فوجی گھر میں داخل ہوئے تو بچیاں چیخی تھیں وہ چھت کے راستے آئے تھے اور صحن میں کودے تھے بچیاں چیخیں تو خالدہ نے انہیں چپ کرا دیا اور خاموشی سے پچھلے دروازے سے گھر سے نکل کر مونس کے گھر چلی گئی تھی جو اگلے محلے میں ہے اس طرح وہ بچ گئی تھی بچیاں بھی اس کے ساتھ ہی تھیں۔''
''اب وہ کہاں ہے؟'' سلیم نے پوچھا۔
''وہ اپنے گھر میں ہی ہے وہ دوسرے دن واپس آئی تھی تو محلے والوں سے اسے پتا چلا تھا کہ تمہیں اور یونس کو فوجی پکڑ کر لے گئے ہیں تب ہی اس نے فون پر مجھے اطلاع دی تھی اور میں تب سے ہی تمہاری رہائی کے لیے کوشش کر رہی تھی۔'' طاہرہ نے کہا۔
''مجھے اندازہ ہے کہ تمہیں کتنی مشکلات کا سامنا کرنا پڑا ہوگا کیونکہ یہ بھارتی درندے کسی صورت پاکستانیوں اور مسلمانوں کو کوئی رعایت دینے کو تیار نہیں ہوتے۔'' سلیم نے کہا۔
''اور احترام اس کی کوئی اطلاع ہے؟'' سلیم نے پوچھا۔
''ہاں وہ اب آزادی کی جدوجہد کی تنظیم میں اور زیادہ باقاعدگی سے کام کرنے لگا ہے اور اس کے خیال میں بس یہی ایک راستہ ہے جس سے انہیں بھارتی سامراج سے نجات مل سکتی ہے۔'' طاہرہ نے بتایا۔
''اللہ مسلمانوں پر رحم کرے۔'' سلیم نے دعا کی۔
''میں کل کسی وقت طاہرہ سے آپ کی بات کرواؤں گی وہ بھی آپ کے لیے بہت پریشان ہے بھارتیوں نے ابھی تک یونس بھائی کو بھی چھوڑا ہے پتا نہیں وہ کس حال میں ہوں گے۔'' خالدہ نے کہا۔
''ہاں میں بھی طاہرہ سے بات کروں گا میں اس کے گھر گیا تو زیادہ بات کرنے کا موقع بھی نہیں ملا قات ہی کو پھر وہ حادثہ ہو گیا کہ فوجی ہمیں پکڑ کر لے گئے اور پھر اب تک طاہرہ اور ان کی بچیوں کے بارے میں کوئی اطلاع مجھے نہیں تھی۔'' سلیم نے کہا۔
پھر دوسرے دن خالدہ نے سلیم کی بات طاہرہ سے

کرائی تھی طاہرہ زاروقطار رو رہی تھی۔
''سلیم میں تو برباد ہوگئی۔ پہلے میرا بڑا بیٹا اس دنیا سے چلا گیا اور بھارتی درندوں کی بھینٹ چڑھ گیا اب یونس ان کی قید میں ہیں اور احترام بھی گھر سے چلا گیا ہے اب ہم گھر میں ماں بیٹیاں رہ گئی ہیں۔'' طاہرہ نے کہا۔
''اللہ پر بھروسہ رکھو طاہرہ، ان شاء اللہ حالات ٹھیک ہو جائیں گے۔''
''ہاں سب یہی کہتی ہیں لیکن اس لڑائی کو ساٹھ سال سے بھی زیادہ ہو چکے ہیں ہماری قسمت کا فیصلہ نہیں ہوتا۔'' طاہرہ نے کہا۔
''ہوگا اللہ کرے گا تو جلد ہوگا، دیکھو پاکستان کی حکومت بھی جموں و کشمیر کے عوام کے لیے برسر پیکار ہے اب تک انڈیا سے تین جنگیں ہو چکی ہیں کشمیر میں مجاہدین بھی لڑ رہے ہیں امید پر دنیا قائم ہے تم پریشان ہو ہر رات کی ایک سحر ہوتی ہے۔'' سلیم نے کہا اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ طاہرہ کو کیسے تسلی دے۔
''یہ بتاؤ اب وہاں کے حالات کیسے ہیں؟''
''ویسے ہی جیسے آپ چھوڑ کر گئے تھے، آئے دن ہنگامے، جلسے، جلوس اور پھر فوجیوں کی مار دھاڑ اب روز کا معمول ہے۔'' طاہرہ نے بتایا۔
''اچھا تم اپنا خیال رکھنا اور حالات سے باخبر رکھنا۔'' سلیم نے بات ختم کرتے ہوئے کہا حالانکہ وہ جانتا تھا کہ اتنی دور بیٹھ کر وہ طاہرہ یا اس کے بچوں کے لیے کچھ بھی نہیں کر سکتا تھا لیکن وہ اس کی ڈھارس بڑھانا چاہتا تھا وہ جانتا تھا کہ جب انسان مایوس ہو جائے تو پھر وہ کسی مشکل کا مقابلہ نہیں کر سکتا لیکن اگر اس میں جوش و ولولہ ہو جینے کی لگن ہو اور سامنے کوئی زندگی کا مقصد ہو تو وہ جی جان سے مقابلہ کرتا ہے اور حالات کو اپنے حق میں موڑ لیتا ہے اسی لیے وہ نہیں چاہتا تھا کہ طاہرہ کی امید ٹوٹے۔
پھر تقریباً ایک ماہ تک ان لوگوں کی طاہرہ سے بات نہیں ہوئی تھی وہ اس کے لیے فکرمند ہو ہی رہے تھے کہ اچانک ایک دوپہر کو اس کا فون آ گیا۔
''سلیم...... میں بہت خوف زدہ ہوں، انہوں نے یونس کو چھوڑ دیا ہے۔'' طاہرہ نے اسے بتایا۔
''یہ تو خوشی کی بات ہے، تم خوفزدہ کیوں ہو؟'' سلیم نے استفسار کیا۔
''انہوں نے اسے بہت مشکل سے چھوڑا ہے انہوں نے اسے چھوڑنے کی ایک بھاری رقم لی ہے۔'' طاہرہ نے کہا۔
''کیا یونس گھر پر ہے، میری اس سے بات کراؤ'' سلیم نے کہا تو طاہرہ نے فون کا ریسیور یونس کو دے دیا۔
''ہیلو۔'' یونس نے کہا تو اس کی آواز بہت نحیف سی محسوس ہوئی جسے سلیم نے بھی نوٹ کر لیا۔
''تمہاری آواز؟ ذرا زور سے بولو۔'' سلیم نے کہا۔
''ہیلو کیا اب میری آواز آ رہی ہے؟'' یونس نے پوچھا۔
''ہاں آ تو رہی ہے لیکن بہت کمزور لگ رہی ہے...... تمہاری طبیعت تو ٹھیک ہے؟'' سلیم نے فکرمندی سے کہا۔
''ہاں ٹھیک ہے...... دراصل میں کمزور ہو گیا ہوں، جیل میں بھارتی درندوں نے میرے ساتھ جو بدسلوک کیا وہ جانوروں سے بھی بدتر تھا انہوں نے میرے جسم کے کسی حصہ کو سلامت نہیں چھوڑا میں سیدھا ہو کر چل بھی نہیں سکتا۔'' یونس نے کراہنے والے انداز میں کیا۔
''اوہ، مجھے اندازہ تھا کیونکہ لوگ بتاتے ہیں کہ ان کی قید سے کوئی بھی مسلمان یا تو زندہ نہیں نکلتا اور اگر نکلتا بھی ہے تو اس کی صحت کا ستیاناس ہو جاتا ہے۔ شکر کرو کہ تمہیں ان لوگوں نے چھوڑ دیا ہے میں تمہارے لیے بہت پریشان تھا۔'' سلیم نے بتایا۔
''تمہیں پتا ہے سلیم جب میں گھر پر نہیں تھا تو ایک بار اور بھی وہ وحشی درندے گھر میں گھسے تھے اور طاہرہ کے شادی کے سارے قیمتی زیورات لے گئے تھے جو اب اس نے بیٹیوں کے لیے رکھے ہوئے تھے۔'' یونس نے بتایا۔
''یونس تم ایسا کرو کہ گھر بدل دو...... کسی اور علاقے میں چلے جاؤ۔'' سلیم نے اسے مشورہ دیا۔
''کوئی فائدہ نہیں ہے...... وہ ہمیں ڈھونڈ لیں گے اگر کسی کو وہ ایک بار پکڑ لیں تو چھوڑتے نہیں اور اگر چھوڑ دیں تو اس پر سخت نظر رکھی جاتی ہے اس کی نقل و حرکت نوٹ کی جاتی ہے اور انہیں بار بار تنگ کیا جاتا ہے۔'' یونس نے بتایا۔
''پھر تم تو بہت مشکل میں ہو اس مسئلے کا کوئی تو حل ہوگا؟'' سلیم نے کہا۔
''ہاں دو حل ہیں ایک تو ہماری موت یا پھر کشمیر کی آزادی فی الحال تو ہمیں موت ہی نظر آ رہی ہے۔'' یونس

نے دکھی انداز میں کہا۔
''اللہ سے اچھی امید رکھو یونس سب ٹھیک ہوجائے گا۔'' سلیم نے تسلی دی۔
''لگتا تو نہیں کہ ٹھیک ہوگا وہ بار بار آتے ہیں اور اب احترام کے بارے میں پوچھتے ہیں ہمیں خود معلوم نہیں کہ وہ کہاں ہے، وہ کبھی کبھی ملنے آتا ہے لیکن یہ نہیں بتاتا کہ اس کا ٹھکانہ کہاں ہے ہمارا اس سے کوئی رابطہ نہیں ہوتا ہم اسے کسی بات سے باخبر نہیں کرسکتے کیا والدین کے لیے یہ بات کسی عذاب سے کم ہے کہ اس کی اولاد زندہ ہو ایک ہی شہر میں ہو اور وہ اس سے مل بھی نہ سکیں پچھلی بار بھی جب وہ آئے تھے تو انہوں نے مجھ پر تشدد کیا کہ میں احترام کے بارے میں کچھ بتاؤں لیکن مجھے کچھ معلوم نہیں تھا اور اگر معلوم ہوتا بھی تو بھلا سوچو کہ میں اپنے بیٹے کے بارے میں انہیں کیسے انفارمیشن دیتا۔'' یونس نے بتایا تو سلیم کو احساس ہوا کہ یونس کی فیملی بہت خطرے میں ہے یونس کے کہنے کے مطابق وہ اب احترام کے پیچھے پڑ گئے ہیں اس کا بڑا بیٹا احتشام پہلے ہی شہید ہوچکا ہے۔
''یونس کچھ بھی ہو ہمت مت ہارنا تمہیں اپنے بچوں کے لیے مضبوط بن کر رہنا ہے۔'' سلیم نے کہا۔
اس کال کے بعد سلیم کی پھر کافی عرصے تک یونس سے کوئی بات نہیں ہوئی اس نے خود بھی کال کرنے کی کوشش کی لیکن رابطہ نہیں ہوسکا۔''
پھر تقریباً ایک ماہ بعد طاہرہ کی کال آئی تھی اس وقت خالدہ کچن میں تھی اور سلیم نے فون ریسیو کیا تھا۔
''اوہ، سلیم بہت برے حالات ہیں۔'' وہ سرگوشی میں بات کررہی تھی۔ لو جی ہمارے مکان کی چھت پر چڑھے ہوئے ہیں یہاں انہوں نے مورچہ بنایا ہوا ہے اور یہاں سے سڑک کی طرف موجود مجمع پر فائرنگ کررہے ہیں میں کیا کروں میری دونوں بیٹیاں بہت سہمی ہوئی ہیں۔'' طاہرہ نے بتایا وہ خود بھی بہت خوفزدہ لگ رہی تھی۔
''کیا نیچے گھر میں بھی کوئی ہے؟'' سلیم نے پوچھا۔
''نہیں وہ باہر سے پائپ کے ذریعے ہی اوپر چڑھے ہیں نیچے کوئی نہیں آیا ہے۔'' طاہرہ نے بتایا۔
''تو تم پچھلے دروازے سے نکل کر احترام کے گھر یا کسی بھی پڑوسی کے گھر چلی جاؤ جو محفوظ ہو۔'' سلیم نے سمجھایا۔

''لیکن میں ایسا نہیں کر سکتی یونس کو اکیلا کیسے چھوڑ جاؤں؟'' طاہرہ نے بے چارگی سے کہا۔
''اس کو بھی ساتھ لے کر جاؤ۔'' سلیم نے کہا۔
''وہ اب چل نہیں سکتا۔'' طاہرہ نے بتایا۔ ''جب بھارتی فوجیوں کی قید میں تھا تو انہوں نے اسے اتنا مارا تھا کہ وہ لہولہان ہو گیا تھا اور اس کی دونوں ٹانگیں توڑ دی تھیں وہ بیساکھیوں سے چلتا ہے اس نے مجھے یہ بات بتانے سے منع کیا تھا۔''
''اوہ میرے خدا۔'' سلیم نے دکھ سے کہا ''تم کوشش کرو کسی طرح اسے کہو کہ تمہارے اور بچیوں کے سہارے چلنے کی کوشش کرے۔''
''وہ نہیں مان رہا ہے کہتا ہے میں گھر چھوڑ کر کہیں نہیں جاؤں گا اگر میری موت آئی ہے تو ضروری نہیں کہ میں گھر سے کہیں پناہ لینے جاؤں اور مارا نہ جاؤں موت برحق ہے اس سے فرار نہیں ہے۔''
''تم اس سے میری بات کراؤ۔'' سلیم نے کہا۔
''یونس یہ کیا بچپنا کر رہے ہو اپنی زندگی بچانے کی کوشش کرو۔''
''کوئی فائدہ نہیں سلیم وہ ہمیں مار کے ہی دم لیں گے وہ ہمارے پیچھے پڑے ہیں۔'' یونس نے مایوسی سے کہا اسی لمحے بھاری بوٹوں کی آوازیں سنائی دی تھیں اور فون کال کا سلسلہ منقطع ہو گیا تھا سلیم کافی دیر اپنی جگہ ساکت کھڑا رہا تھا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا کرے اسے یقین تھا کہ اس نے بھاری بوٹوں کی جو آوازیں سنی تھیں وہ یقیناً فوجیوں کے جوتوں کی آوازیں تھیں بھارتی فوجیوں کے جوتوں کی جو درندوں کی طرح سفاک ہیں جنہیں کسی عورت، بچے یا بزرگ کا کوئی احساس نہیں ہے وہ خود کو بے بس محسوس کر رہا تھا اتنی دور سے وہ یونس کی اور اس کی فیملی کی کوئی مدد نہیں کر سکتا تھا اسی وقت طاہرہ کمرے میں داخل ہوئی اور سلیم کو اس حالت میں کھڑے دیکھ کر پریشان ہو گئی۔
''کیا ہوا؟ کس کا فون تھا۔'' خالدہ نے اس کے ہاتھ سے ریسیور لے کر کریڈل پر رکھتے ہوئے پوچھا۔
''میں یونس سے بات کر رہا تھا۔'' سلیم نے کرسی پر بیٹھتے ہوئے کہا اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ خالدہ کو کیسے بتائے کہ یونس پھر بھارتی فوجیوں کے گھیرے میں پھنسا ہے۔

''ہاں کیا کہہ رہے تھے یونس بھائی۔'' خالدہ نے پوچھا۔
''آج پھر وہاں حالات خراب ہو گئے ہیں طاہرہ نے فون کیا تھا پہلے میری اس سے بات ہوئی وہ ڈری ہوئی تھی اس نے بتایا کہ حریت لیڈر سید علی شاہ گیلانی نے پھر پر امن احتجاج کا مطالبہ کیا ہے اور علاقے کے نوجوان گلیوں میں نکل آئے ہیں وہ بھارتی فوجیوں پر پتھر برسا رہے ہیں اس بار ہنگامہ زیادہ بڑھ گیا ہے حالات خراب ہونے سے تخریب کاروں کا ایک گروہ خوب فائدہ اٹھا رہا ہے اور وہ لوگ دکانیں وغیرہ لوٹ رہے ہیں اور جگہ جگہ عمارتوں کو نذر آتش کر رہے ہیں حالات فوج کے ہاتھ سے نکل گئے ہیں اور فوجی گھروں میں گھس کر مردوں اور لڑکوں کو پکڑ کر لے جا رہے ہیں وہ اس وقت یونس کے مکان کی چھت پر موجود ہیں وہاں انہوں نے مورچہ بنایا ہوا ہے جہاں سے مشتعل لوگوں پر گولیاں چلا رہے ہیں۔''
''اوہ اب کہاں ہوگا، یونس بھائی سے بات ہوئی، انہوں نے کیا بتایا؟''
خالدہ نے گھبرائے ہوئے انداز میں پوچھا۔
''کچھ نہیں...... میں نے اسے سمجھایا تھا کہ تم لوگ گھر سے نکل جاؤ لیکن وہ ضدی ہے اس نے منع کر دیا طاہرہ نے اسی لیے فون کیا تھا کہ میں یونس کو سمجھاؤں وہ گھر سے نکل جائے اور کہیں اور چلا جائے اس سے پہلے کہ فوجی نیچے آئیں لیکن......!'' سلیم خاموش ہو گیا۔
''لیکن کیا؟'' خالدہ نے پوچھا۔
''لیکن وہ چل نہیں سکتا...... بھارتی فوجیوں کی قید میں ظلم کر کے اس کی ٹانگیں توڑ دی گئی تھیں یہ بات طاہرہ نے نہیں بتائی تھی کیونکہ یونس نے اسے ایسا کرنے سے منع کر دیا تھا وہ بیساکھیوں کی مدد سے چلتا ہے۔''
''اوہ...... پھر......!''
''میں بات کر ہی رہا تھا کہ یوں محسوس ہوا کہ فوجی چھت سے اتر کر نیچے آ گئے ہیں کیونکہ میں ان کے جوتوں کی آوازیں قریب آتے سنی تھیں اور پھر کال کٹ گئی۔'' سلیم نے بتایا تو خالدہ بھی سر پکڑ کر بیٹھ گئی۔
''اب یہ کیسے پتا چلے کہ ان کے ساتھ کیا ہوا ہے۔'' خالدہ نے کہا۔
''کچھ دیر میں خبروں ہی میں پتا چل سکے گا۔'' سلیم

نے کہا۔

''ہاں، خبروں میں تو چند جملوں میں شہر کے حالات بتا دیں گے یا کوئی چھوٹی سی ویڈیو دکھادیں گے شہر کی حالت کی لیکن یونس بھائی کے بارے میں کون بتائے۔'' خالدہ نے کہا۔اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے تھے۔

''صبر کے علاوہ کوئی چارہ نہیں ہے۔ ہم ابھی کال بھی نہیں کر سکتے کیونکہ بھارتی فوجی موجود ہیں اگر انہیں پتا چل گیا کہ میں کال کر رہا ہوں اور یہ پاکستان سے کی جارہی ہے تو وہ یونس کو مزید تشدد کا نشانہ بنائیں گے ہوسکتا ہے اسی لیے یونس نے بھی کال کاٹ دی ہو۔'' سلیم نے کہا۔

''ہاں آئیں پھر خبریں دیکھتے ہیں۔'' خالدہ نے کہا اور کمرے میں رکھائی وی آن کر دیا خبریں آنے میں چند لمحے باقی تھے۔

''میں چولہا بند کر کے آتی ہوں۔'' خالدہ نے کہا اور کچن میں چلی گئی پھر وہ جلد ہی واپس آ گئی تھی خبریں بھی شروع ہوگئی تھیں۔

''تازہ ترین اطلاعات کے مطابق کشمیر میں امن و امان کی صورت حال نہایت خراب ہوچکی ہے بھارتی سیکورٹی فورس کا عملہ جموں کشمیر کے لوگوں کو تشدد کا نشانہ بنا رہا ہے سارے شہر میں اجتماعی جلسے جلوس ہورہے ہیں اور ریلیاں نکالی جارہی ہیں اس مہینے میں یہ تیسرا واقعہ ہے جب بھارتی سیکورٹی فورس نے شہریوں کے خلاف سخت کارروائی کی ہے حریت رہنماؤں علی شاہ گیلانی اور مسرت عالم کو ایک بار پھر گرفتار کرلیا گیا ہے۔''

نیوز اینکر خبریں پڑھ رہا تھا اور خبروں کے دوران کشمیر میں ہونے والے ہنگاموں کے کلپ دکھائے جارہے تھے جن میں لوگ سراپا احتجاج تھے عورتیں گھروں سے باہر چیخ و پکار کررہی تھیں بھارتی سیکورٹی کا عملہ لوگوں پر فائرنگ کررہا تھا اور خالدہ کی آنکھوں سے آنسو رواں تھے اچانک سلیم نے ٹی وی بند کردیا۔

''کوئی فائدہ نہیں خالدہ، یوں ٹی وی دیکھنے سے ہم اس مسئلے کو حل تو نہیں کرسکتے اور تم رو رو کے ہلکان ہورہی ہو نہ ہی اس میں خاص طور سے یونس کی فیملی کے بارے میں بتایا جائے گا۔'' سلیم نے کہا وہ نہیں چاہتا تھا کہ خالدہ ٹی وی خبریں دیکھ دیکھ کر روتی رہے اور وہ بے بسی سے بیٹھا اسے

غزل

کرب سا کرب ہے ان یادوں کی پنہائی میں
کیوں چلے آئے مری جاگتی تنہائی میں
لوگ کہتے ہیں زخم دل کے ہرے ہوتے ہیں
مجھ کو اک گو نہ سکوں ملتا ہے پروائی میں
تجھ پہ جب اپنا سا ہونے کا گماں ہوتا ہے
درد کا چاند اتر آتا ہے انگنائی میں
ٹھہرے پانی میں بھنور بنتے ہیں مٹ جاتے ہیں
عمر بھر کون لہو روتا ہے رسوائی میں
ہم پہ تہمت ہے کہ ہم ان کو بھلا بیٹھے ہیں
پھر بھی خوش ہیں گزرتے لمحوں کی کٹھنائی میں

زرین قمر

دیکھتا رہے وہ خود کو بہت مجبور محسوس کررہا تھا۔

''دعا کرو کہ وہ لوگ خیریت سے رہیں ہم صرف ان کے لیے اس وقت دعا ہی کرسکتے ہیں۔'' سلیم نے کہا۔

''ہاں رونے سے بہتر تو اللہ سے دعا کرنا ہے۔'' خالدہ نے کہا اور نماز پڑھنے چلی گئی۔

تیسرے روز طاہرہ کا فون آیا تھا وہ زاروقطار رو رہی تھی۔

''سلیم انہوں نے یونس کو ماردیا، میرا یونس اس دنیا سے چلا گیا، آپ سن رہے ہیں نا؟ آپ کا دوست اور میرا شوہر وہ چلا گیا۔ وہ گھر میں گھس آئے تھے اور انہوں نے ٹیلی فون کا ریسیور اس کے ہاتھ سے چھین لیا تھا۔'' طاہرہ ہچکیاں لے رہی تھی۔

''طاہرہ...... طاہرہ...... سنو حوصلہ کرو...... تم ایسے روتی رہو گی تو میں کچھ بھی سمجھا نہیں سکوں گا۔'' سلیم نے کہا۔

''دیکھو...... میری بات سنو تمہاری بات پوری طرح سمجھ نہیں آرہی ہے تم پہلے رونا بند کرو۔'' سلیم نے دوسری بار اسے سمجھایا۔

''بس میں آپ کو یہ بتارہی ہوں کہ آخرکار انہوں نے یونس کو ماردیا۔'' طاہرہ نے بہ مشکل رونا ضبط کر کے کہا۔

''کوئی اور ہے گھر میں......؟'' سلیم نے پوچھا۔

''ہاں احترام ہے۔'' طاہرہ نے بتایا۔

''اس سے میری بات کراؤ۔'' سلیم نے کہا تو طاہرہ

نے ریسیور احترام کو دے دیا۔
''ہیلو انکل میں احترام بول رہا ہوں۔'' احترام نے بہت ٹھہری ہوئی آواز میں کہا۔
''احترام تم بتاؤ کیا ہوا تھا۔''
''انکل ابو آپ سے فون پر بات کر رہے تھے تو فوجی نیچے گھر میں آ گئے تھے اور کمرے میں آ کر انہوں نے ریسیور ابو کے ہاتھ سے لے لیا تھا لیکن ابو پہلے ہی کال کاٹ چکے تھے پھر فوجیوں نے ابو کو مارنا شروع کر دیا، امی چیختی ہوئی ان کی طرف لپکیں تا کہ انہیں بچا سکیں تو انہوں نے امی کو بھی گنوں کے بٹ مارنا شروع کر دیے تھے پھر وہ ابو کو گھسیٹتے ہوئے گھر سے باہر لے گئے تھے اور برابر کہہ رہے تھے کہ یہ ملک کا غدار ہے یہ پاکستانیوں سے ملا ہوا ہے۔ یہ پاکستان کا جاسوس ہے گھر میں امی اور میری بہنیں چیخیں مار مار کر رو رہی تھیں فوجیوں نے ہمارے گھر کا دروازہ باہر سے بند کر دیا تھا جب ہنگامہ رکا تھا تو کسی نے گھر کا دروازہ باہر سے کھولا تھا اور جب امی چیختی ہوئی باہر نکلیں تو محلے کے چوک پر پڑی چار لاشوں کو لوگ اٹھا رہے تھے۔ ان میں سے ایک لاش ابو کی تھی۔'' احترام اتنا کہہ کر خاموش ہو گیا۔
''تم کب آئے؟'' کچھ دیر بعد سلیم اتنا ہی بول سکا۔
''مجھے شہر میں ہنگامے کی اطلاع تو مل گئی تھی چنانچہ میں گھر والوں کی خیریت پتا کرنے دوسرے ہی دن یہاں آیا تھا تب مجھے ابو کے انتقال کی خبر ملی آج ان کا سوئم ہے۔''
''تم لوگ کہاں ہو، کیا اپنے ہی گھر میں ہو؟'' سلیم نے پوچھا۔
''جی ہاں لیکن مونس بھائی کی ساری فیملی بھی آئی ہوئی ہے وہ کہہ رہے تھے کہ آخری رسومات سے فارغ ہو کر ہم ان کے ساتھ ان کے گھر چلے جائیں جب تک کے حالات ٹھیک نہ ہو جائیں امی اور بہنیں وہیں رہیں۔'' احترام نے بتایا کچھ دیر دونوں طرف خاموشی رہی کچھ دیر بعد سلیم نے خاموشی کو توڑا۔
''احترام تم کیا سمجھتے ہو، کیا ان حالات میں تمہاری امی اور بہنوں کو تمہاری ضرورت نہیں، تمہیں ان کے ساتھ نہیں ہونا چاہیے؟'' سلیم نے اس سے پوچھا کیونکہ اس کے خیال میں ان حالات میں طاہرہ اور بچیوں کا اکیلا رہنا ٹھیک نہیں تھا۔
''آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں لیکن آپ ہی بتائیں کہ اگر میں اور مجھ جیسے دوسرے نوجوان صرف اپنی اپنی فیملی کی حفاظت کے لیے اپنے گھروں میں آ کر بیٹھ جائیں گے تو آزادی کی جدوجہد کون چلائے گا کسی بڑے مقصد کو حاصل کرنے کے لیے چھوٹی چھوٹی قربانیاں دینا پڑتی ہیں میں مجبور ہوں اس دھرتی کا بیٹا ہوں، میں نے اپنے ملک کو کافروں سے آزاد کرانے کا ارادہ کر لیا ہے اور میں اس مقصد سے پیچھے نہیں ہٹوں گا۔ ابو کی موت سے بھی میرے قدم نہیں لڑکھڑائے ہیں لیکن آپ یقین کریں کہ ہماری یہی قربانیاں ایک دن رنگ لائیں گی اور کشمیر آزاد ہو کر رہے گا۔'' احترام نے کہا اور سلیم کو احساس ہوا کہ احترام بالکل ٹھیک کہہ رہا ہے اگر باقی دنیا کی طرح خود کشمیر کے لوگ بھی بے حس ہو گئے جس طرح ساری دنیا بے حس ہے کہ وہ کشمیر پر ہونے والا ظلم دیکھتی ہے اور کچھ نہیں بولتی تو پھر کشمیر کا بھارتی چنگل سے آزادی حاصل کرنا ناممکن ہو جائے گا۔
''ہنگامہ ہوا تھا؟'' سلیم نے پوچھا۔
''احتجاجی ریلی کے بعد بھارتی فوجیوں کی فائرنگ سے لوگ اِدھر اُدھر بکھر گئے تو فوجی ان کے تعاقب میں کشمیر کے گلی کوچوں میں گھس گئے انہوں نے دھکے مار مار کر گھروں کے دروازے توڑ دیے اور گھروں میں سے بچوں اور نوجوانوں کو نکال نکال کر چوک پر جمع کر لیا وہ گھروں کے علاوہ دکانوں اور مسجدوں تک میں گھس گئے اور پھر انہوں نے مساجد میں موجود لوگوں کو بھی گریبانوں سے پکڑ کر باہر نکال لیا اور اس کارروائی میں کئی مقامات پر انہوں نے مسجدوں میں رکھے قرآن مجید کی بھی بے حرمتی کی کئی جگہ قرآنی نسخوں کو پھاڑنے کے بعد آگ لگا دی گئی۔''
''اوہ یہ بھارتی تو انتقام کی آگ میں اندھے ہو گئے ہیں۔'' سلیم نے کہا۔
''بس اس بات پر ہنگامہ مزید بڑھ گیا اور لوگ مزید جوش میں آ گئے پھر کسی کو اپنی جان کی پروا نہ رہی اور انہوں نے بھارتی فوجیوں پر پتھر برسانے شروع کر دیے اور یوں ہنگامہ بڑھتا چلا گیا جس کا انجام دو بھارتی سیکورٹی کے افراد کی موت اور آٹھ کشمیریوں کی موت پر ختم ہوا۔''
''اللہ رحم کرے ہم تو اتنی دور سے دعا ہی کر سکتے ہیں

اگر ممکن ہو تو تم طاہرہ اور بچیوں کو میرے پاس پاکستان بھیج دو۔'' سلیم نے کہا۔

''آپ جانتے ہیں ملنے کے لیے تو شاید چلے جائیں لیکن مستقل وہاں رہنے کے لیے تو شاید اجازت نہ ملے۔'' احترام نے کہا۔

''لیکن طاہرہ تو یہیں کی ہی باشندہ ہے وہ تو شادی ہو کر وہاں گئی تھی۔'' سلیم نے جرح کی۔

''ہاں لیکن میں جانتا ہوں امی بھی اس بات کے لیے تیار نہیں ہوں گی وہ بھی میری طرح ہی سوچتی ہیں کہ فرار ہو کر مقصد حاصل نہیں ہوتا ان کا کہنا ہے کہ اتنی قربانیاں دینے کے بعد کہ بڑے بھائی احتشام اور والد دونوں شہید ہوگئے ہیں اب اس مقصد سے پیچھے ہٹنا مناسب نہیں ہے اگر اب ہم لوگ یا کشمیر کی دوسری فیملیاں اس مقصد سے پیچھے ہٹے تو کشمیر کبھی بھی آزاد نہیں ہو سکے گا اور ساری قربانیاں رائیگاں چلی جائیں گی۔''

''اس کا مطلب؟'' سلیم نے پوچھا۔

''اس کا مطلب یہ ہے کہ میں ابو کی آخری رسومات ادا کر کے واپس سری نگر کے پہاڑی سلسلوں کے جنگلات میں چلا جاؤں گا اور اس جدوجہد کو جاری رکھوں گا جس طرح میرے اور دوسرے ساتھیوں کا فیصلہ ہے۔'' احترام نے پرجوش انداز میں کہا۔ اس کے بعد ان کی گفتگو ختم ہوگئی تھی اور سلیم نے ریسیور رکھ دیا تھا خالدہ اس کے قریب کھڑی سسکیوں سے رو رہی تھی سلیم نے اسے دلاسہ دیا اور ٹی وی آن کر دیا۔

''سرینگر میں حالات بہت تیزی سے بگڑ رہے ہیں رات بھر ہونے والے ہنگامے کے بعد لوگ بڑی تعداد میں بھارتی سیکیورٹی فورس کے کیمپ کے باہر جمع ہوگئے تھے نیوز ایجنسی کے مطابق ان کی تعداد تقریباً 5 ہزار تھی اور وہ بھرپور احتجاج کر رہے تھے جس پر بھارتی فوجیوں کی طرف سے ہجوم پر فائرنگ کر دی گئی جس میں کئی لوگ مارے گئے بھارتی ہوم منسٹر کے مطابق یہ سانحہ افسوس ناک ہے اور بھارتی سیکیورٹی فورس کے انچارج راجیو کرشن کا کہنا ہے کہ لوگ احتجاج کے دوران قابو سے باہر گئے تھے چنانچہ انہیں سیلف ڈیفنس میں فائر کرنا پڑا جبکہ بھارتی ہوم منسٹر مشی کمار شنو نے کہا ہے انسانی جانوں کے ضائع ہونے کا بہت افسوس ہے انہوں نے لوگوں سے پرسکون رہنے کی اپیل کی ہے اور بتایا ہے کہ حادثے کے سلسلے میں ایک انکوائری بٹھا دی گئی ہے۔''

''ہونہہ انکوائری۔'' طاہرہ نے نفرت سے کہا۔ ''ان کی انکوائری بھی ایسے ہی ہوتی ہے صرف لوگوں کا منہ بند کرنے کے لیے یہ الفاظ کہے جاتے ہیں اور اگر کوئی انکوائری کمیٹی بنائی بھی جاتی ہے تو اس کی کوئی رپورٹ کبھی سامنے نہیں آتی...... میں تو وہاں پلی بڑھی ہوں میں نے سب دیکھا ہے اور سہا ہے کوئی فائدہ نہیں ہے کوئی ہمارا ساتھ دینے والا نہیں ہے نہ یو این او اور نہ کوئی دوسرا ملک سب باتیں کرتے ہیں دن مناتے ہیں افسوس کرتے ہیں لیکن مسئلے کو حل کرنے کے لیے کوئی عملی قدم نہیں اٹھائے کچھ نہیں ہوسکتا۔ اتنے سال میں کچھ نہیں ہوا تو اب کیا ہوگا؟'' خالدہ کے لہجے میں مایوسی تھی۔

''نہیں خالدہ...... ضرور ہوگا...... کشمیر ضرور آزاد ہوگا کیونکہ اب اس کی نئی نسل جاگ گئی ہے اور اپنے آباؤاجداد کے مشن کو آگے لے کر بڑھنا چاہتی ہے تمہیں پتا ہے احترام نے مجھ سے کیا کہا؟'' سلیم نے کہا۔

''کیا کہا؟'' خالدہ نے پوچھا۔

''اس کا کہنا ہے کہ اب اس کی طرح کشمیر کے بہت سے مسلمان نوجوان کشمیر کی آزادی کی جدوجہد کا حصہ بن گئے ہیں انہیں باقاعدہ ٹریننگ دی جاتی ہے اور وہ سرینگر کے پہاڑوں پر موجود گھنے چنار کے جنگلات میں تربیت حاصل کر رہے ہیں عام دنیا اور عام لوگوں کی طرح چنار سو نہیں رہے چنار جاگ رہے ہیں اور ایک دن جدوجہد آزادی کی آگ وہاں سے نکلے گی اور سارے کشمیر کو اپنی لپیٹ میں لے کر سامراج کا خاتمہ کر دے گی کشمیر ضرور آزاد ہوگا کیونکہ چنار سلگ رہے ہیں۔'' سلیم کے لہجے میں جو یقین اور عزم تھا اس نے خالدہ کے چہرے پر امید کی کرن روشن کر دی تھی۔



عاقبت اندیش

ریاض بٹ

نئے افق کے سب سے زیادہ پڑھے جانے والے صفحات' ریاض بٹ کے قلم سے ماضی کے ایک پولیس انسپکٹر کو پیش آنے والے واقعات۔ اس دور کی روداد' جب نفرت اور محبت کے جذبات ملاوٹ سے پاک تھے۔

تھانہ ایک ایسی جگہ ہے جہاں ہر قسم کے انسان آتے ہیں یا لائے جاتے ہیں مجرم بھی لائے جاتے ہیں اور فریادی بھی آتے ہیں، وہ بھی ایک فریادی ہی بن کر آئی تھی۔

بڑی خوب صورت عورت تھی تیکھے تیکھے نقوش والی رنگ نہ زیادہ سانولا تھا اور نہ زیادہ گورا اگر میں شاعر ہوتا تو اس کے حسن پر غزل لکھ دیتا اور غزل میں یہ ثابت کر دیتا کہ حسن صرف گورے رنگ میں ہی نہیں ہوتا۔

لیکن میں ایک تھانیدار تھا۔ میں نے اس کو تھانیدارانہ نظروں سے دیکھنا تھا وہ میں نے دیکھا اور بغور اس کو دیکھتے ہوئے اس سے پوچھا۔

''وہ کس مقصد سے آئی ہے۔'' ایک بات کی میں وضاحت کردوں کہ خاتون فینسی برقع میں آئی تھی اور اس کے برقع پہننے کا انداز چیخ چیخ کر یہ اعلان کر رہا تھا۔

وہ اس کی عادی نہیں ہے صرف اپنے آپ کو چھپانے کے لیے اس کا سہارا لیا ہے۔ خاتون نے میرے سوال کے جواب میں بتایا کہ اسے جان کا خطرہ ہے۔ میں نے چونک کر اس کی طرف دیکھا اور بولا۔

''تمہیں کس سے جان کا خطرہ ہے۔''

''اپنے خاوند سے۔''

''کیا مطلب؟'' میں نے حیران نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔

''جی ہاں، تھانیدار صاحب میں یہی بات بتانے آپ کے پاس آئی ہوں کہ اگر میری موت غیر طبعی طریقے سے ہوتی ہے تو آپ میرے خاوند ذوالفقار کو گرفتار کرلیں۔''

میری حیرانگی بڑھتی جا رہی تھی خاتون ایسی باتیں کر رہی تھی جن کا کوئی سر پیر نہیں تھا۔ بغیر کسی وجہ یا ثبوت کے میں اس کی کوئی مدد نہیں کر سکتا تھا۔ میں نے اس کو لاکھ کریدا۔ لیکن وہ کوئی وجہ یا ثبوت نہ دے سکی۔ بس یہی کہتی رہی کہ اس کی چھٹی حس اسے یہاں تک لے آئی ہے۔

میں نے اسے جھوٹی تسلی دی کہ اس کے ساتھ اگر ایسا ویسا کچھ ہوا تو میں سب سے پہلے اس کے خاوند کی خبر لوں گا۔ وہ مطمئن ہو کر گئی یا نہیں مجھے اس بات پر سر کھپانے کی ضرورت نہیں تھی۔

میں نے جب اے ایس آئی شاہد سے ان باتوں کا تذکرہ کیا تو وہ ہنس کر بولا۔

''سر ہو سکتا ہے، خاتون کا کوئی نفسیاتی مسئلہ ہو یا پھر اس کے دماغ کا کوئی اسکرو ڈھیلا ہو۔''

''بھئی تم اس وقت موجود نہیں تھے اس لیے ایسے خیالات کا اظہار کر رہے ہو مجھے تو وہ ٹھیک ٹھاک لگتی ہے۔''

پھر ہمارے درمیان اس کے متعلق کوئی بات چیت نہیں ہوئی اور چند دن بعد میں اسے اور اس کے واہمے کو بھول گیا۔ لیکن ہونی ہو کر رہتی ہے۔

خاتون کے تھانے سے جانے کے پانچویں دن، ہمیں اطلاع ملی کہ ذوالفقار کا قتل ہو گیا ہے۔ آگے بڑھنے سے پہلے چند باتوں کا ذکر کردوں یہ باتیں یا معلومات خاتون سے سوال و جواب کے بعد مجھ تک پہنچی تھیں پہلے میری نظروں سے اس کی کوئی وقعت نہیں تھی اس لیے ذکر نہیں کیا تھا۔

خاتون نے بتایا تھا کہ اس کا خاوند ایک ہوٹل میں منیجر ہے اس نے ہوٹل کا نام بھی بتایا تھا غالباً تاج محل نام تھا بہر حال نام کی اتنی اہمیت نہیں ہے جتنی یہ بات بتانے کی ہے کہ یہ ہوٹل ہمارے تھانے کی حدود میں تھا اور اس میں کمرے بھی تھے ریلوے اسٹیشن قریب تھا اس لیے اکثر مسافر اس میں آ کر رہتے تھے ذوالفقار کو میں پہلی بار دیکھ رہا تھا وہ بھی ایک لاش کی صورت میں وہ زندگی میں ایک خوب صورت جوان ہوگا نین نقش اس کے بھی جاذب نظر ہوں گے لیکن اب تو اس کا چہرہ کورے لٹھے کی طرح سفید تھا



جیسے اس کی رگ رگ سے سارا خون بہہ گیا ہو اس کے سینے میں عین دل کے مقام پر ایک خنجر پیوست تھا جس کا صرف دستہ نظر آ رہا تھا۔

لاش ایک کمرے میں پڑی تھی۔ ضروری کاغذی کارروائی کے بعد میں نے لاش پوسٹ مارٹم کے لیے روانہ کر دی اس وقت میرے ساتھ کانسٹیبل وقار اور سپاہی نواز تھے۔

کانسٹیبل کو میں نے لاش کے ساتھ بھیج دیا اور کمرے کا باریک بینی سے معائنہ کرنے لگا۔

کمرے میں ایک ڈبل بیڈ تھا ایک میز تھی۔ سپاہی نواز میری مدد کر رہا تھا ڈبل بیڈ کی چادر خون سے تر تھی دو تکیے ساتھ ساتھ رکھے تھے میں نے ایک تکیہ اٹھایا تو اس کے نیچے سے مجھے ایک ایسا ثبوت مل گیا۔ جس سے ثابت ہوتا تھا کہ اس بیڈ پر کوئی عورت بھی موجود تھی۔ یہ ہرے رنگ کی چوڑیوں کے ٹکڑے تھے میں نے سپاہی نواز کو یہ ٹکڑے دیے اور اسے کہا کہ انہیں محفوظ کر لے میز پر شراب کی بوتل اور دو گلاس بھی تھے بوتل بالکل خالی تھی ایک گلاس اس بات کی گواہی دے رہا تھا کہ اس میں شراب ڈالی گئی تھی جبکہ دوسرا گلاس خالی اور بالکل صاف تھا۔

سپاہی نواز نے میرے حکم پر تمام چیزوں کے فوٹو بنا لیے تھے میں نے کمرہ سیل کروا دیا۔

اس دوران ہیڈ ویٹر اور کاؤنٹر کلرک ہمارے ساتھ ساتھ رہے تھے۔ اس ہوٹل کے مالک کا نام ملک شہزاد معلوم ہوا وہ آج کل کسی عرب ملک میں گیا ہوا تھا۔ ہوٹل کے علاوہ اس کا ایکسپورٹ امپورٹ کا کاروبار بھی تھا۔

ہوٹل اس نے ذوالفقار (مقتول) کے حوالے کیا ہوا تھا اس ہوٹل کی حد تک وہ سیاہ و سفید کا مالک تھا۔ وہ سیاہ کر رہا تھا یا سفید فی الحال ہمیں اس سے غرض نہیں تھی وہ قتل ہو چکا تھا اور ہمیں اس کے قاتل کی تلاش تھی دوران تفتیش سب کچھ سامنے آ جانا تھا۔

میں نے کاؤنٹر پر جا کر رہائشی کمروں کا رجسٹر چیک کیا۔ رات کو تقریباً دس کمرے لگے ہوئے تھے جن میں نو خالی ہو چکے تھے جبکہ ایک کمرے میں ابھی تک محمد نذر نامی بندہ مقیم تھا، جانے والے مسافروں کے میں نے نام اور پتے نوٹ کر لیے۔ ہیڈ ویٹر نے کاؤنٹر کے پیچھے ہی

ہمارے لیے کرسیاں رکھوادی تھیں۔
میں نے سب سے پہلے محمد نذر نامی بندے کو بلالیا۔ وہ بھرے بھرے چہرے والا ایک چالیس سالہ بندہ تھا۔ رنگ ذرا سانولا تھا آنکھیں سکیڑ کر باتیں کرتا تھا شاید نظر کمزور تھی یا یہ اس کی عادت تھی۔
''نذر صاحب آپ کہاں سے آئے ہیں اور اب کہاں جانے کا ارادہ ہے؟'' میں نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔
''تھانیدار صاحب میں گجرات سے آیا ہوا ہوں اور اب شام کی گاڑی سے واپس گجرات جا رہا ہوں۔'' اس نے سادہ سے لہجے میں جواب دیا۔
''ہوں۔'' میں نے ہنکارا ابھرا چند لمحے اس کے چہرے کی طرف بغور دیکھتا رہا پھر اس سے سوال کیا۔
''یہاں کس مقصد کے تحت آئے ہیں۔''
''تھانیدار صاحب میں کوئی چور ڈاکو یا قاتل نہیں ہوں آپ یہ سب سوال کس لیے کر رہے ہیں۔'' اس نے خشک لہجے میں استفسار کیا۔
اس وقت تک اسے قتل کے متعلق معلوم نہیں ہوا تھا (اگر اس کا اس قتل کے ساتھ کوئی تعلق نہیں تھا)
مجھے یہی بتایا گیا تھا کہ اسے سوتے سے جگایا گیا ہے۔
میں نے مناسب الفاظ میں اسے حالات سے آگاہ کر دیا۔
اس نے پہلے تو اپنی آنکھوں کو پھیلا لیا پھر انہیں سکیڑتے ہوئے گویا ہوا۔
''تھانیدار صاحب دراصل میں گجرات میں پنکھے بنانے والی ایک فیکٹری کا سیل منیجر ہوں میں یہاں ایک ہول سیل ڈیلر سے آرڈر اور پیسے لینے آیا ہوں رات ذرا دیر سے آیا تھا اس لیے ابھی تک پڑا سو رہا تھا یہ ہے ساری بات۔''
قارئین میں یہاں اس بات کی وضاحت ضروری سمجھتا ہوں کہ یہ کہانی ان دنوں کی ہے جب ابھی موبائل کا وجود نہیں تھا ٹیلیفون تھے۔ میں نے اس بات کو ذہن میں رکھتے ہوئے چالیس سالا نہ نذر سے سوال کیا۔
''نذر صاحب آپ کی باتیں میری سمجھ میں آ گئی ہیں لیکن ایک بات کی سمجھ نہیں آئی۔''
''وہ کون سی بات، تھانیدار صاحب۔''
''آرڈر کے متعلق تو ٹیلیفون پر بات چیت ہو جاتی ہے اور پیسے بھی ڈاکخانہ یا بینک کے تھرو بھیجے جا سکتے ہیں پھر آپ کو کیوں بھیجا گیا؟''
میں بال کی کھال اس لیے اتار رہا تھا کہ ہو سکتا تھا کوئی اشارہ مل جاتا۔ وہ مسکرایا پھر گویا ہوا۔
''بات دراصل یہ ہے کہ اس ڈیلر کے پاس تقریباً پچاس ہزار روپے پھنسا ہوا ہے۔''
پھر میرے پوچھنے پر اس نے ڈیلر کا نام بتایا جس کا ذکر مناسب نہیں لیکن میں نے پتا نوٹ کر لیا۔
دو تین اور سوال کر کے میں نے اسے رخصت کر دیا اور اسے تاکید کر دی کہ جب تک میں نہ کہوں وہ اس ہوٹل س کہیں نہ جائے پھر میں نے اپنا روئے سخن ہیڈ ویٹر اور کاؤنٹر کلرک کی طرف موڑا اور کاؤنٹر کلرک کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ اس کا نام آصف تھا۔
''ہاں تو آصف صاحب اب ذرا آپ میرے چند سوالوں کے جواب دیں۔''
''جی تھانیدار صاحب۔'' وہ پوری طرح میری طرف متوجہ ہوتے ہوئے بولا۔
''کیا آپ نے ذوالفقار (مقتول) کے گھر والوں کو اطلاع دے دی ہے۔''
''جناب سلیم اطلاع دینے گیا تھا لیکن ان کی کوٹھی پر تو تالا لگا ہوا ہے۔''
''کیا مطلب؟'' میں اچھل پڑا۔
''جناب بالکل یہی بات ہے جب سلیم (ویٹر) ان کی کوٹھی پر گیا تو کوٹھی کو مقفل پایا پڑوسیوں سے یہ بات پتا چلی کہ رات کو کوٹھی میں بتیاں چل رہی تھیں۔''
یہاں یہ بات بھی بتا دوں کہ لاش بھی سلیم ویٹر نے دریافت کی تھی۔
رات کو ذوالفقار (مقتول) نے ویٹر سلیم کو کہا تھا کہ صبح سات بجے کے قریب دو بندوں کا ناشتہ لے کر آ جانا۔ جب سلیم نے کمرے کے دروازے پر دستک دی تو کوئی جواب موصول نہیں ہوا اس نے دوبارہ یہی عمل دہرایا لیکن نتیجہ وہی ڈھاک کے تین پات نکلا۔
اس نے ویسے ہی دروازہ پر دباؤ ڈالا تو یہ محسوس کر کے حیران رہ گیا کہ وہ اندر سے نہیں ہے۔ اس طرح سلیم کی ملاقات لاش کے ساتھ ہو گئی۔ میں یہ بات سن کر چونک پڑا اور آدھے سر سے گنجے کاؤنٹر کلرک کی طرف بغور دیکھتے

ہوئے استفسار کیا۔
"کیا آپ کو علم ہے کہ رات مقتول کا مہمان کون تھا؟"
"بالکل نہیں جناب اس کے متعلق منیجر صاحب نے ہمیں کچھ نہیں بتایا تھا۔"
"کیا مطلب؟" میں نے اسے گھورا۔ "یہ کیسے ممکن ہے؟"
"جناب حقیقت یہی ہے جو میں نے بتائی ہے۔"
میں نے ہیڈ ویٹر کو کہا کہ سلیم کو بلا لائے اور دوبارہ آصف سے سوال کیا۔
"کیا اکثر منیجر (ذوالفقار) اس طرح اس کمرے میں رات گزارتا رہتا تھا۔"
"جی ہاں جناب ہفتے میں جمعرات اور ہفتے کی رات اس کمرے میں گزارتے تھے اور یہ تقریباً دو ماہ سے تھا آج اتوار تھا۔"
"اس کی کوئی خاص وجہ؟"
"جناب وہ ایک طرح سے اس ہوٹل کے مالک تھے ان سے وجہ پوچھنے کی جرات ہم میں نہیں تھی۔"
وہ ٹھیک کہہ رہا تھا اس کی زبانی یہ بھی پتا چلا کہ اس ہوٹل کا مالک ملک شہزاد مہینے میں ایک دو بار ہی ہوٹل میں آتا تھا۔
کچھ دیر کے بعد ہیڈ ویٹر نے آکر بتایا کہ سلیم کہیں نہیں مل رہا میں نے کاؤنٹر کلرک اور ہیڈ ویٹر کو گھورتے ہوئے کہا۔
"یہ کیا بات ہوئی وہ کچھ بتائے بغیر کہاں چلا گیا؟"
"جناب ہم خود حیران ہیں اس سے پہلے تو سلیم نے کبھی یہ حرکت نہیں کی تھی دونوں نے میرے تیور دیکھ کر کانپتے ہوئے کہا۔
مجھے غصہ آگیا تھا مقتول کی بیوی بھی غائب تھی اور اب یہ سلیم جو مقتول کا خاص ویٹر تھا وہ بھی منظر سے غائب تھا۔
میں نے دونوں کے چہروں کو دیکھ کر اندازہ لگایا کہ یہ سچ کہہ رہا ہے اور یہ واقعی لاعلم ہیں میں نے جلد ہی اپنے غصے پر قابو پالیا۔
اور ان سے مقتول کی کوٹھی کا پتا اور حدود رجہ معلوم کر کے نوٹ کرلیا۔
اس کے بعد میں نے باری باری ہوٹل کے باقی عملے سے سوال و جواب کیے لیکن کام کی کوئی بات معلوم نہ ہوسکی سوائے ایک بات کے کہ جمعرات اور ہفتے کی شب جس

کمرے میں مقتول رات گزارتا تھا اس تک سیڑھیوں کے ذریعے ایک راستہ عقبی گلی کی طرف سے بھی آتا تھا جو ریلوے لائن کے ساتھ تھی۔

اور وہ رات کے وقت تقریباً ویران ہی رہتی تھی۔

کہانی یہ بن رہی تھی کہ مقتول شاید عیاشی کے لیے ہفتے اور جمعرات کی رات اس کمرے میں گزارتا تھا۔

سرہانے کے نیچے سے برآمد ہونے والی چوڑیاں یہی کہانی سنا رہی تھیں بات کچھ اور بھی ہوسکتی تھی اس اسٹیج پر کوئی حتمی بات نہیں کہی جاسکتی تھی۔

جب ہم ہوٹل سے باہر آئے تو لوگ اِدھر اُدھر ٹولیوں کی شکل میں بات چیت کرتے نظر آئے۔

ہوٹل ویران ہوچکا تھا بہرحال اس طرح کے کاموں میں ایسا تو ہوتا ہے۔

نذر کو ہم نے پابند کردیا تھا اس کے علاوہ میں سختی سے عملے کو تاکید کرآیا تھا کہ جونہی سلیم آئے اسے تھانے بھیج دیا جائے۔

یہ بات بھی ممکن تھی کہ سلیم نے ہی خنجر ذوالفقار کے سینے میں اتارا ہو وہ شاید اس کا رازدار تھا اور رازداری بہت کچھ کراسکتی ہے۔

اِدھر تھانے میں اے ایس آئی شاہد تھانے کا انتظام و انصرام سنبھالے ہوئے تھا۔

اپنے کمرے میں پہنچ کر میں نے اسے بلالیا اور ساری صورت حال اس کے گوش گزار کردی ہمیں کافی دیر ہوٹل میں لگ گئی تھی میرا سر تفتیش کے سلسلے میں درد کرنے لگا تھا میں نے آفس بوائے کو بلاکر چائے لانے کا کہا۔

''سر آپ کے دریا کے پاس سے پیاسے واپس آگئے ہیں۔'' اے ایس آئی نے شاید سر درد کی طرف سے میرا دھیان بٹانے کے لیے خوشگوار لہجے میں کہا۔

میں اس کا اشارہ سمجھ گیا ظاہر ہے ہم ہوٹل سے واپس آئے تھے اور وہ ہوٹل کو دریا کہہ رہا تھا۔

''بھئی وہاں حالات ایسے تھے کہ ہم وہاں چائے نہیں پی سکتے تھے میں نے بھی لہجے کو خوشگوار بناتے ہوئے کہا۔

''سر، میں نے تو ویسے بات کہہ دی تھی تا کہ پھر......!''

چائے آنے تک ہمارے درمیان کوئی بات نہیں ہوئی تھی۔

چائے پی کر میرا جسم اور درد سر کچھ نارمل ہوا۔

''سر، اب کیا کرنا ہے۔ اے ایس آئی نے جیب سے رومال نکال کر منہ اور ہاتھ صاف کرتے ہوئے کہا کیونکہ چائے کے ساتھ بیکری بھی تھی۔

''تم اس طرح کرو۔'' میں نے اس کے چہرے کی طرف دیکھتے ہوئے ذرا توقف کیا پھر بولا۔

''سب سے پہلے اس بات کا کھوج لگاؤ کہ مقتول کی بیوی شمائلہ (موجودہ بیوی) کہاں چلی گئی؟''

''سر یہ تو میں کروں گا ہی لیکن وہ تو ایک دن تھانے میں یہ کہنے آئی تھی کہ اسے اپنے شوہر سے خطرہ ہے۔ اب اس کا شوہر قتل ہوچکا ہے اور وہ خود اچانک غائب ہوگئی ہے یہ کیا ماجرہ ہے۔''

''بھئی میں تو خود حیران ہوں کہ یہ سب کیا ہے؟''

بہرحال اے ایس آئی کے جانے کے بعد میں میز پر پڑے اس کام سے فارغ ہونے کے بعد میں نے سپاہی نواز کو بلالیا۔

پہلے ایک بات کا ذکر کرنا میں بھول گیا تھا وہ بات اب بتا دیتا ہوں شراب کی بوتل اور دونوں گلاس پیک کرا کر لیبارٹری ٹیسٹ کے لیے بھیج دیے تھے حالانکہ شراب کی بوتل بالکل خالی تھی۔ لیکن ہوسکتا تھا کوئی سراغ مل جاتا تفتیش میں ایک تنکا بھی بعض اوقات کارآمد ثابت ہوجاتا تھا۔

''نواز۔'' میں نے سپاہی نواز کو مخاطب کیا۔

''جی سر۔'' وہ اٹینشن ہوگیا۔

''تم سفید کپڑوں میں ہوٹل تاج محل جاؤ اور اِدھر اُدھر سے پوچھ گچھ کرو، شاید کوئی ایسا شخص مل جائے جو کوئی ایسی بات بتادے جو ہمارے لیے قاتل کو تلاش کرنے میں مددگار ثابت ہو۔''

اس دن اے ایس آئی نے مجھے جو رپورٹ دی، وہ اس طرح تھی اس میں چند باتیں مجھے ہوٹل میں معلوم ہوگئی تھیں۔

مقتول کی بیوی شمائلہ کی شادی چار سال پہلے مقتول کے نکاح میں آئی تھی ان کی ابھی تک کوئی اولاد نہیں تھی۔ کوٹھی میں یہ جوڑا چار نوکروں کے ساتھ رہتا تھا ایک نوکرانی اور نوکر ساتھ ہی رہتے تھے باقی دو شام سے پہلے اپنے گھروں کو چلے جاتے تھے۔ نوکر اور نوکرانی کی رہائشگاہ بھی معلوم ہوگئی تھی دونوں بہن بھائی تھے اور ایک ہی گھر میں رہتے تھے۔

شام کو میں سادہ کپڑوں میں سپاہی نواز کو ساتھ لے کر ان کے گھر پہنچ گیا۔ یہ دو کمروں پر مشتمل ایک چھوٹا سا گھر تھا جو

مکینوں کی غربت کی کہانی سنا رہا تھا ہم نے اپنا تعارف کرایا۔
نوکر کا نام رفیق اور اس کی بہن کا نام عارفہ معلوم ہوا۔ انہوں نے ہمیں ایک کمرے میں بٹھایا۔
رفیق کی عمر بیس بائیس سال ہوگی جبکہ عارفہ اس سے دو سال چھوٹی ہوگی، بہر حال ہم ان کی عمریں معلوم کرنے تو آئے نہیں تھے۔ جس کام کے لیے آئے تھے وہ میں نے شروع کر دیا۔
''رفیق تمہیں اپنے مالک کے قتل کے متعلق تو معلوم ہو ہی چکا ہوگا۔''
''جی ہاں تھانے دار صاحب آج جب ہم کوٹھی پر گئے تو یہ اندوہناک خبر ہماری منتظر تھی۔''
''وہ پڑھا لکھا لگتا تھا۔''
''تم کتنی جماعتیں پڑھے ہوئے ہو۔'' میں نے اس کو اپنے ساتھ بے تکلف کرنے کے لیے پوچھ لیا۔
''تھانیدار صاحب وہ ایک سرد آہ بھر کے بولا میں نے ابھی میٹرک کا امتحان دینا تھا کہ سب کچھ، سب خواہشیں ادھوری رہ گئیں، میں نے دیکھا کہ اس کی آنکھوں میں دل کا دکھ پانی بن کر آ گیا ہے لیکن اس نے کمال ضبط سے اپنے جذبات پر قابو پایا اور بات کو آگے بڑھاتے ہوئے بولا۔
اچانک والد صاحب پر فالج کا حملہ ہوا، وہ چارپائی کے ہو کر رہ گئے والدہ اس صدمے کی تاب نہ لاتے ہوئے چل بسیں والد صاحب ذوالفقار صاحب کے گھر باورچی کا کام کرتے تھے فالج کے حملے کے چند دن بعد والد صاحب بھی چل بسے۔
''ذوالفقار صاحب نے ہم دونوں کو نوکر رکھ لیا۔ انہیں باورچی اور ایک نوکر کی ضرورت تھی۔
باورچی خانے کا کام عارفہ کرتی ہے اور میں باہر کے کام کرتا ہوں یعنی سودا سلف لے آتا تھا۔
''عارفہ تمہاری مالکہ کیسی تھی؟'' میں نے اچانک عارفہ سے پوچھ لیا۔
وہ شاید خیالات میں کھوئی ہوئی تھی اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آیا۔ ان کا موڈ خراب ہی رہتا تھا میں نے ان کو بہت کم خوشگوار موڈ میں دیکھا تھا۔''
''میاں بیوی کے تعلقات کیسے تھے؟''
ہم شام سے پہلے گھر آ جاتے تھے صاحب بہت کم گھر میں ہوتے تھے لیکن جب بھی ہوتے تھے میں نے ان کے درمیان سرد مہری ہی دیکھی تھی۔
''ہوں۔'' میں نے ہنکارہ بھرا اور رفیق سے پوچھا۔
''باقی دو نوکروں کے متعلق کچھ بتاؤ۔
''تھانیدار صاحب ان میں ایک چوکیدار تھا جو کوٹھی کے گیٹ پر بیٹھا رہتا تھا جبکہ دوسرا ڈرائیور تھا۔
''میں نے سنا ہے وہ بھی وہیں رہتے تھے۔''
''آپ نے بالکل ٹھیک سنا ہے۔'' رفیق اور عارفہ نے یک زبان ہو کر کہا۔
''ٹھیک ہے۔'' میں نے اٹھتے ہوئے کہا پھر رفیق کی طرف دیکھتے ہوئے بولے۔ ''اگر کوئی اور بات ذہن میں آ جائے تو تھانے میں آ کر بتا دینا۔
جب ہم تھانے میں واپس آئے تو عشا کی اذانیں ہو رہی تھیں۔ میں نے اپنی میز پر پوسٹ مارٹم کی رپورٹ اور لیبارٹری رپورٹ دیکھی تو اسے پڑھنے لگا۔
پوسٹ مارٹم کی رپورٹ کے مطابق مقتول کی موت رات دو بجے اور تین بجے کے درمیان ہوئی تھی موت کے وقت اس کے معدے میں بے ہوشی کی دوا ملی شراب تھی، جس گلاس میں شراب ڈالی گئی تھی۔ اس کے متعلق رپورٹ سے بھی یہی بات ظاہر ہوئی تھی۔
رپورٹوں کو میں نے اپنی میز کی دراز میں رکھا اور آرام کرنے کوارٹر میں چلا گیا، لاش ابھی سرد خانے میں تھی اسپتال کی وجہ کا ذکر آگے آئے گا۔ دوسری صبح دھند نے ہر شے کو اپنی لپیٹ میں لیے ہوا تھا۔
یہ جنوری کے وسطی دن تھے سردی عروج پر تھی۔
ابھی مجھے بیٹھے ہوئے چند لمحے ہی ہوئے تھے کہ مجھے اطلاع دی گئی کہ ایک بندہ مجھ سے ملنا چاہتا ہے میں نے اسے بلایا۔
جب وہ میرے سامنے آیا تو میں نے بغور اس کا جائزہ لیا۔ وہ پچاسی کے پیٹے میں ہوگا نکلتا ہوا قد، گورا رنگ اور کلین شیو تھا۔ اس نے مجھ سے ہاتھ ملاتے ہوئے کہا۔
''تھانیدار صاحب میرا نام شہزاد ہے اور میں ہوٹل تاج محل کا مالک ہوں۔''
''اوہ، تشریف رکھیے جناب آپ کا غائبانہ تعارف تو ہو چکا تھا۔ میں نے اسے بیٹھنے کا اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

وہ بیٹھ گیا اور پریشان لہجے میں بولا یہ کیا ہو گیا تھانیدار صاحب ذوالفقار کو کس نے قتل کر دیا۔"

"شہزاد صاحب میں بھی یہی کھوج لگانے کی کوشش کر رہا ہوں کہ ذوالفقار کا قاتل کون ہے لیکن ذوالفقار کے متعلق کچھ پتا نہیں چل رہا کہ وہ کہاں کا رہنے والا ہے اس کے رشتے داروں کے متعلق میں اندھیرے میں ہوں بیوی (بیوہ) بھی غائب ہے اس کے آگے پیچھے کا بھی کچھ پتا نہیں چل رہا۔"

میں نے اب تک کے حالات اور معلومات اس کے سامنے رکھ دیں وہ دکھی لگتا تھا جیسے اس کا کوئی قریبی رشتے دار قتل ہو گیا ہو۔

اس نے چند لمحے میری باتوں پر غور کیا پھر سنجیدہ لہجے میں بولا۔

"میں آپ کو ساری باتیں بتاتا ہوں پہلے آپ بتائیں کہ لاش کہاں ہے یعنی اس کا پوسٹ مارٹم ہو چکا ہے یا نہیں۔

"لاش اسپتال کے سرد خانے میں ہے اور اس کی وجہ آپ پر آشکار ہو چکی ہو گی۔

"بالکل تھانیدار صاحب آپ کو مقتول کے کسی قریبی رشتے دار کی تلاش ہے، میں ہی اس کا سب کچھ ہوں میرے خیال میں جب تک میں پوری کہانی نہیں سناؤں گا بات آپ کے پلے نہیں پڑے گی پھر اس نے اپنی دانست میں ایک عجیب و غریب کہانی سنا دی۔

میں اور ذوالفقار عجیب و غریب حالات میں ملے تھے۔ دراصل ایک رات میں کہیں سے آ رہا تھا میری جیب میں کافی بڑی رقم تھی شاید دو رہزن میری تاک میں تھے مجھے کافی دیر ہو چکی تھی کچھ دنوں سے میری گاڑی خراب تھی میں پیدل ہی آ رہا تھا کہ ایک قدرے ویران جگہ پر مجھے دو رہزنوں نے گھیر لیا اور ایک نے خنجر جبکہ دوسرے نے ریوالور نکال لیا۔ ریوالور والے نے جو ایک بڑی مونچھوں والا سیاہ رنگ کا بندہ تھا بولا۔

"جو کچھ جیب میں ہے نکال دو، ورنہ۔" اس نے ریوالور والے ہاتھ کو خطرناک انداز میں جنبش دیتے ہوئے فقرہ ادھورا چھوڑ دیا۔

میں اس اچانک افتاد سے گھبرا گیا اور سوچا انہیں مال دے دینا چاہیے ورنہ جان بھی جائے گی اور...... خیر ابھی میں جیب میں ہاتھ ڈالنے ہی لگا تھا کہ ایک بندہ برق رفتاری سے کسی طرف سے آیا اور اس نے ریوالور والے کی کمر پر ایک زوردار لات رسید کر دی وہ منہ کے بل گر پڑا اجنبی نے چیتے کی طرح چھلانگ لگا کر ریوالور اٹھا لیا جب تک خنجر بردار کے پلے کچھ پڑتا اجنبی ریوالور تانے اس کے سامنے کھڑا تھا اور خونخوار لہجے میں کہہ رہا تھا۔

خنجر پھینک دو، ورنہ میں کھوپڑی میں سوراخ کرنے کے لیے گنتی بھی نہیں گنوں گا۔

اس نے خنجر پھینک دیا میں نے آگے بڑھ کر خنجر اٹھا لیا مجھ میں حوصلہ آ گیا تھا۔

اب جب ہم نے گرے ہوئے آدمی کو دیکھا تو اس کا چہرہ خون سے تر تھا اس کا ماتھا پھٹ گیا تھا۔

قصہ مختصر یہ کہ ہم نے دونوں کو پولیس کے حوالے کر دیا اب وہ کوئی غلط حرکت یا مزاحمت کے متعلق سوچ بھی نہیں سکتے تھے۔

کیونکہ بازی پلٹ چکی تھی اور ہتھیار اب ہمارے پاس تھے۔

اس قصے سے فارغ ہونے کے بعد میں نے اپنے محسن کا نام پوچھا تھانیدار صاحب وہ یہی ذوالفقار تھا اس نے بتایا کہ وہ گھر سے بھاگا ہوا ہے۔ دراصل دولت اور جائیداد انسان کی دشمن ہے۔ یہ خون کو سفید کر دیتی ہے۔ اس نے بتایا کہ اس کے ماں باپ فوت ہو چکے ہیں وہ اکیلا ہی دنیا میں آیا تھا چچا اور چچی نے اسے پالا پوسا تھا اور اس پر ظلم کرتے تھے اس نے کسی نہ کسی طرح میٹرک کر لیا وہ آگے بھی پڑھنا چاہتا تھا لیکن چچا اور چچی کی نظریں جائیداد پر تھیں یہ ایک گاؤں تھا اور یہاں جس کی لاٹھی اس کی بھینس والی بات تھی وہ نہیں چاہتے تھے کہ ذوالفقار آگے پڑھے اور ہمارے لیے مصیبت بن جائے وہ اسے کھیتی باڑی میں اتنا الجھا دینا چاہتے تھے کہ اسے کچھ اور سوچنے کی مہلت ہی نہ ملے۔ ذوالفقار کے ساتھ ایک مسئلہ اور بھی تھا وہ چچا کی لڑکی شمائلہ سے محبت کرتا تھا اس نے یہ بات محسوس کر لی تھی کہ چچی کبھی بھی شمائلہ کی شادی اس کے ساتھ نہیں کریں گی۔ دراصل وہ لالچی تھیں انہیں پتا تھا کہ ذوالفقار کی جائیداد تو ویسے ہی ان کے پاس ہے، وہ شمائلہ کی شادی اپنے بھائی کے بیٹے فرقان سے کرنا چاہتی تھیں جو ایک مل مالک تھا۔

فرقان باہر سے تعلیم حاصل کر کے آیا تھا اور ذوالفقار نے اسے نہیں دیکھا تھا۔ بہر حال ذوالفقار نے جائیداد پر لعنت بھیج کر وہاں سے بھاگ آنے کا ارادہ کرلیا۔

وہ کچی عمر تھی اس عمر میں ویسے بھی انسان دماغ سے نہیں دل سے سوچتا ہے۔ ذوالفقار کو جائیداد سے زیادہ شمائلہ عزیز تھی کہتے ہیں محبت کی خاطر تخت وتاج ٹھکرائے گئے تھے جنگ و جدل ہوئی تھی خون بہا تھا بہر حال شمائلہ کی عمر بھی نادانی کی عمر تھی جب ذوالفقار نے اسے کہا کہ وہ یہاں سے جانا چاہتا ہے اور اسے بھی اس کا ساتھ دینا ہوگا تو چڑھتی جوانی نے اسے عشق کے سمندر میں بے خطر کود پڑنے کا مشورہ دے دیا ماں باپ کی عزت کو اس نے طاق پر رکھ دیا۔

بہر حال ذوالفقار اسے بھگا کر یہاں لے آیا۔ وہ یعنی شمائلہ گھر سے کچھ زیور اور پیسے بھی لے آئی تھی جس دن مذکورہ بالا حالات میں میری ملاقات ذوالفقار سے ہوئی تھی اس نے بتایا کہ انہیں اس شہر میں آئے ہوئے ابھی تین دن ہی ہوئے تھے وہ روزگار کی تلاش میں نکلا تھا یہاں پہنچ کر ملک شہزاد رکا۔ میز پر پڑے ہوئے جگ میں سے گلاس میں پانی ڈالا اور اسے پینے کے بعد سلسلہ کلام کو جوڑتے ہوئے بولا۔ میں نے ذوالفقار سے استفسار کیا۔

”کہ وہ شمائلہ کو کہاں چھوڑ آیا ہے۔“

اس نے بتایا کہ اس نے ایک مکان کرائے پر لیا ہے مالک مکان جو ایک بیوہ ہے وہ دوسرے حصے میں رہتی ہے۔“

”دیکھو، ذوالفقار تم ابھی چھوٹے ہو، تم نے بہت بڑی غلطی کی ہے تم اکیلے ہوتے تو کوئی بات نہیں تھی لیکن اب جوان جہان لڑکی بھی تمہارے ساتھ ہے یہ بات زیادہ دیر تک چھپی نہیں رہ سکتی۔ تم جلدی شمائلہ سے نکاح کرلو، ورنہ بہت بڑی مصیبت میں پھنس جاؤ گے، ٹھیک ہے جناب میں مالک مکان (بیوہ) کو اعتماد میں لیتا ہوں۔

”یہ تم ایک اور بے وقوفی کرو گے۔“ میں نے اسے زمانے کی اونچ نیچ سے آگاہ کرنا بہتر سمجھا۔

تھانے دار صاحب ایک تو وہ میرا محسن تھا دوسرے مجھے اندازہ ہوگیا تھا کہ وہ طارق بن زیاد کی طرح کشتیاں جلا کر آئے تھے وہ واپس بھی نہیں جا سکتے تھے اور بغیر نکاح کے زیادہ عرصے رہ بھی نہیں سکتے تھے تھانیدار صاحب آپ شاید اسے اچھا نہ سمجھیں لیکن میرے دل میں کوئی لالچ نہیں تھا میں نے ان کی مدد کرنے کا فیصلہ کرلیا۔ نہ صرف ان کا نکاح پڑھا دیا بلکہ اسے اپنی ایک کوٹھی بھی رہنے کے لیے دے دی۔ ان دنوں مجھے کسی ایماندار مخلص اور محنتی کاؤنٹر کلرک کی ضرورت تھی میں نے اسے ہوٹل میں رکھ لیا، وہ چند لمحے رکا پھر بولا۔

”تھانیدار صاحب وہ واقعی محنتی اور ایماندار ثابت ہوا، میں حیران ہوں اسے کون اور کیوں قتل کر گیا۔“

”یہ تو خیر ایک نہ ایک دن پتا چل جائے گا، آپ یہ بتائیں کہ آپ نے کب اسے منیجر بلکہ سیاہ وسفید کا مالک بنا دیا تھا۔

”اوہ، میں ذوالفقار کی کہانی سنانے میں کھو کر یہ بتانا تو بھول ہی گیا تھا کہ ایک سال پہلے میں نے اسے یہ ذمہ داری دے دی تھی۔ دراصل جیسا کہ آپ کے علم میں آ ہی چکا ہوگا کہ میرا ایکسپورٹ امپورٹ کا کاروبار بھی ہے۔“

”میں آپ کی ساری بات سمجھ گیا ہوں لیکن چند باتیں شاید آپ کے علم میں نہ ہوں، وہ میں بتا دیتا ہوں۔“

پھر میں نے اسے ذوالفقار کے متعلق یہ بتایا تھا کہ وہ جمعرات اور ہفتے کی رات ہوٹل کے کمرے میں گزارتا تھا اور آخری شب یعنی جس شب اس کا قتل ہوا تھا کمرے کی

غزل

میری طرف آنے سے پہلے مجھ کو تو بتلانا تھا
کیوں چپکے سے آئے تم کیا میرا گھر ویرانہ تھا
کیوں آئے تم میری طرف پھر قدموں کی بوجھل چاپ کے ساتھ
زخم کے ٹانکے توڑنے والے جا کر پھر نہ آنا تھا
صبح کی روشن دیوی مجھ کو لاکھ صدائیں دیتی رہی
لیکن تیری یاد کا عالم مہوش کیسے پھر آنا تھا
دنیا دیکھی تم کو دیکھا اور سہانے سپنے بھی
سپنا ٹوٹا دل بھی ٹوٹا پھر کس کو پچھتانا تھا
تم جو کبھی چاہو تو اپنا دل ہی نہیں جاں نذر کروں
شمع کی لو پر جلنے والا پروانہ پروانہ تھا
آپ نہیں کوئی اور ہی ہوگا راہ میں جس نے روک لیا
مجھ کو یوں لگتا ہے جیسے کچھ جانا پہچانا تھا
ایک تڑپتی آس سبھی زریں کے لیے سرمایہ ہے
جس کی خاطر ذرہ ذرہ روز ازل دیوانہ تھا

زرین قمر

حالت کے متعلق بھی بتا دیا ساتھ اس بات کا ذکر بھی کر دیا کہ کوٹھی پر تالا پڑا ہوا تھا۔ شمائلہ، چوکیدار، ڈرائیور اور ویٹر سلیم بھی غائب ہے۔

یہ سب بتا کر میں اندازہ لگانا چاہتا تھا کہ باہر سے واپس آ کر اسے کن باتوں کا پتا چلا ہے۔

اس نے بتایا کہ اسے سب پتا چل گیا ہے ویسے پہلے اسے ذوالفقار کی روٹین کا بالکل علم نہیں تھا۔ میں نے کچھ باتیں اس سے پوشیدہ رکھ لی تھیں۔ ویسے قارئین وہ باتیں آپ کے ذہن میں تو ہوں گی ہی......

اس کے بعد میں نے اسپتال کے سرد خانہ سے لاش منگوا کر اس کے حوالے کر دی تھی اس دوران اس نے ہوٹل سے مدد منگوالی تھی۔

اب میرے ذہن میں کچھ کھچڑی سی پکنی شروع ہو گئی تھی لیکن اس کھچڑی کو ابھی کافی مراحل سے گزرنا تھا۔

دو دن بعد میں اور کانسٹیبل وزیر ہوٹل پہنچ گئے۔ اس دوران میں نے محمد نذر کو اس کا ایڈریس نوٹ کرنے کے بعد جانے کی اجازت دے دی تھی ڈیلر نے اس کے بیان کی تصدیق کر دی تھی۔ ملک شہزاد ہوٹل میں موجود تھا وہ ہمیں ایک کمرے میں لے گیا اور ہماری خاطر تواضع کے متعلق ہدایات دینے لگا۔

لیکن میں نے سختی سے منع کر دیا اور بولا ملک صاحب یہ ان تکلفات کا وقت نہیں ہے آپ پہلے ذرا رجسٹر منگوادیں۔

چند لمحوں کے بعد رجسٹر میرے سامنے تھا میں نے قتل والی رات کا ریکارڈ دوبارہ چیک کیا لیکن جو کچھ میں دیکھنا چاہتا تھا وہ مجھے نہیں ملا۔

میں نے رجسٹر واپس کرتے ہوئے ملک شہزاد کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''شہزاد صاحب کیا یہ ممکن ہے کہ ہوٹل میں ٹھہرنے والے اپنا اتا پتا غلط لکھوائیں۔''

''جناب یہ ممکن تو ہے کیونکہ ہم زیادہ تحقیقات نہیں کرتے''

یہاں قارئین میں اس بات کی وضاحت کر دوں کہ وہ پرسکون دور تھا بم دھماکے، خودکش حملے اور دہشت گردی نہیں ہوتی تھی اس لیے ہوٹلوں میں کمرہ دیتے وقت زیادہ چھان بین نہیں کی جاتی تھی اب تو یہ عالم ہے کہ بغیر شناختی کارڈ کے کمرہ کرائے پر نہیں دیا جاتا اور چھان بین الگ کی جاتی ہے۔

''تھانیدار صاحب کیا آپ کو کوئی سراغ یا کلیو مل گیا ہے۔'' اچانک شہزاد کی آواز سے میں خیالات کی دنیا سے باہر آ گیا میرا ذہن بہت دور تک سوچ رہا تھا۔

''شہزاد صاحب ابھی میں خود واضح راستے کی طرف گامزن نہیں ہو سکا۔''

''اچھا باتوں میں یہ تو یاد ہی نہیں رہا کہ میں آپ کو بتاتا کہ سلیم واپس آ گیا ہے۔''

''سلیم واپس آ گیا ہے کیا مطلب۔'' میں نے اسے خشمگیں نگاہوں سے دیکھتے ہوئے کہا۔

دراصل وہ ڈر کی وجہ سے چھپ گیا تھا جونہی اسے یہ پتا چلا کہ میں آ گیا ہوں میرے پاس آ گیا اور ساری صورتحال سے مجھے آگاہ کر دیا تھانیدار صاحب وہ بے گناہ ہے اور بہت سہما اور خوف زدہ ہے۔

''آپ فوراً اسے بلائیں۔'' میں نے شہزاد کو آگے نہیں بولنے دیا۔

چند لمحوں کے بعد جو بندہ میرے سامنے لایا گیا اس کا رنگ گندمی، درمیانی مونچھیں اور گال پچکے ہوئے تھے۔ وہ باقاعدہ کانپ رہا تھا۔

میں نے اس کی حالت کے پیش نظر ذرا نرم لہجے میں اسے مخاطب کیا۔

''تم بھاگ کیوں گئے تھے؟''

''جناب میں ذرا چھپ گیا تھا مجھے پولیس سے بہت ڈر لگتا ہے۔''

''پولیس سے تو وہ ڈرتے ہیں جنہوں نے کوئی جرم کیا ہوتا ہے۔''

''میں جناب ذوالفقار صاحب کو مرے ہوئے دیکھ کر میں سوچنے لگا کہ پولیس مجھے ضرور پریشان کرے گی میں دراصل ملک صاحب کے انتظار میں تھا اگر آج آپ نہ آئے تو ملک صاحب مجھے آپ کے پاس تھانے میں لے جاتے میرے نرم رویے سے اب وہ کافی حد تک سنبھل گیا تھا۔ قارئین بات ذرا لمبی ہو جائے گی اس نے جو کچھ بتایا وہ میں اپنی زبان میں مختصراً عرض کر دیتا ہوں۔

سلیم، جیسا کہ ذکر آ چکا ہے ہوٹل میں ویٹر تھا وہ کوٹھی میں جاتا رہتا تھا ایک دن شمائلہ اس کے سامنے دل کے

پھپھولے پھوڑنے بیٹھ گئی، اس نے کہا کہ تمہارا صاحب مجھ پر شک کرتا ہے حالانکہ میں نے اس کی خاطر ماں باپ کی عزت کو پیروں تلے روند دیا تھا وہ مجھے دھمکیاں دیتا ہے میں کسی دن جس طرف سنگ سمائے نکل جاؤں گی وہ شاید یہ چاہتا ہے کہ مجھے ڈرا دھمکا کر طلاق لینے پر مجبور کردے اور اسے ایک حصہ بھی نہ دینا پڑے بات کچھ ایسی ہی تھی اسے جھگیوں والی ایک لڑکی پسند آ گئی تھی وہ اس سے شادی کرنا چاہتا تھا ہر جمعرات اور ہفتے کی رات وہ اس کے پاس آئی تھی یہ چکر پچھلے دو ماہ سے چل رہا تھا ذوالفقار کے پاس شاید زیادہ پیسہ آ گیا تھا اور اسے اپنی بیوی بری لگنے لگ گئی تھی عشق کا بھوت اتر چکا تھا۔ میں نے سلیم سے پوچھا۔

''تم نے بیگم صاحبہ (شمائلہ) کو منیجر صاحب کے کرتوتوں سے آگاہ کردیا تھا۔

تھانے دار صاحب جب وہ روتی تھیں تو مجھے ان پر بہت ترس آتا تھا وہ مجبور ہوگئی تھیں نہ پیچھے واپس جاسکتی تھیں اور نہ انہیں ذوالفقار صاحب کا پیار دوبارہ مل سکتا تھا۔ میں نے ایک دن انہیں سب کچھ بتا دیا تھا۔ ویسے تھانیدار صاحب آپ مجھ سے لاکھ درجے سیانے ہیں میں تو آپ کے سامنے طفل مکتب بھی نہیں ہوں، کیا میں نے بیگم صاحبہ کو سب کچھ بتا کر برا کیا تھا، میں نے اس سوال پر اپنا فیصلہ محفوظ رکھا اور اس سے اس جھگیوں والی کے متعلق پوچھا کہ اس کا نام کیا تھا اور وہ کہاں سے آئی تھی؟

''جناب نام تو اس کا افشاں تھا شہر سے باہر جو جھگیاں ہیں میں اس کو وہاں سے لے کر آتا تھا تھانیدار صاحب مجھے معاف کردیں میں مجبور تھا اس نے باقاعدہ ہاتھ جوڑ دیے۔ وہ واقعی مجبور تھا دو کشتیوں کا سوار بنا گیا تھا اس نے یہ بھی بتایا تھا کہ وہ افشاں کو پچھلی طرف سے لے کر آتا تھا اور صبح وہ ذوالفقار صاحب کے ساتھ ناشتہ کرتی تھی پھر وہ اسے سب کی نظروں سے بچا کر واپس چھوڑ آتا تھا۔

میں نے اسے فارغ کردیا اور ہم تھانے میں واپس آ گئے عجیب صورت حال تھی سب ڈوریاں الجھ چکی تھیں۔

اپنے کمرے میں بیٹھ کر میں نے پہلے میز پر بکھرے ہوئے کاغذ سمیٹے ان کو پیپرویٹ کے نیچے رکھ کر میں فارغ ہی ہوا تھا کہ اے ایس آئی شاہد اندر داخل ہوا چند لمحوں بعد وہ کہہ رہا تھا۔

''سر...... قاتل کا کچھ پتا چلا۔'' میں نے تازہ صورت حال اس کے سامنے رکھ دی۔
چند لمحوں کے لیے وہ کسی گہری سوچ میں کھو گیا پھر بولا۔
''میرا خیال ہے سر میں اس گاؤں (جہاں سے ذوالفقار مقتول) اور شمائلہ کا تعلق ہے جاؤں اور وہاں کے حالات کا جائزہ لے کر آؤں تمہارے ذہن میں کیا ہے شاہد'' میں نے اس کی آنکھوں کو دیکھتے ہوئے کہا۔
''سر، کیا یہ ممکن نہیں ہے کہ مقتول کے چچا اور چچی نے گمشدگی کی رپورٹ درج ہی نہ کروائی ہو اور یہ عہد کر لیا ہو کہ انہیں ڈھونڈ کر ختم کر دیں گے کچھ لوگ ایسے ہی ذہن کے مالک ہوتے ہیں اپنی بے عزتی کا بدلہ خون بہا کر ہی لیتے ہیں۔''
''بہت خوب تمہاری بات دل کو لگتی ہے تمہارے خیال میں دونوں کو قتل کر دیا گیا ہے لیکن شمائلہ کی لاش کہاں ہے؟''
''کوٹھی میں ہو سکتی ہے؟''
میں اچھل پڑا حالات اس کیس میں اتنی تیزی سے بدلے تھے کہ اس طرف میرا دھیان ہی نہیں گیا تھا میں نے کوٹھی کی تلاش نہیں کی تھی۔
''بھئی تم نے میرا دماغ روشن کر دیا ہے خیر ہر کام قانون کے تقاضوں کے مطابق ہوگا صبح ہم عدالت سے خانہ تلاشی کا وارنٹ لے کر کارروائی کریں گے اب تو عدالتیں بند ہو چکی ہوں گی۔''
''ٹھیک ہے سر۔ میں چلتا ہوں صبح عدالت کی طرف سے ہو کر ہی آؤں گا۔''
''نہیں پہلے تھانے آنا صبح جو حالات ہوں گے ان کے مطابق کارروائی کریں گے، ابھی تم کسی سپاہی کو ساتھ لے کر جھگیوں کی طرف ایک چکر لگا آؤ۔ ہوٹل سے سلیم (ویٹر) کو ساتھ لے جانا اور افشاں کو ساتھ لے کر ابھی آجاؤ۔
''ٹھیک ہے، سر۔'' کہہ کر وہ چلا گیا۔
تقریباً دو گھنٹے بعد آ کر اس نے بتایا کہ جھگیوں والے وہاں سے ڈیرہ اکھاڑ کر جا چکے ہیں یہ ایک نئی دردسری تھی۔
اس وقت شام ہونے والی تھی دن بھر کی مغز کھپائی نے میرے ذہن کی چولیں ہلا دی تھیں۔
میں آرام کرنے اپنے کوارٹر میں چلا گیا میں یہ سوچ کر گیا تھا کہ صبح ایک پولیس پارٹی جھگیوں والوں کی تلاش میں روانہ کروں گا۔
سلیم (ویٹر) نے یہ بھی بتایا تھا کہ جب صبح وہ کمرے میں گیا تھا تو افشاں غائب تھی علاوہ ازیں اس نے یہ بھی بتایا تھا کہ اس نے شراب کی بوتل اور گلاس پہلی بار کمرے میں دیکھے تھے۔
لیکن......
قارئین اگلی صبح ہمارے سب کے سب منصوبے دھرے کے دھرے رہ گئے۔ ابھی مجھے تھانے میں آئے ہوئے کچھ ہی دیر ہوئی تھی کہ سپاہی انور اندر داخل ہوا اور سلیوٹ کر کے بولا۔
''سر ایک خاتون آپ سے ملنا چاہتی ہے ہمیں کچھ نہیں بتا رہی کہتی ہے تھانیدار صاحب سے کام ہے ذرا نجی قسم کا ویسے ایک بات ہے سر اسے کوئی ضروری کام ہی ہوگا ورنہ اتنی ٹھنڈی صبح تھانے میں کون آتا ہے۔
''ٹھیک ہے بھئی بھیج دو۔'' میں نے اس کی لمبی چوڑی تمہید سے اکتا کر کہا۔ پھر جب خاتون میرے سامنے آئی تو دنگ رہ گیا وہ شمائلہ تھی۔ جی ہاں وہی شمائلہ جس کی آمد سے یہ کہانی شروع ہوئی تھی وہ آج بھی فیشن برقعے میں تھی اور اس نے کمرے میں آ کر نقاب الٹا دیا تھا۔
''تھانیدار صاحب آج آپ مجھے یہاں دیکھ کر حیران تو ہوئے ہوں گے جب میں پہلی بار آپ کے پاس آئی تھی تو آپ نے مجھے شاید کوئی نفسیاتی مریضہ سمجھا تھا اور میری باتوں کو کوئی اہمیت نہیں دی تھی لیکن آج میں جو کہانی سنانے آئی ہوں اسے آپ میرا بیان سمجھ لیں اور اس بیان پر آپ کا قانون بھی حرکت میں آئے گا، خیر مجھے کوئی پروا نہیں ہے۔'' میں نے کافی عرصہ پہلے کشتیاں جلا دی تھیں۔
قارئین میں اس کا بیان ان باتوں کو حذف کر کے سنا دیتا ہوں جن کا ذکر پہلے آ چکا ہے۔
افشاں کے متعلق سب کچھ جان کر اس نے انتقام لینے کا ایک بھیانک منصوبہ بنایا سلیم کو اس سے ہمدردی ہو گئی تھی وہ یہ چاہتا تھا کہ کسی طرح دوبارہ ذوالفقار صاحب دل سے اپنی بیگم کا ہو جائے لیکن وہ یہ نہیں جانتا تھا کہ بیگم صاحبہ کے دل میں کیا ہے بہرحال شمائلہ نے سلیم سے یہ کہہ کر افشاں کے ڈیرے کا پتا پوچھ لیا کہ وہ افشاں کو سمجھائے گی میرا گھر نہ اجاڑ لے۔ لیکن جمعتہ المبارک کے دن صبح ہی صبح اس نے فیشن برقعہ پہنا (ویسے وہ چادر استعمال کرتی تھی)

اپنے آدھے زیور ایک پوٹلی میں باندھے اور ڈیرے پر پہنچ گئی، ڈیرے والے حیران رہ گئے کہ یہ کون ہے اور ہم غریبوں کے ڈیرے پر کیوں آئی ہے اس نے افشاں کے متعلق پوچھا۔ اسے افشاں سے ملا دیا گیا ڈیرے پر کھسر پھسر شروع ہو گئی تھی لیکن شمائلہ اس کی پروا کیے بغیر افشاں کو ایک طرف لے گئی اور بولی تم سنا ہے تاج محل ہوٹل کے منیجر ذوالفقار کے پیچھے دیوانی ہوئی ہو، کان کھول کر سن لو وہ بھنورا ہے وہ پہلے میری زندگی تباہ کر چکا ہے (اس نے اسے یہ نہیں بتایا کہ وہ ذوالفقار کی بیوی ہے) بہرحال افشاں کا جواب خلاف توقع تھا وہ دلیری سے بولی بی بی جی کون کمبخت محبت کرتا ہے میں تو مردوں سے انتقام لے رہی ہوں اس جیسا ایک بابو میری زندگی تباہ کر کے کہیں بھاگ گیا ہے اس نے مجھ سے شادی کا وعدہ کیا تھا لیکن میری عزت سے کھیل کر بھاگ گیا۔''

''اوہ بہت افسوس ہوا یہ کہہ کر شمائلہ نے زیور کی پوٹلی اس کے سامنے کرتے ہوئے کہا۔

''یہ زیور تمہارا ہو سکتا ہے اگر تم میرے کہنے پر عمل کرو۔''

''قتل تو نہیں کرنا پڑے گا۔'' وہ للچائی ہوئی نظروں سے زیور کو دیکھتے ہوئے بولی۔

''بالکل نہیں پگلی، بس اسے صرف ایک سبق دینا ہے ویسے تم لوگ یہاں کب تک ہو؟ شمائلہ نے اچانک کچھ سوچ کر پوچھ لیا اتوار کو ہم جا رہے ہیں۔'' افشاں نے بتایا۔

''ٹھیک ہے تم نے صرف اتنا کرنا ہے کہ ایک شراب کی بوتل خریدنی ہے گلاس تو کمرے میں ہوتے ہوں گے۔''

افشاں نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

اس ہفتے کو تم جاؤ، تو اسے جی بھر کے شراب پلانا لیکن خبردار خود چسکی بھی نہ لینا پھر میں پہنچ جاؤں گی۔ اس کی جیب میں جتنے پیسے ہوں گے وہ تمہارے ہوں گے پھر شمائلہ نے سو سو کے تین نوٹ نکال کر اس کے حوالے کیے اور یہ کہتے ہوئے واپس آ گئی دیکھو یہاں ان باتوں کی کسی کو بھنک بھی نہیں پڑنی چاہیے زیور بھی اسے دے آئی تھی۔ اس کے بعد شمائلہ نے بتایا کہ وہ رات دو بجے کے قریب پچھلی طرف سے کمرے میں پہنچ گئی یہ سب اس نے کمال مہارت سے سلیم سے پوچھ لیا تھا اس نے دیکھا کہ ذوالفقار بے سدھ پڑا ہے اس نے سرگوشی میں افشاں سے پوچھا کیا تم نے بے ہوشی کی دوا شراب میں ملا دی تھی افشاں نے سر ہلا کر ہاں کر دی۔ شمائلہ نے اس کی جیب سے سارے پیسے نکال کر افشاں کے حوالے کر دیے اور اسے کہا تم اپنے کپڑے صحیح کر کے نیچے انتظار کرو میں تھوڑی دیر میں آ رہی ہوں شمائلہ نے مجھے سنایا کہ اس لمحے اسے ذوالفقار سے شدید نفرت محسوس ہوئی اس نے میرے دل کا خون کیا تھا میں نے اس کا خون کر دیا حساب برابر ہو گیا۔

''بی بی میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا حساب برابر نہیں ہوا تمہیں قانون کو حساب دینا ہوگا۔

قارئین آپ کے ذہن میں کچھ سوال آ رہے ہوں گے لیجیے ان کے جواب بھی آپ کی خدمت میں پیش کر دیتا ہوں۔ میں نے شمائلہ سے پوچھا تھا کہ وہ اتنے دنوں بعد تھانے میں کیوں آئی کوٹھی میں موجود نوکر کہاں گئے؟ اور افشاں اس کو نیچے کھڑی ہوئی ملی تھی یا نہیں؟''

اس نے بتایا کہ افشاں اس کو مل گئی تھی وہ اس کے ساتھ ان کے ڈیرے پر چلی گئی تھی اس کا ڈیل ڈول اس کے ساتھ ملتا جلتا تھا افشاں کو اس نے بتایا کہ اس نے کیا کر دیا ہے افشاں پہلے تو گھبرائی پھر اسے کہا تم اپنے کپڑے اتار دو میں انہیں جلا دیتی ہوں تم میرے کپڑے پہن لو۔ جب یہ سب کچھ ہو گیا تو اس نے کہا۔ میں اب واپس نہیں جاؤں گی تم مجھے ساتھ ہی لے چلو، مختصراً وہ ڈیرے والوں کے ساتھ چلی گئی۔ وہ وقتی غصے اور جذباتی لمحوں کے حصار میں گرفتار ہو کر یہ سب کچھ کر چکی تھی اب اس کا ذہن ماؤف ہو گیا تھا لیکن چند دن بعد جب ہیجانی کیفیت سے وہ باہر آئی تو وہ مضطرب اور بے چین ہو گئی کہتے ہیں انسانی خون بڑے بڑے مجرموں کو ہضم نہیں ہوتا وہ تو وقتی اشتعال کے تحت یہ سب کچھ کر گزری تھی اسے یہی حل نظر آیا کہ وہ تھانے میں جا کر سب کچھ بتا کر اپنے دل کا بوجھ ہلکا کر لے چوکیدار اور ڈرائیور (کوٹھی کے نوکروں) کو اس نے پکی چھٹی دے دی تھی اگلے دن افشاں کو بھی ہم پکڑ کر لے آئے تھے۔ میرے خیال میں ذوالفقار اور شمائلہ دونوں عاقبت نااندیش تھے جنہوں نے اپنا سب کچھ گنوا دیا تھا۔



ضرورت

نوشاد عادل

ضرورتیں جب اعتدال سے تجاوز کر جائیں تو عموماً انسان کی عقل خبط ہو جاتی ہے اور وہ خواہشوں کا اسیر ہو جاتا ہے۔
ایک نوجوان کی روداد' اس کی ضرورت نے اسے رشتوں کا مول لگانے پر مجبور کر دیا تھا۔

وہ آج پھر ایک نئی شان دار اور قیمتی کار میں آیا تھا۔ ہر گاڑی پچھلی گاڑی سے زیادہ مہنگی ہوتی تھی۔ طارق آرڈر لکھتے لکھتے رک گیا تھا۔ اچانک اس کی نظریں شیشے کی دیوار کے باہر پارکنگ میں گئی تھیں۔ اسی لمحے گاڑی رکی تھی۔

جامنی رنگ کی جہازی سائز کار تھی۔ ایسی گاڑیاں عموماً سڑکوں پر دکھائی نہیں دیتی تھیں اور نہ ہر ایرے غیرے کے پاس ہوتی ہیں۔

"ذرا جلدی سرو کروادیں۔" ایک آواز نے اسے چونکا دیا۔

"جی جی۔ جی سر...... آپ نے لاسٹ میں چکن منچورین لکھوایا ہے نا۔" طارق گڑبڑا کر گاہک سے بولا۔

"چائنیز رائس کہا ہے میں نے۔" وہ آدمی منہ بنا کر بولا

"سوری سر...... بس...... ابھی چند منٹ ویٹ کرنا پڑے گا آپ کو۔" طارق نے ایک ویٹر کو اشارے سے بلوایا اور اسے آرڈر سمجھانے لگا۔ ساتھ ہی وہ باہر بھی دیکھتا جا رہا تھا۔ اب گاڑی سے ڈرائیور سمیت تین آدمی اتر آئے تھے۔ ایک نے بڑھ کر عقبی دروازہ کھولا تب وہ بوڑھا دھیرے دھیرے اندر سے برآمد ہوا۔ دوسرے آدمی نے اسے باہر نکلنے میں مدد کی تھی۔ بوڑھے کے ہاتھ میں ایک قیمتی اور منقش چھڑی تھی۔ طارق نے اندازہ لگایا کہ صرف اس چھڑی کی مالیت اس کی کم از کم پانچ ماہ کی تنخواہ کے برابر ہوگی۔ اب بوڑھے اور اس کے ساتھیوں کا رخ ریسٹورنٹ کے دروازے کی جانب تھا۔

"اسے اتنی حسرت سے دیکھنے سے...... تمہاری تقدیر نہیں بدل جائے گی۔" ایک آواز سن کر طارق تیزی سے مڑا۔ اس کے سامنے ریسٹورنٹ کا منیجر قہر آلود نظروں سے اسے گھور رہا تھا۔ منیجر طارق پر طنز کرنے اور اسے لتاڑنے کا کوئی بھی موقع ہاتھ سے جانے نہیں دیتا تھا۔ "اس جیسا امیر بننے کے لئے تمہیں کم از کم تین سو سال کی عمر درکار ہوگی۔ بلکہ تم تو پانچ سو سال ہی لگالو...... مسٹر طارق۔" منیجر دھیمی مگر سخت آواز میں بول رہا تھا۔ "مجھے بہت خوشی ہوگی جب میں تمہیں نوکری سے فارغ کروں گا۔"

"س...... سوری سر......" طارق کے چہرے پر ہوائیاں اڑنے لگیں۔

طارق کی گھبراہٹ نے منیجر کے ہونٹوں پر ایک طمانیت بھری آسودہ سی مسکراہٹ بکھیر دی۔ اسے دل سے خوشی ہوتی تھی جب کوئی اس سے معذرت کرے اور گھبرانے لگے۔ خاص طور پر طارق کو اپنے سامنے لاچار دیکھ کر اس کے دل میں پھول کھل اٹھتے تھے۔

"فی الحال اپنا منہ ٹھیک کرو...... اور جا کر سیٹھ پرویز سے آرڈر لو...... کوئی فالتو بات کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ میں تمہاری ایک ایک حرکت پر نظر رکھے ہوئے ہوں۔" منیجر نے تیزی سے دبے لہجے میں کہا اور کاؤنٹر کی جانب بڑھ گیا۔

اس اثنا میں سیٹھ پرویز اپنے آدمیوں کے ساتھ اندر آ کر اپنی مخصوص نشست پر بیٹھ گیا۔ اس نے چھڑی دیوار کے سہارے کھڑی کر دی اور اپنے ساتھیوں کی طرف دیکھ کر سر ہلاتے ہوئے کچھ کہا۔ فوراً ہی وہ دونوں باہر نکل گئے۔

طارق سیٹھ پرویز کے پاس جا پہنچا۔

"سلام سر......" "کیسے ہیں آپ؟"

سیٹھ پرویز نے طارق کو دیکھا اور مسکراتے ہوئے خفیف سے انداز میں سر ہلایا۔ "آئم فائن......"

"گڈ...... کیا پسند کریں گے سر......؟" طارق خالص پیشہ ورانہ انداز میں بول رہا تھا۔ اسے معلوم تھا کہ خبیث منیجر اسے کسی جگہ سے کینہ توز نظروں سے گھور رہا ہوگا۔

''فریش اورنج جوس۔'' سیٹھ پرویز نے مختصراً کہا۔

''اور کچھ سر؟''

''نتھنگ۔۔۔''

''او کے سر۔۔۔ بس چند منٹ ویٹ کرنا ہوگا۔'' طارق یہ کہہ کر وہاں سے جلدی سے ہٹ گیا۔

پھر طارق نے اورنج جوس سرو کروایا۔ سیٹھ پرویز خاموشی سے جوس کے سپ لیتا رہا۔ اس نے جوس کا گلاس تقریباً آدھے گھنٹے میں ختم کیا۔ اس دوران اس نے اپنی جیب سے قیمتی موبائل فون نکال کر میز پر رکھ دیا تھا۔ طارق دور کھڑا تھا مگر کن انکھیوں سے اسے دیکھ رہا تھا۔ ایک بار سیٹھ پرویز نے سپ لیتے لیتے اچانک طارق کی جانب دیکھا جو بڑی محویت اور رشک بھری نظروں سے اسے دیکھ رہا تھا۔ جیسے ہی طارق کی نظریں سیٹھ پرویز کی نظروں سے ٹکرائیں وہ گڑبڑا گیا اور دوسری جانب دیکھنے لگا۔ سیٹھ پرویز کے ہونٹوں پر مدھم سی مسکراہٹ ابھر آئی۔ طارق کو ایسا لگا کہ اس کی چوری پکڑی گئی ہے۔ ساتھ ہی اسے منیجر کا دھڑکا بھی لگا ہوا تھا جو یقیناً اسی کی تاک میں بیٹھا ہوگا۔

اس نے دھڑکتے دل کے ساتھ دزدیدہ نظروں سے سیٹھ پرویز کی طرف دوبارہ دیکھا۔ سیٹھ پرویز انگلی کے اشارے سے اسے بلا رہا تھا۔ انکار کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوسکتا تھا۔ طارق جھٹ سے اس کے پاس جا پہنچا۔

''جی سر۔۔۔؟''

''کتنے عرصے سے یہاں ملازم ہو؟''

''جی۔۔۔'' طارق اس غیر متوقع سوال پر بچ مچ حیران ہوگیا تھا۔ ''میں سمجھا نہیں۔''

''یہاں کتنے عرصے سے جاب کررہے ہو؟'' سیٹھ پرویز نے بڑے تحمل سے اپنا سوال دہرایا۔

''بہت زیادہ عرصہ نہیں ہوا۔'' ''آپ نے کچھ اور آرڈر کرنا ہے سر؟'' طارق کا دل و دماغ منیجر میں لگے ہوئے تھے۔

''فرسٹ ٹائم جاب کی ہے۔ یا پہلے بھی کسی جگہ کرچکے ہو؟'' سیٹھ پرویز نے اس کا سوال نظر انداز کردیا۔

''کئی کرچکا ہوں۔'' طارق بے چین ہو رہا تھا۔

''اچھا۔۔۔ تم یوں کرو کہ یہ۔۔۔'' اس نے جیب سے

ایک کارڈ نکال کر سامنے رکھا۔ ''رکھ لو...... میرا کارڈ مجھ سے لازمی ملنا...... میں انتظار کروں گا۔''

طارق نے مشینی انداز میں کارڈ اٹھا کر پھرتی سے جیب میں ڈال لیا۔ اتنے میں سیٹھ پرویز نے موبائل پر ایک نمبر پر کال کر کے کہا۔ ''یس...... کم آن......''

پھر اس کے دونوں آدمی اندر آئے۔ سیٹھ پرویز چھڑی سنبھال کر کھڑا ہو گیا۔ ساتھ ہی اس نے اپنے بٹوے میں سے کئی بڑے نوٹ ٹیبل پر رکھ دیئے۔

''آنا ضرور...... ہوسکتا ہے تمہاری خوش نصیبی تمہارا انتظار کر رہی ہو۔'' یہ کہہ کر سیٹھ پرویز اپنے آدمیوں کے ساتھ چلا گیا۔

طارق اس کے جملوں پر غور کرتا رہ گیا۔ اس کی نظریں بڑے نوٹوں پر تھیں۔ سیٹھ پرویز ہمیشہ اسی طرح سے بہت سے نوٹ رکھ کر چلا جاتا تھا۔

''کیا باتیں کر رہے تھے تم......؟'' اچانک منیجر عقب سے نمودار ہوا۔

''میں باتیں نہیں کر رہا تھا۔ میں صرف جواب دے رہا تھا۔'' پتہ نہیں کیوں طارق کو اس لمحے منیجر سے سخت نفرت ہونے لگی۔ دل چاہ رہا تھا کہ اس کے منہ پر جوتا دے مارے۔ وہ اتنا مکروہ لگ رہا تھا۔

''کیا پوچھ رہا تھا وہ بڈھا؟'' منیجر تفتیش کرنے لگا۔

''یہی کہ تم یہاں کتنے عرصے سے ملازمت کر رہے ہو؟'' طارق نے سچ بتانے میں کوئی مضائقہ نہ سمجھا۔

''یا کچھ اور بات پوچھ رہا تھا؟'' منیجر کو یقین نہیں آیا۔

''یہ آپ اس کے گھر جا کر بھی پوچھ سکتے ہیں...... اگر میں جھوٹا نکلا تو کھڑے کھڑے نوکری سے فارغ کر دینا۔'' طارق نے قدرے بدلے ہوئے انداز میں کہا۔

منیجر اسے گھورنے لگا۔ پھر زہریلے لہجے میں بولا۔ ''وہ تو میں ضرور کروں گا۔ آج نہیں تو...... کل۔''

......☆☆☆......

''آج پھر ڈھائی بجا دیئے تم نے بیٹا۔'' امی نے طارق کے لئے دروازہ کھولتے ہی کہا۔

''تو امی میں کیا کر سکتا ہوں۔'' طارق نے اندر آتے ہوئے کہا۔

''تم نے تو کہا تھا کہ گیارہ بجے چھٹی ہو جایا کرے گی اور آتے آتے بارہ بج جائیں گے۔'' امی اس کے پیچھے پیچھے چلی آئیں۔ اتنے میں طارق کی چھوٹی بہن بھی آ گئی تھی۔

''امی میں نوکری کرتا ہوں۔'' مالک تو نہیں ہوں نا وہاں کا۔'' طارق تھوڑا سا جھنجلا گیا۔

''امی آپ جا کر کھانا گرم کر دیں۔'' بہن نے کہا۔

امی چلی گئیں۔

''تم سوئی نہیں ابھی۔'' طارق نے جوتے اتارتے ہوئے پوچھا۔

''آپ نہیں آئے تھے نا۔'' اس لئے نیند بھی نہیں آ رہی تھی۔'' اس کی بہن فاطمہ نے معصومانہ انداز میں کہا۔

طارق مسکرا دیا۔ ''اچھا...... اب آ گیا میں۔ اب تم جا کے سو جاؤ۔''

''ہاں...... سو جاؤں گی...... آپ کھانا تو کھا لیں۔''

''کھانا تم لے آؤ...... اور امی کو بولو کہ جا کر سو جائیں۔'' طارق نے کہا ''میں جب تک منہ ہاتھ دھو لوں۔''

فاطمہ چلی گئی۔

''بھائی...... آپ کوئی اور اچھی سی نوکری کیوں نہیں کر لیتے؟'' فاطمہ نے سوال کیا۔

طارق کھانا کھا رہا تھا۔ ''ملے گی تو ضرور کروں گا۔ میں خود یہ لعنتی ملازمت چھوڑنا چاہتا ہوں۔ اصل میں میرا منیجر جو ہے نا بڑا ہی منحوس انسان ہے۔ ورنہ تو اس ملازمت میں بھی کوئی برائی نہیں ہے۔

''بہت تنگ کرتا ہے وہ؟''

''ایسا ویسا...... بات بات پر نوکری سے فارغ کرنے کی دھمکی دیتا ہے۔ پتہ نہیں مجھ سے کیا دشمنی ہے اسے۔'' طارق نے گلاس اٹھا کر کہا پھر پانی پینے کے بعد بولا۔ ''ریسٹورنٹ میں ایک امیر کبیر بوڑھا آتا ہے۔ آج بھی آیا تھا۔ اپنا کارڈ دے کر گیا ہے کہ مجھ سے آ کر ملنا۔''

''اچھا تو جائیں گے آپ؟''

''ہاں...... ہوسکتا ہے مجھے اپنے پاس جاب پر رکھ لے۔''

''یہ تو بڑا اچھا ہو جائے گا بھائی۔''

''ہاں بس...... دعا کرو......''

''وہ تو میں کرتی رہتی ہوں۔''

......☆☆☆......

نظم

تو نے کس عہد میں چھوڑا ہے جنوں کا دامن
تو کہ ہر عہد میں رہتا ہے صبح کا دشمن
تو نے کب ظلم کے چہرے سے الٹ دی ہے نقاب
تو نے کس عہد میں محسوس کیا کچھ بھی حجاب
ہاں تری راہ میں جب حق کی صدا آئی ہے
روشنی ظلم کی تاریکی میں در آئی ہے
سالہا سال پرانی میری تاریخ کو دیکھ
فتح مکہ کی نشانی میری تاریخ کو دیکھ
بابل ونینوا شاہد ہیں میری عظمت کے
معترف قیصر و کسریٰ ہیں میری طاقت کے
تو نے دیکھا ہے مجھے بدر کے میدانوں میں
جوش مستی سے چھلکتے ہوئے پیمانوں میں
کیا تجھے یاد نہیں بت شکنی کا منظر
غزنوی ضرب کے شعلوں میں تھے بت خاکستر
تو نہیں جانتا ظالم کہ مسلمان کیا ہے
تو نے سمجھا ہی نہیں قوت ایمان کیا ہے
طارق، خالد و ٹیپو کیا تھے یاد نہیں
ضرب سے جن کی دہل جاتے تھے کفارز میں
تو نے رن کچھ میں بھی اک بار جسے دیکھا ہے
آج پھر تو نے اسی قوم کو للکارا ہے
تیرے سب ظلم امن و امان کی خاطر
ہم کے مرتے ہی رہے سارے جہاں کی خاطر
تو نے سمجھا کہ وہ پہلے سے مسلمان نہ رہے
صاحب دیں نہ رہے صاحب ایمان نہ رہے
فیصلہ کر ہی لیا وحشی و حیوان کی طرح
فوج بڑھنے لگی تیری کسی طوفان کی طرح
ہر طرف پھیل گئے جور و ستم کے سائے
ماہ و خورشید پس ابر سیاہ شرمائے
کتنی ارض وطن گھر گئی طوفانوں میں
شائبہ بھی نہ رہا، پیار کا انسانوں میں
زہر آلود فضاؤں میں بھڑک اٹھی آگ

”مجھے یقین تھا کہ تم ضرور آؤ گے۔“ سیٹھ پرویز نے طارق کو دیکھتے ہی کہا اور صوفے کی طرف اشارہ کیا۔ ”آرام سے بیٹھو۔“

طارق خاموشی سے صوفے پر بیٹھ گیا۔

آج وہ صبح جلد بیدار ہو گیا تھا۔ رات ہی وہ فیصلہ کر کے سویا تھا کہ صبح سیٹھ پرویز سے ملاقات کرنے جائے گا۔ ورنہ وہ عموماً دیر میں اٹھتا تھا۔ سہ پہر اسے ریسٹورنٹ پہنچنا ہوتا تھا اور رات گیارہ بجے چھٹی ہوتی تھی۔

”کیا منگواؤں تمہارے لئے۔ جو دل چاہے بتا دو؟“ سیٹھ پرویز نے اس سے پوچھا۔

”کچھ نہیں...... میں تو صرف آپ سے ملنے چلا آیا تھا۔“ طارق نے ہچکچاہٹ آمیز آواز میں کہا۔

سیٹھ پرویز کے سیاہ ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔ اس نے ایکسٹینشن ریسور اٹھا کر ہلکی آواز میں کچھ لانے کے لئے کہا۔ پھر طارق کی طرف متوجہ ہو گیا۔

میں اس ریسٹورنٹ میں کافی عرصے سے جا رہا ہوں۔ تمہیں کچھ وقت سے دیکھ رہا تھا۔ میں جب بھی آتا تھا تم بھرپور توجہ اور خاص دلچسپی سے مجھے دیکھتے تھے۔ میں نے ٹھیک کہا نا؟“ سیٹھ پرویز آخر میں اس سے پوچھا۔

”جی...... جی...... جی ہاں۔“

”گڈ......“ سیٹھ گردن ہلانے لگا۔ وہ اب تک بڑی ٹیبل کے عقب میں اپنی اونچی پشت والی کرسی پر بیٹھا تھا۔ ”اور مجھے یہ احساس ہوا کہ تم اپنی نوکری سے خوش نہیں ہو۔“

”نوجوان...... کیا تم اپنی موجودہ زندگی سے مطمئن ہو؟“ اچانک ہی سیٹھ پرویز نے ایک الگ سوال کر ڈالا۔

طارق اس کا منہ تکنے لگا۔ میں اس بات کا طلب سمجھا نہیں۔

سیٹھ پرویز مسکرایا۔ ”یہ بات نہیں...... سوال ہے...... سیدھا سا۔“

”سچ کہوں تو...... نہیں۔“

”گڈ...... میرا بھی یہیں اندازہ تھا۔“ سیٹھ پرویز کی مسکراہٹ مزید گہری ہو گئی۔ ”اور مجھے تم جیسے ہی نوجوان کی تلاش تھی۔“

”تلاش...... مگر کس لیے؟“

”اگر میں تمہیں اپنی کمپنی میں اچھے عہدے کی نہایت

آ گیا شعلوں کی زد میں میری دھرتی کا سہاگ
پھر بڑی دھوم سے بنیا سرِ میداں آیا
کبھی اپنا تو کبھی روس کا ساماں لایا
اور اِدھر دیکھیے قدرت کی کرشمہ سازی
آگ میں کود پڑے اپنے وطن کے غازی
محوِ پرواز ہوئے پاک وطن کے شاہین
ہر طرف جلنے لگی آگ میں بھارت کی زمیں
چیل کوؤں کی طرح ڈھیر تھے بھارت کے جہاز
اور شاہین فضاؤں میں تھے محوِ پرواز
دشمن ارضِ وطن خائف انجام ہوا
یہ زمیں کیا ہے فلک لرزہ براندام ہوا
جن کی تقدیر میں ہے فتح مبیں کی دولت
جن کی پرواز میں مضمر ہے وطن کی عظمت
یہ وہ شاہین ہیں جو بت شکنی کرتے ہیں
وہی کرتے ہیں جو جرأت کے دھنی کرتے ہیں

ان کی پرواز میں ایٹم کا دھماکا ہے نہاں
ان کے حملوں میں ہے پوشیدہ قیامت کا سماں
تم کو اک بات بتاتے ہیں مہاراج سنو!
نہ سنو وقت کی آواز مگر آج سنو!
آج جو بات ہماری نہ سمجھ پاؤ گے
گنگا جل ڈھونڈنے نکلو گے نہیں پاؤ گے
شانتی ڈھونڈنے نکلو گے نہیں پاؤ گے
رحم کی بھیک جو مانگو گے نہیں پاؤ گے
ملک پر اپنے کبھی آنچ نہ آنے دیں گے
جان دے دیں گے مگر آن نہ جانے دیں
سب لٹا دیں گے تری شان بچانے کے لیے
ترے خوش رنگ گل و گلزار سجانے کے لیے
ہم نے ہستی بھی مٹا دی ہے تو کچھ زیادہ نہیں
خوں اگر امن کی سرخی ہے تو کچھ زیادہ نہیں

زرین قمر

پرکشش تنخواہ کی آفر کروں تو...... تم کیا کرو گے؟“

”ظاہر ہے...... میں یہ موقع ہاتھ سے جانے نہیں دوں گا۔“ طارق اپنے اندر کی خوشی کو چھپانے کی ناکام کوشش کرتے ہوئے بولا۔

”گڈ سمجھ داری بھی اسی میں ہے۔“ سیٹھ پرویز نے قدرے آگے جھک کر دونوں کہنیاں ٹیبل کی سطح سے ٹکالیں اور ہاتھوں کی انگلیاں ایک دوسروں میں پھنسا کر طارق کو بغور دیکھا۔ ”اور اگر فرض کرو...... میری جگہ تم لے لو...... اور جو کچھ میرا ہے وہ سب کچھ تمہارا ہو جائے تو تمہارے کیا احساسات ہوں گے؟“

”ایسا کس طرح ہو سکتا ہے۔“ طارق خفیف سا ہو گیا تھا۔ اسے یوں لگا کہ سیٹھ اس سے کھیل رہا ہے۔

”کیوں نہیں ہو سکتا۔ بس تم راضی ہو جاؤ ۔ تو...... ہو جائے گا۔ میرے تمام کاروبار...... گاڑیاں...... بینک بیلنس...... بنگلے سب کچھ تمہارا ہو جائے گا۔“ سیٹھ پرویز نے سنجیدگی سے کہا۔

طارق نے چونک کر اسے دیکھا کہ کہیں بڈھے کا دماغ تو نہیں چل گیا ہے۔ مگر اس کے چہرے پر متانت اور آنکھوں میں گہری سوچ تھی۔

”آپ میرا امتحان لے رہے ہیں سر......“ طارق کی آواز میں کھوکھلا پن عیاں تھا۔

”میں نہیں نوجوان...... اب تم خود اپنا امتحان لے رہے ہو۔ جو میں نے پوچھا ہے اس کا جواب دو۔“ اس بار سیٹھ کا لہجہ تھوڑا کرخت ہو گیا تھا۔

طارق ایک عجیب سے مخمصے کا شکار ہو گیا تھا۔ دل مان ہی نہیں رہا تھا کہ بوڑھا سنجیدگی دکھا رہا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ وہ اس کا امتحان لے رہا ہے۔ پھر طارق نے جواب دیا۔ ”سچ تو یہ ہے کہ میں آپ کے پاس ایک اچھی نوکری کا خواب لے کر آیا تھا۔“

”یہ میری بات کا جواب نہیں ہے نوجوان۔“ سیٹھ پرویز کی آواز میں بھاری پن عود کر آیا۔

”میرا خیال ہے کہ میں آپ کا سوال ٹھیک سے سمجھ نہیں پایا ہوں۔ کیا...... آپ دوبارہ بتائیں گے؟“ طارق کو شک گزرا تھا کہ واقعی اس کے سننے میں کوئی غلطی ہوئی ہے۔

”کیا تم......“ بوڑھے سیٹھ پرویز نے تحمل سے کہا۔ ”میرے ایک ایک پیسے...... ایک ایک شے کے

مالک بننا چاہو گے۔ اگر بننا چاہتے ہو تو میں اپنا سب کچھ تمہیں دینے کے لئے تیار ہوں۔''

طارق کے دماغ میں تاریکی چھا گئی۔ اس بار اس نے سننے میں کوئی غلطی نہیں کی تھی۔ ایک ایک لفظ واضح سنا تھا۔ مگر ...... مگر وہ ایسا کیوں چاہ رہا ہے۔ اس سے بوڑھے کو بھلا کیا حاصل ہوگا۔

''کیا آپ کی کوئی اولاد نہیں ہے۔'' طارق نے ذہن میں سب سے پہلے آنے والے سوال کو زبان سے ادا کیا۔

''دو بیٹے ہیں۔ وہ یہاں نہیں رہتے۔ تم ہاں کر رہے ہو یا پھر نہ؟''

''اگر میں نہ کر دوں تو......''

''تو تمہاری مرضی......'' بوڑھے سیٹھ پرویز نے اپنی کرسی سے ٹیک لگالی۔ پھر میں کسی اور کا انتظار کروں گا۔ تمہارے جیسے کسی اور شخص کا۔''

''ہوں...... اچھا...... تو اگر میں یہ کہوں کہ میرا جواب اقرار میں ہے تو کیا ہوگا؟''

''کچھ نہیں ہوگا۔ سب کچھ تمہارا ہو جائے گا۔ میں نے تیاریاں مکمل کر رکھی ہیں۔ میرا وکیل کاغذات لائے گا اور پانچ منٹ کے بعد سب چیزوں کے مالک تم ہو گے۔''

''یقیناً آپ کی کوئی شرط بھی ہوگی۔'' آخر طارق نے یہ بات کہہ ڈالی۔ جو کافی دیر سے اس کے دماغ میں پھنسی ہوئی تھی۔ ''سمجھ دار ہو۔'' سیٹھ پرویز نے ستائشی نظروں سے اسے دیکھا۔ ''بس ہوگا یہ کہ تم میرے جسم میں آ جاؤ گے اور میں تمہارے۔''

''ہیں......؟'' طارق کا منہ کھلا رہ گیا۔ ''ایسا کیسے ہو سکتا ہے۔ یہ کیسے ہوگا؟ یہ تو...... یہ تو ناممکن ہے۔''

''یہ تمہارا مسئلہ نہیں ہے نوجوان۔'' سیٹھ پرویز نے ہاتھ میں پکڑے پین کو دھیرے دھیرے ٹیبل پر مارنا شروع کر دیا۔ ''دیکھو۔ ہم دونوں ضرورت مند ہیں۔ تمہیں دولت کی ضرورت ہے۔ وہ میں تمہیں دے رہا ہوں اور مجھے ایک جوان کا جسم چاہئے۔ جو تمہارے پاس ہے۔ جلدی بولو۔ کیا کرنا ہے؟''

طارق کے دماغ میں جھکڑ چلنے لگے تھے۔ اب اسے سیٹھ پرویز کی باتوں پر یقین کرنا پڑ رہا تھا۔ سب کچھ ٹھیک ہے مگر یہ کس طرح ہوگا کہ وہ میرے جسم میں آ جائے گا اور میں اس کے جسم میں چلا جاؤں ...... یہ بات ہضم نہیں ہو پا رہی تھی۔

''اچھا ٹھیک ہے۔ مجھے لگتا ہے کہ تم راضی ہو۔ مگر کسی نامعلوم وجہ سے ہچکچا رہے ہو۔'' سیٹھ پرویز نے سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ''ایک کام کرو۔ آج تم گھر جاؤ اور خوب اچھی طرح سوچ لو۔ ایک طرف شاہانہ اور پرتعیش زندگی تمہاری منتظر ہے اور دوسری طرف ریسٹورنٹ کی معمولی سی نوکری۔ اور ساتھ ہی بھنچی بھنچی سی زندگی۔ جس کے دامن میں صرف حسرتیں سنپولیوں کی طرح کلبلا رہی ہیں۔ جا کر سوچو۔ فیصلہ کر لو۔ تو کل بلا جھجک چلے آنا۔''

طارق کھڑا ہونے لگا کہ اتنے میں ملازم کھانے پینے کے لوازمات سے بھری ہوئی ٹرالی دھکیلتا ہوا اندر آیا۔

''بیٹھو...... کچھ کھا پی کر جانا۔'' سیٹھ پرویز نے کہا۔

''جی شکریہ...... مجھ سے اب کچھ کھایا نہیں جائے گا۔ میں اب چلتا ہوں۔'' طارق نے ماتھا کھجایا۔ سیٹھ پرویز نے سر ہلایا اور طارق وہاں سے باہر آ گیا۔

......☆☆☆......

آج ریسٹورنٹ میں کام کرتے ہوئے بھی طارق کھویا کھویا سا رہا تھا۔ اس کے دماغ میں سیٹھ پرویز کی باتیں اور اس کی حیرت انگیز پیش کش چکرا رہی تھی۔ یہ تو سچ ہے کہ امیر کبیر بننا طارق کا خواب ہے اور وہ اس خواب کی تعبیر پوری ہونے کا ہمیشہ سے منتظر رہا ہے۔ مگر کبھی کوئی صورت دکھائی نہیں دیتی تھی کہ وہ دولت کو اپنی ملازمہ بنا سکے۔ گھر کے حالات بس نارمل تھے۔ کبھی کبھی تنگی ہو جاتی تو مزاجوں میں ترشی بھی آ جاتی تھی۔ پیسہ سب کچھ تو نہیں مگر آج کے دور کی بڑی ضرورت ہے۔ اس سے بہت سی خوشیاں بھی خریدی جا سکتی تھیں۔ طارق بھی زندگی کی تمام خوشیاں یکمشت حاصل کر لینا چاہتا تھا۔ حقیقت میں وہ شارٹ کٹ کے ذریعے آگے بڑھنے والوں میں سے تھا۔ سیٹھ پرویز کی جہاں دیدہ نظروں نے اس کے چہرے کے تاثرات سے یہ بات بھانپ لی تھی' اس لئے اس نے طارق کو بلا کر ایک دوسرے کی ضروریات کا سودا کیا تھا۔ اب یہ طارق کے اوپر تھا کہ وہ سودا قبول کرتا ہے یا رد۔

آج کام کے دوران منیجر نے اسے الگ بلوا کر دوبارہ ڈانٹا بھی تھا۔ ''میں دیکھ رہا ہوں کہ آج تمہارا دل اور

دماغ کام میں نہیں لگ رہا..... دھیان کہیں اور لگا ہوا ہے۔ دل اچاٹ ہوگیا ہے تو بے شک نوکری چھوڑ کر گھر جاسکتے ہو۔''

طارق کا دل چاہا کہ منیجر کے منہ پر گھونسا دے مارے اور تمام دانت باہر کردے۔ اس نے بمشکل اپنی اس دیرینہ خواہش کا گلا گھونٹا اور دھیمی آواز میں جواب دیا۔ بس سر ..... وہ آج طبیعت تھوڑی خراب ہے۔ رات کو بھی بخار ہوگیا تھا۔''

اب چاہے بخار ہو یا کینسر..... کام تو کام ہے۔ وہ تو ہر حال میں کرنا ہے۔ ورنہ اور بھی بہت لوگ بے روزگار گھوم رہے ہیں۔ آج بولوں گا تو کل دس افراد آجائیں گے۔ جا کر کام پر توجہ دو۔ یہ بخار شخار گھر چھوڑ کر آیا کرو۔''منیجر نے روکھے لہجے میں کہا۔

طارق سر ہلاتا ہوا خاموشی سے باہر نکل گیا۔

اس پر ہی منیجر نے اکتفا نہیں کیا۔ رات کو ایک بار پھر اپنے کمرے میں بلا کر ذلیل کیا۔ وجہ بھی کوئی خاص نہیں تھی۔ بس اسے طارق کو بے عزت کرنے کا شوق تھا۔ اس کی ڈانٹ سنتے ہوئے طارق کا دل کررہا تھا کہ قینچی سے اس کی قینچی جیسی زبان کاٹ ڈالے۔ رات کو گھر پہنچنے کے بعد اس نے امی اور فاطمہ سے زیادہ بات نہ کی۔ ابو جلد سونے کے عادی تھے۔ ان سے طارق کی ملاقات کم ہی ہوتی تھی۔ جس وقت صبح ابو اپنے کام پر جاتے تھے اس وقت طارق سو رہا ہوتا تھا اور جب رات کو طارق گھر آتا تھا تو اس کے ابو کی آدھی سے زیادہ رات ہو چکی ہوتی تھی۔

طارق کھانا کھانے بیٹھا تو فاطمہ سونے کے لئے جاچکی تھی۔ امی اس کے پاس آکر بیٹھ گئیں۔ طارق نے چونک کر انہیں دیکھا۔

''آپ بھی جاکے سوجائیں..... میں کھاکے رکھ دوں گا برتن..... جاکر آرام کریں۔''

''بیٹا..... وہ..... بات کرنی تھی ایک؟اس کی امی نے قدرے تردد سے کہا۔

''صبح کرلینا امی.....''

''بیٹا..... صبح کاموں میں دماغ سے بات نکل بھی جاتی ہے۔ وہ کمیٹی کے پیسے دینا ہیں..... چار ہزار روپے۔''

''تو.....؟''طارق کا منہ چلتے چلتے آہستہ ہوگیا۔

''تمہارے ابو سے بھی بولا تھا۔ ان کے پاس بھی نہیں ہیں۔ روز آکے کمیٹی والی جان کھا رہی ہے۔''

''میں کہاں سے دوں ابھی۔''طارق نے کھانے سے ہاتھ کھینچ لئے۔''ابھی تو تنخواہ ملنے میں ایک ہفتہ باقی ہے۔''

امی کی آواز حلق میں پھنسنے لگی۔''تت..... تو میں کس کے آگے ہاتھ پھیلاؤں بیٹا..... میں نے تو سوچا تھا کہ شاید تیرے پاس پیسے ہوں گے۔''

''آپ کو پتا ہے میری کتنی تنخواہ ہے..... پھر آپ نے یہ کیسے سوچ لیا کہ میرے پاس پیسے ہیں؟''طارق بدمزہ ہوگیا تھا۔

سمجھ نہیں آرہا..... کل کمیٹی والی کو کیا بولوں..... اس نے تو کل ہنگامہ کھڑا کردینا ہے۔''پھر وہ اٹھتے ہوئے بولیں۔''اچھا بیٹا..... کل میں شامی صاحب کی بہو سے مانگتی ہوں جاکے..... وہ بہت اچھی ہے۔ منع نہیں کرتی کسی چیز کا۔ بس بار بار میرا منہ نہیں پڑتا مانگنے کا۔''

طارق نے ان کی اس بات پر کوئی تبصرہ نہیں کیا۔ امی چند سیکنڈ اسے دیکھتی رہیں اور پھر اٹھ کر چلی گئیں۔ کھانے سے فارغ ہوکر طارق ہاتھ دھونے گیا تو امی برتن بھی اٹھا کر لے گئیں۔ طارق بستر پر لیٹ کر سیٹھ پرویز سے ہونے والی گفتگو کے بارے میں سوچنے لگا۔ پھر اس کی سوچ کی لہریں اپنے گھر اور معاشی حالات کی جانب مڑ گئیں۔ وہ ایسی سسکتی زندگی گزارنے کا قائل نہیں تھا۔ بس وہ چاہتا تھا کہ ایک دم سے سب کچھ بدل جائے۔ اس کی زندگی یکسر تبدیل ہوجائے۔ یہ بھی کوئی زندگی ہے۔ تھوڑے سے پیسوں کے لئے ذلیل خوار ہوتے رہو اور کہاں سیٹھ پرویز کی شاہانہ زندگی۔

پھر ایک لمحے کے لئے طارق کے دماغ میں عجیب سا خیال آیا کہ سیٹھ پرویز کے ساتھ ''ضرورت'' کے سودے میں صرف ایک قباحت ہے۔ وہ جوان نہیں رہے گا۔ اسے باقی زندگی ایک بوڑھے جسم میں گزارنی ہوگی۔ لیکن ..... لیکن..... یہ بھی تو دیکھنا ہے کہ زندگی کتنی عالی شان اور بادشاہوں جیسی ہوجائے گی۔ چھوٹی چھوٹی چیزوں کے لئے ترسنا نہیں پڑے گا۔ قیمتی ترین شے بھی باآسانی دسترس میں آجائے گی۔ سونے سے پہلے طارق حتمی فیصلہ کرچکا تھا کہ اسے کرنا کیا ہے۔

......☆☆☆......

”مجھے یقین ہے کہ تم نے اچھا فیصلہ کیا ہوگا۔ اپنے حق میں۔“ سیٹھ پرویز نے مسکراتے ہوئے طارق کو دیکھا‘ جو اس کے سامنے بیٹھا تھا۔

”جی......جی سر......“ طارق نے جواب دیا۔ ”مگر......اب یہ سب کچھ ہوگا کیسے؟“

”پہلے یہ بتاؤ کہ تم نے اس بات کا ذکر اور کسی سے کیا ہے؟ میرا مطلب ہے ہمارے سودے کا ذکر؟“ سیٹھ پرویز نے اس سے سوال کیا۔

”کسی سے بھی نہیں......میں کسی سے اس کا ذکر کیوں کرنے لگا۔ میں نے تو گھر میں بھی کسی کو نہیں بتایا۔“

”گڈ......اچھا......ایک بات سن لو۔ جب ہم دونوں ایک دوسرے کے جسم میں آ جائیں گے تو پھر تم سیٹھ پرویز بن جاؤ گے اور اسے دنیا کی کوئی سائنس بھی جھوٹ ثابت نہیں کر سکے گی۔ بالکل اسی طرح میں طارق بن جاؤں گا۔ لہٰذا ضروری نہیں ہے کہ میں کاغذات تمہارے نام کروں۔ تم تو ویسے بھی سیٹھ پرویز بن جاؤ گے۔“ سیٹھ پرویز نے اسے مطمئن کرنے کے لیے تفصیل سے آگاہ کیا۔

بات معقول اور سمجھ میں آنے والی تھی۔ اس لئے طارق نے کسی قسم کے خدشے یا تردد کا اظہار نہیں کیا۔ بس اسے اس بات کا تجسس تھا کہ آخر جسموں کی تبدیلی ہوگی کیسے۔

سیٹھ پرویز نے نیچے رکھا ہوا اپنا بریف کیس اٹھایا اور اسے کھول کر ایک نظر طارق پر ڈالی۔ طارق اسے ہی دیکھ رہا تھا۔ تب سیٹھ پرویز نے مسکراتے ہوئے ایک چھپکلی کے انڈے کے جتنا موتی نکالا اور سامنے ٹیبل پر رکھ دیا۔ طارق موتی کو گھورنے لگا۔ موتی خاصا پرانا دکھائی دیتا تھا اور چمک دار بھی نہیں تھا۔ اسے بھدا سا کہا جائے تو مناسب ہوگا۔

”یہ کیا ہے؟“ طارق کے منہ سے نکلا۔

”موتی ہے......جادوئی سمجھ لو......“

”جادوئی موتی......؟“ طارق مشتبہ نظروں سے سیٹھ کو دیکھنے لگا۔ ”بھلا آج کے دور میں جادوئی شے کہاں سے آ گئی؟“

”مگر یہ حقیقت ہے۔“ سیٹھ پرویز نے موتی اٹھا کر ہتھیلی پر رکھ لیا۔ ”یہ ہمارے خاندان میں کئی نسلوں سے چلا آ رہا ہے۔ یہ میرے پردادا کے بھی دادا کو ایک سپیرے نے کسی احسان کے بدلے میں دیا تھا۔ اس میں یہ خاصیت ہے کہ اس کے ذریعے ہماری نسل کا فرد کوئی بھی ایک خواہش پوری کر سکتا ہے۔ مجھے آج تک کسی خواہش کو پورا کرنے کے لئے اس موتی کی ضرورت نہیں پڑی۔ میرے پاس سب کچھ ہے۔ مگر اب عمر کے اس حصے میں آ کر خواہش کی تکمیل چاہتا ہوں۔ جو میں نے تم سے سودے کی صورت میں کی ہے۔“

”یقین نہیں آ رہا۔“ طارق بڑبڑایا۔

”مجھے معلوم ہے......آج کے جدید دور میں کسی کو بھی یقین نہیں آئے گا۔ مگر یہ سچائی ہے اور اس کے ذریعے میں اپنی خواہش پوری کروں گا۔ اب تیار رہو۔“ یہ کہہ کر سیٹھ پرویز نے موتی کو مٹھی میں دبا لیا اور اس پر دوسرا ہاتھ بھی رکھ دیا۔ ساتھ ہی اس نے اپنی آنکھیں بند کر لیں اور نہ ہی منہ میں کچھ بڑبڑانے لگا۔ طارق حیرت بھری نظروں سے اسے دیکھنے لگا۔ اچانک طارق کو ایسا لگا کہ اس کا دماغ سن ہوتا جا رہا ہے۔ اس نے سر کو ایک جھٹکا دیا۔ مگر کوئی فرق نہیں پڑا۔ تب اس نے سیٹھ پرویز کی جانب دیکھا تو وہ حیران رہ گیا۔ سیٹھ پرویز ایک کی جگہ دو دکھائی دے رہے تھے۔ یہ حیرت انگیز بات تھی جب کہ کمرے کی باقی دکھائی دینے والی تمام چیزیں ٹھیک سے نظر آ رہی تھیں۔ دھیرے دھیرے طارق کی آنکھوں کے سامنے اندھیرے بڑھنے لگے اور پھر اسے کچھ ہوش نہ رہا۔

طارق نے ایک لمبی سی سانس منہ کھول کر لی۔ ایسا کرتے وقت اس کا چہرہ اوپر اٹھ گیا تھا۔ ساتھ ہی اس کی آنکھیں بھی کھل گئیں۔ وہ اب سیٹھ پرویز کے روم میں تھا۔ منظر وہی تھا بس زاویہ تبدیل ہو گیا تھا۔ اچانک اس نے اپنے سامنے والی کرسی پر خود کو بیٹھے دیکھا۔ اسے ایک جھٹکا لگا۔

شاید یہ اس کی بصارت کا دھوکا ہے؟

مگر نہیں......یہ حقیقت تھی۔ وہ اپنے سامنے خود کو بیٹھا دیکھ رہا تھا۔

”یہ......یہ کیا ہو گیا۔“ اس کے منہ سے نکلا۔

”سودا ہو گیا ہے۔“ اس کے سامنے بیٹھے اس کے ہم شکل نے مسرت آمیز لہجے میں کہا۔ ”اب تم سیٹھ پرویز بن چکے ہو اور میں طارق۔ ہم دونوں کی ضرورتیں پوری ہو چکی ہیں۔ اب تو تمہیں اس موتی کے جادوئی ہونے پر کوئی شک

نہیں ہوگا۔''

طارق ایک جھٹکے سے اپنی جگہ سے اٹھنا چاہتا تھا' مگر اس سے اٹھا نہیں گیا۔ اسے اپنے بدن میں پہلی سی طاقت محسوس نہیں ہورہی تھی۔ تب میں قدرے آہستگی سے اٹھا۔ پھر وہ خود کو ٹٹولنے لگا۔ اس کے جسم پر سیٹھ پرویز والے کپڑے تھے وہ اپنے ہاتھوں کا جائزہ لینے لگا۔ اس کے جوان ہاتھ اب بوڑھے ہوگئے تھے وہ سر سے پیر تک بدل گیا تھا۔

''پریشان نہ ہو۔'' اس کے سامنے بیٹھے ہوئے ہم شکل نے اسے مضطرب دیکھ کر کہا۔ ''ہم وہی ہیں' ہماری یادداشت میں موجود تمام باتیں یادیں وہی ہیں۔ سوچیں وہی ہیں۔ بس جسم تبدیل ہوگئے ہیں۔ حقیقت میں اب تم سیٹھ پرویز بن چکے ہو مجھے امید ہے کہ تم بھی اپنی خواہش کی تکمیل کے بعد خوش ہوگے۔ تمہیں وہ سب کچھ مل گیا جو تم حاصل کرنا چاہتے تھے۔''

طارق کا تو دماغ قابو میں نہ تھا وہ بار بار خود کو ٹٹول رہا تھا۔ پھر وہ کمرے کے ساتھ ملحق باتھ روم میں چلا گیا اور وہاں بڑے سے آئینے میں خود کو دیکھنے لگا۔

مگر آئینے میں اسے اپنے بجائے سیٹھ پرویز کا چہرہ دکھائی دیا۔ اس کے دل میں ایک ہوک اٹھی۔ ''یہ...... یہ میں نے کیا کردیا؟'' طارق منہ چھپا کر رونے لگا۔ پھر وہ کچھ دیر بعد باہر نکلا تو دیکھا سیٹھ پرویز اس کا جسم لے کر جا چکا تھا۔

طارق نڈھال نڈھال سا سیٹ پر بیٹھ گیا۔

ایک جھٹکے سے ہی اس کی دنیا بدل گئی تھی۔ وہ جانتا تھا کہ اگر وہ اپنے گھر جائے گا تو اسے کوئی نہیں پہچانے گا۔ کیونکہ اس کے پاس جسم ایک بوڑھے کا تھا۔

طارق بے جان مجسمے کی طرح سیٹ پر بیٹھا چھت کو گھورتا رہا۔

......☆☆☆......

رات کو طارق نے ڈرائیور سے گھر چلنے کا کہا تھا۔ گھر آکر اس کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ وہ ایک بہت بڑا عالیشان بنگلا تھا۔ اس میں دنیا کی ہر آسائش موجود تھی۔ نوکروں کی بڑی تعداد بھی تھی۔ یہ وہ چیز تھی' جس کا اس نے خواب دیکھا تھا۔ اب یہ تمام آسائشیں اس کی اپنی تھیں۔ وہ ایک ایک چیز کو ہاتھ لگا کر دیکھ رہا تھا۔ اس حرکت پر ملازم اسے حیرت سے دیکھ رہے تھے مگر اسے کسی کی پروا نہ تھی۔ یہاں آکر اس کا دکھ خاصا کم ہوگیا تھا۔ وہ دکھ جو اسے آئینے میں اپنی بوڑھی شکل دیکھ کر ملا تھا۔

محض چار دن میں ہی طارق پر یہ حقیقت عیاں ہوگئی کہ اس نے یہ سودا کتنا مہنگا کیا تھا۔ ایک بوڑھے کے روپ میں زندگی کتنی کٹھن اور سست ہوجاتی ہے اس کے پاس دنیا کی ہر شے موجود تھی مگر سگے رشتے نہیں تھے۔ وہ ہر وقت اپنے سامنے ملازمین کی شکلیں دیکھتا رہتا تھا۔ گھر میں بھی اور آفس میں بھی۔ کاروبار کی طرف سے بھی بہت زیادہ مسئلہ نہیں تھا۔ ہر معاملے کو ہینڈل کرنے کے لیے آدمی موجود تھے۔ اسے صرف سائن کرنا ہوتے تھے۔ کھانے کے معاملے پر اس پر سخت پابندیاں لگی ہوئی تھیں۔ رات کا کھانا اس کے سامنے آیا تو بتا لگا وہ بے مزہ اور پھیکا سا تھا۔

''یہ کیا ہے؟'' اس نے قریب کھڑے اپنے سیکریٹری سے پوچھا۔

''سر...... آپ کا کھانا......'' ڈاکٹر نے یہی پرہیزی کھانا کھانے کی ہدایت کی ہوئی ہے۔''

''مگر یہ مجھ سے کھایا نہیں جارہا۔ کوئی ذائقے دار کھانا بنواؤ'' طارق نے ہاتھ کھینچ لیے۔

''سوری سر...... میں یہ نہیں کرسکتا۔''

''کیوں نہیں کرسکتے۔'' طارق دہاڑا۔ ''یہ میرا حکم ہے۔'' ''اور آپ نے ہی مجھے سختی سے ہدایت کررکھی ہے کہ چاہے کچھ بھی ہوجائے۔ پرہیزی کے علاوہ آپ کو کوئی اور کھانا نہ کھلایا جائے۔ ورنہ آپ کی طبیعت اتنی خراب ہوجائے گی کہ آپ کو ہاسپٹلائز کرنا پڑے گا۔'' سیکریٹری اسی انداز میں بول رہا تھا۔ ''آپ کو شاید یاد نہیں آپ نے ایک بار بدپرہیزی کرلی تھی تو آپ کی حالت کتنی بگڑ گئی تھی۔''

طارق خون کے گھونٹ بھر کر رہ گیا۔ چاروناچار اسے وہی بدمزہ کھانا زہر مار کرنا پڑا۔

کھانے سے فارغ ہونے کے بعد دواؤں کی ٹرے آگئی۔ کئی رنگوں کی ٹیبلٹس اور کیپسولز نگلنے پڑے تھے بے وجہ کی تھکاوٹ نے اس کے اعضا مضمحل کردیے تھے۔ ایسا لگتا تھا جیسے وہ سڑکیں کھود کر آیا ہے۔ تھوڑی دیر بعد وہ اپنے پرتعیش کمرے کے جہازی سائز بیڈ پر دراز تھا۔

یہ اس کے روز کا معمول بن گیا تھا۔
تینوں ٹائم پابندی سے دوائیں کھانا، صبح ہلکی پھلکی ایکسرسائز کرنا، پھر سارا دن آفس میں رہنا، ہر چوتھے روز ڈاکٹر کو مکمل چیک اپ کروانا۔ اس کے معمولات کا حصہ بن کر رہ گئے تھے۔ اس کے ملنے جلنے والے بہت تھے مگر وہ صرف کاروباری افراد ہوتے تھے، کاروبار کی باتیں کرنے اور بس۔ کوئی اپنا نہ تھا۔ حالانکہ رشتے دار بہت تھے، مگر کسی کے پاس اتنی فرصت نہ تھی کہ وہ فون پر حال احوال ہی دریافت کرلیتا۔ یہاں تک کہ سگے بیٹے بھی کال تک نہیں کرتے تھے۔ انہوں نے اپنا ایک نیا جہان بسالیا تھا اور ان کے پاس اتنی سی فرصت نہ تھی کہ وہ دو منٹ کے لئے اپنے باپ کو کال کرکے خیریت دریافت کرسکیں۔
بہت جلد طارق کو احساس ہوگیا تھا کہ کنارے کی تلاش میں اس کی کشتی چٹانوں سے ٹکرا گئی تھی۔ اب اسے آئینے میں اپنی شکل دیکھنے سے بھی خوف آتا تھا۔ وہ جو کچھ کربیٹھا تھا اس کا ذمہ دار بھی وہ خود ہی تھا۔ کسی سے شکایت کرسکتا تھا اور نہ کوئی اس پر یقین کرتا۔
اسے اپنے گھر والوں کی یاد آتی تھی۔ ایک دن دل اتنا چاہا کہ وہ ڈرائیور کے ساتھ اپنے گھر کی جانب نکل پڑا۔
''سر اس علاقے میں آپ کو کیا کام پڑ گیا ہے؟'' ڈرائیور حیران رہ گیا تھا۔
''کوئی کام ہے اسی لئے جارہا ہوں۔'' طارق نے سپاٹ انداز میں کہا تھا۔
ڈرائیور نے مزید کوئی سوال نہیں کیا۔ جب گاڑی اس علاقے میں داخل ہوئی جہاں طارق کا گھر تھا اس کے ماں باپ اور بہن وہاں رہتے تھے تو اس کا دل تڑپنے لگا۔ وہ اپنے گھر والوں کو ایک نظر دیکھنا چاہتا تھا۔ اتنی بڑی اور شاندار کار پہلی بار اس علاقے میں آئی تھی۔ بچوں کا رش لگ گیا۔ لوگ بھی حیرت زدہ نظروں سے اسے دیکھنے لگے کہ کہیں بھول کر تو یہ کار یہاں نہیں چلی آئی؟
''کہاں چلنا ہے سر؟'' ڈرائیور نے لوگوں اور بچوں کی بھیڑ بڑھتے دیکھ کر پوچھا۔
''بس اسی گلی کے آخر میں روک لینا۔'' طارق شیشے سے باہر دیکھ رہا تھا۔ یہاں کا چپہ چپہ اس کا دیکھا ہوا تھا۔ حتیٰ کہ ان لوگوں کو بھی جانتا تھا جو باہر کھڑے تھے اور حیرت سے کار کو دیکھ رہے تھے۔ اس علاقے کے لوگ ایک دوسرے کو بخوبی جانتے تھے۔
کیا ان میں سے کوئی یہ سوچ بھی سکتا ہے کہ میں اصل میں کون ہوں؟ طارق کے دل پر ایک گھونسا لگا۔
یہ بات کسی کے گمان میں نہیں آسکتی کہ میں اصل میں طارق ہوں۔ جس کا گھر اس گلی کے کونے پر ہے۔ اور اب جو وہاں طارق رہتا ہے وہ کوئی اور ہے۔ مگر کوئی اسے بھلا کیسے پہچان سکتا ہے۔ اسے تو ماں باپ اور بہن بھی شناخت نہیں کرسکتے۔
کار رکی ہوئی تھی، دو آدمی آگے بڑھے اور ڈرائیور سے پوچھا ''کس کے گھر جانا ہے؟''
''بس وہ گلی کے کونے پر صاحب کو کسی سے ملنا ہے۔'' ڈرائیور نے جواب دیا۔
''گاڑی آگے بڑھاؤ......'' طارق نے کہا۔
پھر ڈرائیور نے گلی کے کونے پر کار روک دی۔ بہت سے بچے ساتھ ساتھ چلے آئے تھے۔
طارق کار سے اترتے ہوئے بولا۔ ''تم ادھر ہی رکو...... میں آتا ہوں۔'' پھر وہ اپنے گھر کی طرف بڑھنے لگا۔ اس کے ہاتھ میں وہی منقش چھڑی تھی جو وہ اپنے ساتھ رکھتا تھا۔ دل کن پٹیوں پر زور زور سے دھڑک رہا تھا پتا نہیں اب کیا ہونے والا ہے۔ دل میں ایک لمحے کے لئے آیا کہ وہ یہاں سے پلٹ جائے...... مگر وہ ایسا نہ کرسکا۔ کم از کم ماں کو ایک نظر دیکھنا چاہتا تھا۔

......☆☆☆......

دھک دھک کرتے دل کے ساتھ اس نے اپنے گھر کے دروازے پر دستک دی۔ جواب میں اسے کسی کے قدموں کی چاپیں سنائی دیں پھر دروازہ کھل گیا۔ سامنے کی بہن کھڑی تھی۔
''جی فرمائیے؟'' فاطمہ نے اسے دیکھتے ہی پوچھا۔
''وہ...... وہ...... یہ طارق کا گھر ہی ہے نا۔'' اس کے دماغ میں دھماکے ہونے لگے۔
''جی ہاں مگر بھائی تو ابھی نہیں ہیں گھر میں۔''
''نہیں ہے...... اوہ...... اوچھا...... تو تم اس کی بہن ہو۔ وہ سوچے سمجھے بغیر بول رہا تھا۔
''جی ہاں۔''

''اور کوئی ہے گھر میں؟''
''امی ہیں۔''
''انہیں بلا سکتی ہو؟''
اتنے میں اس کی ماں خود ہی آ پہنچی۔ ''کون ہے فاطمہ؟''
''امی یہ بھائی سے ملنے آئے ہیں۔ میں نے بتا دیا ہے کہ بھائی تو گھر میں نہیں ہیں۔ جاب پر گئے ہیں۔''
''جی بھائی صاحب۔ کوئی کام ہے آپ کو طارق سے۔'' اس کی ماں نے مہذبانہ لہجے میں سوال کیا۔
طارق کا وجود ریزہ ریزہ ہو رہا تھا لگتا تھا کہ اس کے جسم پر آرے چل رہے ہیں۔ سامنے اس کی ماں کھڑی تھی اور وہ اسے ماں کہنے سے قاصر تھا۔ ماں بھی اسے شناخت نہیں کر سکتی تھی۔ اس کا صاف مطلب تھا کہ انسان کی پہچان اس کا چہرہ ہوتا ہے چہرے کو نقاب کے پیچھے چھپا لیا جائے تو شناخت مشکل ہو جاتی ہے اور چہرہ ہی بدل جائے تو بھی پہچاننا ناممکن ہو جاتا ہے۔ یہاں تو طارق سر سے پیر تک بدل گیا تھا۔ اگر اسے ماں نے نہیں پہچانا تو یہ ممتا کا قصور نہیں۔ نظروں کا تھا۔ نظروں کی راہ میں ایک اجنبی چہرہ حائل ہو گیا تھا۔
''جی...... جی...... کام تھا۔'' بمشکل اس کے منہ سے نکلا۔
''تو اسے کال کر لیں...... نمبر تو ہوگا آپ کے پاس۔''
''ہاں...... ہے تو...... بس وہ میں یہاں سے گزر رہا تھا سوچا کہ ملتا جاؤں۔ ویسے ابھی کال کرنے کا فائدہ ہی نہیں ہے۔ وہ تو نوکری پر ہوگا۔ میں بعد میں کال کر لوں گا۔''
''آپ کا نام؟''
''طا......'' طارق کو یاد آیا کہ وہ سیٹھ پرویز کے روپ میں ہے اس لئے اس نے فوراً کہا۔ ''اسے بتا دیجئے گا پرویز صاحب آئے تھے۔ سیٹھ پرویز۔''
''اچھا ٹھیک ہے۔ آپ اندر آ جائیں...... چائے'' اس کی ماں نے راستہ چھوڑتے ہوئے کہا۔ سیٹھ سے وہ مرعوب ہو گئی تھی۔
''نہیں...... پھر کبھی سہی۔ اب میں چلتا ہوں۔'' طارق سلام کر کے پلٹ گیا۔
اتنی دیر وہ اپنی ماں کے سامنے جس حوصلے سے کھڑا رہا تھا یہ اس کا دل ہی جانتا تھا۔ کیسی بدقسمتی تھی وہ کیا کر بیٹھا تھا۔ اب اسے اس بات کا شدت سے احساس ہو رہا تھا کہ اس نے بہت بھیانک غلطی کی ہے۔ اس نے دولت حاصل نہیں کی تھی اپنے آپ کو دے کر بیماریوں کی پوٹ لے لی تھی۔ اپنی عمر کا سودا کیا تھا ایک ہی چھلانگ میں وہ چالیس سال آگے چلا آیا تھا۔ محض دولت کی خاطر۔ اب اسے احساس ہو رہا تھا کہ سیٹھ پرویز تو سراسر فائدے میں رہا تھا۔ نقصان تو اس نے اپنا کیا تھا۔ وہ نوجوان تھا۔ محنت کر کے دولت کما سکتا تھا اور پھر سب سے بڑھ کر یہ کہ اس نے اپنے سگے رشتے کھو دیئے تھے۔ وہ لاکھ انہیں اپنے بارے میں بتائے مگر کوئی اس کی بات کا یقین نہیں کرے گا۔ طارق یہ باتیں سوچتا ہوا گاڑی میں آ بیٹھا۔ اب اس نے ایک فیصلہ کر لیا تھا۔ اسے یاد آیا کہ وہ جادوئی موتی تو اس کے پاس آفس کی میز کی دراز میں ہے مگر اس کے لئے سیٹھ پرویز کا ہونا بھی ضروری ہے کیونکہ اس کا جسم تو سیٹھ کے پاس ہی تھا۔
''میں اپنا جسم واپس لوں گا۔'' طارق نے چلتی گاڑی سے باہر دیکھتے ہوئے سوچا۔ ''نہیں چاہئے مجھے یہ سب دولت اور یہ آسائشیں...... اور یہ بیماریاں۔ یہ بوڑھا جسم۔ نہیں چاہئے۔''
اس نے آنکھیں بند کر کے سیٹ سے سر ٹکا لیا۔
''کیا آپ اس سودے سے خوش ہیں؟'' طارق نے اپنے سامنے بیٹھے ہوئے سیٹھ پرویز کو دیکھتے ہوئے استفسار کیا۔ ''یا پھر...... کوئی پچھتاوا ہے؟'' سیٹھ پرویز جو طارق کے روپ میں تھا۔ بے ساختہ ہنس پڑا۔ طارق حیرت سے اسے دیکھ کر بولا۔ ''اس میں ہنسنے والی کون سی بات ہے؟''
''کیا تم نے صرف یہی معلوم کرنے کے لئے بلوایا ہے۔ اور اس لئے میرے گھر گئے تھے؟'' سیٹھ پرویز نے تمسخرانہ لہجے میں کہا۔
''آپ میرے سوال کا جواب دیں۔'' طارق نے غصہ ضبط کیا۔ سیٹھ پرویز نے گہری سانس لی۔ اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ گہری ہو گئی تھی۔ ''سچ پوچھو تو میں بہت خوش اور مطمئن ہوں اور امید کرتا ہوں کہ تم بھی ہو گے۔ کیونکہ ہم دونوں کی جو جو خواہش یا ضرورت تھی وہ پوری ہو گئی

ہے۔ خوش تو دونوں کو ہونا چاہئے۔"

"مگر......" طارق نے ٹیبل کی دراز میں سے جادوئی موتی نکال کر ٹیبل کی سطح پر رکھ دیا۔ "میں کچھ اور چاہتا ہوں۔"

"کچھ اور؟" سیٹھ پرویز چونکا۔ "کیا مطلب کچھ اور؟"

"میں اس بوڑھے جسم کو پا کر خوش نہیں ہوں۔" طارق نے بتانا شروع کیا۔ حالانکہ اس کے ساتھ مجھے بے پناہ دولت اور دنیا کی ہر آسائشیں بھی ملی ہے لیکن کیا فائدہ ایسی دولت اور آسائش کا۔ جن سے میں لطف اندوز نہیں ہو سکتا اور اب میں نے اپنے سگے رشتوں کو بھی کھو دیا ہے......ماں......باپ، بہن اپنی جوانی......سب کچھ بیچ کر دولت خرید لی ہے۔ مجھے احساس ہو گیا ہے کہ میں لالچ میں......شارٹ کٹ کے چکر میں اندھا ہو گیا تھا۔"

"میں نے تو تمہیں سوچنے کے لئے وقت بھی دیا تھا۔ اور تم نے یہ سودا بہ ہوش وحواس بہ رضا و رغبت کیا تھا۔ اس سودے میں میری کسی زبردستی یا دباؤ کا کوئی دخل نہیں تھا۔ پھر اب یہ اچانک کیا ہو گیا؟" سیٹھ پرویز نے پوچھا۔

"مجھے اپنا آپ یاد آ رہا ہے......اپنے گھر والے یاد آ رہے ہیں۔" طارق نے روہانسا ہو کر کہا۔ "بس میں چاہتا ہوں کہ مجھے میرا جسم واپس مل جائے۔ تاکہ مجھے اپنی اصل شناخت مل جائے۔ اپنے سگے مل جائیں۔" اس نے جادوئی موتی کی طرف اشارہ کیا۔ "یہ رکھا......تمہارا وہ جادوئی موتی......بس اب میں اس سودے پر ایک لمحہ بھی مزید قائم نہیں رہ سکتا۔ مجھ پر رحم کریں۔" طارق باقاعدہ لجاحت پر اتر آیا تھا۔

سیٹھ پرویز متاسفانہ نظروں سے اسے دیکھ رہا تھا۔ پھر ایک گہری سانس لے کر موتی اٹھا لیا۔ "مجھے افسوس ہے مائی ڈیئر......ایسا نہیں ہو سکتا۔"

"کیوں......کیوں نہیں ہو سکتا؟" طارق بے چین ہو کر تیز آواز میں بولا۔ "ہو نہیں سکتا......یا تم چاہتے نہیں ہو؟"

"اب میرے چاہنے اور نہ چاہنے سے کچھ نہیں ہو سکتا۔ اب یہ کسی کے اختیار میں نہیں ہے۔" سیٹھ پرویز نے ہونٹ بھینچ لئے۔

"سب کچھ ہو سکتا ہے۔" طارق ایک دم ہتھے سے اکھڑ گیا۔ "تم غلط بول رہے ہو۔" وہ شدت جذبات سے تم پر اتر آیا تھا۔ "اصل میں اب تم سودا واپس کرنا ہی نہیں چاہتے ہو۔ تم نے اسی موتی کے ذریعے یہ سب کچھ کیا تھا۔ تو یہ رہا موتی۔ اب وہ کرو جو میں کہہ رہا ہوں۔"

"کیا تمہیں یاد نہیں۔" سیٹھ پرویز نے آگے جھکتے ہوئے کہا۔ "میں نے موتی کے بارے میں کیا بتایا تھا؟

"کیا......کیا بتایا تھا......مجھے کچھ یاد نہیں۔"

"یہی کہ اس موتی میں یہ خاصیت ہے کہ یہ ایک نسل کے فرد کی کوئی ایک خواہش پوری کر سکتا ہے اور میں ایسا کر چکا ہوں میرے عزیز۔

"بکواس کرتے ہو تم۔" طارق حلق کے بل چیخا۔ "دھوکے باز......تم مجھے بے وقوف بنا رہے ہو۔" زور سے چلانے کی وجہ سے طارق کو زوردار کھانسی آ گئی۔

"یہ سچ ہے۔ چیخنے چلانے سے کچھ حاصل نہیں ہوگا۔" سیٹھ پرویز نے سنجیدگی سے کہا۔ "اب کچھ بھی نہیں ہو سکتا۔ کچھ بھی نہیں۔ اس کا حاصل صرف یہ ہے کہ تم نے سودے کے بدلے جو کچھ حاصل کیا ہے وہ سب کچھ تمہیں چاہئے تھا۔" سیٹھ پرویز یہ کہتے ہوئے کھڑا ہو گیا۔ "اور ہاں ایک بات اور۔ اب یہ موتی کسی کام کا نہیں ہے۔ اس کی حیثیت ایک بے کار پتھر سے زیادہ نہیں ہے۔ باقی رہا میں۔ تو میں بہت خوش ہوں۔ مجھے سب سے زیادہ سگے رشتوں کی ضرورت تھی۔ وہ مجھے ماں، باپ اور بہن کی صورت میں مل گئے۔ یہ انمول رشتے ہیں۔ جن کا تم نے مول لگایا تھا۔ خدا حافظ۔"

یہ کہہ کر سیٹھ پرویز وہاں سے چلا گیا۔

طارق پھٹی پھٹی نظروں سے بند دروازے کو دیکھتا رہ گیا۔ اس کے پاس اب کچھ نہیں بچا تھا۔ اب اسے یاد آ گیا تھا کہ موتی کے بارے میں سیٹھ پرویز نے شروع میں ہی اسے یہی بات بتائی تھی، مگر اس کے سر پر تو امیر کبیر انسان بننے کا بھوت سوار تھا اس لئے اس نے کوئی خاص توجہ نہیں دی تھی۔

طارق تھکے تھکے انداز میں سیٹ پر ڈھیر ہو گیا اور اپنے بوڑھے، جھریوں بھرے ہاتھوں کو دیکھنے لگا۔



آخری حصہ

عشق کسی کی ذات نہیں

امجد جاوید

عشق حقیقی ہو یا مجازی، عشق پر کسی کی اجارہ داری نہیں ہوتی۔ عشق چاہے اپنے مقصد کے لیے ہو، کسی ذات سے ہو یا پھر رب تعالیٰ سے، وہ اپنا آپ منوا لیتا ہے۔ حق و باطل کے درمیان اپنے کردار سے وہی لکیر کھینچ سکتا ہے جس کے پاس آفاقی سچائی ہو۔ قوت عشق سے وہ میدان عمل میں اترتا ہے جو ایک کردار کی شہادت دیتا ہے۔ انسانی ذات ہی وہ میدان عمل ہے جہاں حاصل عشق کا ظہور ہوتا ہے۔

ایک دوشیزہ کی کہانی جو معاشرے کی روایتی پابندیوں کو توڑ کر اپنے کردار سے یہ ثابت کر دیتی ہے کہ من سچا ہو تو زمانہ جھک جاتا ہے۔

عشق اور حاصل عشق کے درمیان ڈولتی ہوئی دل گداز کہانی، قارئین نئے افق کے لیے تو شہ خاص۔



READING
Section

"تمہارے دماغ پر نجانے کس نے پردہ ڈال دیا ہے۔ زندگی سنور جائے گی تمہاری۔" اس کی ماما نے نخوت سے کہا۔

"مجھے ایسی زندگی نہیں چاہیے جہاں عورت کی تذلیل ہوتی ہو۔ مغربی معاشرہ اپنی عورت کو حیوانی سطح پر لاکر ذلیل کر چکا ہے۔ مغربی مفکر جو اسلامی دنیا کی مظلوم عورت کے غم میں گھلے جا رہے ہیں۔ پہلے اپنی عورت کو تو احترام دیں۔ کیا انہیں نہیں معلوم اللہ کے نبی ﷺ نے چودہ سو سال پہلے عورت کو وہ حقوق دیئے ہیں جو آج تک کوئی معاشرہ نہیں دے سکا۔ وہ تو چاہیں گے کہ ساری دنیا ان کے جیسی ہو جائے۔ اسلامی دنیا میں عورت کو ٹارگٹ بنا کر اس سے حیا چھین لینا چاہتے ہیں۔ آپ ماما' میرے بارے میں فکر مند نہ ہوں۔ انشاءاللہ میرا اللہ میرے ساتھ بہت اچھا کرے گا۔" سعدیہ نے انہیں سمجھاتے ہوئے کہا۔

"اگر تمہارا معاملہ تم پر چھوڑ بھی دیا جائے تو اس کے اثرات ہمارے خاندان پر پڑیں گے۔ میں نہیں چاہتی کہ ہمارا تاثر شدت پسند والا بن جائے۔ لہٰذا یہ حجاب وغیرہ ختم کرو اور سیدھے سیدھے۔"

"میں حجاب ختم نہیں کر سکتی۔" سعدیہ نے دوٹوک انداز میں کہا۔ تو اس کے پاپا نے بڑے پیار سے سمجھایا۔

"بیٹی! میں چاہتا ہوں کہ تم بہت ترقی کرو، آگے بڑھو۔ اس حجاب کی وجہ سے تمہاری آزادی محدود ہو کر رہ جائے گی۔ نہ تمہارا معاشرتی رابطہ رہے گا اور نہ ہی تم ترقی کر پاؤ گی۔ تمہارے ساتھ امتیازی سلوک ہو گا۔ تم میڈیا کی تعلیم حاصل کر چکی ہو۔ دنیا کے ان مراکز میں جاؤ جہاں سے علم ملتا ہے اور کچھ کر کے دکھاؤ۔ کیا تم اپنی تعلیم یونہی ضائع کر دو گی؟"

"پاپا! اگر حجاب نہ پہننا ترقی ہے اور اس سے معاشرتی رابطہ نہیں رہتا تو ٹیلی فون، فیکس، ڈاک، ای میل اور ریڈیو پر چہرہ دکھائی نہیں دیتا۔ اسے تو اب تک ختم ہو جانا چاہیے۔ میں نے میڈیا کی تعلیم حاصل کی ہے تو انشاءاللہ میں اس میں اپنی بساط بھر کچھ نہ کچھ تو کروں گی۔ اسلام عورت کو گھر کی چاردیواری میں قید نہیں کرتا اور نہ ہی بے لگامی دیتا ہے کہ تم جو چاہو سو کرو۔"

"لیکن حجاب کرنے والے طبقے میں عورت محدود ہے۔ انہیں تو گھر کی چاردیواری میں قید رکھا ہوا ہے۔ کیا تم اس سے انکار کر سکتی ہو۔" اس کے بھائی نے طنزیہ لہجے میں کہا۔

"میں تمہاری بات سے انکار نہیں کرتی، ممکن ہے تم درست کہہ رہے ہو لیکن' اسلام عورت کو علم و فنون حاصل کرنے اور معاشرتی تعلقات قائم کرنے کی اجازت دیتا ہے۔ گھروں سے نکلنے، علمی مجالس میں، قومی درس گاہوں میں، مساجد کی جماعتوں میں، جہاد و غزوات میں، درس و تدریس میں مسلمان عورت کی عظیم تاریخ رہی ہے۔ ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہؓ کا درس جامع عالم ہے۔ سیدۃ النساء حضرت فاطمہؓ اور حضرت نائلہؓ کی تقریریں، بنو عباس کے دور میں آئیں تو ام الفضل ریاضی و ہیت میں کمال درجہ رکھتی تھیں۔ خلیفہ مامون الرشید کی بیوی بوران، یونانی، لاطینی اور عربی زبانوں اور فلسفے کی ماہر، علم ہیت اور اجرام فلکی کی ماہر۔ جس کی اپنی درس گاہ تھی اور....."

"ہم موجودہ دور کی بات کر رہے ہیں۔" اس کے بھائی نے ٹوک دیا۔

"اس دور میں جہاں مسلمانوں کی اپنی کمزوریاں ہیں۔ وہاں غیر مسلم اس کا فائدہ اٹھا رہے ہیں۔" یہ کہہ کر اس نے اپنے پاپا کی جانب دیکھا اور بولی۔ "پاپا! میں نے میڈیا کی تعلیم حاصل کی ہے تو میرا حق بنتا ہے کہ ایک مسلمان عورت ہونے کے ناتے، مسلمان عورت کے خلاف جو زہر اگلا جا رہا ہے، اس کی درست تصویر پیش کروں۔ سامراجی قوتوں نے جو ہمارے گھروں میں نقب لگائی ہے۔ عورت کو گمراہ کرنے کی کوشش کی ہے۔ میں اپنی بساط بھر کوشش کروں۔ خدا کے لیے آپ میرا ساتھ دیں۔ میں کم از کم ان عورتوں کو تو بتا سکوں جو اسلامی اقدار اور روایات کو سینے سے لگائے، اپنی اگلی نسل کو اسلامی رنگ میں پروان چڑھا رہی ہیں۔"

"کیسی فلسفیانہ باتیں کر رہی ہو، بے عملی والی بات کیوں کرتی ہو؟" اس کے پاپا نے کہا۔

"نہیں پاپا، آج بھی ایسی عورتیں موجود ہیں جو اپنی جان کا نذرانہ دے کر اس دینی فریضے کی پاسداری کر رہی ہیں۔ کیا آپ کو معلوم نہیں، جرمنی کے شہر درسدن میں مصری خاتون مروہ الشربینی۔ اس کا پڑوسی ایگول ڈبلیو اس حجاب پہننے پر طنز کا نشانہ بناتا اور اسے ہراساں کرنے کی کوشش کرتا۔ عدالت نے ایگول کے رویے کو تشددانہ قرار دے کر جرمانہ کر دیا۔ اس پر ملزم نے اپیل کی۔ پیشی کے دن عدالت نے مروہ کو بیان دینے کے لیے روسٹرم پر بلایا۔ تب جنونی ایگول نے خنجر سے

یکے بعد دیگرے اٹھارہ وار کیے۔ جس سے وہ شہید ہوگئی۔"
"عدالت کو کیا معلوم کے ایگزل کیا ارادہ رکھتا ہے۔" اس کے پاپا نے کہا۔
"عدالت میں مروہ کا شوہر عکاظ علوی اور کمسن بچہ بھی موجود تھا۔ مروہ خود چار ماہ کی حاملہ تھی۔ عکاظ علوی اپنی بیوی کو بچانے کے لیے لپکا۔ قاتل نے اس پر بھی وار کیا۔ سیکورٹی اہلکاروں نے قاتل کو پکڑنے کی بجائے عکاظ علوی کو گولی مار کر زخمی کر دیا۔ کمسن بچے کے سامنے اس کے ماں باپ خون میں لت پت ہیں، وہ چیخ رہا ہے۔ کس نے ان کی مدد کی؟ اس لیے کہ وہ مسلمان تھے؟ یہ ہے مغرب کا انصاف اور عورت کی آزادی؟"
اس کی بات پر کوئی نہیں بولا تو اس نے کہا۔
"عینی شاہدین کے مطابق، قاتل مروہ کے سر سے اسکارف اُتار کر اسے بھری عدالت میں ذلیل کرنا چاہتا تھا۔ مروہ نے اپنی آخری سانسوں میں یہ کوشش کی کہ اس کا اسکارف نہ اترنے پائے۔ قاتل خنجر سے وار کرتا رہا اور مروہ الشربینی نے اپنے کردار سے شہادت دے دی۔ وہ شدت پسند نہیں، عدالت کے سیکورٹی اہلکار اور ایگزل کے علاوہ جرمن حکومت شدت پسند ہے۔ جنہوں نے انصاف کی بجائے اس واقعے پر پردہ ڈالنے کی کوشش کی۔ مروہ الشربینی تو شہادت پاکر ثابت کر گئی کہ اس نے فرمان رسول ﷺ اور سنت سیدة الزہرہؓ کی پاسداری کی اور آپ مسلمان ہو کر مجھے حجاب سے روک رہے ہیں۔"
"تمہارے ارادے بہت خطرناک ہیں لڑکی۔" اس کی ماما نے حیرت اور تشویش سے کہا۔
"لیکن میں فیصلہ کر چکی ہوں۔" اس نے حتمی انداز میں کہا۔
"تم جب پابندیوں میں رہ کر، اسلامی شدت پسندوں کے ہاتھوں آنسو بہاؤ گی تب تجھے سمجھ آئے گی کہ تم کن لوگوں کے چنگل میں پھنس گئی ہو۔" اس کی ماما نے دکھ سے کہا۔
"بیگم! اسے اس کے حال پر چھوڑ دو۔ فی الحال یہ برین واش ہو چکی ہے۔ اسے سمجھانا پڑے گا۔ تم ان لوگوں کو تلاش کرو جو اسے گمراہ کر رہے ہیں۔ پھر دیکھتے ہیں۔" اس کے پاپا نے انتہائی سنجیدگی سے کہا اور اٹھ گئے۔ ان سب کے درمیان خاموشی چھا گئی تھی۔ تبھی اس کا بھائی بھی اٹھ گیا۔ جبکہ سعدیہ سوچ رہی تھی کہ میں ایک مسلم معاشرے میں اس قدر تنقید کا شکار ہو رہی ہوں۔ آفرین ہے ان عورتوں پر جو مغربی معاشرے میں رہ کر حجاب کی پابندی کر رہی ہیں۔ بلاشبہ وہ زیادہ مضبوط ایمان کی عورتیں ہیں۔



شبانہ وقار اس پارک میں پہنچ گئی جہاں زرق شاہ نے اسے بلایا تھا۔ وہ وسیع وعریض پارک تھا۔ اس نے لائبریری کے سامنے گاڑی پارک کی ہی تھی کہ اس کی نگاہ زرق شاہ پر پڑی۔ وہ اپنی گاڑی میں سے بیساکھیوں کے سہارے اتر رہا تھا۔ اس کا ڈرائیور اسے اترنے میں مدد دے رہا تھا۔ وہ دیکھ رہی تھی۔ زرق شاہ وہاں سے ایک جانب چل پڑا۔ شبانہ نے گاڑی لاک کی اور اس کے پیچھے پیچھے جانے لگی۔ وہ ایک گھنے پیڑ کے نیچے رک گیا، جس کے نیچے اردگرد لکڑی کا بینچ بنا ہوا تھا۔ وہ بیٹھا ہی تھا کہ شبانہ اس کے پاس پہنچ گئی۔ زرق شاہ نے اسے خوشگوار حیرت سے دیکھا پھر علیک سلیک کے بعد وہ آمنے سامنے بیٹھ گئے۔
"میں سوچ بھی نہیں سکتا کہ آپ یوں میرے سامنے ہیں۔ لگتا ہے میں خواب دیکھ رہا ہوں۔" زرق شاہ نے اپنے لہجے کو جذباتی بناتے ہوئے خوشگوار انداز میں کہا۔
"لیکن یہ حقیقت ہے کہ میں آپ کے سامنے ہوں۔" شبانہ نے نرم لہجے میں کہا۔
"کہاں سامنے ہیں۔ آپ کو دیکھنے کے لیے تو میں ترس گیا ہوں۔" وہ حسرت آمیز لہجے میں بولا۔
"یہی اس حجاب کا منشا و مقصود ہے کہ آلودہ نگاہوں سے محفوظ رہا جائے۔" اس نے نہایت سکون سے کہا۔
"تو......" وہ کہتے کہتے رک گیا۔ پھر لمحہ بھر تاخیر سے بولا۔ "شبانہ، میں نے جب سے آپ کو دیکھا تب سے آپ میرے ذہن ہی میں نہیں، من میں بھی سما گئی ہیں۔ جبکہ مجھے یہ تک خبر نہیں کہ میرے لیے آپ کے دل میں کوئی نرم گوشہ بھی ہوگا؟" وہ پھر اسی حسرت آمیز لہجے میں بولا۔
"نرم گوشہ ہے تو میں آپ کے پاس یوں بیٹھی ہوں۔ کیا آپ کہہ سکتے ہیں کہ یہ اجنبیت ہے؟" وہ بولی۔
"نہیں...... اجنبیت نہیں، لیکن جب من میں پیار سما جائے، محبت بے چین کر دے اور پھر نارسائی ہو، تب کرب انگیز کیفیت کے سوا اور کیا ہوتا ہے۔" وہ اپنا احساس بیان کرتے

ہوئے بولا۔
"تو گویا آپ مجھ سے محبت کرتے ہیں۔" شبانہ نے اطمینان سے کہا۔
"کوئی شک نہیں، یہ نارسائی اس طرح رہی تو یہ محبت عشق میں بدل سکتی ہے۔" وہ عزم سے بولا۔
"تو آپ نے مجھے یہاں اس لیے بلایا ہے کہ اپنی محبت کا اظہار کر سکیں؟" اس نے پوچھا۔
"اپنا حال بیان کر رہا ہوں۔" وہ درد انگیز لہجے میں بولا۔
"دیکھیں شاہ جی! میں ایک لڑکی ہوں۔ ظاہر ہے میری شادی ہو گی اور یہ حق میرے والدین کا ہے کہ وہ میرے لیے کیسا شوہر تلاش کرتے ہیں۔ مجھے ان پر اعتماد ہے۔ مجھ تک رسائی کا واحد طریقہ یہی ہے۔" شبانہ نے حتمی لہجے میں کہا۔
"تو آپ اعتراف کر رہی ہیں کہ آپ کی کوئی مرضی نہیں۔ آپ کی پسند و ناپسند کو ذرا بھی اہمیت نہیں دی جاتی۔ وہی چار دیواری میں قید رکھنے والے شدت پسند۔" وہ کہہ رہا تھا کہ شبانہ نے ٹوک دیا۔
"نہیں شاہ جی، ایسی کوئی بات نہیں۔ یہ حق میرے والدین کا ہے۔ وہ میں انہیں دینا چاہتی ہوں اور میرا یقین ہے کہ وہ میرے لیے جو کریں گے بہتر کریں گے۔"
"کوئی شخص اگر آپ سے محبت کرتا ہے تو اس کی محبت رائیگاں جائے گی؟" اس نے پوچھا۔
"یہ کیا کہہ رہے ہیں آپ، محبت تو رائیگاں نہیں جاتی۔" اس نے جذب سے کہا۔
"جو راستہ آپ نے مجھے بتایا۔ اس راہ پر چلتے ہوئے تو میں کبھی آپ کو حاصل نہیں کر سکتا۔ یہ جو بیساکھیاں میرے پاس ہیں، یہ کسی حادثے کی وجہ سے نہیں، آپ کی دی ہوئی ہیں۔ میں نے آپ سے شکوہ یا شکایت اس لیے نہیں کی کہ مجھے آپ سے محبت ہے۔" وہ جذباتی انداز میں بولا۔
"میں نے کیسے دیں یہ بیساکھیاں؟" اس نے حیرت سے پوچھا تو وہ انتہائی جذباتی لہجے میں بولا۔
"آپ کے بھائی نے چند غنڈوں کو بھیجا۔ اب میں انہیں غنڈے بھی نہیں کہہ سکتا۔ وہ آپ کی جاسوسی کرتے ہیں۔ نگرانی کرتے ہیں۔ آپ جو آزادی کی بات کر رہی ہیں وہ سراسر غلط ہے، جھوٹ ہے، میں کیسے مان لوں"
"کیا یہ..... انہوں نے؟" وہ حیرت سے بولی۔
"ہاں، نہیں یقین، تو پوچھ لیں ان سے۔ تصدیق کر لیں۔ اب وہ کسی قیمت پر آپ تک رسائی نہیں دیں گے۔ کس آزادی کی بات کر رہی ہیں آپ؟" اس نے سنجیدگی سے کہا۔
"ایسا اگر انہوں نے کیا ہے تو غلط کیا ہے۔ انہیں کم از کم مجھ سے پوچھ لینا چاہیے تھا۔" وہ دکھ سے بولی۔ "لیکن میرے بھائی کا جو فرض تھا۔ اس نے نبھایا۔ مجھے بتائیں انہیں اور کیا کرنا چاہیے تھا؟"
"اگر میں مجرم تھا۔ مجھے سزا دینا تھی تو اتنی گنہ گار آپ بھی تھیں۔ میں نے کوئی دست درازی نہیں کی تھی جو مجھے جان سے مار دینے والا معاملہ کیا گیا۔ آپ سے کیوں نہیں باز پرس ہوئی؟ یہ ناانصافی ہے۔ میں کہتا ہوں میرا جتنا جرم بنتا اتنی ہی سزا ملتی۔" اس کے لہجے میں احتجاج بھرا ہوا تھا۔
"میں خود کو سزا کے لیے پیش کرتی ہوں۔" اس نے اعتماد سے کہا۔
"میں بھلا آپ سے کیا کہہ سکتا ہوں۔ کوئی اپنی محبت کے لیے بھی سزا تجویز کرتا ہے۔" وہ آہستہ سے بولا۔ لہجے میں جہاں بھر کا پیار سمٹا ہوا تھا۔
"محبت، شاہ جی، میں جانتی ہوں کہ محبت کیا ہوتی ہے اور عشق کس کا نام ہے۔ یہ جس محبت وغیرہ کی باتیں آپ کر رہے ہیں۔ یہ سب فضول ہیں۔ مجھے یہ بھی معلوم ہے کہ حیا کی حد کیا ہے اور کہاں سے فحاشی شروع ہوتی ہے۔ میں دعوے سے کہہ سکتی ہوں کہ آپ عشق و محبت کی ابجد سے بھی نہیں واقف۔" وہ انتہائی جذباتی لہجے میں بولی۔
"میں محبت سے نہیں واقف؟" اس نے حیرت سے کہا۔
"ہاں، آپ نہیں ہیں واقف۔ خیر بتائیں، آپ نے مجھے یہاں پر کس لیے بلایا ہے؟" اس نے انتہائی سنجیدگی سے کہا تو وہ چند لمحے اس کی طرف دیکھتا رہا۔ اسے شبانہ کا یوں جھٹک دینے والا انداز بالکل بھی اچھا نہیں لگا تھا۔
"ہاں، آپ کے کہنے کے مطابق، میں نے پہلی ملاقات کو یاد کیا، مجھے یاد آ گیا، ایک سوال باقی ہے۔ جس کے بارے میں آپ نے کہا تھا جب چاہوں، جہاں چاہوں بات کر سکتا ہوں۔" اس نے مرجھائے ہوئے لہجے میں کہا۔
"بھلا کیا کہا تھا میں نے؟" شبانہ نے دہرانا چاہا تو زرق شاہ نے یوں پوز کیا جیسے یاد کر رہا ہو۔ حالانکہ یہی تو وہ الفاظ تھے جن کی چبھن سے وہ اس حال تک پہنچا تھا۔ یہی کرب اسے

انتقام پر اکساتا تھا۔ وہ الفاظ وہ کیسے بھول سکتا تھا۔ چند لمحوں بعد وہ بولا۔

"ہاں یاد آیا آپ نے کہا تھا۔ آپ کون ہیں اور کیا کر رہے ہیں؟ کیا کبھی آپ نے غور کیا کہ آپ کی نسبت اسلامک کلچر سے بنتی بھی ہے یا نہیں۔ اگر آپ کو معلوم نہیں ہے کہ آپ کس ثقافت سے تعلق رکھتے ہیں تو آپ جہاں چاہیں، میں اس پر بات کرنے کے لیے تیار ہوں۔ میں نے جو نقاب لیا ہے تو کم از کم میں اپنی نسبت سے منافقت نہیں کر رہی۔ فیصلہ آپ کر لیجیے۔"

"تو شاہ جی! آپ کو اب تک پتہ نہیں چلا کہ آپ کی نسبت اسلامک کلچر سے بنتی بھی ہے یا نہیں اور آپ کون ہیں؟" اس نے انتہائی نرم انداز میں کہا۔

"میرے خیالات تو آپ کو معلوم ہو گئے تھے۔ آپ بتائیں؟" وہ اس کی جانب غور سے دیکھتے ہوئے بولا۔

"شاہ جی! آپ سیّد ہیں اور آپ کی نسبت ہندوستانی ہے یا اسلامی کلچر والے لوگوں سے۔ آپ کے آباؤ اجداد ہندو تھے یا وہ لوگ جن کی وجہ سے اسلامی کلچر بنا؟"

"اُوہ! ظاہر ہے ہم آل رسولؐ میں سے ہیں۔" وہ بری طرح چونکتے ہوئے بولا۔ شبانہ خاموش رہی کہ وہ اس لمحے سوچ لے جو سوچ سکتا ہے۔ تب اس نے کہا۔ "میرے کہنے کا مطلب یہ تھا کہ ہماری معاشرت، اب ہم جو یہاں رہ رہے ہیں، ہمارا وطن، ہمارا کلچر تو یہی۔" وہ کہتے کہتے ڈگمگا گیا۔

"آپ جانتے ہیں نسبت کیا ہوتی ہے؟"

"آپ ٹھیک کہہ رہی ہیں شبانہ۔ میں سیّد فیملی سے متعلق ہوں اور میری نسبت اس آل رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے بنتی ہے۔" وہ سر جھکاتے ہوئے بولا۔

"تو کیا پھر آپ اپنی نسبت سے منافقت نہیں کر رہے ہیں۔ اب یہ سوچنا یا نہ سوچنا آپ کا کام ہے۔ ہاں میں آپ کو اتنا بتا دینا چاہتی ہوں، میں اپنی نسبت سے منافقت نہیں کر رہی ہوں میری نسبت ام المومنین عائشہ صدیقہؓ سے ہے۔ میری نسبت خاتون جنت فاطمہ الزہرہؓ سے ہے۔ میری نسبت اس خاتون حضرت سمعیہؓ سے جو پہلی شہید خاتون ہیں۔ دنیا کی ہر عورت ان جلیل القدر عظیم خواتین سے اپنی نسبت بنا سکتی ہیں۔ اصل میں یہ نسبت ہے کیا۔ یہ کوئی خاندانی میراث نہیں، وہ عظیم سوچ و فکر ہے، جس نے اپنائی، اسی کی نسبت ہو گئی۔ کیونکہ اسلام ذات پات، رنگ و نسل، عربی و عجمی، امارات وغیرہ کے سارے بت پاش پاش کرتا ہے تو فقط اسی ایک سوچ و فکر کے لیے اور میں اس گئے گذرے دور میں اسی نسبت کو اپنائے ہوئے ہوں۔" شبانہ نے سنجیدگی سے کہا۔

"میں شبانہ، میں 'تو'۔" زرق شاہ بڑبڑا کر خاموش ہو گیا۔

"آپ تو آل رسولؐ ہیں۔ آپ پر تو یہ ذمے داری بنتی ہے۔ کسی سیّد کی تعظیم اس لیے نہیں کی جاتی کہ وہ ذات کا سیّد ہے۔ کیونکہ یہ تعلیمات قرآن کے عین منافی ہیں۔ قرآن نے کردار کا معیار دیا ہے۔ پھر بھی میں آپ پر دہری ذمے داری مانتی ہوں۔ آپ کی رگوں میں اس خون کے اثرات تو ہونے چاہئیں جس کی نسبت اس جوان سے جا کر ملتی ہے جو اپنے خاندان سمیت کربلا کے میدان میں آ گیا؟ جانتے ہو حسینیت کیا ہے؟"

"کیا ہے حسینیت؟" وہ سرسرایا۔

"امام عالی مقام کا کردار' کیا وہ نہیں جانتے تھے کہ سامنے یزیدیت کا لشکر جرار ہے اور وہ فقط بہتر نفوس پر مشتمل لوگ' جنگ بنتی ہی نہیں' کیا امام عالی مقامؓ وہاں پر منطق کی کتابیں لے کر گئے تھے؟ کوئی فلسفہ بیان کرتے رہے؟ نسبتِ رسول ﷺ کا واسطہ دیا' لب پر شکوہ و شکایت لائے؟ ہاتھ میں تسبیح تھی؟ نہیں' ایسا کچھ نہیں تھا' کیوں گئے تھے وہاں پر؟ وہ وہاں پر اپنا کردار لے کر گئے تھے اور قیامت تک اس کردار کو امر کر دیا' سوال اب بھی وہیں پر ہے کہ وہ وہاں پر کیوں گئے؟"

"کیوں؟" وہ پھر سرسرایا۔

"اس نسبت کو زندہ و جاوید کر دینے کے لیے جہاں سے عشق کی ابتداء ہوئی ہے۔ بلالِ حبشی غلام تھے، اسی نسبت کو پا کر سیدنا بلال بن رباحؓ بن گئے۔ کعبہ پاؤں کے نیچے آ گیا' یہ ابتداء ہے' ساری دنیا ایک طرف' صدیق اکبرؓ ایک طرف کہ جو نبی صادق و امینؐ نے فرما دیا، وہی سچ ہے۔ سب کچھ تج دیا' عمر فاروقؓ نے تنہا تلوار سونت لی۔ آئے کوئی مقابلے میں' ساری دنیا ایک طرف' عمر فاروقؓ کی شجاعت ایک طرف' عثمان غنیؓ دولت ایک طرف' نبی رحمت ﷺ کی محبت ایک طرف' حیدر کرارؓ کی رشتے داری ایک طرف' ساری دنیا سے لڑنے کی شجاعت ایک طرف' الذوالفقار ہاتھ میں' باب العلم اور انتہا' شہید کربلا' امام عالی مقامؓ جانتے تھے۔ یزید نماز بھی پڑھتا ہے' وہ سب شعائر اپنائے ہوئے ہے لیکن' وہ نظام جو اُن کے نانا نبی رحمت

ﷺ نے دیا اس نظام سے روگردانی کی تھی یزید نے آپ عالی مقامؓ نے کربلا میں جا کر اپنی نسبت کا اظہار اس طرح کیا کہ اس نظام کے خلاف کردار کو روشن کیا۔ انکارِ حسینؓ کو رہتی دنیا تک مثال بنا دیا بتا دیا کہ نسبت کیا ہوتی ہے۔ آپ تو اس آل سے تعلق رکھتے ہیں۔ آپ کو تو حسینیت کا سب سے زیادہ علمبردار ہونا چاہیے تھا اور آپ کیا ہیں؟" شبانہ نے انتہائی جذباتی انداز میں کہا تو زرق شاہ کا چہرہ کسی تاثر کے بغیر پیلا ہو رہا تھا۔

"اور شاہ جی! عشق اسے نہیں کہتے جو آپ کہہ رہے ہیں۔ ابھی تو آپ کو اپنے آپ کا نہیں پتہ۔ جائیں پہلے نسبت کے بارے میں معلوم کریں۔ پھر پتہ کریں حسینیت کیا ہے اور پھر سمجھ میں آئے گا کہ عشق کیا ہے۔ ہاں اتنا کہہ دوں عشق کا راستہ کربلا سے ہو کر گزرتا ہے اور کوئی بات کرنی ہے آپ نے؟" شبانہ نے کہا تو وہ اس کا منہ دیکھتا رہ گیا ایک لفظ بھی نہ کہہ سکا تب وہ اٹھتے ہوئے بولی۔ "رابطہ اسی وقت کیجئے گا جب ان کی سمجھ آجائے۔"

وہ اٹھی اور اس جانب چل دی جدھر سے وہ آئی تھی۔ اس نے پلٹ کر بھی نہیں دیکھا کہ زرق شاہ کی حالت کیا ہے۔ اسے ضرورت بھی نہیں تھی۔ وہ اپنے عشق میں سرمست تھی۔ کوئی نہیں جانتا تھا کہ زرق شاہ کے قریب سے اٹھ کر اپنی گاڑی تک پہنچنے میں اس کے کتنے آنسو بہے تھے۔ اس کے اندر موجود بغاوت پر آمادہ وہ لڑکی کس قدر شور مچا رہی تھی۔ وہ محبت کی شاہراہ پر بال کھولے بیٹھی بین کر رہی تھی لیکن اپنے مقصد سے عشق کرنے والی شبانہ وقار نے اس کی جانب کوئی توجہ نہیں دی۔ نفسانیت کی تلوار سے اس کا سینہ زخمی ہو رہا تھا۔ دنیا داری اور اس کی لذتوں کے تصورات نے نجانے کتنی بار اس پر حملے کیے تھے مگر وہ اپنی نسبت سے عشق کرنے والی اپنے اندر کے کربلا سے گزر رہی تھی۔

شبانہ کو پوری طرح احساس تھا کہ اس کا حُسن کروڑوں میں اگر نہیں تو لاکھوں میں یکتا ضرور ہے۔ اپنے حسن کی ستائش کون نہیں چاہتا۔ ایک لڑکی کی اس معصوم خواہش سے لے کر اپنی بساط کے مطابق عالمی ہزرہ رسائی کا جواب دینے کے لیے خود کو تیار کر لینے تک کے درمیان میں وہ کتنا سفر کر چکی تھی۔ یہ اسی ایک نسبت کے سہارے ہوا تھا۔ جس کی روح عشق کے سوا اور کچھ بھی نہیں ہو سکتی۔ ساری دنیا ایک طرف اور اس کا اپنا مقصد ایک طرف، یہی روحِ عشق اسے ہر لحہ، ہر پل آگے ہی آگے چلنے پر مجبور کر رہی تھی۔ نجانے اس کی راہ میں کوئی اور کربلا کب آجائے، جو اس کا مقصود تھا۔

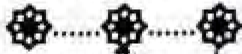


زرق شاہ اپنے کمرے میں بیٹھا تھا۔ اس کی حالت یوں تھی کہ جیسے وہ تو یہاں موجود ہے لیکن اس کی روح نجانے کہاں چلی گئی تھی۔ وہ اندر سے یوں خالی ہو گیا تھا جیسے اس میں کچھ تھا ہی نہیں۔ یوں جیسے کسی نے اس کے اندر کی ساری دنیا میں صور پھونک دیا ہو۔ یا پھر وہ کوئی ایسا محل تھا جس میں فقط ہوائیں سرسرا رہی تھیں۔ کوئی انسانی آواز نہیں تھی۔ اس کی یہ کیفیت اسی لمحے ہو گئی تھی۔ جب شبانہ وقار اس کے پاس سے اٹھ کر گئی تھی۔ اسے نہیں معلوم کہ وہ یہاں اپنے کمرے تک کیسے پہنچا تھا۔ ایک خلا تھا جو اس کے اردگرد پھیل گیا تھا۔ جہاں نہ آواز آتی تھی اور نہ ہی کوئی آواز باہر جاتی تھی۔ وہ جب بھی کوشش کر کے کسی سوچ کا سرا پکڑتا اسی لمحے شبانہ کے لفظ بازگشت کی مانند اس کے گنبدِ سر میں گھومنے لگتے۔ کہتے ہیں کہ جب درد حد سے بڑھتا ہے تو دوا بن جاتا ہے۔ وہ اسی کرب ناک کیفیت میں مبتلا تھا، جہاں احساس شرمندگی اسے مارے ڈال رہی تھی۔ وہ کون تھا؟ کیا تھا وہ؟ کیا کرتا پھر رہا تھا وہ؟ شبانہ کے دکھائے ہوئے آئینے میں اسے اپنی صورت بہت بھیانک دکھائی دی تھی۔ اس کی نسبت کن سے ہے؟ وہ حسینیت کے ماننے والوں میں سے ہے یا پھر یزیدیت کی صفوں میں کھڑا ہے؟ بے شک امام عالی مقامؓ نے کربلا میں اپنا کردار پیش کر کے اس نظام کے خلاف مثال بنا دی جو انسانیت کا قاتل ہے۔ حسینیت اس انکار کا نام ہے۔ جس میں وسائل، تعداد، منطقیں تاویلیں، روحانیت کے امتیاز، علم و فضل کے خزانے کچھ اہمیت نہیں رکھتے۔ کربلا میں تو فقط کردار کا سکہ چلتا ہے۔ گردن کٹا دینے کا نام حسینیت ہے۔ جہاں زندگی بھی شرمندگی کے ساتھ حیرت زدہ رہ جاتی ہے۔ دوام کردار کو ہے، فلسفے اور تاویلوں میں نہیں۔ امام عالی مقامؓ کے پاس کیا نہیں تھا؟ چاہتے تو دنیا کی ہر نعمت ان کے قدموں میں ہوتی۔ سامنے کا لشکر بھی کوئی حیثیت نہیں رکھتا تھا۔ میدانِ بدر کی مانند فرشتے وہاں بھی حکم کے منتظر تھے لیکن امام عالی مقامؓ ایک انکار کر کے، قیامت تک جہاد کی فرضیت کا وہ مقام دے گئے، جہاں پر نظام ہائے دنیا اپنی کسمپرسی پر ماتم کناں ہوتا ہے۔ یہی

وہ کردار ہے، جو زندگی دیتا ہے اور زندگی کے ساتھ نسبت رکھنے والوں کو زندگی ملتی ہے۔ تبھی عشق پروان چڑھتا ہے۔
زندگی دوسروں کی عیب جوئی، انگشت نمائی اور تنقید کا نام نہیں، اپنی ذات کی کمزوری کو دور کرنے کا نام ہے۔ یہی وہ مقام ہے جب خود احتسابی سے خوش گمانی تک سفر کی ابتدا ہوتی ہے۔ تب حسن اپنی تمام تر رعنائیوں سے آنکھوں کو خیرہ کرتا ہے۔ عقل سوچنے پر مجبور کرتی ہے کہ اگر حسن ہے تو اس کا تخلیق کار بھی ہوگا۔ حسن جب اپنا آپ منواتا ہے تو حسن کی کشش تخلیق کار کی جانب ضرور آمادہ کرتی ہے۔ یہاں اس خیال کی اہمیت فزوں تر ہو جاتی ہے، جس سے حسن کو دیکھا جاتا ہے اور تخلیق کار کے بارے میں خیالی رویہ کیا ہے؟ یہیں سے خود کو اہل بنانے کا احساس پیدا ہوتا ہے کہ حسن کی دیکھ سکوں، حسن کی رعنائی اس وقت ہی خیال میں سماتی ہے جب خود کو اہل بنا لیا جائے اور یہی خیال ہی اسے حسن تک رسائی میں مدد دیتا ہے۔ تب جا کر زندگی اس کی اہل ہوتی ہے کہ وہ زندگی کے ساتھ جڑ کر حیاتِ جاوداں کی راہ پر گامزن ہو سکے۔ ورنہ صحیفے مُردوں کے لیے نہیں اترا کرتے۔

شام ڈھل رہی تھی۔ دوپہر سے لے کر غروب آفتاب تک کوئی بھی اس کے پاس نہیں آیا تھا۔ نہ ہی اس نے کسی کو بلانے کی ضرورت محسوس کی تھی۔ ٹیلی وژن کی اسکرین تاریک تھی۔ سگریٹ کا پیکٹ ویسے ہی پڑا تھا۔ اس نے میڈیسن بھی نہیں لی تھیں۔ وہ صوفے پر بیٹھا خلا میں معلق تھا۔ تبھی اس کی بہن فاطمہ کمرے میں آئی۔ وہ ٹین ایج میں تھی۔ اس نے ویسا ہی لباس پہن رکھا تھا جیسے وہ معمول کے مطابق پہنتی تھی مگر اسے بہت برا لگا۔ وہ سخت لفظ کہنے ہی لگا تھا کہ اس کے گنبدِ سر میں لفظ گونج گئے۔ کردار اپنے کردار سے ثابت کرو کہ تم کہاں پر کھڑے ہو۔ کچھ بھی کہنا نہ پڑے اور اثر ہو جائے۔
''بھائی! خیریت ہے، طبیعت تو ٹھیک ہے نا آپ باہر آئے ہی نہیں۔''
''بس ایسے ہی۔'' اس نے کہا تو اسے اپنے لفظ اجنبی لگے۔
''آؤ پھر باہر نکلتے ہیں۔ لان میں بیٹھ کر گپ شپ لگاتے ہیں۔''
''چلو۔'' اس نے اٹھنا چاہا۔ تبھی فاطمہ اس کی بیساکھیوں کو اٹھانے کے لیے بڑھی تو زرق شاہ نے تیزی سے کہا۔

''نہیں۔ میں خود کوشش کروں گا۔'' یہ کہہ کر اس نے اپنی بیساکھیاں سیدھی کیں اور فاطمہ کے ساتھ باہر کی جانب چل دیا
اس وقت وہ لان میں جا کر کھڑے ہی ہوئے تھے۔ تب اردگرد سے اذانیں شروع ہو گئیں۔ فاطمہ ایک دم سے اندر کی جانب بھاگی۔ زرق شاہ حیران ہوا کہ اسے کیا ہو گیا۔ وہ اسی کشمکش و پیچ میں مبتلا، بید کی کرسی پر بیٹھ گیا۔ تبھی فاطمہ اندر سے نمودار ہوئی۔ اس کے سر پر آنچل نما کپڑا تھا۔ وہ شدت حیرت سے اس کی جانب دیکھنے لگا۔ وہ لاکھ مذہبی معاملات سے دور ہو۔ لباس جیسا بھی پہنتی ہو مگر اس کے لاشعور میں احترام اذان ہے۔ وہ خاموش تھی۔ وہ بھی خاموش تھا۔ اذان کی آواز گونج رہی تھی۔ چند لمحوں میں اسے یوں لگا جیسے اس کے اندر بھی کوئی اذان دے رہا ہے۔ یہ بازگشت تھی یا اس کے اندر کوئی مؤذن تھا۔ وہ نہ سمجھ سکا۔ اذان ختم ہوئی تو فاطمہ نے وہ کپڑا سر سے اتار کر میز پر رکھ دیا۔ تبھی وہ بچپن کے اس دور میں چلا گیا جب وہ بڑے اہتمام سے وضو کیا کرتا تھا اور قریبی مسجد میں اپنے دادا کے ساتھ جاتا تھا۔ کیسا زمانہ تھا وہ۔ اچانک وہ اپنی بیساکھیاں سنبھالتا ہوا اٹھنے لگا۔ اس کے انداز میں انتہائی درجے کا اضطراب تھا۔
''کیا ہوا بھائی، آپ کہاں جا رہے ہیں؟'' وہ حیرت سے بولی۔
''میں جا رہا ہوں۔'' وہ اٹھ کر اندر کی جانب چل دیا۔ فاطمہ اسے وہیں کھڑی دیکھتی رہی۔ بہت مشکل سے بیساکھیاں ایک جانب رکھ کر وہ واش روم میں گیا۔ وہ باہر آیا تو وضو کر چکا تھا۔ اس کے کمرے میں مصلیٰ نہیں تھا۔ اس نے قالین پر چادر بچھائی اور نماز کے لیے کھڑا ہو گیا۔ اللہ اکبر کہہ کر جیسے ہی اس نے نیت باندھی اس کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے۔ وہ ثناء کے لفظ بھول چکا تھا۔ جنہیں یاد کرتے ہوئے وہ احساس شرمندگی سے رو پڑتا۔ غبار ڈھلنا شروع ہو گیا تھا۔



رات گہری ہوتی چلی جا رہی تھی۔ بیڈ پر لیٹے ہوئے شبانہ مضطرب تھی۔ اس کی نگاہوں کے سامنے سے زرق شاہ کا چہرہ ہی نہیں ہٹ رہا تھا۔ وہ خود کو ملامت کر رہی تھی۔ اس کے ذہن میں ارادہ تھا کہ اسے حسینیت کے بارے میں بتانا ہے اور اسے یہ بھی بتانا ہے کہ وہ کر کیا رہا ہے لیکن اس وقت جب وہ اس کا اہل ہوتا۔ ابھی تو وہ اس قابل ہی نہیں تھا کہ اتنا ذہنی دھچکہ

برداشت کر سکے۔ اسے اس سطح پر لانا تھا جہاں وہ نہ صرف بات کو سمجھ سکتا بلکہ اسے قبول بھی کر لیتا۔ وہ اپنی خامی پر کڑھ رہی تھی۔ اسے جذباتی نہیں ہونا چاہیے تھا لیکن یہ حقیقت ہے کہ وہ جذباتی ہو گئی تھی۔ اسے احساس ہو گیا تھا کہ دلیل کے ہتھیار سے وار کاری پڑا ہے۔ وہ ابھی اس کا تحمل نہیں ہو سکتا تھا۔ وہ یہی سوچ رہی تھی کہ ایسا کیوں ہو گیا؟

وہ اگر پارک تک گئی تھی تو اس کا اپنا مقصد اسے کشاں کشاں لے گیا تھا۔ زرق شاہ ہی نے کہا تھا کہ اسے وہ سوال یاد آ گیا جس کا جواب چاہتا ہے۔ وہ جس وقت کے لیے منتظر تھی وہ آ گیا تھا لیکن جب اسے یہ احساس ہوا کہ وہ اپنے سوال کے جواب میں دلچسپی نہیں رکھتا، بلکہ اس کے اندر کی عورت کو جذباتی کر کے اسے گمراہ کرنے کی کوشش کر رہا ہے۔ تب اس سے رہا نہیں گیا۔ وہ اس کی ہمدردیاں حاصل کر کے قرب کی راہ پر لانا چاہتا تھا اور پھر اس نے وہ سب کچھ کہہ دیا جو کہنا چاہتی تھی۔ یہ سب سوچتے ہوئے اس کے دل میں میٹھی کسک بھی موجود تھی۔ زرق شاہ اس لیے بھی نگاہوں سے نہیں ہٹ رہا تھا کہ وہاں چھائی شرمندگی میں سے معصومیت بھی جھانک رہی تھی۔ نگاہوں میں وہ بے بسی تھی جو کسی بے گناہ کی ہوتی ہے، جب اس پر فرد جرم عائد کر دی جائے۔ وہ گڈمڈ خیالوں کے ساتھ نجانے کب نیند کی وادیوں میں کھو گئی۔

اگلی صبح جب وہ ناشتہ کر چکی تھی۔ اپنی امی کے ساتھ ڈرائنگ روم میں بیٹھی ہوئی تھی۔ امی کچھ دیر پہلے ہی وہاں آ کر ستانے کے لیے بیٹھی تھی جبکہ وہ اخبار کے اشتہار بھی پڑھ چکی تھی۔ تبھی ان لمحوں میں اس کا فون بج اٹھا۔ وہ سعدیہ کا تھا۔ علیک سلیک کے بعد اس نے کہا۔

"شبانہ بیگم! معلوم ہے کہ آج رزلٹ آئے گا۔"

"کیا واقعی، تمہیں کہاں سے خبر لگی ہے۔" شبانہ نے پوچھا۔

"تم نہیں جانتی ہو، میرے لیے یہ رزلٹ کتنا اہم ہے۔ اسی لیے میں بہت پریشان ہوں۔" وہ بولی۔

"رزلٹ اہم ہے، پریشانی میں کبھی نہیں۔" وہ واقعتاً سعدیہ کی بات نہیں سمجھ پائی تھی۔

"جس وقت میں امتحان دے رہی تھی، اس وقت میری ذہنی کیفیت کچھ اور تھی اب اور ہے، میری موجودہ صورت حال کے بارے میں تم نہیں جانتی ہو۔ گھر میں اپنی بہتر پوزیشن کے لیے رزلٹ کا اچھا ہونا بہت ضروری ہے۔" اس نے پھر گول مول بات کہہ دی۔

"تم پتہ نہیں کیا کہہ رہی ہو۔ سیدھی بات کیوں نہیں کرتی ہو۔" وہ اکتائے ہوئے لہجے میں بولی۔

"سیدھی بات یہ ہے کہ آج رزلٹ آئے گا۔ میں نے پتہ کروایا ہے۔" سعدیہ نے کہا۔

"تو کیا رہا؟" اس نے پوچھا۔

"یہی تو معلوم نہیں ہوا۔ ہاں یہ خبر ضرور مل گئی ہے کہ آج اعلان ضرور ہو گا۔" وہ بولی۔

"چلو آئے گا تو دیکھا جائے گا لیکن وہ جو تم پہلے اور بعد کی ذہنی کیفیت کے بارے میں۔" شبانہ نے پوچھنا چاہا مگر اس نے بات اُچکتے ہوئے کہا۔

"وہ میں ابھی آتی ہوں۔ پھر سارا پس منظر بتا کر پلان کرتے ہیں۔"

"پس منظر، پلان، یہ کیا کہہ رہی ہو؟" اس نے الجھتے ہوئے پوچھا۔

"آ رہی ہوں، بتاتی ہوں۔" اس نے سنجیدگی سے کہا اور فون بند کر دیا۔ تبھی اس کی امی نے پوچھا۔

"کیا پریشانی ہے شبانہ؟"

"کوئی پریشانی نہیں، سعدیہ نے بتایا کہ آج رزلٹ آنے والا ہے۔" اس نے اُلجھتے ہوئے کہا۔

"بات تو پریشانی کی ہے۔" امی نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"امی یہ بات تو طے ہے کہ میں پاس ضرور ہو جاؤں گی۔" وہ جلدی سے بولی۔

"اچھا ٹھیک ہے۔ تمہارا رزلٹ آئے تو پھر میں تیری بات چلاؤں۔ بہت پڑھ لیا۔ اب اپنی گھرداری سنبھالو۔" اس کی امی نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"امی ابھی نہیں، بس دو سال کی مہلت دیں، پھر آپ کی جو مرضی ہو کیجیے گا۔"

"پہلی بات تو یہ ہے کہ میں طارق کی شادی بھی کر دینا چاہتی ہوں۔ وہ کیا تیری وجہ سے دو سال تک لٹکتا رہے گا اور دوسری بات یہ دو سال کیوں؟"

"امی میں ایک سیٹ اپ بنانا چاہتی ہوں، یہ ضروری ہے۔ ورنہ میری تعلیم و تربیت یونہی رائیگاں جائے گی۔" وہ گھبراتے ہوئے بولی۔

''میری بیٹی! کیا تم یہ نہیں جانتی ہو کہ حاصل کیا گیا علم رائیگاں نہیں جاتا۔ ہاں مگر اس پر عمل کرنے کی نیت ہو۔'' اس کی امی نے کہا۔
''وہی تو' وہی تو میں کہہ رہی ہوں عمل کے بنا علم رائیگاں ہے۔'' وہ ہنستے ہوئے بولی۔
''اچھا میرے ساتھ بحث مت کرو۔ میں تمہارے ابا کو تیار ہونے میں مدد دے دوں۔'' یہ کہتے ہوئے امی اٹھ گئیں۔ اسے معلوم تھا کہ شبانہ یونہی بحث کرتی چلی جائے گی۔
امی اٹھ گئیں تو تنہائی ملتے ہی وہ سوچوں میں کھوگئی۔ رزلٹ کا اچھا ہونا اس کے لیے بہت ضروری تھا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ اگر رزلٹ اچھا نہیں آتا تو اس کی ساری دلیلوں پر پانی پھر جائے گا۔ وہ سارے دعوے مٹی میں مل جاتے جو علم حاصل کرنے کے لیے اس نے دیئے تھے۔ کوئی بھی یہ ماننے کو تیار نہیں ہوگا کہ فیل ہونے کی وجوہات کیا ہیں اور نہ ہی وہ بتا سکتی تھی کہ زرق شاہ نے ان دنوں نہ صرف ڈسٹرب کیا ہوا تھا بلکہ وہ اس کے خیالوں پر چھایا ہوا تھا۔ اس کے پاس وقت تھا اور فیل ہونے کی صورت میں یہی مانا جاتا کہ اس نے محض وقت گذاری کی ہے۔ تب وہ اپنی کوئی بات نہیں منوا سکتی تھی بلکہ اسے وہی کچھ ماننا پڑتا جو اس کے گھر والے کہتے۔
''کیا بات ہے بہنا! بڑی سائنس دان قسم کی چیز بننے کی کوشش میں ہو۔'' طارق نے سامنے والے صوفے پر بیٹھتے ہوئے کہا۔ وہ چونک گئی، پھر مسکراتے ہوئے بولی۔
''آج رزلٹ آرہا ہے بھائی۔''
''مجھے معلوم ہے۔ یہ کوئی نئی چیز نہیں۔'' اس نے دھیمی سی مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔
''آپ کو معلوم ہے؟'' اس نے حیرت سے پوچھا۔
''جی بہنا! مجھے تو انتظار ہے، تمہارے رزلٹ کا جو کچھ دیر بعد مجھے معلوم ہوجائے گا۔'' وہ مسکراتے ہوئے بولا۔
''مطلب۔'' وہ بولی۔
''مطلب یہ کہ میں نے اپنے ذرائع سے معلوم کیا ہے، اعلان ہونے سے پہلے ہی مجھے معلوم ہو جائے گا بلکہ......'' وہ پھر مسکرا دیا۔
''آپ کچھ چھپا رہے ہیں۔'' وہ مصنوعی غصے سے بولی۔
''بالکل چھپا رہا ہوں۔ اس لیے کہ تم شور نہ مچادو۔'' وہ ہولے سے ہنستے ہوئے بولا۔
''بتائیں' کیا رزلٹ ہے۔'' وہ بچوں کی طرح مچل گئی۔ تبھی اس کے ابا ڈرائینگ روم میں آگئے۔ انہوں نے سن لیا تھا۔ اس لیے خوشگوار لہجے میں بولے۔
''بتاتے ہیں' ذرا سانس لو۔''
''آپ کو بھی۔'' وہ حیرت سے بولی۔ اتنے میں اس کی امی بھی وہیں آگئیں۔
''بیٹی میں تو کئی دن سے معلوم کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔'' یہ کہتے ہوئے وہ بیٹھ گئے۔ انہی لمحات میں باہر گاڑی رکی۔ تو شبانہ کا سانس بھی گلے میں اٹک گیا۔ اگر یہ سعدیہ ہوئی تو' اس نے لباس' کاش یہ کچھ دیر بعد آتی' وہ یہی سوچ رہی تھی کہ سعدیہ ڈرائینگ روم میں داخل ہوئی۔ شبانہ اسے دیکھ کر حیرت زدہ رہ گئی۔ حجاب کے ساتھ پورا بدن ڈھکا ہوا تھا۔ وہ مسکرا رہی تھی۔ تبھی شبانہ نے طارق کی طرف دیکھا۔ وہ بھی اس جیسا حیران تھا۔ اس کے ابو کی نگاہوں میں ستائش تھی۔ اس کے ہاتھوں میں مٹھائی کا بڑا سا ڈبہ پکڑا ہوا تھا۔ سلام کرنے کے بعد وہ شبانہ سے ملی اور اس کے ساتھ صوفے پر بیٹھ گئی۔ تو شبانہ نے مٹھائی کے ڈبے کی طرف اشارہ کیا۔
''یہ؟''
''میں جو خبر سنانے والی ہوں۔ اس کے بعد یہ ضروری ہے۔''
''سناؤ بیٹی!'' وقارالدین نے نرم لہجے میں کہا۔
''اپنی شبانہ وقار نے اپنے ڈیپارٹمنٹ میں سب سے زیادہ مارکس لیے ہیں اور یہ ٹاپ پر ہے۔'' اس نے ہیجان خیز لہجے میں کہا۔
''اوہ! تو میں خبر سنانے سے رہ گیا۔'' طارق نے افسوس بھرے انداز میں کہا جبکہ شبانہ پر شادیٔ مرگ کی سی کیفیت طاری تھی۔ خوشی سے اس کی آنکھوں میں سے آنسو جاری ہوگئے۔ تب اس نے پوچھا۔
''اور تمہارا رزلٹ؟''
''میں الحمدللہ سب میں پاس ہوں۔ اچھے مارکس ہیں۔ میں بہت خوش ہوں۔''
''ہمارے پاس بھی تمہارے لیے یہی خوشخبری تھی۔ بہر حال یہ سعدیہ کے نصیب میں ہوا۔'' وقارالدین نے کہا تو اس کی امی بولیں۔
''میرے لیے سب سے زیادہ خوشی کی بات یہ ہے کہ میں

نے سعدیہ بیٹی کو حجاب میں دیکھ لیا۔اللہ پاک توفیق دے تو یہ نقاب بھی لے لے گی۔"

"ہاں یہ بہت بڑی خوش نصیبی اور سعادت ہے۔" وقارالدین نے کہا، پھر جیب میں سے اپنا والٹ نکالا اور اس میں سے اپنا ڈیبٹ کارڈ نکال کر شبانہ کی جانب بڑھا دیا

"یہ کیا ابو؟" اس نے پوچھا۔

"یہ انعام ہے اپنے طور پر جو مرضی خرید نا تم دونوں۔" اس نے شفقت پدری سے کہا۔

"نہیں ابو میں یہ نہیں لوں گی۔ بلکہ میرا مطالبہ کچھ اور ہے۔" وہ ایک دم سنجیدگی سے بولی۔

"وہ کیا۔؟" انہوں نے سکون سے پوچھا۔

"میں مزید پڑھنا چاہتی ہوں اور اس کے ساتھ پروڈکشن سیٹ اپ شروع کرنا چاہتی ہوں۔" اس نے اطمینان سے کہا۔

"تو کیا تم ڈرامے بناؤ گی؟" طارق نے حیرت سے پوچھا۔

"طارق بھائی! ضروری نہیں ہے کہ پروڈکشن ڈراموں کی ہوتی ہیں اور بہت سی چیزیں ایسی ہیں جو بنائی جا سکتی ہیں۔" شبانہ نے تحمل سے کہا۔

"مثلاً!......ذرا مجھے بھی معلوم ہو۔" وہ تیزی سے بولا۔

"مثلاً ایک چھوٹا بچہ ہے، اسے بار بار سمجھانا پڑتا ہے کوئی شے سکھانے کے لیے۔ اگر تصویر کے ساتھ وہ تمام حرکات و سکنات کی فلم بنا دی جائے تو اسے بار بار دکھایا جا سکتا ہے۔ بار بار سن کر وہ یاد کر سکتا ہے ہمارا یہ پیغام ان بچوں تک بھی پہنچ سکتا ہے، جو ہمیں جانتے بھی نہیں ہوں گے۔ سرحدیں بھی اس کی راہ میں رکاوٹ نہیں اور پھر بے شمار موضوع ہیں۔" وہ نرمی سے سمجھاتے ہوئے بولی۔

"مثال کی حد تک تمہاری بات ٹھیک ہے، مگر یہ کوئی نیا آئیڈیا نہیں۔ اس پر تو کام ہو چکا ہے۔ میں نے ایک ٹی وی چینل پر ایسا دیکھا ہے۔" طارق نے نرم لہجے میں کہا۔

"میں مانتی ہوں۔ صرف میں ہی نہیں امت مسلمہ میں اور بہت سارے لوگ ہیں جو کام کرنا چاہتے ہیں اور کئی کام کر بھی رہے ہیں۔ ان سب کو اجتماعیت درکار ہے۔ میں نے کہا نا کہ یہ اور بہت سارے موضوع ہیں۔ انہیں تمثیل کے طور پر بھی دکھایا جا سکتا ہے۔ ٹاک شو ہو سکتے ہیں۔ خواتین پر زیادہ محنت کی ضرورت ہے۔ جن بنیادی مسئلوں سے بگاڑ کی صورت پیدا ہو رہی ہے۔ انہیں پوری شدت سے پوائنٹ آؤٹ کیا جا سکتا ہے۔ یہ تو محض ایک مثال تھی۔" شبانہ نے تفصیل سے اپنا نکتہ نگاہ سمجھاتے ہوئے کہا۔

"یہ چیزیں بھی تو ہو رہی ہیں۔ سبق کون لیتا ہے۔" طارق اڑ گیا

"پیغام میں سچائی ہونی چاہیے اثر ہو جاتا ہے۔ یورپ میں رہنے والی ان خواتین کے خیالات تو اپنے لوگوں کو بتائے جا سکتے ہیں، جہاں حجاب پر پابندی ہے۔ وہ کیوں نقاب لیتی ہیں۔"

"بیٹی! مجھے تمہارا یہ آئیڈیا پسند آیا ہے۔ تمہیں جو چاہیے مجھے بتاؤ۔" وقارالدین نے حتمی انداز میں کہا۔

"الحمدللہ! سعدیہ میرے ساتھ ہے۔ ہم دونوں نے طے کیا تھا کہ رزلٹ کے بعد یہ بات کریں گے۔ ہم پلان کر لیں۔ پھر ہم آپ کو بتا دیں گے۔"

"اچھی بات ہے۔" وقارالدین کے سر ہلاتے ہوئے کہا۔ پھر بڑے جذباتی لہجے میں بولا۔"جب بھی کوئی اللہ کی راہ پر چلتا ہے تو اللہ اسے انعامات سے ضرور نوازتا ہے اب یہ انسان پر ہے کہ وہ انعامات ہی میں کھو کر رہ جاتا ہے یا اللہ کے راستے پر گامزن رہتا ہے۔ میری بیٹی! مجھے تم پر فخر ہے اور میری دعا ہے کہ اللہ تمہیں حفظ داماں میں رکھے اور مزید کامیابیوں سے نوازے۔" یہ کہہ کر وہ اٹھنے لگے تو سعدیہ بولی۔

"انکل! کم از کم یہ مٹھائی تو چکھتے جائیں۔"

"اوہ! معاف کرنا بیٹی لاؤ بھئی جلدی سے۔" انہوں نے کہا تو شبانہ نے ڈبہ کھول لیا۔ سب کو دینے کے بعد خوشگوار ماحول میں وقارالدین اور طارق اپنے آفس کے لیے نکل گئے

"آؤ پہلے شکرانے کے نوافل ادا کر لیں۔ پھر گپ شپ کرتے ہیں۔" شبانہ نے سعدیہ کا ہاتھ پکڑتے ہوئے کہا اور وہ دونوں اپنے کمرے کی جانب چل دیں۔ امی نے مٹھائی اٹھائی اور گھر میں موجود تمام ملازمین میں بانٹ دینے کے لیے اپنی ملازمہ کو دے دی۔ وہ خوش تھی کہ اس کی بیٹی نے اتنی بڑی کامیابی حاصل کی ہے لیکن ساتھ میں یہ دکھ بھی تھا کہ وہ پرایا دھن ہے ایک دن اپنے گھر چلی جائے گی۔

❁......❁......❁

وہ شہر کی قدیم مساجد میں سے ایک تھی۔ گنجان آبادی کے باعث اب وہاں کھلے راستے نہیں رہے تھے۔ زرق شاہ گاڑی

میں بیٹھا ہوا، اس مسجد کے مینار کو دیکھ رہا تھا۔ یہی وہ مسجد تھی جہاں بچپن میں وہ آیا کرتا تھا۔ یہیں وہ پہلی بار سپارہ سینے سے لگائے ان بچوں کے درمیان میں آکر بیٹھا تھا۔ جہاں دوسرے بچے قطار بنائے استاد محترم سے پڑھ رہے تھے۔ اس کی بسم اللہ یہیں پر ہوئی تھی۔ اسے اچھی طرح یاد تھا کہ اس کے والد نے اس کی انگلی پکڑی ہوئی تھی۔ مسجد کی جانب جاتے ہوئے مٹھائی کی ٹوکری اس کے والد نے خریدی اور پھر استاد محترم کے پاس چلے گئے۔ انہوں نے نہایت شفقت سے بسم اللہ پڑھائی اور وہ مٹھائی بچوں میں تقسیم کردی۔ یہ اس کی قسمت تھی کہ وہ پورا قرآن پاک پڑھ نہیں سکا تھا۔ محض دو برس بعد ہی وہ اس گنجان آبادی والے محلے سے نکل کر ماڈل ٹاؤن میں چلے گئے۔ پھر وہ مسجد تو اس کے ذہن میں رہی مگر سب کچھ بھول بھال گیا۔

گذری رات وہ اپنے آپ کو سوچتے ہوئے اپنے ماضی میں جا پہنچا۔ وہ اس کھوج میں تھا کہ اس کا دین سے رابطہ کہاں ٹوٹا تھا۔ اس تلاش میں چلتے چلتے وہ اس مسجد تک آپہنچا۔ انہوں نے انتہائی درجے کی معاشی ترقی تو کرلی تھی لیکن اپنی اصل سے رابطہ ختم کر بیٹھے تھے۔ اسے اپنے معاش کی کوئی فکر نہیں تھی۔ اسے محض یہی فکر تھی کہ حسینیت سے نسبت جوڑنے کے لیے آخر اسے کرنا کیا ہوگا۔ یہ کتنا بڑا المیہ تھا کہ وہ یہ بھی نہیں جانتا تھا اور نہ ہی یہ جانتا تھا کہ اسے یہ گیان کہاں سے ملے گا۔ رات جب اپنی کھوج میں سفر کرتے ہوئے اس مسجد تک پہنچا تو اس کا دل گواہی دینے لگا کہ رابطہ جہاں سے ٹوٹا ہے، وہیں سے جڑے گا بھی۔ دن کافی چڑھ آیا تھا جب وہاں آن پہنچا۔ وہ گاڑی سے اترا اور بیساکھی لیے مسجد کی جانب بڑھا۔ چند قدموں کا فاصلہ تھا اور وہ سیڑھیوں تک جا پہنچا۔ اس کے سامنے وسیع صحن تھا جس کے درمیان پانی کا حوض بھرا ہوا تھا۔ اسے یاد آنے لگا۔ یہیں حوض کے قریب سے اسے خوف بھی آتا تھا کہ کہیں اس میں گر نہ جائے اور یہیں پانی کے چھینٹے اڑانے کا مزہ بھی آتا تھا۔ وہ اپنے ہمجولیوں کے ساتھ یہاں بہت دیر تک کھیلتا رہتا تھا۔ اس کی نگاہوں میں بچپن کا زرق شاہ تھا۔ یہیں اس مسجد میں اس کی بہت ساری یادیں بکھری پڑی تھیں۔ وہ وہیں حوض پر بیٹھ گیا اور اپنی یادوں سے ملنے لگا۔ بچپن کا وہ بے فکری والا زمانہ، قہقہے، دوسروں سے آگے نکلنے کی لگن......

"کیا بات ہے بیٹا! یہاں بیٹھے کیوں آنسو بہا رہے ہو۔"

زرق شاہ اس شفیق آواز پر چونک گیا۔ اس نے سر اٹھا کر دیکھا تو حیرت سے وہیں جم گیا۔ اگرچہ گذرے وقت نے اپنے تاثرات ان پر چھوڑے تھے لیکن نقش و نگار تو وہی تھے وہی سر پر سادہ سی سفید پگڑی، سرخ و سفید چہرے پر تیکھے نقش و نگار، سادہ سفید کرتا اور تہبند وہ جلدی سے اٹھنے کی کوشش میں لڑکھڑا گیا اور بے ساختہ اس کے منہ سے نکل گیا۔

"استاد جی آپ......!"

"بیٹھو...... بیٹھو بیٹا...... بیٹھ جاؤ" استاد جی نے اسے سہارا دیتے ہوئے کہا تو بیٹھ گیا۔ وہ بھی اس کے ساتھ ہی بیٹھ گئے۔

"استاد جی! میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ آپ مجھے یوں مل جائیں گے بس، بائیس سال بعد میں آپ کو دیکھ رہا ہوں۔"

"معاف کرنا بیٹا! میں تمہیں پہچان نہیں سکا۔ اب تک اللہ جانے کتنے بچے پڑھ کر چلے گئے۔" انہوں نے مشفقانہ انداز میں کہا۔

"جی میں سید صادق حسین شاہ کا پوتا اور سید عابد حسین شاہ کا بیٹا ہوں، جو آج سے۔" زرق شاہ سے کہنا چاہا تو استاد جی نے سر ہلاتے ہوئے کہا۔

"میں سمجھ گیا ہوں، تم بہت تھوڑا عرصہ یہاں آئے تھے۔ ماشاء اللہ اب تو گھبرو جوان ہو چکے ہو۔ اللہ نظر بد سے بچائے یہ بیساکھی اور یہاں، خیریت تو ہے نا بیٹا؟" استاد محترم نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے پوچھا تو زرق شاہ چند لمحے ان کی جانب دیکھتا رہا۔ پھر بولا۔

"شاید مجھے اپنے آپ تک پہنچنے کے لیے کٹھن راستہ اپنانا ہوگا۔"

"ہوں۔" استاد جی نے گہرا ہنکارہ بھرا۔ چند لمحے خاموش رہے پھر بولے۔ "تو اپنے آپ کی تلاش میں نکلا ہے۔ وہ تم نے ایک محاورہ سنا ہے آنکھ اوجھل پہاڑ اوجھل۔"

"جی۔" وہ استعجاب سے بولا۔

"کیا تم اپنے آپ کو دیکھتے ہو؟" انہوں نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔

"آئینے میں یا کسی ویڈیو فلم میں، خود کو دیکھتا ہوں۔" وہ بولا۔

"خود کو کہیں دیکھتے ہو یا جو کوئی تمہیں جیسا دکھانا چاہے ویسا دیکھتے ہو کبھی اپنے آپ کے ساتھ خالص پن سے بھی ملے ہو ساری سوچ و فکر، دین دھرم، فلسفے منطقیں ایک جانب رکھ کر

"انہوں نے بڑی نرمی سے پوچھا۔

"نہیں۔" وہ لرزتے لہجے میں بولا۔

"کبھی اپنے آپ کو ایک انسان کی حیثیت سے دیکھا' سوچا میں کون ہوں' انسان ہونے کے ناتے مجھے کیا کرنا ہے۔ میں اپنی ضرورت کے لیے اس زمین اور کائنات سے رابطہ رکھنے پر مجبور ہوں' مجھے ان کے ساتھ اپنا تعلق کیسے رکھنا ہے' یہ سارے سوال بعد کے ہیں۔ اگر تم پہلے اپنے خالص پن میں متعارف ہو جاؤ تو اپنے آپ سے ملنے کی ساری راہیں تمہارے اندر پڑی ہوئی ہیں۔ اگر تم ٹی شرٹ پہن کر آئینے کے سامنے جاؤ گے تو آئینہ ٹی شرٹ میں دکھانے پر مجبور ہوگا۔ تمہارے اندر کا خالص پن کیا کہتا ہے۔ اس سے ہم کلام ہو کر کبھی کہا' دیکھو' وہی تمہیں راستے دکھائے گا۔"

"استاد جی! اپنے اندر جھانکنے کے لیے بھی نگاہ چاہیے۔ میرے پاس تو وہ نگاہ بھی نہیں ہے۔" وہ جذب سے بولا۔

"یہ کیوں نہیں ہے۔" میں نے کہا نا آنکھ اوجھل پہاڑ اوجھل جس لمحے تم نے اپنے آپ پر غور کرنا شروع کر دیا۔ دراصل وہی تمہارے خود سے ملنے کی شروعات ہوگی اور پھر چاہے راستہ جتنا بھی طویل ہے۔ اللہ کی توفیق سے لمحوں میں طے ہو جاتا ہے۔" انہوں نے کہا اور وضو کرنے لگے۔ وہ وضو کر چکے تو زرق شاہ نے ادب سے کہا۔

"استاد جی! کیا ہم کچھ دیر مزید باتیں کر سکتے ہیں؟"

"کیوں نہیں' آؤ' ادھر حجرے میں چل کر بیٹھتے ہیں۔" استاد جی نے کہا اور وہ ان کے ساتھ ساتھ چلنے لگا۔

حجرہ پرانے وقتوں سے بنی ایک کوٹھری تھی۔ جس میں ایک بستر فرش پر بچھا ہوا تھا۔ جس کے اطراف میں کتابیں پڑی تھیں۔ کونے میں صراحی اور پیالہ اور ایک جانب صندوق پڑا تھا۔ وہ دونوں آمنے سامنے بستر پر بیٹھ گئے۔ زرق شاہ کچھ دیر تک خاموش رہا، پھر بولا۔

"استاد جی! کیا آپ میری رہنمائی کر سکیں گے کہ حسینیت کیا ہے؟ اس سے اپنی نسبت کیسے جوڑ سکتا ہوں؟"

یہ سوال سن کر وہ چند لمحے اس کی جانب دیکھتے رہے۔ پھر سیدھے ہو کر دو زانو ہوئے اور بڑے ادب سے کہا۔

"یہ بات تمہارے دل میں خود بخود آئی ہے یا کسی نے تمہارے سامنے رکھی ہے؟"

"کسی نے۔" وہ آہستہ سے بولا۔

"جس نے اتنی بات کہی، اسی سے جواب بھی لے لینا تھا نا۔" وہ بولے۔

"میری رسائی نہیں اس تک، اس لیے۔" وہ کہتے کہتے خاموش ہو گیا۔ پھر شبانہ نے جو کہا تھا وہ ان کے گوش گزار کر دیا۔

"بے شک افکار حسین پاکؓ ہی حسینیت ہے اور نسبت، وہی عمل کیا جائے جو حسین پاکؓ نے کیا۔ ان جیسا بننے والا ہی نسبت دار کہلاتا ہے۔" انہوں نے ادب بھرے لہجے میں کہا۔

"تو پھر ہمارے اردگرد تو زیادہ یزیدیت ہی ہے، ہم کیوں نہیں انکار کرتے' ہم کیوں نہیں اٹھ کھڑے ہوتے؟" وہ جذباتی انداز میں بولا۔

"یہ تو توفیق کے معاملے ہیں۔ جسے وہ اوپر والا دے۔ مگر ایک اور بات بھی ہے۔ اللہ پاک نے تو بخشش لکھ دی ہے' مگر ہم ہی اپنے کردار سے بخشش کا انکار کر دیں۔" یہ کہہ کر وہ خاموش ہوئے پھر چند لمحوں بعد بولے۔ "امام حسین پاکؓ کا شمار ان ہستیوں میں ہوتا ہے جنہوں نے اپنے من کے اندر سے اٹھنے والی تمام تر باطل قوتوں پر قابو پا لیا تھا۔ وہ اپنے اندر سے فتح یاب تھے۔ تبھی باطل کو للکارا۔ جو جس قدر اپنے اندر سے مضبوط ہوگا، اس قدر ہی باطل قوتوں کو للکارنے کی جرات کرتا ہے۔ اسی میں قربانی دینے کا حوصلہ پیدا ہوتا ہے۔"

"اپنے من کی باطل قوتیں؟" اس نے پوچھا۔

"ہاں' ایک نفس بھی تو ہمارے اندر موجود ہے نا' جس طرح باہر کشمکش ہے، اسی طرح ہمارے اندر بھی تو کشمکش موجود ہے۔ ایک کربلا ہمارے اندر بھی تو بڑا ہے۔ جہاں بہت کچھ قربان کرنا پڑتا ہے۔ خود پر اسی نے فتح پائی ہے، جس نے اپنے آپ کو سمجھا اور جانا' دین، دھرم اور فکر و فلسفے' یہ سب بعد کی باتیں ہیں۔ پہلے خود کو انسان ہو کر تو دیکھے' پھر پتہ چلتا ہے کہ کائنات کا نظام کس شے پر چل رہا ہے۔"

"کوئی آئینہ تو ہوگا جس میں خود کو دیکھا جائے۔" اس نے سوچتے ہوئے انداز میں کہا۔

"وہی انکار' باطل قوتوں کا انکار، پھر اثبات ہے' اب تمہارا سوال یہ ہو سکتا ہے کہ آخر باطل قوتیں ہیں کیا' ان کی پہچان کیا ہے؟" وہ نرمی سے بولے۔

"جی۔" وہ سرسراتے ہوئے انداز میں بولا۔

"یہی دیکھنے کے لیے انسان کو عقل ودیعت کی گئی

ہے۔ یہی شعور ہے کہ وہ دیکھے، سچائی کہاں ہے، یہی آئینہ ہے، یہی معیار انسانیت ہے۔ امام حسین پاک کا انکار بھی تو انسانیت کی فلاح تھا نا۔ باطل قوتوں کا انکار، کس کے لیے ؟فلاح انسانیت کے لیے۔ تاریخ انسانیت میں دیکھو کہاں پر کیا ہے۔ بعض اوقات لوگوں کا اجتماع بھی سچائی پر نہیں ہوتا۔ سقراط کو زہر کا پیالہ پینا پڑا۔ پورا شہر اس کے خلاف ہو گیا لیکن تاریخ نے ثابت کیا کہ وہ اس وقت سچائی پر تھا۔ یزید کا لشکر جرار ایک طرف، یزید جب تخت نشین ہو گیا۔ تب اکثریت ایسے لوگوں کی تھی جو امت میں اختلاف نہیں چاہتے تھے۔ انتشار ختم کرنا چاہتے تھے۔ امن سکون چاہتے تھے۔ ایک نظام کو چلا کر مزید قتل و غارت گری کا خاتمہ چاہتے تھے اور ان لوگوں کی تعداد بہت کم تھی، جن کے خیال میں یزیدی نظام باطل تھا۔ وہ باطل کیوں تھا؟ اس لیے کہ سچائی، انصاف، عہد کی پاسداری اور اخلاق جیسے زریں اصول کونے کھدرے میں ڈال دیے گئے تھے۔ ایسے میں سیدنا حسین پاکؓ نے حق اور سچ کو رہتی دنیا تک ثابت کر دینے کے لیے کربلا کے صحرا میں شہادت کو زندگی دے دی۔ انہوں نے اپنے انکار سے ثابت کر دیا کہ باطل قوتوں کے خلاف کھڑا ہونا ہی عین جہاد ہے۔ یہ بھی ایک آئینہ ہے۔" انہوں نے تحمل و بردباری سے لفظ لفظ کہتے ہوئے سمجھایا۔

"مجھے کیا کرنا چاہیے۔" وہ روہانسا ہوتے ہوئے بولا۔

"اپنے آپ کو سمجھ لو تو پہلے اپنے اندر کی باطل قوتوں کے خلاف ڈٹ جاؤ۔ پھر باہر کی قوتوں سے نبرد آزما ہونا بہت آسان ہوتا ہے۔ اگر حسین پاکؓ کی نسبت چاہتے ہو تو اس نظام کو سمجھو، جس کے لیے انہوں نے شہادت کو زندگی دیا اور یہ بنا عشق کے حاصل ہونے والا گوہر نہیں۔ کیونکہ حسینیت، عشق ہے اور عشق، حسینیت ہے۔"

"ابتداء کہاں سے کروں۔" وہ سر سرایا۔

"کلمہ اپنے کلمے کو دیکھو "لا" کیا ہے انکار ہی تو ہے تمام باطل قوتوں کا۔ یہ کر لو پھر آگے اللہ ہی اللہ ہے اور پھر اللہ کو کیسے پانا ہے، وہ نبی دو جہاں، سرور کائنات، رحمت العالمین سرکار مدینہ حضرت محمد ﷺ کے ارشاد پاک ہیں۔ انہی سے اللہ بھی ملتا ہے۔ پھر سارے راستے کھلتے چلے جاتے ہیں، عشق خود ہی راہ پر لا کر منزل کی جانب گامزن کر دیتا ہے۔" انہوں نے بڑے جذب اور محبت سے کہا تو ان میں خاموشی چھا گئی۔ زرق شاہ سوچ کی دنیا میں نجانے کہاں جا پہنچا تھا۔ کافی دیر بعد چونکتے ہوئے اس نے استاد جی کے چہرے پر دیکھا اور ممنونیت سے بولا۔

"بہت شکریہ آپ نے میرا بڑا مسئلہ حل کر دیا۔ میں اگر آپ سے ملنے آؤں تو۔"

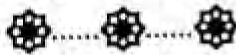
"بیٹا! اب تو مجھے بھی یاد نہیں کہ میں کب سے اس مسجد کی خدمت کر رہا ہوں۔ میں یہیں ہوتا ہوں۔ اگر کہیں ادھر ادھر ہو بھی جاؤں تو کسی ضرورت کے لیے بازار جاتا ہوں، پھر ادھر ہی آ جاتا ہوں، میں اب بھی یہیں بچے پڑھاتا ہوں۔"

"میں اگر کہوں کہ مجھے بھی وہیں سے سبق پڑھائیں جہاں میں نے چھوڑا تھا تو۔"؟" اس نے پوچھا۔

"مجھے خوشی ہو گی لیکن تم کسی نگاہ والے کے پاس جاؤ وہ تمہیں سنبھال لیں گے۔" انہوں نے انکساری سے کہا۔

"استاد جی! کیا میں اب بھی نگاہ میں نہیں ہوں؟" اس نے پوچھا۔

ہو، یہ نگاہ ہی کا تو کمال ہے کہ تم یہاں پر ہو لیکن ہر کسی کا اپنا مقام ہے، اس کا مقام اور ہے، جس نے تمہیں یہاں بھیجا، ان کا مقام اور ہے، جن کے پاس تم جاؤ گے، میری تو کوئی حیثیت ہی نہیں۔ مقام یار سے مقام عشق تک بڑے مرحلے ہیں بیٹا۔" انہوں نے گہری سنجیدگی سے کہا تو زرق شاہ گہری سوچ میں ڈوب گیا۔ پھر اچانک اٹھا۔ اس نے دونوں ہاتھوں سے مصافحہ کیا اور بیساکھی سنبھال کر باہر کی جانب چل دیا۔ عشق کی چنگاری جو سلگی تھی اس کی حدت وہ خود میں محسوس کرنے لگا تھا۔



شہر کے اس پوش علاقے میں شبانہ وقار نے اپنی گاڑی کی رفتار دھیمی کی اور پھر ایک بنگلے کے سامنے روک دی۔ گاڑی دیکھتے ہی چوکیدار نے گیٹ کھول دیا۔ اس نے پورچ میں سعدیہ کی گاڑی کے ساتھ اپنی گاڑی پارک کی اور پھر اندر کی جانب بڑھی۔ اس بنگلے کو وہ اپنا آفس بنا چکی تھی۔ اس کے پاس چند لڑکیاں کام کر رہی تھیں۔ جن کے ذمے مختلف کام تھے۔ جدید ترین سہولیات سے وہ آفس آراستہ کر رہی تھی۔ اس کے ابا نے وعدے کے مطابق ہر وہ شے مہیا کر دی تھی جس کی اسے ضرورت محسوس ہوئی۔ سعدیہ نے بھی کثیر سرمایہ اس کے پاس جمع کرا دیا۔ شبانہ نے زر کے سارے معاملات سعدیہ کے سپرد کیے اور خود انتظام سنبھال لیا۔ اس دن ان کی پہلی میٹنگ

تھی۔ یہیں اس نے طے کیا گیا منصوبہ سب کو بتانا تھا۔اس کے آتے ہی سب ہال میں جمع ہوگئیں۔

وہ بڑا روح پرور منظر تھا۔ہال میں سبھی لڑکیاں تھیں۔کوئی پورے نقاب میں کوئی حجاب میں۔شبانہ وقار نے تلاوت کلام مجید سے اس میٹنگ کا آغاز کیا۔اس نے اپنے سامنے بیٹھی چھ لڑکیوں کو دیکھا اور اپنی بات شروع کی۔

''میری بہنو! ہم کسی نئے کام کی شروعات نہیں کرنے لگیں۔بلکہ اُسی کام کو آگے بڑھا رہی ہیں جو رحمت العالمین، سرور کونین حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ نے شروع کیا، یعنی فلاح انسانیت۔ہمارے ذمے یہ فرض ہے کہ ہم اگلی نسل تک یہ پیغام پہنچائیں۔اگر ہم ایسا نہیں کرتے تو دنیا میں ہم سے کوئی پوچھنے والا بھلے نہ ہو مگر آخرت میں ہماری جواب دہی ہے۔اسلام عورت اور مرد کو برابر حیثیت دیتا ہے۔تاہم ان دونوں کے فطری تقاضوں کی بدولت فرائض میں تخصیص ہے اور اسی طرح حقوق میں بھی۔تا کہ فلاح انسانیت کی جو ذمے داری اسلام نے اپنے ماننے والوں کو دی ہے وہ بہترین طریقے سے سر انجام پائے۔فلاح انسانیت کے اس ابدی فرض کو مرد مسلمان نے جس قدر جانفشانی سے نبھایا، خواتین نے بھی اسی جوش و خروش اور خوش اسلوبی سے اس فرض کو ادا کیا۔مثال کے طور پر جنگ اُحد میں ایک خاتون حضرت نسیبہؓ نے اسی جانفشانی سے حضور نبی اکرم ﷺ کا دفاع کیا جس طرح مرد صحابہؓ نے کیا۔فرمانِ نبی ﷺ میں ذکر ہے کہ خود آنحضرت ﷺ نے حضرت نسیبہؓ کے بارے میں فرمایا کہ میں نے انہیں دیکھا وہ دائیں بائیں کسی طرف متوجہ ہوئے بغیر صرف میرے بچاؤ کے لیے لڑتی رہیں۔نیزوں کے کچوکوں اور تلواروں کے وار سے ان خاتون کے جسم پر بارہ زخم آئے تھے۔حضرت نسیبہؓ، حضرت زید بن عاصمؓ کی بیوی تھیں جو اپنے بیٹوں حبیب اور عبداللہ کے ساتھ میدان جنگ کے لیے نکلی تھیں۔تب رحمت العالمین ﷺ نے فرمایا تھا، اے اہل بیت رسول! اللہ تمہیں برکت عطا فرمائے۔حضرت نسیبہؓ نے آپ ﷺ سے عرض کی کہ آپ اللہ سے دعا کریں کہ ہمیں جنت میں آپ ﷺ کا ساتھ نصیب ہو۔آپ ﷺ نے اسی وقت یہی دعا فرمائی کہ اے اللہ ان سب کو جنت میں میرا ساتھی بنانا۔یہ سن کر حضرت نسیبہؓ نے کہا اب مجھے دنیا کی کسی مصیبت کی بھی پروا نہیں ہے۔'' وہ بڑے جذب سے کہتی ہوئی سانس لینے کو رکی۔تب پھر بولی۔

''حضرت عمارہؓ، بیعت عقبہ میں شریک تھیں اور غزوہ احد میں بھی اپنے شوہر اور دو بیٹوں کے ساتھ شامل تھیں۔بیعت رضوان اور جنگ یمامہ میں حاضر تھیں۔وہ برابر لڑیں ان کا ایک ہاتھ ضائع ہوگیا۔انہی سے مولیٰ ابن عباسؓ نے روایت کی ہے کہ حضرت عمارہؓ نے آنحضرت ﷺ سے عرض کیا کہ میں دیکھتی ہوں ہر چیز مردوں کے لیے ہے، عورتوں کا کہیں ذکر نہیں آتا۔اس پر یہ آیت مبارکہ نازل ہوئی۔''بے شک مسلمان مردوں کے لیے مسلمان عورتیں اور مومنین کے لیے مومن عورتیں''۔یہی وہ جوہرِ ایمان ہے جس کی بدولت اسلام سارے عالم میں پھیل گیا۔فلاح انسانیت کا پیغام خواتین نے بھی اسی طرح پھیلایا جیسا مردوں نے۔پھر جس طرح تہذیب اسلامی مضبوط سے مضبوط تر ہوئی۔اسی طرح مزید احکام آتے چلے گئے۔یہاں تک کہ پردے کا حکم آگیا لیکن خواتین پر کوئی قدغن نہیں کہ وہ فلاح انسانیت کے اس لازوال پیغام کو ترک کردیں۔کیونکہ ان کے بغیر یہ ادھورا ہے۔'' وہ یہ کہہ کر خاموش ہوگئی۔تبھی ایک لڑکی نے پوچھا۔

''اُس دور کے تقاضے کچھ اور تھے اور ہم جس دور میں ہیں اس کی کچھ دوسری ضروریات ہیں۔کیا ہم آج کے حوالے سے بات کرسکتے ہیں۔''

''میری بہن میں اسی طرف آرہی ہوں۔عہد کوئی بھی ہو لیکن پیغام تو وہی ہے نا اور یہ حقیقت ہے کہ ہر عہد میں مشکلات کم یا زیادہ ہوتی ہیں اور آج کا دور سب سے مشکل ہے کیونکہ اس میں ذہنی طور پر فتح کے خواب دیکھے جارہے ہیں۔اسی بنیاد پر گہری سازشیں کی جارہی ہیں۔بظاہر جنگ دکھائی نہیں دیتی لیکن شیطان بھیس بدل بدل کر، دلفریب نعروں کے ساتھ ہمارے عہد میں موجود ہے۔اس کا مقابلہ کرنے کے لیے زیادہ مضبوط ایمان اور زیادہ محنت کی ضرورت ہے۔''

''تمام تر مقابلہ عورت کے ذمے تو نہیں ہے نا۔'' ایک لڑکی نے کہا۔

''بے شک نہیں ہے لیکن اگر مسلمان عورت اپنے فرائض ہی سے آگاہ ہو جائے۔اپنی ذمے داریوں سے واقف ہو جائے اور اس پر عمل کرے تو اس کے لیے اتنا ہی کافی ہے۔عورت کو یہ سمجھنا چاہئے کہ اس کا دین اس سے کیا چاہتا ہے۔اسی سے ہی شیطان کی راہ میں اتنی بلند دیوار کھڑی ہو جاتی ہے کہ وہ اسے عبور نہیں کرسکتا۔''

"جب عورت چار دیواری تک ہی محدود رہے گی تو وہ کیا کر سکتی ہے۔ دور جدید میں علم کیسے حاصل کر پائے گی جو اس پر فرض ہے۔ کیونکہ آج کا معاشرہ عورت کو وہ سب مہیا نہیں کر رہا ہے۔ جس کی اسے ضرورت ہے یا دوسرے لفظوں میں آج کا معاشرہ پوری طرح اسلامی معاشرہ نہیں ہے۔"

"آپ کی بات درست ہے ایک عورت اپنی نسل نو کی اسی وقت پرورش و تربیت احسن انداز میں کر پائے گی، جب وہ خود علم حاصل کر چکی ہو اور اس کے ساتھ باعمل بھی ہو۔ اصل میں حقوق نسواں تو یہی ہے کہ وہ معاشرے کو مجبور کر دے اس کی ضرورت کے مطابق علم حاصل کرنے کی بہترین سہولیات مہیا کرے ہم نے ایسے ہی معاملات خواتین کے سامنے رکھنے ہیں۔"

"اس ضمن میں ہم نے کیا کرنا ہے۔" ایک لڑکی نے کہا۔

"دیکھو میری بہن! ہم نہ تو حاکم ہیں اور نہ ہی مفتی کہ فتویٰ دیں۔ اصل میں ہم نے موجود معاشرے کی عورت کے حقوق کو دینی نکتہ نگاہ سے سمجھنا ہے۔ عورت کو اس کی حیثیت سے دیکھنا ہے اور اس دین کے لیے کیا چاہتا ہے۔ اس سے آگاہ کرنا ہے۔ کسی خامی پر تنقید کرنا بہت آسان ہے۔ ہم نے کہیں بھی تنقید نہیں کرنی۔ اس خامی کے بدلے میں اچھائی کا ذکر کرنا ہے۔ ہدایت میرے اللہ کے پاس ہے۔ یہ اسی نے دینی ہے۔ ہم نے اپنا فرض نبھانا ہے۔"

"کیا آپ اسے کھول کر سمجھا سکتی ہیں۔" اسی لڑکی نے پوچھا۔

"میں کوشش کرتی ہوں، دیکھیں میرے علم کے مطابق پردے کے تین درجات بیان کیے گئے ہیں کہ عورت اپنے گھروں کی چار دیواری تک محدود رہے اور فقط شوہر اور محرم رشتے داروں کے سامنے چہرہ کھول سکتی ہے۔ دوسرا یہ کہ پورا چہرہ، یا فقط آنکھیں غیر محرم اجنبی یا غیر محرم رشتے دار کے سامنے کھول سکتی ہے۔ تیسرا درجہ اجنبیوں کے لیے مکمل پردہ، گھر اور خاندان کے افراد کے سامنے کھلا چہرہ، ضرورت یا خدمت کے لیے سامنے آنا وغیرہ، اب ہمارے معاشرے میں ایسی خواتین بھی ہیں جو پردہ تو کرنا چاہتی ہیں لیکن جب انہیں پردے کے بارے میں سختی سے بتایا جاتا ہے تو گھٹن محسوس کرتی ہیں۔ جب پورے پس منظر کے بغیر انہیں آگاہی دی جائے گی تو ایسے ہی تصورات پیدا ہوں گے۔ ان پر جبر نہ کیا جائے۔ فطری طور پر وہ خود، بخود ادنیٰ درجے سے اعلیٰ درجے تک آجائیں گی۔ اکتاہٹ محسوس نہیں کریں گی۔ کبھی رات ایک دم نہیں آتی اور نہ سورج ایک دم سے نکل آتا ہے۔ آہستہ آہستہ انسانی فطرت کے مطابق ترغیب دی جائے۔ ہمارے سامنے کئی فرقے، مسلک یا مکتبہ فکر ہوں گے، ہم یا تو خود کسی کی نمائندگی نہیں، قطعاً نہیں۔ ہمارا پیغام فلاح انسانیت کا ہے۔ وہی محبت انسان، قرآن مجید میں انسان مخاطب ہے۔ پھر مومنین کی باری آتی ہے۔ یہ ہو ہی نہیں سکتا کہ مومن اچھا مسلمان نہ ہو اور یہ بھی نہیں ہو سکتا کہ اچھا مسلمان ایک اچھا انسان نہ ہو۔ یہی بات تو بتانی ہے کہ دین انسان کے لیے کیا اعلیٰ صلاحیتیں پیدا کرنے کا اہتمام کرتا ہے۔ جس سے وہ اچھا مسلمان بنتا ہے، پھر مومن۔ ہمارے پیغام میں جب شہرت کا حصول یا انانیت نہیں ہو گی، تو ہمارا تعلق صرف انسانی فلاح سے ہو گا۔ کیونکہ نفسانیت ہی تمام خرابیوں کی جڑ ہے۔ انانیت کو نکال دیں، جو اپنی الگ شناخت بنانے پر مجبور کرتی ہے تو باقی فقط فلاح ہی بچتی ہے۔ ہمارے اذہان میں صرف اور فقط امت مسلمہ ہو تو ہم اسلام کے نمائندہ قرار پائیں گی۔"

"اس طرح ہمارا دائرہ عمل محدود نہیں لامحدود ہو جائے گا۔" ان میں سے ایک لڑکی بولی۔

"جی، جس طرح میں نے ابتداء میں خواتین صحابیات کا واقعہ سنایا، اس کا مقصد یہی ہے کہ خواتین کم مسلمان نہیں ہیں اور نہ ہی ان کا درجہ کم تر ہے۔ یہ تو فطری ساخت کی بناء پر ان کے دائرہ عمل مختلف ہیں۔ اب میں سمجھتی ہوں کہ یورپ کی وہ خواتین جو حجاب پہنتی ہیں اور اپنی زندگی کو اسلامی رنگ میں رنگے ہوئے ہیں وہ ہم سے کہیں زیادہ بہتر ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ وہاں کی نفرت اور تعصب کا شکار ہیں۔ وہ زیادہ مزاحمت کر رہی ہیں۔ کبھی ہم نے سوچا کہ وہ حجاب کیوں لینے پر اصرار کر رہی ہیں۔ جبکہ وہاں تو کپڑے اتار دینے کی مکمل آزادی ہے۔ قوانین بھی مخالف ہیں۔ معاشرے میں بھی تعصب ہے؟ ہم انہیں حوصلہ کیسے دے سکتی ہیں؟ ان کے خیالات اپنے معاشرے کو بتا سکتی ہیں۔ یہیں سے امت واحدہ ہمارے اذہان میں آئے گی۔"

"اس طرح ہم ان کی نہ صرف حوصلہ افزائی کریں گی۔ بلکہ انہیں مزید مضبوط ہونے میں مدد دیں گی۔" ایک لڑکی نے کہا۔

"بالکل اگر یورپ میں حجاب کو سیاسی علامت مان بھی لیا

جائے تو کیا ہے؟ وہ ایسا سوچتے رہیں لیکن ہمیں ہی احساس دلانا ہے کہ یہ سیاسی نہیں ہماری دینی ضرورت ہے۔" اس نے کافی حد تک جذباتی لہجے میں کہا۔

"جی اس کا بہترین طریقہ تو یہی ہے کہ یورپ جس قدر اسلامی تہذیب کے بارے میں اپنی نفرت اور تعصب کا اظہار کرتا ہے ہمیں اس کا جواب نہ صرف اپنے قول سے بلکہ فعل سے دینا چاہیے۔ ہمارے معاشرے میں حجاب کا فروغ زیادہ ہونا چاہئے۔" وہیں موجود ایک لڑکی نے کہا۔

"اصل میں وقت کے ساتھ ساتھ جہاں سوچنے کا انداز بدلا ہے وہاں بات سمجھانے کے انداز بھی بدلے ہیں۔ اب جب تک آپ کی بات میں مضبوط دلائل نہیں ہوں گے، بات قبول نہیں کی جائے گی۔ سو اب ہمارا کام تحقیق کی بنیاد پر ہونا چاہیے۔ کیونکہ ایمان والوں کے لیے تو کلام رب جلیل ہی کافی ہے لیکن وہ جو کمزور ایمان رکھتے ہیں یا پھر وہ جو ایمان والے نہیں ہیں، انہیں دلیل و براہین کی ضرورت ہے۔ ان کے لیے دلیل تو دینا ہوگی اگر ہم سچے ہیں۔"

"ہم سچے ہیں۔ ہمارا پیغام سچا ہے۔" ایک لڑکی نے بہت جذباتی انداز میں کہا۔

"میں اگر یہ سوال کروں کہ بتاؤ تم کس بنیاد پر کہہ رہی ہو تو؟" اس نے پوچھا۔

"کیونکہ یہ قرآن مجید کا فیصلہ ہے جو اٹل ہے اور سچا ہے۔ اس لیے نہیں کہ مسلمان ہوں اور اس لیے کہہ رہی ہوں۔ بلکہ اسے جب اور جہاں آزمایا جائے گا، وہیں پورا اترے گا اور وہ فیصلہ یہ ہے کہ حق آیا اور باطل مٹ گیا، بے شک باطل مٹ جانے کے لیے ہے۔ گہرے اندھیرے میں ہلکی سی کرن بھی باطل کو تاراج کر دیتی ہے۔" اس لڑکی نے جذباتی انداز میں کہا۔

"بالکل، یہی انداز لیکن ہمیں اس سے بھی آگے جانا ہے۔ غیر مسلم کی ہر "کیوں" کا جواب بھی دینا ہے۔ اس کی خامیاں بیان کر کے نہیں، اپنی خوبیاں بیان کر کے۔ ہمارا سب سے پہلا کام یہی ہوگا کہ پردے پر تحقیق کریں۔ اس کے ہر پہلو کا جائزہ لیں اور اپنی ان مسلم بہنوں کے سامنے رکھیں جو ابھی پردہ نہیں کرتیں۔ پھر وہ قبول کرتی ہیں تو الحمدللہ، نہیں کرتیں تو پھر سے کوشش کرنی چاہیے۔" یہ کہہ کر وہ خاموش ہو گئی۔ چند لمحے بعد وہ بولی۔ "مزید کوئی سوال اگر آپ کرنا چاہیں۔"

"فی الحال تو نہیں ہے۔ اگر ہوا تو دیکھیں گے۔" ان میں سے ایک نے کہا۔

"ٹھیک ہے، ہم اپنا اپنا کام کریں۔" شبانہ نے کہا اور پھر اٹھ گئی۔ کچھ دیر بعد ہال خالی ہو گیا۔ شبانہ اپنے آفس میں گئی تو سعدیہ بھی وہیں جا پہنچی۔ جیسے دیکھ کر وہ بولی۔

"ہمیں ایک اچھی ٹیم مل گئی ہے۔ اب ضرورت اس بات کی ہے کہ ہمارا کام درست سمت میں چل پڑے۔"

"ان شاء اللہ ہوگا لیکن میں اکثر سوچتی ہوں، ہمارا معاشرہ جو مرد کا معاشرہ ہے، ہم اس میں کہاں تک اپنا کام کر پائیں گی۔" اس نے پوچھا۔

"سعدیہ! یہی تو ہم نے ثابت کرنا ہے کہ ہم سب کچھ کر سکتی ہیں۔ حجاب ہماری راہ میں رکاوٹ نہیں ہے اور نہ ہی یہ مردوں کا معاشرہ اور دوسری بات یہ ہے کہ ہماری نیت خالص ہے۔ ہمیں تائید الٰہی ضرور ملے گی اور تیسری بات یہ کہ اس دور کا تقاضا کمرشل ہے۔ مشن تو ہے ہی لیکن ہمارے کام کی بنیاد جب کمرشل ہے تو بلاشبہ نفع کا حصول بھی ہوگا۔ تم پریشان نہ ہو۔ دیکھنا ہمارا کام پوری دنیا میں پھیلے گا۔" شبانہ نے تحمل سے اسے سمجھاتے ہوئے کہا۔

"میں پریشان نہیں ہوں۔ بلکہ اپنے گھر والوں کی وجہ سے ڈسٹرب ہوں۔ وہ لوگ اس تجسس میں ہیں کہ میں کیا کرتی ہوں، کدھر جاتی ہوں وہ مجھے دہشت پسند، شدت پسند اور نہ جانے کیا کچھ خیال کرنے لگے ہیں۔" وہ مسکراتے ہوئے بولی۔

"اچھا ہے، انہیں دکھاؤ، انہیں اپنے کام کے بارے میں بتاؤ، اور ثابت کرو کہ ایسا کچھ نہیں ہے، بلکہ تم تو وہ فریضہ ادا کرنے نکلی ہو، جس کی عورت کو اس زمانے میں سب سے زیادہ ضرورت ہے۔" اس نے کہا۔

"یہ سمجھانے میں بڑا وقت لگے گا۔" وہ بڑبڑائی پھر تیزی سے بولی۔ "خیر، مجھے تو اپنا فرض نبھانا ہے اور وہ میں نبھاؤں گی۔ اس میں کوئی دوسری بات نہیں ہے۔"

"سعدیہ! مخالفت تو ہوگی۔ غیر بھی کریں گے اور اپنے بھی۔ دکھ ہوتا ہے جب اپنے ہی مخالفت پر اتر آئیں۔ وہ ہمارا نکتہ نظر ہی نہیں سمجھ سکتے لیکن ہم نے اپنا کام کرنا ہے۔ ایک سوچ دینی ہے۔ وہ ہم دیں گے۔ باقی اللہ ہمارا حامی و ناصر

ہے۔ وہ ہمیں استقامت تو دے گا نا۔" شبانہ نے جذب سے کہا تو سعدیہ مسکرا دی۔ پھر اٹھ کر اپنے کمرے کی جانب بڑھ گئی۔ شبانہ اسے دیکھتے ہوئے بہت حوصلہ محسوس کر رہی تھی۔ اسے یونیورسٹی والی سعدیہ یاد تھی۔



اس دن زرق شاہ بنا بیساکھیوں کے مسجد کی سیڑھیاں چڑھ کر حوض کے قریب جا پہنچا۔ اس وقت دن خاصا چڑھ آیا تھا۔ صحن میں کوئی نہیں تھا۔ چند کبوتر تھے جن میں کچھ دیوار پر بیٹھے ہوئے تھے اور کچھ صحن میں غٹرغوں غٹرغوں کر رہے تھے۔ تبھی اس کی نگاہ حجرے پر پڑی جس کا ایک پٹ کھلا اور دوسرا بند تھا۔ وہ اس کی جانب بڑھ گیا۔ اس نے دروازہ پر دستک دینے کے لیے ہاتھ بڑھایا ہی تھا کہ اندر سے استاد جی کی آواز آئی۔

"آ جاؤ بیٹا!"

وہ اندر چلا گیا۔ علیک سلیک کے بعد کچھ دیر حال احوال کی باتیں ہوتی رہیں۔

"بہت دنوں بعد آئے ہو، مصروف تھے۔" استاد جی نے انتہائی شفقت سے پوچھا۔

"میں ذات اور شناخت سے لے کر نسبت تک میں پھنس گیا ہوں۔ میں چاہتا ہوں کہ نسبت جوڑ لوں۔ مگر مجھے کوئی طریقہ، کوئی لائحہ عمل نہیں مل رہا ہے۔ کن افکار کے سہارے میں اپنی نسبت تک پہنچوں۔" اس نے الجھے ہوئے لہجے میں کہا۔ تب وہ بڑی نرمی سے مسکراتے ہوئے بولے۔

"میں نے تو سوچا تھا کہ تم نے بہت غور و فکر کیا ہوگا۔ اب تک کسی نکتے پر پہنچ گئے ہوگے۔ مگر تم نے بھی کوئی نئی یا انوکھی بات نہیں کی۔ یہ تو ہمارے آج کے نوجوان کا مسئلہ ہے۔ زندگی میں ایک وقت ایسا ضرور آتا ہے جب ہم اپنی ذات پر غور کرتے ہیں۔ خوش نصیب ہیں وہ لوگ جن کے لیے یہ وقت جوانی میں آ جاتا ہے۔"

"لیکن میں کن افکار پر اعتماد کروں۔" اس نے دھیرے سے پوچھا۔

"جن افکار پر تیرا دل مطمئن ہو جائے۔ اصل مرشد تو دل ہی ہے نا۔ یہی لوتھڑا اگر درست ہے تو سب درست، اگر اس میں کہیں کجی ہے تو سب ٹیڑھا۔ اصل میں تم خود الجھے ہوئے ہو۔ تمہارے اندر موجود نفس، تمہیں ان الجھنوں سے نکال ہی نہیں رہا۔ کیونکہ جن افکار نے تمہیں جڑوں سے ہلا دیا ہے انہی میں تمہاری مضبوطی چھپی ہوئی ہے۔ تم نے ان پر غور ہی نہیں کیا۔" استاد جی نے اس کے چہرے پر دیکھتے ہوئے کہا۔

"میں نے غور کیا ہے استاد جی! میں اپنی منزل کے بارے میں مطمئن ہوں لیکن میری منزل اوجھل ہے اور اتنے راستے ہیں کہ ان راستوں پر آ کر الجھ گیا ہوں۔ نجانے کون سا راستہ منزل پر پہنچا دینے والا ہے۔ میں تذبذب میں ہوں۔" وہ الجھے ہوئے بولا۔

"بے شک تمہارا تذبذب فطری ہے لیکن یہ دلالت کرتا ہے کہ تم نے اپنے آپ کو نہیں دیکھا۔ کیا تم اپنے آپ کو اس قابل سمجھتے ہو کہ منزل کی جانب چل سکو؟" استاد جی نے پیار سے کہا۔

"جی، یہ کیسے، میں۔" وہ ہکلا کر رہ گیا۔

"دیکھ میرے بیٹے! جب محبت من میں آ جاتی ہے تو پھر وہاں کچھ اور نہیں رہتا۔ ماسوائے انکار خود بخود آتا چلا جاتا ہے۔ بات بہت لمبی ہے لیکن اختصار سے فقط اتنا کہا جا سکتا ہے کہ جسے تم اپنے من میں بسانا چاہتے ہو، کیا اپنے من کو اس کے شانِ شایان بنایا ہے؟ جب تک اپنے آپ سے آشنا نہیں، منزل سے آشنائی کا دعویٰ کیسے کر سکتے ہیں۔ من میں شکوک و شبہات ہیں تو وہاں محبت اتر ہی نہیں سکتی۔ یہی ایمان ہے۔"

"کیا میں انہی راستوں میں الجھ کر رہ جاؤں گا؟" وہ مایوسی میں بولا۔

"نہیں، یہ راستے کوئی وقعت نہیں رکھتے، جب منزل پر بھروسہ ہو۔ کیا منزل تمہاری طرف نہیں آ رہی ہے۔ یہ ذرا سی بات سمجھ کیوں نہیں آتی بیٹے کہ وہ اللہ جس کی چاہت تم اپنے من میں رکھتے ہو، اس کا تو کہنا ہے کہ وہ ستر ماؤں سے بھی زیادہ پیار کرتا ہے۔ ایک قدم اس کی جانب بڑھاؤ تو وہ دس قدم اس کی جانب آتا ہے۔ اگرچہ یہ ساری سمجھانے کی باتیں ہیں۔ معاملہ کچھ اور ہے۔ جس وقت منزل کی طرف نگاہ کی۔ اللہ کی جانب رجوع کیا۔ تبھی سفر شروع ہو گیا۔ پھر راستے کہاں گئے۔ اصل قیمت تو خلوص کی ہے اور خلوص کا جوہر عشق ہے، جس من میں پیدا ہو گیا۔ دیکھو نا، یہ جو ایمان ہے، کون سی طاقت اسے مضبوط کرتی ہے۔ خلوص سے پختگی کس شے سے آتی ہے۔ عشق کے سوا کوئی قوت ایسی نہیں جو باطل کا انکار کروائے۔ جب تعلق ہی براہ راست ہے تو پھر راستہ بھی وہی

دکھاتا ہے۔ ظلمت چھٹتی ہے اور نورِ الٰہی خود انسان کی رہنمائی کرتا ہے۔"

"کب' کیسے۔" وہ تذبذب سے بولا۔

"عشق کا راستہ حسن ہے اور عشق کی فطرت کیا ہے؟ وصل پانے کی جستجو میں لگے رہنا۔ یہاں تک حق کی شہادت دے دے۔ منزل کو پالینے کی تڑپ کہاں ہوتی ہے' تمہارے من ہی میں نا اگر تڑپ ہی من میں نہیں رہی تو پھر کہاں کے راستے، کہاں کی منزل اگر تڑپ میں خلوص ہے اور عشق جہد مسلسل پر آمادہ کیے رکھتا ہے تو پھر کسی الجھن کا سوال نہیں۔ اسی جہاد میں شہادت مل جانا ہی منزل ہے۔ عشق الجھنے نہیں دیتا۔ کیونکہ اس کے آنے سے کوئی الجھن نہیں رہتی۔ اب آتے ہیں راستے کی طرف اگر تم اس پر اصرار ہی کرتے ہو تو۔" استاد جی نے نرم لہجے میں کہا۔

"ہاں' کوئی تو راستہ ہوگا۔ جس پر چلنا ہے۔ جو منزل کی جانب جاتا ہے۔ اب عشق کی بدولت چاہے دو قدم پر ہی منزل مل جائے یا پھر ساری عمر کی مسافت میں کبھی نہ ملے۔" وہ جلدی سے بولا۔

"وہ صراطِ مستقیم ہے، وہی میعار ہے، وہی سچائی ہے۔ وہ ہے کلام الٰہی، جو دے دیا لے لو اور جس سے منع کیا اسے چھوڑ دو۔ اسی سے نگاہ ملتی ہے کہ کون سا راستہ بند گلی میں لے جاتا ہے کون سا دلدل تک جاتا ہے اور کون سا منزل کی جانب کرتا ہے۔ یہاں جو بھی اور جیسا بھی راستہ بنا کر بیٹھا ہوا ٹیکس وصول کر رہا ہے۔ وہ خود بخود عیاں ہو جاتا ہے کہاں انانیت ہے، کہاں نفس پرستی ہے اور کہاں نورِ الٰہی موجزن ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ آخر اسی پر اصرار کیوں؟ یہی راستہ چنا جائے۔ یہ وہ مقام ہے جہاں من میں ابھی شکوک شبہات ہیں۔ تب سارے راستوں کو دیکھا جائے کہ فلاح انسانیت کی راہ کون سی ہے؟ اگر فلاح انسانیت کی راہ "صراطِ مستقیم" ہے تو اپنا لیں۔ تب یہ مجبوری کی نیکی ہے۔ یہاں میں جبر نہیں کر رہا کہ بلا تحقیق مان لو۔ تحقیق کرو جہاں تک مطمئن ہونے کے لیے کرو۔ مگر اس کے لیے بھی عشق چاہیے۔ سچائی کا ترازو تمہارے ہاتھ میں ہو۔ خود کو اس کا اہل بناؤ کہ سچائی کا ترازو اپنے ہاتھ میں لے سکو۔ جہاں شکوک و شبہات جیسی آلودگی ہے وہاں عشق جیسی پاکیزہ شے آ ہی نہیں سکتی۔"

"کیسے' کیسے معلوم ہوگا کہ میں اپنے من کو اس قابل بنا چکا ہوں کہ عشق۔" وہ آہستہ سے بولا۔

"یہ سب کردار سے واضح ہو جاتا ہے۔ کردار ہی اظہار ہے۔ وہی بتاتا ہے کہ یہ اپنے من میں کیسے خیال رکھتا ہے۔ کردار ہی شہادت دیتا ہے کہ اس کی نسبت کیا ہے۔ کیونکہ نبی رحمت، سرور کونین رحمت العالمین اور حقوق انسان کے سب بڑے داعی حضرت محمد ﷺ نے خطبہ حجتہ الوداع پر فرما دیا تھا کہ ذات پات، نسب کا غرور، عربی یا عجمی کی فضیلت نہیں بلکہ تقویٰ یعنی کردار ہی باعث فضیلت ہے۔ نسبت تو وہی اور اسی کی ہوگی جس کے خیالات ذہن میں ہیں۔ کردار بھی ویسا ہی ہوگا۔"

"اتنی بات تو میں سمجھ گیا ہوں استاد جی۔ تاہم ایک بات ضرور سمجھنا چاہوں گا کہ کیا عشق کی معراج شہادت ہے؟" وہ بولا۔ تو استاد جی قدرے جذباتی ہو گئے۔ انہوں نے لرزتے ہوئے لہجے میں کہا۔

"یہ بہت تفصیل طلب بات ہے۔ ایک نشست میں نہیں کی جا سکتی۔ تاہم میں اتنا کہہ دیتا ہوں کہ اصل مقصود قربانی ہی ہے۔ شہادت دینا، اپنے آپ کی، اپنے اظہار کی، اپنے من کے اندر کی' یہ جان لو کہ مردہ کی قربانی نہیں ہوتی' ہمیشہ زندہ کی قربانی ہوتی ہے' کیا تمہارا کردار زندوں والا ہے۔ زندہ لوگ ہی اپنی قربانی دیا کرتے ہیں۔ تم کیا سمجھتے ہو ہر طرف دکھائی دینے والے انسان زندہ ہیں؟ اگر زندہ ہوتے تو ان میں ہوش بھی ہوتا، ان کا شعور بیدار ہوتا۔ خود کو مسلمان بھی کہلوائیں اور مردہ بھی ہوں ایسا ممکن نہیں ہے۔ زندگی ہی زندگی کو جنم دیتی ہے۔ کیا تم اسے مردہ نہیں گردانو گے جو یہ الجھن لیے پھرتا ہے کہ میں اللہ سے محبت کیسے کروں؟ کیا وہ مردہ نہیں ہے جو دعویٰ تو عاشق رسول کا کرے اور اس کے کردار سے شہادت یہ ملتی ہو کہ اس کے اندر اب بھی بت پڑے ہیں۔ کہیں نسب کے' کہیں انانیت کے' کہیں شہرت کے' کہیں حب جاہ مال کے اور تمہارے جیسے بندے کو یہ پوچھنے کی ضرورت پڑے کہ حسینیت کیا ہے۔"

"بے شک قربانی زندوں کی ہوتی ہے۔" وہ زیر لب بڑبڑایا۔

"کیا تم اتنا بھی نہیں جانتے کہ عشق رسول ﷺ کے تقاضے کیا ہیں۔ تو سنو' نبیوں کے باپ حضرت ابراہیمؑ سے حسینیت کا آغاز ہوتا ہے اور انتہاء کربلا کے میدان میں ہوتی

ہے۔اپنے کردار سے شہادت کا مطلب ہی یہی ہے کہ فلاح انسانیت کا جو پیغام نبی رحمت، سرکار مدینہ صلی اللہ علیہ وسلم لے کر آئے اس سے پوری دنیا کو فیض یاب کر دیا جائے۔ یہی اعزاز خاتم النبین صلی اللہ علیہ وسلم کی امت کا ہے۔ عشق رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا تقاضہ یہ ہے کہ جو کیا، جو کہا اپنے آپ کو اس میں ڈھال لو، عشق ہی وہ آگ ہے جو ڈھلنے میں مدد دیتی ہے۔ کیا میں اور تم اپنے کردار سے یہ شہادت دیتے ہیں کہ ہماری نسبت، محبت اور عشق وجہ تخلیق کائنات صلی اللہ علیہ وسلم سے ہے؟" اگر ہم زندہ ہوں تو شیطان سو طرح کے بھیس بدل کر ہمارے درمیان موجود نہ ہو۔ ہر محاذ پر کافرین مسلمانوں کو مطعون نہ کر رہے ہوں۔ غیر اقوام کا طرز زندگی ،اگر امت مسلمہ میں دکھائی دے رہا ہے تو یہ ہمارے مردہ ہونے کی شہادت نہیں تو اور کیا ہے' کیا ہمارے مردہ ہونے کی شہادت یہ نہیں ہے کہ ظلم سہہ رہے ہیں اور پلٹ کر جواب نہیں دے رہے؟"

"استاد محترم! بے شک ہر محاذ پر مسلمان ہی کو مورد الزام ٹھہرایا جا رہا ہے۔ جبکہ فلاح انسانیت کا پیغام تو انہی کے پاس ہے۔"

"المیہ تو یہی ہے کہ ہم اس قدر مردہ ہیں۔ دشمن انسانیت کے ہتھیاروں ہی کو نہیں سمجھ پا رہے۔ وہ ہماری عورتوں کو ننگا کر دینے کے درپے ہیں جبکہ اللہ کا حکم تو نبی رحمت صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعے یہی ہے کہ پردہ کریں۔ اب یہ ہم اور تم خود جان لیں کہ موت کے کس مقام پر ہیں۔ آج کا میڈیا دشمن انسانیت کا سب سے بڑا ہتھیار بن چکا ہے لیکن افسوس کہ ہم اسی میں الجھے ہوئے ہیں کہ یہ ہتھیار اٹھائیں یا نہیں؟ اسی سے ان کی جرات ہوئی اور آج کے دور میں وہ کام ہو گیا جو پہلے کبھی نہ ہوا تھا۔ اہانت رسول! اور ہمارا کردار کیا شہادت دیتا ہے، ہمارا عشق کیا شہادت دیتا ہے؟" اپنے آپ کو ہی جلا لیا جائے۔ یہ تو بے بسی کی انتہا ہے۔ موت کی آخری ہچکی' عاشق رسولؐ ہونے کا دعویٰ اپنی قبروں میں لے جاؤ۔ مردوں کی بستی میں شیطان دندناتا پھرتا ہے۔" استاد جی روہانسے ہوتے ہوئے بولے۔ ان کی آنکھیں نم ہو گئی تھیں۔

"میں' میں۔" وہ بڑبڑا کر رہ گیا۔

"یہی میں ہمیں موت کی جانب لیے جا رہی ہے۔ اپنی اپنی انانیت لیے گروہ در گروہ بیٹھے ہیں اور تم مجھ سے یہ پوچھ رہے ہو کہ نسبت کیا ہے۔ نسب سے نسبت نہیں، عشق سے نسبت بنتی ہے۔ تم سید زادے اپنے آپ کو دیکھو، کیا تم اس قابل ہو کہ رسول عربی صلی اللہ علیہ وسلم سے اپنی نسبت کا دعویٰ کر سکو، دعویٰ وہی کر سکتا ہے جو اپنے کردار سے شہادت دے۔ اپنے زندہ ہونے کا ثبوت خود کو جلانے سے نہیں، اپنے زندہ ہونے کا احساس دلانے سے ہے۔ سنت نبویؐ کو اپنانے کی شہادت اپنے کردار سے دیں۔ رحمت العالمین صلی اللہ علیہ وسلم کی اہانت کوئی نہیں کر سکتا۔ کیونکہ اللہ پاک نے خود فرما دیا کہ میں نے تیرے ذکر کو بلند کر دیا۔ وہ تو خدا اور محبوب کا تعلق ہے، ہم کہاں ہیں؟ اگر ہمارا اس حکم پر یقین پختہ ہے کہ جاء الحق و ذالحق الباطل' تو ظلمت جتنی بھی ہو نور آ جانے سے سب چھٹ جائے گا۔ اگر ہمیں اپنے پیغام کی سچائی کا ادراک ہے۔ عشق کہتا ہے آگ میں کود پڑو تو پھر کود پڑو تبھی رحمت الٰہی سے آگ گل و گلزار ہوتی ہے۔ مظلوم نہیں بنو، زندہ ہو کر دکھاؤ۔ آج کے کربلا میں یہی شہادت ہے۔" استاد جی نے حد درجہ جذباتی ہو کر کہا تو کمرے میں خاموشی چھا گئی۔ پھر زرق شاہ بڑبڑاتے ہوئے بولا۔

"استاد جی! میں سمجھ گیا، میرا راستہ کیا ہے، ساری الجھنیں دور ہوئیں' میں سمجھ گیا زندگی ہی سے زندگی ملتی ہے' میرے نبی رحمت صلی اللہ علیہ وسلم کا پیغام زندہ ہے' میں مردہ نہیں۔"

"تو پھر سن لو! کسی شے کو حاصل کرنے کی جستجو کا نام عشق ہے، جمود نہیں ارتقاء ہے، منزل نہیں جہد مسلسل ہے' یہ جان لو اور سمجھ لو کہ عشق کے اندر قوت تخلیق ہے۔ اسی کی بدولت روح ایمان اور جوہر یقین نصیب ہوتا ہے۔ زمانے کے ساتھ ڈھل جانے کا نام عشق نہیں، بلکہ عشق بھی اس وقت زندگی پاتا ہے جب کربلا جیسے حالات ہوں۔ تبھی شہادت قبول ہوتی ہے اور زندگی بس زندگی پاتی ہے۔ عشق مردہ لوگوں کا شیوہ نہیں زندوں کا ہے۔ ان کا دعویٰ باطل ہے جو مردہ ہیں۔ دشمنان انسانیت کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بات کرنے کا حوصلہ بھی عشق عطا کرتا ہے، جاؤ! عشق کی دولت حاصل کرو' اسی میں سب کچھ پنہاں ہے۔" استاد جی نے شدت جذبات سے کہا اور آنکھیں موند لیں۔ نجانے وہ اپنے اندر کیسا دکھ محسوس کر رہے تھے۔ زرق شاہ کچھ دیر تک بیٹھا رہا۔ پھر جب انہوں نے کوئی بات نہ کی تو وہ اٹھ گیا۔ اپنی گاڑی تک واپس آتے ہوئے اپنے اندر کی کیفیت کو محسوس کر رہا تھا۔

وہ گاڑی میں بیٹھا تو ڈرائیور نے گاڑی بڑھا دی۔ وہ خیالوں میں کھو گیا۔ بلاشبہ وہ آج سے پہلے مردہ ہی تھا۔ کیونکہ

سسپنس تجسس اور سے لبریز ایک ناقابل فراموش کہانی

امجد جاوید کے قلم کا شاہکار ناول

عورت زاد

عورت زاد اس حسینہ کی کہانی جسے اِس ظالم معاشرے نے جنم دیا

عورت زاد اس عورت کا احوال جس نے ظالم معاشرے میں علم بغاوت بلند کیا

عورت زاد آہنی ارادوں والی ریشم بدن کی روداد جس نے وقت کی لگام کو تھام لیا

عورت زاد حالات کی بنائی ہوئی سنگلاخ راہوں پر چلنے والی ایک نازک اندام

عورت زاد آگ وخون سے گذر کر منزل کی طرف گامزن رہنے والی برق صفت دلربا

عورت زاد ایک صنف نازک کی سرگذشت، جو باغی دلوں پر حکومت کرنا جانتی تھی۔

بہت جلد نئے افق کے صفحات پر ملاحظہ کیجیے

نئے افق کے سالانہ خریدار بن کر اپنی کاپی آج ہی محفوظ کرالیں

مردے کی کیفیت کیا ہوتی ہے۔اس کا مادی جسم تو موجود ہوتا ہے لیکن نہ اس میں کوئی فکر ہوتی ہے، نہ خیال اور نہ کوئی سوچ۔اس میں جذبات نہیں ہوتے اور نہ کوئی حس کام کر رہی ہوتی ہے۔اگر چہ وہ کھاتا پیتا اور سانس بھی نہیں لیتا۔اس طرح کھانا پینا اور سانس لینا کس لیے۔محض زندگی کے لیے، جس کا کوئی مقصد نہیں۔یہ تو حیوان بھی کرتے ہیں۔اصل شے تو فکر ہے، جس کے باعث انسان، انسان ہے۔ورنہ وہ بھی حیوان۔یہ سب سے بڑا المیہ ہے کہ کوئی انسان ہو کر حیوان جیسی زندگی بسر کرے اور اس سے بھی بدتر المیہ یہ ہے کہ وہ سانس بھی لے مگر اس کے پاس کوئی فکر نہ ہو اور وہ بے حس اور جذبات سے عاری ہو۔تو میں وہی زندہ رہتی ہیں جن کے پاس زندہ افکار ہوتے ہیں۔زندگی ہی زندگی دے سکتی ہے، موت کیا زندگی دے گی۔



اس دن چھٹی ہونے کی وجہ سے سعدیہ گھر پر ہی تھی۔فجر پڑھنے اور اپنے معمولات کے بعد وہ کچن میں گئی۔چائے بنا کر وہ لکھنے کی میز پر آ بیٹھی۔تب سے وہ اپنے کام میں مگن تھی۔ایسے میں ملازمہ ہلکی سی دستک کے ساتھ کمرے میں آ گئی۔اس نے ہولے سے کہا۔

''آپ کو بیگم صاحبہ نے بلایا ہے۔''

''اچھا ٹھیک ہے میں آتی ہوں۔'' یہ کہہ کر اس نے کھڑکی کے پار دیکھا باہر روشن دھوپ میں سبز پودے، بہت ہی دلکش لگ رہے تھے۔یوں آنکھوں کے سامنے خوبصورت منظر آنے سے اس کے من میں خوشگوار لہر دوڑ گئی۔اس نے قلم بند کر کے اپنے سامنے پڑے کاغذوں پر رکھا اور پھر اس دلکش منظر میں محو ہو گئی۔ملازمہ جا چکی تھی۔وہ کچھ دیر اس منظر سے لطف اندوز ہوتی رہی۔پھر ایک لمبی سانس لے کر اٹھ گئی۔

اس کی ماما ڈرائنگ روم میں تھیں۔اس کے سامنے میز پر ناشتہ دھرا ہوا تھا۔اسے اپنی ماما پر بہت پیار آیا۔وہ ان کے قریب بیٹھتے ہوئے بولی۔

''تھینک یو ماما! کام کرتے ہوئے مجھے خیال ہی نہیں رہا کہ میں نے ابھی ناشتہ کرنا ہے۔''

''اچھا چلو۔ناشتہ کرو۔'' اس کی ماما نے کہا تو دونوں ناشتہ کرنے لگیں۔اس وقت جب سعدیہ نے چائے پی کر خالی کپ میز پر رکھا تو اس کی ماما بولیں۔''سعدیہ! میں نے تم سے بہت ضروری بات کرنی ہے۔''

''جی کریں۔'' اس نے متوجہ ہوتے ہوئے کہا۔

''لیکن، میں چاہتی ہوں کہ تم میری بات کو بہت غور سے سنو، پوری سنجیدگی کے ساتھ، اور پھر اس پر خوب سوچ بچار کرو، تا کہ ہماری، بہت ساری پریشانیوں کا خاتمہ ہو سکے۔'' ماما نہایت سنجیدگی سے بولیں۔

''ماما! ایسی کیا بات ہے جو آپ یوں انتہائی سنجیدگی سے تمہید باندھ رہی ہیں۔'' اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''بات ہی ایسی ہے۔'' وہ بولیں۔

''بات سن رہی ہوں۔آپ کہیں۔'' اس نے سنجیدہ ہوتے ہوئے کہا۔

''تم جانتی ہو کہ پچھلے دنوں تمہارے پاپا ایک ہفتے کے لیے لندن گئے تھے۔؟'' ماما نے اسی سنجیدگی سے کہا۔

''جی، میں جانتی ہوں۔'' اس نے کہا۔

''یہ ان کا بزنس ٹور کم اور تمہاری آنٹی سے بات کرنے کا مقصد زیادہ تھا۔وہ پوری کوشش کر رہے ہیں کہ تمہاری بات دوبارہ ناصر جمال سے جڑ جائے۔اس کوشش میں وہ کافی حد تک کامیاب بھی رہے ہیں۔'' انہوں نے امید افزاء انداز میں کہا۔

''ماما! جب ایک بار بات ختم ہو گئی تو پھر اتنی کوشش کیوں کی جا رہی ہے۔جہاں میری قسمت ہو گی۔وہاں میری شادی ہو جائے گی۔اس میں اتنا پریشان ہونے کی ضرورت کیا ہے۔'' اس نے بڑے تحمل سے کہا۔

''تم یہ بات اس لیے کہہ رہی ہو کہ تمہیں اس کا احساس نہیں۔ورنہ تم بھی پریشانی محسوس کرتیں۔'' ماما نے واقعتاً پریشان ہوتے ہوئے کہا۔

''آخر بات کیا ہے!'' اس نے پوچھا۔

''دیکھو یہ ٹھیک ہے کہ رشتے ناطوں میں خلوص، محبت اور ہمدردی ہونی چاہیے۔تمہارے اور ناصر جمال کے رشتے میں بھی ایسا ہی ہے۔اب کوئی اس کو کسی اور نگاہ سے دیکھے تو اپنی سوچ ہے۔اس میں کوئی شک نہیں کہ ناصر جمال نے جو مختصر مدت میں اتنی کامیابیاں حاصل کی ہیں۔اتنا بزنس پھیلایا ہے اور اس قدر دولت مند ہو گیا ہے، بلاشبہ یہ اس کی محنت کا نتیجہ ہے۔وہ چاہے تو اپنے سے بھی زیادہ دولت مند گھرانے میں شادی کر سکتا ہے لیکن، وہ رشتہ ناتوں میں خلوص، محبت اور

ہمدردی دیکھ رہا ہے تو تمہارے ساتھ شادی پر راضی ہے۔" ماما نے سمجھاتے ہوئے کہا تو وہ تحمل سے بولی۔

"اور آپ کا ان کے ساتھ کیا خلوص، محبت اور ہمدردی ہو گی؟"

"ہم نے بیٹی دے دی، یہ تھوڑا ہے اب دیکھو کچھ سال پہلے تمہارے پاپا نے چند پراجیکٹ پر اس کے ساتھ سرمایہ کاری کی۔ اس نے پوری ایمانداری سے کام کیا اور ہمارے حصے میں بہت سا نفع آیا۔ اب تمہارے پاپا مزید پراجیکٹ میں سرمایہ لگا چکے ہیں اور وہ۔" ماما نے کہنا چاہا تو اس نے بات اُچکتے ہوئے پوچھا۔

"اگر میری شادی اس نے نہیں ہو گی تو کیا وہ سرمایہ کاری ختم ہو جائے گی؟"

"نہیں قطعاً نہیں، ایسا تم سوچو بھی نہیں۔ وہ تو ہو گی لیکن تمہاری شادی اس کے ساتھ ہو جانے سے ہم سب کو فائدہ کیا ملنے والا ہے، اس پر غور کرو، وہ تمہیں میں بتاتی ہوں۔" ماما نے کہا۔ پھر لمحہ بھر توقف کے بعد بولی۔ "سب سے پہلی بات یہ ہے کہ تمہارے پاپا یورپ میں اپنا بزنس لے جانا چاہتے ہیں۔ اس کی ابتداء ہو گئی ہے۔ تم اگر وہاں چلی جاؤ گی تو یہ بہت آسان ہو جائے گا۔ بہت سارے قانونی تقاضے آسانی سے حل ہو جائیں گے۔" ماما نے بتایا۔

"بس یا مزید کچھ اور......" اس نے پوچھا۔

"ظاہر ہے تمہارے بھائی نے بھی بزنس کرنا ہے۔ وہ یہاں کے بہت سارے معاملات سنبھال چکا ہے۔ آخر ایک دن اس نے تمہارے پاپا کی جگہ لینی ہے۔ تمہاری وجہ سے وہ بزنس میں بہت آگے جا سکتا ہے۔ وہ وہیں کہیں اچھی سی دولت مند لڑکی سے شادی کر کے ناصر جمال کی طرح اپنا بزنس پھیلا سکتا ہے۔ تمہاری بہن کسی دولت مند گھرانے میں بیاہی جا سکتی ہے۔ ہماری رشتے داری قائم رہ سکتی ہے۔ ابھی ہمیں ان کی ضرورت ہے اور وہ بڑے خلوص سے ہمیں کنویں جیسے بزنس سے نکال کر دریا جیسے بزنس میں لانا چاہتے ہیں اور تمہاری ہاں سے یہ سب کچھ آسان ہو سکتا ہے۔" ماما نے بڑے گمبھیر لہجے میں صورت حال سمجھائی۔

"یعنی میری وجہ سے آپ ڈھیروں دولت کما سکیں گے۔ میرے بھائی اور بہن کا مستقبل شاندار ہو جائے گا۔" سعدیہ نے دل پر جبر کرتے ہوئے کہا۔

"بالکل، تم اب ٹھیک سمجھی ہو مجھے امید تھی کہ جب تمہارے سامنے اصل صورت حال رکھی جائے گی تو تمہارا فیصلہ وہی ہو گا جو ہم چاہ رہے ہیں۔ تم سمجھ دار ہو، خاندان کے مسائل سمجھ سکتی ہو۔" ماما کے خوش ہوتے ہوئے کہا۔

"میری قربانی دینے سے آپ اپنی پریشانیاں ختم کر رہی ہیں۔" سعدیہ نے آہستگی سے کہا تو ماما نے چونکتے ہوئے کہا۔

"یہ تم کیا کہہ رہی ہو؟ اس میں قربانی دینے والی کیا بات ہے۔ تم لڑکی ہو۔ کہیں تو تمہاری شادی ہو گی۔ تم خوش قسمت ہو کہ اپنوں میں جا رہی ہو۔ تم ایسا کیوں سوچتی ہو؟"

"میں وہی سوچوں جو آپ سوچ رہی ہیں تو آج ہمارے درمیان ایسی گفتگو ہی نہ ہو۔ چونکہ میری اور ناصر جمال کی سوچ میں بڑا فرق ہے۔ اس لیے وہ کچھ ممکن نہیں ہو پائے گا جو آپ سوچ رہی ہیں۔" وہ بہت نرمی سے بولی۔

"تو لڑکی اپنی سوچ کو بدلو۔" ماما نے سخت لہجے میں کہا۔ تب وہ سنی ان سنی کرتے ہوئے بولی۔

"اگر وہ میرے اپنے ہیں۔ خلوص، محبت اور ہمدردی میں مجھے بیاہ کر لے جا رہے ہیں۔ تب کیا ہم انہیں دھوکا نہیں دے رہے ہیں۔ کیونکہ ہم یہ شادی بزنس کے نکتہ نظر سے کریں گے پھر ہمارا تو اس سے کوئی خلوص نہیں ہوا۔"

"یہی دنیا داری ہے بیٹی اس دنیا میں کچھ لو اور کچھ دو ہی کا اصول چلتا ہے اور پھر انسان ہی تو انسان کے کام آتا ہے۔ یہ دھوکا نہیں ہے بلکہ بہت سوچ سمجھ کر اپنے لیے کسی معاملے کا بہترین انتخاب ہے۔ اللہ نے عقل دی ہے تو اس کا استعمال بھی کرنا چاہیے۔ یہ حقیقت ہے کہ تمہاری شادی کرنی ہے۔ تمہارے لیے بہترین بَر تلاش کرنا۔ یہ عقل سمجھ کا کام ہے۔ اب ہمارے سامنے قدرت نے ایک موقع فراہم کر دیا ہے۔ جس سے نہ صرف تمہارا مستقبل سنور سکتا ہے بلکہ دوسروں کا بھی تو عقل مندی کا تقاضہ یہی ہے کہ اس موقع کو ضائع نہیں کرنا چاہیے۔ لہٰذا تم عقل سے کام لو اور ہاں کر دو تا کہ وقت ضائع نہ ہو۔" ماما نے بہت تحمل سے اسے سمجھایا۔

"وقت گزر چکا ہے ماما۔ اب کچھ نہیں ہو سکتا۔" وہ اطمینان سے بولی۔

"کوئی نہیں گزرا وقت۔ تمہارے پاپا گئے تھے اور انہوں نے سب سنبھال لیا ہے۔ اب یہ تم پر منحصر ہے کہ تم یہ حجاب وغیرہ خود پر سے ہٹاؤ۔ خود کو پڑھی لکھی، سمجھ دار اور زمانہ شناس

ثابت کرو۔" ماما نے حتمی انداز میں اسے سمجھاتے ہوئے کہا۔
"ماما اس لیے تو کہہ رہی ہوں کہ اب وقت گزر چکا۔ میرا یہ حجاب اب نقاب میں تو تبدیل ہوسکتا ہے۔ اتر نہیں سکتا۔" وہ نہایت تحمل اور اطمینان سے بولی۔
"کیوں نہیں اتر سکتا؟ غضب خدا کا تم ہمیں سمجھا رہی ہو۔" ماما ایک دم ہتھے سے اکھڑ گئیں۔
"اس لیے کہ میں بہت ساری بری نگاہوں سے بچ گئی ہوں۔ میں خود کو محفوظ سمجھتی ہوں۔ یہی مجھے احساس دلاتا ہے کہ میں مسلمان عورت ہوں اور اسلام مجھ سے کیا چاہتا ہے۔" وہ اسی اطمینان سے بولی۔
"تمہارا یہی حجاب تیری ترقی کی راہ میں رکاوٹ ہے۔ اک یہی حجاب ہٹا دو۔ دنوں میں لاکھوں پاؤنڈ کی مالک بن جاؤ گی۔ وہ سب چیزیں جن کے لیے ایک عام عورت ترستی رہتی ہے۔ تمہارے اشاروں پر حاضر ہوں گی۔ میں بار بار کہہ رہی ہوں کہ نہ صرف تمہارا مستقبل سنور جائے گا بلکہ تم اپنے بھائی اور بہن کا مستقبل بھی سنوار لوگی۔" ماما نے کافی حد تک نرم لہجے میں کہا مگر لہجے میں اکتاہٹ پھر بھی نمایاں تھی۔
"نہیں ماما! زندگی یہ نہیں ہے، زندگی کچھ اور ہے۔ جس کے بارے میں آپ نہیں جانتی۔ اللہ کرے آپ اس زندگی سے واقف ہو جائیں۔ تب آپ کی نگاہ میں یہ سونا چاندی، دولت، چیزیں، بنگلے یہ سب ہیچ ہو جائیں گے۔ نہیں ماما! میں جس زندگی سے آشنا ہو چکی ہوں۔ میں اب وہ نہیں چھوڑ سکتی۔ میرا ایمان ہے کہ جو میری قسمت ہے وہ مجھے مل جائے گا اور میرا اللہ میرے ساتھ بہتر معاملہ ہی کرے گا۔" سعدیہ نے حتمی انداز میں کہہ دیا تو اس کی ماں چند لمحے اس کی طرف دیکھتی رہی پھر سخت لہجے میں بولیں۔
"تو سنو پھر لڑکی! یہ جن لوگوں نے تمہارا دماغ خراب کیا ہے نا۔ برین واش کر کے اپنے شدت پسندانہ خیال ٹھونسے ہیں۔ ہم ان کے خلاف کارروائی کریں گے۔ قانونی ہوسکی تو وہ کریں گے۔ اگر وہ نہ ہوئی تو جو ہوسکا ہم کریں گے۔ غضب خدا کا، ہماری اچھی بھلی بیٹی کو پاگل کر کے رکھ دیا اور ہم انہیں کچھ بھی نہ کہیں۔"
"آپ انہیں کچھ نہیں کہہ سکتے۔" وہ تیزی سے بولی۔
"کیوں، ہم کیوں نہیں کہہ سکتے۔ تیرا کیا خیال ہے ہمارا کوئی اثر و رسوخ نہیں۔ ہم یونہی بیٹھے ہیں۔ جو کوئی بھی آئے اور ہمارے بچوں کا ذہن خراب کر دے۔ تم ٹھیک کہتی ہو۔ اب وقت گزر گیا لیکن اتنا بھی نہیں، تم اب کہیں نہیں جایا کرو گی۔ بلکہ چند دن بعد میرے ساتھ تم لندن جا رہی ہو۔ وہاں تمہارا ذہنی علاج ہوگا۔" ماما نے انتہائی غصے میں کہا۔
"میں بیمار نہیں۔ بالکل تندرست ہوں۔ الحمدللہ! میں جو کچھ کر رہی ہوں پورے ہوش و حواس اور اپنی مرضی سے کر رہی ہوں۔ میرے حوالے سے آپ کسی کو کچھ نہیں کہیں گی۔" وہ تیزی سے بولی۔
"یہ ہمارا فیصلہ ہے۔ اگر تم مان جاؤ، سکون سے انہیں چھوڑ دو تو ممکن ہے کہ ہم ان پر اپنا وقت ضائع نہ کریں۔" ماما نے کچھ اس طرح کہا جس سے سعدیہ کے من میں خوف سرائیت کر گیا۔ وہ سمجھ رہی تھی کہ دولت کی خاطر یہ مادیت پرست دنیا کچھ بھی کر سکتی ہے۔ اس کی ذات اس فساد کی وجہ بنے گی۔ وہ سوچ بھی نہیں سکتی تھی۔ جو تحریک شبانہ لے کر اٹھی تھی، وہ چاہے اسے ختم نہ کر سکیں لیکن ان کے لیے مشکلات ضرور پیدا کر دیں گے۔ وہ جانتی تھی کہ ان کے لیے کہاں کہاں سے مشکلات پیدا کی جا سکتی ہیں۔ جس قدر ہماری قوم جذباتی ہے۔ کھوکھلے نعروں پر اپنی جان لٹا دینے کو تیار رہتی ہے۔ ایسے میں کسی بھی کٹھ پتلی میں جان پیدا کی جا سکتی ہے۔ شیطان تو اس تاک میں رہتا ہے۔ درخت کو کاٹنے کے لیے کلہاڑے میں بھی لکڑی ہوتی ہے۔ نہیں سے بہت سارے لوگ ایسے پیدا کیے جا سکتے ہیں جو تنقید و تحقیر کے واروں سے وقتی رکاوٹیں کھڑی کر سکتے ہیں۔ چند ٹکوں کے عوض، ڈھیر ساری دولت کے حصول میں سودا مہنگا تو نہیں تھا۔ شبانہ کیا سوچے گی۔ اسی کے باعث یہ سب ہو گیا۔
"سوچ لو اور خوب سوچ لو، میں تمہیں دو دن دیتی ہوں۔ اپنا فیصلہ سنا دو ورنہ ہم اپنے فیصلے پر عمل کریں گے۔" ماما نے کہا اور اٹھ گئی۔
سعدیہ کے لیے وہ ایسے لمحات تھے جن میں وہ اپنے آپ کو کڑے امتحان میں محسوس کر رہی تھی۔ ایک جانب اس کے والدین تھے۔ ان کی خواہش تھی۔ بھائی بہن کا مستقبل تھا اور دوسری جانب اس کا اپنا ایمان تھا۔ وہ ڈٹ جانے کا حوصلہ خود میں رکھتی تھی مگر اس کی سب سے بڑی کمزوری یہی تھی کہ اس کی وجہ سے شبانہ پر بڑا عتاب آنے والا تھا۔ شیطانی قوتیں حرکت میں آنے والی تھیں۔ وہ پودا جو ابھی پھوٹا ہے۔ کونپل کونپل اپنی

بہار دکھا رہا ہے، جس پر ابھی برگ و ثمر آنے ہیں۔ یہ اس کا امتحان تھا یا اس کے ایمان کا۔ جو کچھ تھا۔ فیصلے کی گھڑی اس پر مسلط تھی۔ اس نے کوئی ایک فیصلہ تو کرنا تھا۔ ورنہ ٹوٹ پھوٹ لازمی تھی۔



زرق شاہ اس نئے نئے آباد ہونے والے ٹاؤن میں جا پہنچا تھا۔ اس نے ڈیش بورڈ پر رکھا ہوا کاغذ ایک مرتبہ پھر پڑھا اور اندازے سے چل پڑا۔ کچھ دیر بعد وہ ایک بڑے سے بنگلے کے سامنے آ کر رک گیا۔ اسے یقین تھا کہ یہی پروفیسر رضی الدین کا گھر ہے۔ ہارن کے جواب میں چوکیدار باہر آیا اور پھر وہ گاڑی سمیت پورچ میں تھا۔ اس وقت شام ہو رہی تھی۔ سورج مغربی افق تک جا پہنچا تھا۔

''ادھر لان میں پروفیسر صاحب بیٹھے ہیں۔'' چوکیدار نے رہنمائی کی تو وہ اسی جانب بڑھ گیا۔ وہ کھلے سے لان میں سفید کرسیوں کے درمیان ایک کرسی پر بیٹھے ہوئے تھے۔ پتلون شرٹ اور کیلس پہنے ہوئے تھے۔ بھاری جثہ، خشخشی ڈاڑھی کے ساتھ بڑی رعب دار شخصیت رکھتے تھے۔ اسے دیکھتے ہی وہ اٹھ کر کھڑے ہو گئے۔ ان کی نگاہ اس کے چہرے پر تھی جیسے وہ اسے اندر تک دیکھ رہے ہوں۔ اس نے آگے بڑھ کر ہاتھ ملاتے ہوئے سلام کیا۔ انہوں نے جواب دیتے ہوئے اسے بیٹھنے کا اشارہ کیا اور وہ دونوں بیٹھ گئے۔ تب وہ بڑے خوشگوار لہجے میں بولے۔

''یہ کیا بھئی! اتنے دن شیو نہیں کی یا ڈاڑھی رکھ لی ہے۔ یا یہ بھی کسی کردار کا گٹ اپ ہے۔''

''نہیں سر! میں نے ڈاڑھی رکھ لی ہے اور میں نے اداکاری کو خیر باد کہہ دیا ہے۔'' وہ سنجیدگی سے بولا۔

''ہوں۔'' انہوں نے ہنکارہ بھرا پھر چند لمحے توقف کے بعد بولے۔ ''بہت عرصے بعد ملاقات ہوئی ہے نا سناؤ کیا حال احوال ہیں؟''

''سر! کچھ باتیں ایسی ہیں، مجھے جن کے بارے میں الجھن ہے۔ میں انہیں دور کرنا چاہتا ہوں۔'' وہ بڑی مشکل سے بولا۔

''باتوں کو یا الجھنوں کو دور کرنا چاہتے ہو۔'' پروفیسر پھر خوشگوار لہجے میں بولے۔

''ظاہر ہے سر الجھنیں دور کرنا چاہتا ہوں۔'' وہ مسکراتے ہوئے بولا۔

''دیکھو زرق شاہ! علم کا حصول بہت بڑی سعادت ہے۔ یہ ٹھیک ہے کہ حصول علم میں بندے کو سنجیدہ ہونا چاہیے لیکن اس میں خود کو مظلوم ثابت مت کرو۔ حصول علم کوئی بوجھ نہیں بلکہ یہ زندگی کی وہ ضرورت ہے۔ جو زندگی کو خوبصورت بناتی ہے۔ اسے اس قابل بناتی ہے کہ جینا کسے ہے۔ اس لیے حصول علم میں وہی لطف محسوس کرنا چاہیے جیسے دیگر ضروریات کی تسکین میں ہم کرتے ہیں۔'' انہوں نے اسی خوشگوار لہجے میں کہا جو بالکل فطری لگ رہا تھا۔

''سر! میں یہ سمجھنا چاہتا ہوں کہ اسلامی کلچر کیا ہے اور کیا یہ کسی بھی قوم کے کلچر کو ڈسٹرب کرتا ہے؟''

''نہیں بیٹا! اسلامی کلچر کسی کو ڈسٹرب ان معنوں میں نہیں کرتا کہ وہ اپنی چھاپ ان پر لگا دے بلکہ وہ چند اصولوں کی بنیاد پر رویے میں تبدیلی چاہتا ہے۔ وہ رویہ جو انسان کی ذاتی فلاح کے لیے ہے۔ ذاتی رویہ ہی اجتماعی رویہ بنتا ہے۔ چونکہ اسلامی کلچر الہامی ہے۔ اس کا روئے سخن پوری انسانیت سے ہے، اس لیے یہ فطری تقاضوں سے ہم آہنگ ہے۔ اس میں جبر نہیں، بلکہ ذوق و شوق اور لگن ہے۔''

''یہ عبا، جبے اور رومال۔'' زرق شاہ نے کہنا چاہا تو وہ جلدی سے بولے۔

''او، تمہارے ذہن میں اسلامی کلچر کا تصور عربی ثقافت کا ہے۔ اسلامی کلچر، عربی ثقافت نہیں ہے۔ مثال کے طور پر اسلام نے ستر ڈھانپنے کی بات کی ہے اور ایک معیار دے دیا ہے کہ ستر یہاں سے یہاں تک ہے۔ عورت کے لیے الگ اور مرد کے لیے الگ، اب ستر ڈھانپنا ضروری ہے اور اس کے بعد آپ جو چاہیں پہنیں۔ اب اگر ایک ہندوستانی مسلمان عربی ثقافت کو اپناتا ہے تو اس کی وجہ دوسری ہے۔ وہ سنت نبویؐ کے اتباع میں اپنی پوری ذات کو اسی رنگ میں رنگنے کی کوشش کرتا ہے۔ پھر لباس کے معاملے میں بہتر سے بہتر پہلو سامنے لاتا ہے۔ یہ عام مسلمان سے مومن بن جانے تک کا سفر ہے کہ اپنی زندگی کو سرکار مدینہ ﷺ کے انداز میں گذارنے کی کوشش کی جائے۔ وجہ کیا ہے کہ ایک بہترین انسان کی تخلیق جو فلاح انسانیت کے لیے بے تاب رہتا ہے۔ معاملہ فقط لباس تک محدود نہیں ہے۔ زندگی کے دیگر پہلو بھی اس میں آتے ہیں مثلاً پاکیزگی۔

"جی۔ یہ اسلامی کلچر ہے نہ کہ عربی کلچر۔" وہ جلدی سے بولا۔

"دیکھ بیٹا! عرب میں فقط مسلمان ہی نہیں ہیں، دیگر مذاہب کے لوگ بھی تو تھے اور اب بھی ہیں۔ عربی النسل عیسائی بھی ہوسکتا ہے، یہودی یا کوئی بھی'ان کے لباس بھی تو وہی ہیں جو عربی ثقافت ہے۔ اب ان کے ہاں تو پاکیزگی کا کوئی تصور نہیں ہے' یہ تو اسلامی تصور ہے نا جسے تم اسلامی کلچر کہہ رہے ہو۔ اب پاکیزگی ذاتی رویہ ہے' اس کے بغیر عبادت کا تصور نہیں' اب سوال یہ ہے کہ پاکیزگی کیوں؟"

"جی' یہ سوال تو وہ بھی کر سکتا ہے نا جس کے پاس پاکیزگی کا تصور نہیں۔" وہ بولا۔

"بالکل' کسی بھی نئی شے کے بارے میں سوال کرنا فطری بات ہے' اب پاکیزگی کے تصور کو لیں تو یہ کھانے پینے، ذاتی صفائی، مال و دولت اور حتیٰ کہ خیالات تک میں ہو۔ یہ اسلامی کلچر ہے۔ جب خیالات سے لے کر رویے تک میں پاکیزگی ہے تو اس کا مقصد انسانی ذات کو بہتر سے بہترین بنانا ہے' مثال کے طور پر آپ نے جو بھی خیال سوچا ہے، وہ دوسروں پر عیاں کر دیا جائے تو اس پر آپ کو شرمندگی نہ ہو۔" انہوں نے بڑے سکون سے کہہ دیا تو وہ بولا۔

"آپ نے یہ تو بتایا ہی نہیں کہ کیوں؟ کیونکہ میں نے متعدد کتب دیکھی ہیں۔ ان میں یہ تو بتایا جاتا ہے کہ فلاں شے حلال ہے یا حرام، فلسفہ حلال و حرام نہیں کہ کیوں؟"

"یہ تو تم جانتے ہونا کہ انسان روح اور مادے کا شاہکار ہے۔ مادی جسم میں جو خوراک بھی جاتی ہے وہ جزو بدن بنتی ہیاور اس کے اثرات بھی ہوتے ہیں۔ حلال و حرام کے اثرات بدن پر ظاہر ہو کر رہتے ہیں۔ یہ میڈیکل سائنس بھی ثابت کر چکی ہے۔ اب معاملہ آیا روح کا۔ روح کو بھی اپنی غذا چاہیے۔ روح ایک ایسی شے ہے جو حلال و پاکیزگی سے قوت پکڑتی ہے اور حرام سے وہ کوما کی جانب بڑھتی چلی جاتی ہے۔ خیر' یہ ایک لمبی بحث ہے۔ اسے مختلف پہلوؤں سے ثابت کیا جا چکا ہے۔ ہمارا موضوع تھا اسلامی کلچر اور پاکیزگی اس کا بنیادی پہلو ہے۔ اب دنیا کے کسی خطے میں۔ کسی بھی کلچر کا لباس ہو جو ستر ڈھانپے اور پاکیزہ ہو، وہ اسلامی ہے۔ اب کوئی اپنا رنگ ڈھنگ مخصوص کرنے کے لیے، اپنی الگ سے شناخت بنانے کے لیے، کسی خاص لباس پر اصرار کرتا ہے تو یہ بہر حال ایک دوسری بحث ہے۔"

"سر! میرا ایک سوال یہ ہے کہ اسلامی اصول و ضابطے بہترین ہیں تو پھر ہم اسے اپناتے کیوں نہیں۔ ہمارے مجموعی معاشرتی رویے میں اس کی جھلک کیوں دکھائی نہیں دیتی۔" اس نے سنجیدہ لہجے میں کہا۔

وہ کہتے ہیں نا دونوں طرف ہے آگ برابر لگی ہوئی۔ مجھے یہ معاملہ کچھ ایسا ہی دکھائی دے رہا ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اسلامی اصول و ضابطے، اسلامی فلسفہ بلکہ دین اسلام نہ صرف فطری ہے بلکہ بہترین ہے۔ یہ دعویٰ میں ایک مسلمان ہونے کی حیثیت سے نہیں کر رہا بلکہ یہ ہر مذہب کی طرف سے مان لیا گیا ہے۔ سب نے چھان پھٹک لیا ہے۔ صدیوں سے ایسا ہوتا آیا ہے، ہو رہا ہے اور ہوتا رہے گا۔ اب میں نے جو دونوں طرف والی آگ کی بات کی ہے۔ اس میں ایک طرف وہ ہے جو غیر مسلم ہیں اور دوسری طرف مسلمان ہیں۔ اتنی بات سمجھ گئے ہو۔" انہوں نے پوچھا۔

"جی، اتنا سمجھ گیا ہوں۔" وہ بولا۔

"غیر مسلم اپنی بقا کی جنگ لڑ رہے ہیں۔ کیونکہ ان کے پاس کوئی بنیادی فلسفہ نہیں جو انسانیت کی فلاح کرے۔ بلکہ ان کے جتنے بھی نظام ہیں وہ انسانیت کی تذلیل کر رہے ہیں۔ کوئی شعبہ اٹھا کر دیکھ لیں۔ ایسا اس لیے ہے کہ ان کے ہاں مذہبی حمیت کم اور دیگر مفادات سامنے ہیں۔ مثال کے طور پر اہل کلیسا نے بادشاہوں کی سیاست کو اپنے قبضے میں لیا۔ انہوں نے انسانیت کے لیے کیا کیا۔ تاریخ شاہد ہے۔ پھر سائنسدان ان کے عتاب کا نشانہ بنے۔ کیونکہ بائبل تو کائنات کے امور کے بارے میں کوئی انکشاف نہیں کرتی۔ اب سائنس دانوں کا مذہب کا رویہ مخاصمانہ کیوں ہے؟ اس کی وجہ اہل کلیسا کا رویہ رہا ہے۔ ان کے ہاں عورت کی حیثیت کیا ہے۔ عائلی نظام' جو بھی' چلیں یہاں ہم صرف نظر کر لیتے ہیں کہ وہ جیسا چاہیں، جینے کا حق رکھیں لیکن' مذہبی بھی نہیں رہے اور حیوانیت کی راہ پر چل نکلے۔ چونکہ انسانی فطرت میں اچھائی بھی ہے تو جستجو اچھائی کی تلاش میں اسلامی اصولوں تک آ پہنچی ہے۔ غیر مسلم معاشرے کے وہ لوگ جنہیں مذہب سے نہیں اپنے اختیارات جاہ و حشم کی ضرورت ہے۔ وہ نہ صرف اسلامی اصولوں سے اپنے لوگوں کو بچانے کے لیے بلکہ اسلامی اصولوں کی مخالفت میں سازش کرنے کے لیے سرگرم ہیں۔ کیونکہ یہ ان کی بقاء کا

مسئلہ ہے۔ اب جس طرح تحقیق و جستجو عام ہوگی۔ علم کے حصول میں جس قدر آسانی ہوگی، اس قدر اسلامی اصولوں کی ترویج و اشاعت ہوگی۔ یہ حقیقت ہے، اسے کوئی نہیں جھٹلا سکتا اور اسی شدومد سے مخالفت بھی ہوگی۔ سازش کے نئے رنگ ڈھنگ سامنے آئیں گے۔ یہ بھی حقیقت ہے۔ اپنی بقاء ان کے لیے آگ کی حیثیت رکھتی ہے۔ یا تو جل جائیں گے یا آگ بجھا لیں گے۔"

"دوسری طرف؟" اس نے پوچھا۔

"اب دیکھو دین اسلام میں علم کا حصول فرضیت کے درجے پر ہے۔ عبادات سے لے کر زندگی کے ہر پہلو تک کو اس وقت نہیں سمجھ سکتے ہیں جب تک ہمیں اس کا علم نہیں ہو گا۔ ہماری سب سے بڑی کمزوری یہی ہے کہ ہم علم میں پیچھے ہیں۔ یہ ایک حقیقت ہے۔ ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ دنیا بھر کے غیر مسلم جن کے ہاں علم کی فرضیت نہیں ہے۔ وہ مسلم معاشرے کے در پر علم کے حصول کے لیے کھڑے ہوتے۔ ہم وہاں پر جا کھڑے ہوتے ہیں اور بڑے فخر سے بتاتے ہیں کہ ہم فلاں یورپ کی درسگاہ سے علم حاصل کر رہے ہیں۔"

"علم تو مومن کی میراث ہے، جہاں سے چاہے لے لے۔" اس نے کہا۔

"بات تو وہی ہے نا علم حاصل کرنا۔ اب مجھے یہ بتاؤ کونسا ایسا علم ہے جو دائرہ اسلام سے خارج ہے؟ خیر ہر قوم اور معاشرہ اپنی ضرورت کے مطابق علم حاصل کرتا ہے اور اپنی ضرورت کو مدنظر رکھ کر اپنا نصاب ترتیب دیتا ہے۔ ہم نے تو اپنی راہیں متعین ہی نہیں کیں کہ ہمیں کرنا کیا ہے۔ نت نئے علوم معرض وجود میں آ رہے ہیں تو یہ کون کر رہا ہے۔ انسان ہی نا اور کیا اس کائنات سے باہر ہیں وہ علوم نہیں تو پھر اسلامی کلچر یہی کہتا ہے کہ یہ کائنات مسخر کر دی گئی ہے۔ فلاح انسانیت کے لیے بنیادی لائحہ عمل اس وقت بھی اور بعد کے زمانوں کے لیے بھی قرآن حکیم ہی ہے۔ یہی اسلام کا بنیادی نصاب ہے۔ اسی سے علم و حکمت کی ساری راہیں پھوٹتی ہیں۔ اس میں سارے علم محفوظ ہیں۔ قرآن حکیم کی بنیادی اور عملی تشریح سرکار مدینہ، محبوب خدا، سرور کائنات محمد ﷺ کے قول و فعل نے کر دی۔ حدیث مبارکہ کا خزانہ ہمارے پاس موجود ہے۔ اب اگر اس صورت میں، ہم مسلمان پوری دنیا کی قیادت نہیں کر رہے ہیں تو خرابی ہمارے اعمال میں ہے۔ یہی آگ ہمیں ذلت کی گہرائیوں میں لے جا رہی ہے کہ ہمارا استفادہ بنیاد سے نہیں۔ ہماری یہی کمزوریاں، غیر کی سازشوں کو تقویت دیتی ہیں۔ زور اس پر نہیں کہ ہمیں غیر مسلم کر دیا جائے بلکہ ہمیں اس قدر الجھا کر انتشار کا شکار کر دیا جائے کہ کوئی بنیادی خیال ہمارے ذہنوں میں تقویت ہی نہ پا جائے۔ شک و شبہات کا زہر وہ ہمارے افکار میں ملا دینا چاہتے ہیں اور ہم ان کی سازش کا شکار ہوتے چلے جا رہے ہیں۔" پروفیسر صاحب نے تفصیل سے سمجھاتے ہوئے کہا۔

"ان حالات میں ہمارے پاس کوئی حل بھی ہے۔؟" اس نے تڑپ کر پوچھا۔

"حل تو ہمارے پاس ہے۔ ہمارے طاقوں اور جزدانوں میں پڑا ہے۔ سرکار مدینہ کی زندگی ہمارے لیے مشعل راہ ہے۔ اصل بات ہے اس کی طرف راغب ہونے کی۔ ہمارے لیے یہی پل صراط بنا ہوا ہے۔" پروفیسر نے کہا۔

"یہ تو آپ نا امیدی کی بات کر رہے ہیں۔ تنقید تو سبھی کرتے ہیں۔ آپ کا تجزیہ بڑا پر مغز ہے لیکن اگر آپ کے پاس کوئی حل نہیں ہے تو پھر آپ کی دانشوری کس کھاتے میں؟" زرق شاہ نے مایوس ہوتے ہوئے کہا۔

"بیٹا! حل تو ہے لیکن ایسا معاشرہ جس میں انتہا پسندی وہ بھی بلا وجہ ہو وہاں کوئی کیا کر سکتا ہے لیکن میں نا امید نہیں ہوں۔ انقلاب آئے گا تو معاشرہ بھی اسلامی ہو جائے گا۔" پروفیسر نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"میں آپ کی بات نہیں سمجھ سکا۔ نا امیدی بھی نہیں اور حل۔"

"اسلامی معاشرہ کی تشکیل میں رکاوٹ کیا ہے، کبھی تم نے اس پر تحقیق کی؟" انہوں نے پوچھا۔

"پلیز بتایئے۔" اس نے انتہائی تجسس سے کہا۔

"وسائل پر قابض لوگ کبھی نہیں چاہیں گے کہ علم کا فروغ ہو اور قوم باشعور ہو کر سچائی تک پہنچے۔ یہی لوگ نہیں چاہتے کہ معاشرتی انصاف ہو، دولت کی منصفانہ تقسیم ہو۔ ہوس اقتدار کئی روپ میں جلوہ گر ہے۔ کہیں شخصیات پرستی کے روپ میں اور کہیں علمی میراث کے دعوے دار ہونے کے روپ میں۔ کتنا بڑا المیہ ہے کہ اسلامی اقدار کی پامالی، اسی ملک میں ہو رہی ہے جس ملک کی بنیادوں میں لا الہ الا اللہ کے نام پر خون بہا اور انہی بنیادوں پر ملک معرض وجود میں آیا۔" یہ کہتے ہوئے

پروفیسر کا لہجہ پژمردہ ہو گیا۔ "کتنا بڑا المیہ ہے کہ اہانت رسول ﷺ کے ممالک سے سفارتی رابطہ ختم نہیں کیا جاتا بلکہ انہیں سیکورٹی دی جاتی ہے۔ مسلمان کی یہ شان ہی نہیں ہے کہ وہ احتجاج کرے۔ مسلمان کا کردار ہی وہی ہے کہ جس سے دوسرے کانپ جائیں۔ جرات نہ ہو کسی کی۔ جبکہ یہاں پر مغربی افکار کے پرچار کے لیے جتنی این جی اوز ہیں۔ انہیں اگر گنا جائے، ان پر تحقیق کی جائے تو زیادہ تر انہی لوگوں کی ہوں گی جو کسی نہ کسی طرح اقتدار کے ساتھ ہیں۔ اسلامی معاشرہ کی تشکیل میں سب سے بڑی رکاوٹ یہی ہیں اور کوئی شک نہیں کہ اس میں ملائیت بھی پوری طرح ملوث ہے۔" یہ کہتے ہوئے پروفیسر کا لہجہ شدت اختیار کر گیا تھا۔

"بات تو پھر وہی کی وہی ہے، کوئی حل؟" زرق شاہ نے پوچھا۔

"صدیوں سے سازشوں کی شکار اس قوم کا حل کیا ہو سکتا ہے۔ بدھ مت کو کیسے ختم کیا گیا جانتے ہو۔ اس میں بت پرستی کو فروغ دے دیا گیا۔ آج اپنا پیغام دینے کے لیے میڈیا سب سے بڑا ہتھیار ہے۔ غیر مسلم تو اپنا کام کر رہے ہیں۔ اب اگر ہم انہیں اخلاقیات کا درس دیں کہ بھئی تم ایسے نہ کرو تو یہ ہماری بے بسی ہے۔ اگر کوئی آدھے ادھورے کپڑوں میں ملبوس عورت ٹیلی وژن پر نمودار ہوتی ہے تو جیت کس کی ہے، ہار کس کی ہے؟ لیکن ہمارے ہاں اس جدید آلے کو اپنے مطلب کے لیے استعمال کرنے کی بجائے اس سے روکا جا رہا ہے۔ کتنا کم ہوا؟ چند میگزین کے چند مضمون تک کہ فلاں بندے نے ٹیلی وژن توڑ دیا۔ کیا فلمیں آنا بند ہو گئیں۔ اسلامی شعار کا مذاق اُڑانا بند ہو گیا۔ یہ حقیقت ہمارا منہ چڑا رہی ہے اور اس کا فائدہ کس کو جا رہا ہے؟ کون لوگ فائدہ اٹھا رہے ہیں؟ کیا اس سے معاشرے میں انصاف ہے۔ دولت کی تقسیم منصفانہ ہے۔ حل اس کا یہ ہے کہ جب تک انقلاب کے ذریعے ان لوگوں کو ہٹایا نہیں جائے گا۔ اس وقت تک اسلامی کلچر فروغ نہیں پا سکتا۔ مجھے بتاؤ، اگر علم مومن کی میراث ہے تو سائنسی علوم سے مدرسے کیوں گھبرا رہے ہیں۔ انہیں علم حاصل کرنا چاہئے اور وہ سکول کیا کردار دے رہا ہے۔ جہاں سائنسی علوم پڑھائے جا رہے ہیں۔ وہاں نصاب سے قرآنی علم کیوں نکالا جا رہا ہے۔ الجھن کا شکار کون کر رہا ہے اور کس کے ہاتھوں؟ اسلامی کلچر کے احیاء کے لیے، اس تذلیل والے نظام کو ہٹانا ہو گا۔ یہی حل ہے۔"

"کیسے؟" زرق شاہ نے تیزی سے پوچھا۔

"یہ تم جانو تم کیا کر سکتے ہو۔ ویسے فطری طور پر انقلاب کی راہ ہموار ہو رہی ہے۔ انتہا پسندی اپنا رنگ ضرور دکھاتی ہے۔" وہ حتمی لہجے میں بولے۔ پھر چند لمحے توقف کے بعد بولے۔ "اب دیکھو، تم ایک اداکار رہے ہو۔ تم جانتے ہو کہ ایک ڈرامے کے عوام پر اثرات کیا ہوتے ہیں۔ اگر میں یہ کہوں کہ تم اسلامی ڈرامہ بناؤ تو یہ ایک مضحکہ خیز بات ہو گی۔ اسلامی ڈرامہ کیا ہوتا ہے؟ لیکن یہ بات منہ سے نکالتے ہی تم پر فتوئی نہیں فتوے لگ جائیں گے، جس کا حصول بڑا آسان ہے۔ خیر، ایک طرف ہمارے گھروں میں ایسے ڈرامے دیکھے جا رہے ہیں جن کا ٹارگٹ خواتین ہیں۔ انہیں درس کیا دیا جا رہا ہے۔ فیشن، مکر و فریب، سازش اور منافقت کا۔ عائلی زندگی میں توڑ پھوڑ کا۔ جعلی اور زہریلی انا کا۔ کیا ہم اسے روک پائے ہیں۔ نہیں نا، ہم ٹیکنالوجی کے ہاتھوں بے بس ہیں۔ یا پھر اتنے راسخ العقیدہ مسلمان نہیں بنا سکے کہ وہ ٹی وی دیکھنا ہی بند کر دیں۔ میرے نزدیک یہ حل نہیں۔ ہاں، اگر ہم اسلامی ڈرامہ نہیں بنا سکتے لیکن ایسے زریں اصولوں اور بہترین افکار پر تو بنا سکتے ہیں۔ جو کم از کم خواتین میں ان کی بہترین صلاحیتوں کی رہنمائی کرے۔ اچھے رویے کے لیے رائے عامہ ہموار کی جائے۔ ہم گلیمرزدہ، گھٹیا موضوعات پر رومانوی ڈرامے تو دیکھ رہے ہیں۔ اعلیٰ موضوعات پر نہیں بنا سکتے۔ اسلامی کلچر کی راہ میں جو رکاوٹیں ہیں، انہیں دور کرنے کی تحریک تو چلا سکتے ہیں۔ مثال کے طور پر عوام کو یہ بتایا جائے کہ اعلیٰ سیاسی شعور کیا ہوتا ہے۔ عوام جاگیرداری نظام میں کس طرح استعمال ہو رہی ہے۔ کرپشن کی حقیقی وجوہات کیا ہیں۔ بھوک اور عزت نفس کی پامالی انسان کو کہاں تک لے جا سکتی ہے۔ وہ معاشرہ کیسا ہوتا ہے جس میں دولت کی منصفانہ تقسیم ہوتی ہے۔ شخصیات پرستی کیا ہے۔ ایسے بت کیسے توڑے جا سکتے ہیں۔ سیکڑوں موضوع ہیں۔ پہلے ان پر تو کام کریں۔"

"سر! آپ نے مجھے راہ دکھا دی۔ میں کسی ایسے کام کی تلاش میں تھا۔ میری اپنی عبادت تو مجھ تک محدود ہے لیکن مظالم میں باطل کا انکار ہی دراصل زندگی ہے۔ میری راہ تو اور بھی زیادہ مشکل ہے۔ مجھے تو چھوٹے چھوٹے بت توڑنے پڑیں گے۔" زرق شاہ نے یوں کہا جیسے وہ خود کلامی کر رہا ہو۔

"میں تمہارے ساتھ ہوں بیٹا! کسی بھی قسم کی تحقیق ہو۔ میں حاضر ہوں۔ تیرے جیسے کئی لوگ منتظر ہیں کہ کوئی ایسی تحریک اٹھے۔ تم شروعات کرو، قافلہ بن جائے گا۔" پروفیسر نے حوصلہ دیتے ہوئے کہا۔

"میں سمجھ گیا ہوں کہ مجھے کیا کرنا ہے۔" زرق شاہ نے کہا اور اٹھتے ہوئے اپنا ہاتھ بڑھا دیا۔

"نہیں ابھی تم نہیں جا سکتے۔ ڈنر کے بعد جانا۔ اس دوران ہم کچھ مزید باتیں کر لیں گے۔ آؤ، اندر چل کر بیٹھتے ہیں۔" پروفیسر نے کہا اور پھر وہ دونوں اٹھ کر اندر چلے گئے زرق شاہ محسوس کر رہا تھا کہ اس کے لیے راہ منتظر ہے۔



سعدیہ دوسرے دن بھی آفس نہیں آئی تو شبانہ کو تشویش ہوئی۔ گذشتہ دن تو اس نے خود رابطہ نہیں کیا کہ کوئی وجہ ہوگی۔ ورنہ وہ خود فون کر دیتی۔ اس نے ڈسٹرب کرنا مناسب نہیں سمجھا تھا لیکن دوسرے دن نہ آنے پر شبانہ نے خود رابطہ کرنے کے لیے سیل سے کال ملائی۔ دوسری طرف بیل جاتی رہی لیکن کال ریسو نہ کی گئی۔ وہ کچھ دیر کوشش کرتی رہی مگر جواب نہیں ملا۔ تب اس نے گھر کے فون پر کوشش کی۔ تھوڑی دیر بعد کال ریسو کر لی گئی۔ دوسری طرف سعدیہ کی ماما بات کر رہی تھی۔ علیک سلیک کے بعد اس نے کہا۔

"آنٹی! میں شبانہ بات کر رہی ہوں۔ سعدیہ کی دوست۔"

"کون شبانہ، وہی جو میری بیٹی کو ورغلا کر، اس کا برین واش کر کے شدت پسند بنا رہی ہے۔ تم اس کی دوست نہیں دشمن ہو۔" ماما نے بظاہر تحمل سے کہا تھا مگر لفظوں میں چھپی آگ تو اپنا تاثر رکھتی ہے۔

"آنٹی! آپ کو غلط فہمی ہوئی ہے۔ نہ تو میں نے اسے ورغلایا ہے اور نہ ہی اس کا برین واش کیا ہے۔ اگر اس کی زندگی میں کوئی تبدیلی آئی ہے تو یہ اس کی اپنی مرضی ہے۔ اسے احساس ہو گیا ہے کہ ایک اچھا مسلمان کیسا ہوتا ہے۔" شبانہ نے انتہائی نرم لہجے اور ادب سے کہا۔

"یہی تم جیسے لوگوں کا کمال ہے کہ ذمے داری بھی خود نہیں لیتے۔ اس کی اچھی بھلی زندگی تم لوگوں نے ڈسٹرب کر کے رکھ دی ہے۔ جس سے ہمارا پورا خاندان پریشان ہے۔ خدا کے لیے اس کا پیچھا چھوڑ دو۔" ماما نے کہا۔

"آنٹی، میں پھر کہوں گی کہ آپ کو کچھ غلط فہمی ہوئی ہے۔ میں اس کے بارے کبھی غلط نہیں سوچ سکتی۔" اس نے ادب آمیز لہجے میں کہا۔

"میں نے کہا نا اس کی وجہ سے ہمارے پورے خاندان میں پریشانی ہے۔ یہ غلط فہمی نہیں حقیقت ہے۔" وہ بولیں۔

"اس نے اپنی پریشانی کا کبھی مجھ سے ذکر نہیں کیا۔ آپ مجھے بتائیں میں کوئی مدد کر سکتی ہوں؟" اس نے پورے خلوص سے پوچھا۔

"تم نے کیا مدد کرنی ہے۔ تم ہی تو اس پریشانی کی وجہ ہو۔ نجانے کون سی اس کی کمزوری تمہارے ہاتھ آ گئی ہے اور میری بچی تمہاری ہر بات ماننے پر مجبور ہو گئی ہے۔" ماما نے غصے میں کہا۔

"یہ کیا کہہ رہی ہیں آپ۔" وہ ایک دم پریشان ہو گئی۔ اسے لگا جیسے معاملہ یونہی معمولی سا نہیں ہے۔

"وہی جو تم سمجھ رہی ہو۔" ماما نے تیکھے لہجے میں کہا۔

"کیا میری بات سعدیہ سے ہو سکتی ہے؟" اس نے پوچھا۔

"نہیں! بالکل نہیں، وہ پہلے ہی ذہنی طور پر بہت پریشان ہے۔ میں اسے مزید پریشان نہیں کرنا چاہتی۔ تم بھی سن لو، اس سے رابطہ کرنے کی کوشش بھی مت کرنا۔ میں چند دن بعد اسے ذہنی علاج کے لیے لندن لے جا رہی ہوں۔ میں اسے تم لوگوں کے چنگل سے نکال لینا چاہتی ہوں۔" ماما نے یوں حقارت سے کہا جیسے وہ اس کے لیے کوئی اہمیت نہیں رکھتی۔

"آنٹی آپ ایک بار میری بات اس سے کروا دیں۔ میں اس سے پوچھ تو لوں کہ وہ کیا چاہتی ہے۔ پلیز! آپ یہ بات ذہن سے نکال دیں کہ اس کی کوئی کمزوری ہے اور وہ بلیک میل ہو رہی ہے۔ ایسا کچھ نہیں ہے۔ مجھے یہ سمجھ نہیں آ رہی ہے کہ آپ کے ذہن میں یہ بات آئی کیسے؟" اس نے پوچھا۔

"جیسے بھی آئی، تم کون ہوتی ہو پوچھنے والی۔" ماما نے نخوت سے کہا۔

"ٹھیک ہے، میرا اس سے کوئی خونی رشتہ نہیں ہے۔ میں وہ مان بھی نہیں رکھتی جو آپ کا ہے لیکن آپ ہم پر الزام نہیں لگا سکتیں۔ یہ حق آپ کو نہیں ہے۔ میں یہ مان ہی نہیں سکتی کہ وہ میری وجہ سے پریشان ہو سکتی ہے۔ یہ سچ نہیں ہے۔" اس نے تحمل سے باادب لہجے ہی میں کہا۔

"تو کیا میں جھوٹ بول رہی ہوں۔ اب تم مجھے جھوٹا کہو

گی؟ غضب خدا کا، میں اپنی بیٹی کی زندگی بچانا چاہتی ہوں اور تم کہہ رہی ہو کہ مجھے ایسا کوئی حق نہیں۔ سنو لڑکی! آئندہ اگر تم نے سعدیہ سے رابطہ کرنے کی کوشش کی تو ہم یہ حق رکھتے ہیں کہ تمہارے خلاف کچھ بھی کر سکیں۔ اگر تم ہمارے عتاب سے بچنا چاہتی ہو تو سعدیہ کو بھول جاؤ۔" ماما نے انتہائی تلخی سے کہا اور مزید کوئی بات سنے بغیر فون بند کر دیا۔ جبکہ شبانہ ایک دم سکتے میں آ گئی کہ آخر یہ ہوا کیا ہے؟ یہ اچانک اسے کیا ہو گیا۔ اس کی ماما کے لہجے میں اتنی نفرت کیوں تھی۔ سعدیہ نے بات نہیں کی۔ سعدیہ کے نہ آنے سے شبانہ کو نقصان ہو سکتا تھا۔ وہ اس کی سب سے زیادہ قابل اعتماد ساتھی تھی۔ جس کے مشوروں سے نہ صرف وہ حوصلہ پاتی تھی بلکہ بہت ساری ذمے داریاں اس نے لی ہوئی تھیں۔ بہت سارے پراجیکٹ ایسے تھے جنہیں صرف سعدیہ دیکھ رہی تھی۔ ایک بااعتماد ساتھی کا کھو جانا بہت بڑا نقصان ہوتا ہے۔ دوسرا سب سے بڑا نقصان یہ تھا کہ سارے اکاؤنٹ اسی کے پاس تھے۔ ان کی واپسی چاہے ہو جاتی لیکن کچھ عرصے کے لیے وہ ایک دھیلا بھی نہیں خرچ کر سکتے تھے۔ یوں سارے کام جہاں تھے وہیں رک جاتے۔ اس طرح اگر سعدیہ کے بارے میں اس کی ماما کے خیالات دوسروں کو معلوم ہو جائیں تو اس کے اثرات کیا ہوں گے؟ یہ بہرحال تشویش ناک بات تھی۔

شبانہ جوں جوں فون پر ہونے والی گفتگو کے بارے میں سوچ رہی تھی۔ توں توں وہ فکر مند ہوتی چلی جا رہی تھی۔ سعدیہ کے بارے میں الزامات اور اس کے نہ آنے کے باعث جو نقصان ہونا تھا، وہ اپنی جگہ لیکن ان کی مخالفت کا جو حق جتایا گیا تھا۔ اس بارے میں وہ سوچتے ہوئے فکر مند ہونا فطری سی بات تھی۔ وہ سعدیہ اور اس کی فیملی کو اچھی طرح سمجھتی تھی۔ یقیناً سعدیہ ذہنی طور پر ان کے عتاب کا شکار ہو رہی ہو گی۔ وہی لوگ اسے ذہنی اذیت دے رہے ہوں۔ سوچنے والی بات یہ تھی کہ کیا یہ موقع ایسا ہے جب سعدیہ کی مدد کی جائے یا پھر اس امتحان سے گزرنے دیا جائے۔ جس کے بعد ایمان پختہ ہو جاتا ہے؟

"کیا تم کسی متوقع مخالفت سے ڈر گئی ہو جو سعدیہ کو اکیلا چھوڑ رہی ہو؟" اس کے اندر سے آواز ابھری۔

"نہیں، کسی کی مخالفت سے نہیں ڈرتی۔ اگر میرے اللہ نے مجھ سے کوئی کام لینا ہے تو بلاشبہ وہ میری مدد کرے گا اور اگر نہیں تو پوری دنیا کے لوگ بھی مل کر میری مدد کو آ جائیں میں کامیاب نہیں ہوں گی۔"

"تو پھر ایک سعدیہ کے لیے کیوں پریشان ہو؟"

"میں پریشان تو ہوں، وہ میری دوست ہی نہیں۔ بہت اچھی ساتھی بھی ہے۔ وہ جبر کا شکار ہو رہی ہے۔"

"کیا تمہیں یقین ہے کہ وہ جبر کا شکار ہو رہی ہے۔ ممکن ہے اس میں اس کی اپنی مرضی بھی شامل ہو۔ وہ تم سے تمہارے کام سے اکتا گئی ہو۔"

"تو چھوڑ کر جانے کا طریقہ یہ نہیں ہے۔ میں کچھ نہ کچھ تو سعدیہ کی فطرت جانتی ہوں۔ وہ واشگاف الفاظ میں مجھے سنا کر چھوڑ جاتی۔ تب میں اس کا کچھ بھی نہ کر سکتی۔"

"کیا پھر تم اسے اکیلا چھوڑ دو گی؟"

"نہیں، اکیلا نہیں چھوڑوں گی۔ ہر ممکن مدد کروں گی۔ مجھے پوری بات کا علم تو ہو۔"

"پھر یہ امتحان سے گزر جانے کی بات؟"

"اس لیے ہے کہ وہ خود پر ہونے والے جبر کا مقابلہ کرتے ہوئے بھی ہمارے ساتھ شامل ہو جاتی ہے تو بلاشبہ وہ کندن ہو گی۔"

"تو بس پھر اس کے لیے دعا کرو۔ اس تک رسائی کی کوشش کرو۔ سب ٹھیک ہو جائے گا۔"

اس نے سوچا اور پھر مسکرا دی۔ وہ یونہی بے سروپا سوچوں میں الجھ کر رہ گئی تھی۔ اس نے سارے خیالات کو ذہن سے نکالا اور اس دن کے شیڈول پر نگاہ ڈالی اور اپنے کام میں مصروف ہو گئی۔ کچھ دیر تک وہ مصروف تو رہی لیکن ذہنی طور پر اس کا دھیان سعدیہ ہی کی جانب رہا۔ وہ اپنا دھیان ہٹانے کے لیے اپنے کام کے بارے میں سوچنے لگی۔

انہیں اپنے کام کی ابتداء کیے ہوئے اتنا زیادہ عرصہ نہیں گزرا تھا۔ اس دوران اس نے ان تمام ذرائع سے رابطے کیے جن سے نہ صرف وسائل کی امید تھی بلکہ تحقیقی معاملات میں بھی استفادہ کیا جا سکتا تھا۔ یہ رابطہ اندرونی اور بیرونی ممالک تک تھا۔ اسے اپنی توقع سے زیادہ رسپانس ملا تھا۔ اس کی نہ صرف حوصلہ افزائی ہوئی تھی بلکہ اس کے خیالات کو سراہتے ہوئے مزید معلومات کے تبادلے کی بھی آفر کی گئی۔ اس نے جو پراجیکٹ شروع کیے تھے ان میں کچھ نئے تھے اور کچھ پہلے کہیں نہ کہیں چل رہے تھے۔ اپنے ملک کے چند چینل ایسے تھے جہاں پر وہ ایسے پروگرام دینا چاہتی تھی، جن کا براہ راست

فائدہ خواتین کو ہوتا۔اس کے لیے وہ اسکرپٹ تیار کر رہی تھی۔ان مختلف چینل سے بات چل رہی تھی لیکن اس کے پہلے وہ ایک اور کام کے مکمل ہو جانے کا انتظار کر رہی تھی۔کسی بھی معاشرے کے رجحان کو جاننے کے لیے کچھ اشارے ہوتے ہیں اور کچھ تحقیقات ہوتی ہیں۔ان سے یقین کر لیا جاتا ہے کہ عوامی رجحان کیا ہے۔وہ دیکھنا یہ چاہ رہی تھی کہ لوگ پڑھنا پسند کرتے ہیں یا دیکھنا۔اسی سے اس کا رخ متعین ہونا تھا کہ وہ اپنا پیغام زیادہ سے زیادہ کیسے پھیلا سکتی ہے؟ جس قدر وہ سوچتی تھی۔سعدیہ اس سے کہیں زیادہ کام کر رہی تھی۔وہ اس کے لیے بڑا حوصلہ تھی، وہ بہت زیادہ کام کر رہی تھی۔وہ اس کا بہت زیادہ ہاتھ بٹا رہی تھی لیکن شروعات میں ہی اس کا الگ ہو جانا اس کے لیے یقیناً دھچکہ تو تھا۔

"تو پھر مجھے کیا کرنا چاہیے؟"

"اگر وہ ہوتی تو اچھا تھا۔"

"میں کب کہتی ہوں کہ اچھا نہیں تھا۔کام تو اپنی جگہ ہو گا۔وہ نہیں تو اللہ کسی اور کا سہارا دے گا لیکن اس کی کیا مجبوریاں ہیں۔اسے کیا ہو گیا ہے؟ کہیں وہ اکتا تو نہیں گئی۔آزاد فضاؤں کا پنچھی کہیں چند پابندیوں سے گھبرا تو نہیں گیا۔حالانکہ ان پابندیوں میں نہ صرف اڑان ملتی ہے بلکہ نئے سے نیا جہان اس پر آشکار ہوتا ہے۔"

"ایک دوست کی حیثیت ہی سے سہی، میں اس تک رسائی کی کوشش ضرور کروں گی۔"

اس نے پورے خلوص سے سوچا اور پھر سے اپنے کام میں مگن ہونے کی کوشش کرنے لگی۔اس کی نگاہیں تو کمپیوٹر سکرین پر تھیں لیکن ذہن میں لاشعوری طور پر الجھن چلتی چلی جا رہی تھی



سعدیہ آفس جانے کے لیے تیار ہو چکی تھی۔کافی تلاش کے باوجود اسے اپنا سیل فون نہیں مل رہا تھا۔وہ ملازمہ سے بھی پوچھ چکی تھی۔تبھی وہ ڈرائنگ روم میں پڑے لائین فون کے پاس گئی تاکہ کال کر کے معلوم کر سکے کہ اس کا سیل فون کہاں پڑا ہے۔انہی لمحات میں اس کی ماما فون پر شبانہ سے بات کر رہی تھی۔ریسور کریڈل پر رکھتے ہی جب اس کی ماما پلٹی تو اپنے سامنے سعدیہ کو کھڑے پایا۔وہ اسے دیکھ کر حیران رہ گئیں۔

"ماما! میرا سیل فون کہاں ہے؟"

"میرے پاس ہے اور میں نہیں چاہتی کہ اب تم دوبارہ ان سے رابطہ کرو۔" ماما نے صاف انداز میں کہا اور صوفے پر بیٹھ گئی۔

"ماما! مجھے بلیک میل تو آپ کر رہی ہیں جبکہ الزام دوسروں کو دے رہی ہیں۔" سعدیہ نے آہستگی سے کہا۔

"وہ تو ٹھیک ہے مگر یہ تم کہاں جا رہی ہو؟" ماما نے اسے سر تا پا دیکھتے ہوئے کہا۔

"میں آفس جا رہی ہوں۔" اس نے اطمینان سے کہا۔

"اس کا مطلب ہے تمہیں ہماری بات سمجھ میں نہیں آئی۔" ماما نے غضب ناک ہوتے ہوئے کہا۔

"مجھے آپ کی بات سمجھ آئی ہے۔آپ نے خود ہی تو چند دن سوچنے کو دیئے ہیں لیکن لگتا ہے کہ آپ مجھے سوچنے بھی نہیں دیں گی۔" اس نے تحمل بھرے لہجے میں کہا۔

"بالکل اس میں سوچنے والی بات کیا ہے۔ختم کروان سے تعلق۔" ماما نے صاف انداز میں کہا۔

"ان کا بہت کچھ میرے ذمے ہے۔میں وہ واپس کر دوں تبھی ان سے تعلق ختم ہو سکتا ہے۔" اس نے آہستگی سے کہا۔

"کیا ہے ایسا ان کا تمہارے پاس۔ہمیں بتاؤ، ہم دے دیتے ہیں۔" ماما نے نخوت سے کہا۔

"آپ نہیں دے سکتے۔وہ مجھے ہی معلوم ہے۔باقی میں واپس آکر اپنا فیصلہ بتا دیتی ہوں۔" وہ بولی تو ماما نے بڑے غور سے اس کی جانب دیکھا اور پھر تجسس سے بولی۔

"اس کا مطلب ہے تم فیصلہ کر چکی ہو؟"

"جی۔" اس نے اختصار سے کہا۔

"کیا ہے۔ادھر بیٹھو، بتاؤ مجھے۔" وہ تیزی سے بولیں۔

"میں نے کہا نا، میں ابھی جاؤں گی۔پھر واپس آکر بتاتی ہوں۔" اس نے آہستہ سے کہا۔

"نہیں، تم کہیں نہیں جا رہی ہو۔ادھر بیٹھو اور مجھے بتاؤ۔" وہ اصرار کرتے ہوئے بولیں۔اس پر وہ کچھ دیر خاموش رہی۔پھر بولی۔

"تو پھر سنیں! اگر ناصر جمال مجھے حجاب کے ساتھ قبول کرتا ہے تو میں آپ کے ساتھ آج ہی لندن جانے کے لیے تیار ہوں۔میں شبانہ سے تعلق ختم کر لوں گی اور وہ ایک دن ہونا ہی ہے۔میں ساری زندگی تو ان کا ساتھ نہیں دے سکتی لیکن یہ جو حجاب کے ساتھ میرا ناتا جڑ گیا ہے۔یہ اب ختم نہیں ہو سکتا۔"

"سارا فساد تیرے انہی خیالات ہی کا تو ہے۔وہ کیسے خواہ

مخواہ اپنے آپ کو مشکوک کرے۔اس کی وہاں پر ایک کاروباری ساکھ ہے۔اس کا۔" ماما نے کہنا چاہا مگر وہ ہاتھ اٹھا کر بولی۔

"کچھ بھی ہے، میں نے کہہ دیا۔اب آپ کی اپنی مرضی۔میرا سیل فون۔" اس کا لہجہ کچھ ایسا باغیانہ تھا کہ اس کی ماما ایک لمحے کے لیے چونک گئی۔

"وہ میرے بیڈ روم کے سائیڈ ٹیبل کے دراز میں پڑا ہے۔" ماما نے انتہائی اجنبی لہجے میں کہا۔سعدیہ اٹھنے لگی تو وہ اسی اجنبی لہجے میں بولیں۔"سعدیہ!تم اپنے آپ کے ساتھ اور اپنے خاندان کے ساتھ بہت برا کر رہی ہو۔تمہیں نہیں احساس کہ تم ساری زندگی کے لیے تنہا ہو کر رہ جاؤ گی۔"

"مجھے کوئی افسوس نہیں ہوگا۔کیونکہ میرے لیے میرا اللہ کافی ہے۔" وہ سکون سے بولی اور باہر کی جانب چل دیا اور پھر کچھ دیر بعد پورے حجاب میں اپنی گاڑی تک گئی اور وہاں سے چلی گئی۔

اس دن وہ معمول سے ہٹ کر تقریباً دو گھنٹے لیٹ تھی۔وہ سیدھی شبانہ کے آفس میں پہنچی۔وہ اسے دیکھ کر حیران رہ گئی۔پھر انتہائی خوشگوار انداز میں اس کی طرف دیکھتے ہوئے بولی۔

"مجھے یقین تھا تم ضرور آؤ گی'تمہارا ایمان اتنا کمزور نہیں ہے۔"

"شبانہ!مجھے لگتا ہے کہ میں اب ایسے مقام پر آ گئی ہوں جہاں مجھے اپنے بہت سارے گناہوں کا کفارہ ادا کرنا ہوگا' میں نے سوچ لیا ہے کہ اب میں۔"

"اللہ معاف کرنے والا ہے۔وہ اپنے گنہ گار بندوں کی توبہ قبول کرتا ہے۔" وہ سکون سے کہتے ہوئے لمحہ بھر توقف کے ساتھ بولی۔"مجھے بتاؤ' کیا بات ہے۔"

اس پر سعدیہ چند لمحے خاموش رہی پھر من وعن ساری بات کہہ دی۔پھر آخر میں بولی۔

"میں نہیں جانتی کہ تمہیں یا تمہارے کام پر کوئی حرف آئے لیکن اپنا آپ بھی بچا لینا چاہتی ہوں۔"

"جہاں تک میری مخالفت کی بات ہے۔تم اس سے مت گھبراؤ۔میں اس کا سامنا کر لوں گی۔تاہم ایک بات مجھے صاف بتا دو کیا تم فقط ناصر جمال کے ساتھ شادی کرنے کی غرض سے میرے ساتھ ہو یا پھر اپنے ایمان۔" شبانہ نے کہنا چاہا لیکن اس نے بات اچکتے ہوئے کہا۔

"میں نے اگر یہ حجاب پہنا ہے تو یہ کوئی ڈرامہ نہیں ہے۔میں نے پورے ہوش وحواس سے اس کی اہمیت اور فرضیت کو سمجھتے ہوئے لیا ہے۔ظاہر ہے اس سے بہت پہلے، بہت ساری باتوں کو راسخ کرنا پڑتا ہے۔یہ ٹھیک ہے کہ اس کی محرک تم ہو مگر اس کے اپنانے میں تمام تر میری اپنی مرضی شامل ہے۔میرے خوف زدہ ہونے کی فقط ایک ہی وجہ تھی کہ کہیں یہ لوگ تمہیں نقصان نہ پہنچائیں۔"

"اللہ بہتر کرے گا۔تم حوصلہ رکھو۔" شبانہ نے مسکراتے ہوئے کہا تو وہ بھی مسکرا دی۔پھر بولی۔

"ویسے اگر تم اکاؤنٹس مجھ سے لے لو تو زیادہ بہتر ہے۔پتہ نہیں میرے حالات کیسے ہوں۔میں کام کرتی ہوں گی۔"

"آسمان نہیں گر پڑے گا۔تم کام کرو۔" وہ حتمی انداز میں بولی۔

سعدیہ چند لمحے سوچتی رہی پھر اٹھ کر اپنے آفس میں آ گئی۔

سہ پہر ہو چکی تھی جب سعدیہ واپس آئی۔پورچ میں گاڑی روکتے ہوئے اس نے دیکھ لیا تھا کہ لان میں اس کے پاپا سمیت سبھی بیٹھے ہیں۔اگر وہ یونہی اندر چلی جاتی تو اچھے تاثر والی بات نہیں تھی۔وہ سیدھی انہی کے پاس چلی گئی۔اس نے سلام کیا اور بیٹھ گئی۔پاپا نے دھیرے سے سلام کا جواب دیتے ہوئے پوچھا۔

"جب تمہاری ماما نے تمہیں کہا تھا کہ کہیں نہیں جانا تو پھر تم کیوں گئی؟"

"پاپا مجھے آفس تو جانا ہی تھا۔میں یوں اچانک بغیر بتائے تو نہیں بیٹھ سکتی گھر میں۔" وہ نرم لہجے میں بولی۔

"دیکھو سعدیہ!تمہاری یہ جاب مجھے قطعاً پسند نہیں اور نہ یہ پسند ہے کہ تم شدت پسندوں میں شامل ہو جاؤ۔یہ ٹھیک ہے کہ تم اچھی مسلمان بننا چاہتی ہو۔کس نے روکا ہے بنو لیکن ایسی نہیں کہ ہمارے لیے مشکلات پیدا کرو۔تم نہیں جانتی ہو کہ یہ کس طرح لوگوں کو، خصوصاً نوجوانوں کے جذبات سے کھیلتے ہیں اور۔" پاپا نے کہنا چاہا تو سعدیہ بولی۔

"پاپا!آپ آخر کہنا کیا چاہتے ہیں۔"

"وہی جو تمہاری ماما نے تمہیں سمجھایا ہے اور اگر تم نہ سمجھی تو یہ فقط دھمکی نہیں ہے، وہ ادارہ تباہ ہو جائے گا۔پھر تم کہاں جاؤ

گی۔" پاپا نے قدرے سخت لہجے میں کہا۔
"پاپا آپ بھی اور ماما بھی مجھے یہی دھمکیاں دے رہے ہیں کہ وہ ادارہ تباہ ہو جائے گا۔ تو کر دیں۔ کس نے روکا ہے۔ ادارے بنتے اور ٹوٹتے رہتے ہیں۔ اگر ان میں حوصلہ ہوا، قوت ہوئی اور مزاحمت کر سکے تو کر لیں گے لیکن میں جو ہوں اور جیسی ہوں، اسی طرح رہوں گی۔ مجھ سے میرا ایمان نہیں چھین سکتے آپ؟" سعدیہ نے واشگاف الفاظ میں کہا اور اٹھ کر اندر کی طرف چل دی۔ تبھی اس کے کانوں میں ماما کی آواز پڑی۔
"دیکھا ایک دن گئی ہے اور اس قدر منہ پھٹ ہو گئی ہے۔ کل تک یہ خوف زدہ تھی آج کتنی جرات سے جواب دے رہی۔ میں تو کہتی ہوں انہیں سبق مل ہی جانا چاہیے۔"
پاپا نے کیا جواب دیا اس نے توجہ ہی نہیں دی اور اپنے کمرے کی جانب بڑھتی چلی گئی۔



اس صبح زرق شاہ ناشتے کی میز پر آیا تو معمول کے مطابق سبھی وہاں تھے۔ وہ خاموشی سے آ کر بیٹھ گیا۔ اس کے پاپا اسے بڑے غور سے دیکھ رہے تھے۔ وہ پلیٹ سیدھی کر کے توسٹ اس میں رکھ رہا تھا کہ پاپا انتہائی خوشگوار لہجے میں مسکراتے ہوئے بولے۔
"زرق شاہ! بھئی آج کل تم گھر میں بڑا وقت دے رہے ہو، کیا بات ہے کہیں اداکاری کی "محنت مزدوری" نہیں مل رہی ہے تمہیں؟"
"نہیں پاپا! میں نے اداکاری چھوڑ دی ہے۔" اس نے مسکراتے ہوئے آہستگی سے کہا تو فاطمہ ہنستے ہوئے بولی۔
"اصل میں حادثے کے بعد ان کے سر پر کافی چوٹ آئی ہے۔ ظاہر ہے بندے کا کوئی نہ کوئی اسکرو ڈھیلا ہو ہی جاتا ہے۔"
اس کے معصومانہ انداز پر سبھی ہنس دیئے۔ تو ماما نے گھورتے ہوئے کہا۔
"فاطمہ! بھائی سے ایسے بات کرتے ہیں؟"
"ماما! میں بات نہیں، تبصرہ کر رہی ہوں۔" اس نے پھر کہا تو سبھی مسکرا دیئے۔ تب پاپا بولے۔
"تمہاری یہ سکرو ڈھیلا ہونے والی بات مجھے پسند آئی ہے۔ دیکھو نا بالکل ہی بدل کر رہ گیا ہے۔"
"میں تو کہتی ہوں یہ اچھی تبدیلی ہے۔ اب یہ پانچ وقت کی نماز پڑھتا ہے۔ صبح کے وقت تو مصلے ہی سے نہیں اٹھتا اور یہ کہ سارا دن کتابوں میں مشغول رہتا ہے۔" ماما نے مسکراتے ہوئے کہا۔
"اچھی بات ہے۔" یہ کہتے ہوئے انہوں نے چند لمحے سوچنے والے انداز میں توقف کیا اور بولے۔ "یہی دیکھتے ہوئے میں چند دن سے سوچ رہا تھا کہ تم سے بات کروں۔"
"کیسی بات پاپا؟" اس نے سنجیدگی سے پوچھا۔
"بھئی فاطمہ تم جلدی سے ناشتہ کرو۔ تمہیں کالج سے دیر ہو رہی ہے۔" ماما نے فاطمہ کی طرف دیکھ کر کہا جو بڑی دلچسپی سے ان کی گفتگو میں مگن تھی۔ تب اس نے جلدی سے جوس کا گلاس ختم کیا اور اٹھ گئی۔ ماما اسے باہر تک چھوڑنے کے لیے چلی گئی۔
"تمہارے معمولات بدل گئے۔ تم نے اداکاری چھوڑ دی۔ اب آگے کے لیے کیا سوچا ہے؟"
"میں کچھ سوچ رہا ہوں۔ پچھلے دو تین مہینوں سے میں مختلف شخصیات سے مل رہا ہوں۔ زمینی حقائق دیکھ رہا ہوں۔ اب بس چند دنوں میں کوئی فیصلہ کر لوں گا۔" وہ سنجیدگی سے بولا۔
"مطلب، کیا؟" کس بارے میں یہ سب کر رہے ہو؟" پاپا نے پوچھا۔
"میں ابھی خود مطمئن نہیں ہوں۔ جیسے ہی میں کسی فیصلے تک پہنچا، آپ کو ضرور آگاہ کر دوں گا۔" اس نے کہا۔
"ٹھیک ہے، جو تم چاہو۔ بہرحال میری طرف سے تمہیں آفر ہے۔ ہمارا بزنس اور آبائی زمین اس قدر ہیں کہ ممکن ہے تمہیں کام کرنے کی ضرورت نہ پڑے لیکن میں چاہتا ہوں کہ تم بھی بزنس کی دنیا میں آ کر مصروف ہو جاؤ۔ میرے خیال میں تمہیں یہ بات سمجھانے کی ضرورت نہیں کہ میں ایسا کیوں چاہتا ہوں۔"
اس دوران اس کی امی واپس آ کر بیٹھ گئی تھی۔
"ممکن ہے میں آپ ہی کے ساتھ آ جاؤں یا کچھ نیا کروں۔" اس نے پھر کوئی حتمی بات سے بچتے ہوئے کہا۔
"اصل میں ابھی اس پر کوئی ذمے داری نہیں ہے۔ اس لیے ایسے سوچ رہا ہے۔ میں تو کہتی ہوں اب اس کی شادی کر دیں۔" ماما نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"یہ تیار ہو تو ہم بھی تیاریاں کر لیتے ہیں۔" پاپا نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"میں شادی بھی کروں گا لیکن کچھ وقت بعد۔" وہ بولا۔

"کوئی لڑکی ہے نظر میں۔" پاپا نے پوچھا تو زرق شاہ نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"یہ ٹھیک ہے پاپا کہ آپ کا رویہ آج تک میرے ساتھ دوستوں جیسا رہا ہے۔ میں نے جو چاہا سو کیا لیکن۔"

"مناسب وقت پر بتاؤں گا یہی کہنا چاہتے ہو نا؟" پاپا نے اس کی بات اچکتے ہوئے کہا۔

"نہیں' ایسی بھی کوئی بات نہیں لیکن جسے میں پسند کرتا ہوں۔ وہ میری رسائی سے بہت دور ہے۔ پتہ نہیں میں اس تک پہنچ بھی پاؤں گا یا نہیں۔" وہ حسرت آمیز لہجے میں کہتا ہوا کھو گیا۔ پھر فوراً ہی چونکتے ہوئے بولا۔

"خیر' جو بھی ہو میں آپ ہی کی پسند کو ترجیح دوں گا۔"

"بیٹا! تم میرے اکلوتے ہو اور ایک باپ کی حیثیت سے میں چاہتا ہوں بلکہ میں چاہوں گا کہ تمہیں دنیا بھر کی خوشیاں اور سہولیات ملیں۔ زندگی تم نے گذارنی ہے' تو پسند بھی تمہاری ہونی چاہیے۔ یوں تو بہت رشتے ہیں۔ خاندان کی بہت ساری لڑکیاں ہیں لیکن یہ' جو تم نے رسائی اور نارسائی والی بات کی ہے نا یہ کچھ میری سمجھ میں نہیں آئی۔" پاپا نے الجھتے ہوئے کہا۔

"چھوڑیں پاپا' جب میں ہی پُر اُمید نہیں ہوں۔ تو اس کے ذکر کا فائدہ۔"

"غلط بات ہے' اُمید تو کبھی بھی نہیں چھوڑنی چاہیے۔ نا امید شخص کی بھی کوئی زندگی ہے۔" وہ بولے۔

"میں نے شاید امید لفظ غلط بولا ہے۔" اس نے فوراً ہی اعتراف کرتے ہوئے کہا۔ "دراصل میں چاہوں بھی تو شاید اس تک رسائی نہ ہو پائے۔"

"ایسی بھی کیا بات ہے بیٹا۔ تم بتاؤ' ہم کوشش تو کر دیکھیں گے۔" ماما نے پیار سے کہا۔

"میں بتا دوں گا اور وہ وجہ بھی جس کے باعث اس تک رسائی ممکن نہیں ہے۔" وہ مسکراتے ہوئے بولا۔

"تو ابھی بتا دو نا۔" پاپا ہنستے ہوئے بولے۔

"وہی' تھوڑا وقت پلیز' وعدہ رہا کہ جس دن میں نے کوئی فیصلہ کیا' اسی دن آپ کو سب کچھ بتا دوں گا۔" وہ باوجود کوشش کے کہہ نہ سکا۔

"چلو' جب مناسب سمجھو تب بتا دینا لیکن یہ یاد رکھنا' بعض اوقات دیر بھی ہو جاتی ہے۔ کہیں گاڑی نہ نکل جائے۔" وہ خوشگوار انداز میں بولے۔ تو ماما نے فوراً کہا۔

"آپ بھی نا' بس' میں اپنے بیٹے سے خود پوچھ لوں گی' ابھی آپ دونوں ناشتے پر توجہ دو۔"

"ٹھیک ہے بھئی' اب ہم تو چلے آفس۔" پاپا نے اٹھتے ہوئے کہا تو اس کے ساتھ ہی وہ موضوع بھی بند ہو گیا۔

وہ ناشتے کے بعد کاریڈور میں آبیٹھا۔ بہت مدت بعد اس کی شادی کے بارے میں بات ہوئی تھی۔ پہلے تو عموماً اسے چھیڑنے کے لیے یا پھر یونہی اس کا عندیہ لینے کے لیے بات ہوتی۔ اس بار جو اس کے والدین کا لہجہ تھا اور اس میں سے چھلکتی ہوئی محبت تھی۔ اس نے بہت کچھ سوچنے پر مجبور کر دیا تھا۔ نجانے کیوں اس کے بدل جانے پر کچھ زیادہ ہی نرم دل ہو گئے تھے۔ پہلے وہ سب اس کی پروا نہیں کیا کرتے تھے۔ پتہ نہیں وہ کیا سوچ رہے تھے۔ یقیناً وہ اس بار یونہی نہیں' سنجیدگی سے بات کر رہے تھے۔ کیونکہ اس کا اپنا دل گواہی دے رہا تھا۔ پہلے جب بھی کبھی ایسی بات ہوتی تھی کوئی بھی چہرہ شریک حیات کے طور پر اس کی نگاہوں میں نہیں آتا تھا لیکن آج جب انہوں نے بات کی تو کسی تکلیف کے بغیر شبانہ وقار کا سراپا اس کی نگاہوں کے سامنے آگیا تھا۔ وہ اپنی پوری جولانیوں کے ساتھ اس کے ایوانِ ذہن کے سنگھاسن پر براجمان تھی۔ یوں جیسے وہ اس کے جہانِ خیال پر حکمرانی کر رہی ہو۔

وہ اسے کبھی بھی نہیں بھولا تھا۔ جب سے اسے دیکھا' تبھی سے وہ اس کے خیالوں پر حکمران تھی۔ وہ جو اس کی جانب منفی خیالات لے کر بڑھا تھا۔ زندگی کا ایک ایسا سبق لے کر پلٹا جس سے وہ اپنا آپ ہی بھول گیا۔ اسے یاد رہا تھا تو بس وہ سبق۔ صدائے منصور یونہی نہیں لگتی۔ عشق ہی نہیں' روحِ عشق کو بھی اپنے اندر راسخ کرنا پڑتا ہے اور تب سے وہ محوِ سفر تھا۔ اس نے اگر شبانہ تک نارسائی کی بات کی تھی تو ٹھیک کی تھی۔ وہ خود اس کی طرف نہیں بڑھنا چاہتا تھا۔ کیونکہ اس کے دامن میں ابھی تک کچھ نہیں تھا۔ کتابوں میں بند لفظ خوشبو نہیں دیتے لیکن جیسے ہی انہیں کوئی پڑھتا ہے اور اپنے کردار سے اس کا اظہار کرتا ہے تبھی ان لفظوں کی خوشبو اپنا اظہار کرتی ہے۔

وہ شبانہ سے بے خبر نہیں تھا۔ وہ اچھی طرح جانتا تھا کہ وہ ادارہ بنا چکی ہے۔ یہ اسے معلوم نہیں تھا۔ اسے یہ غرض نہیں تھی

کہ وہ کیا کر رہی ہے۔ اسے تو اپنے آپ سے غرض تھی کہ اس نے کیا کرنا ہے۔ اسے اپنی زندگی کا مقصد ملا تو وہ خود کو شبانہ کے اور زیادہ نزدیک محسوس کرنے لگا۔ اپنائیت کا احساس اس قدر بڑھ گیا تھا کہ وہ اسے اپنی سانسوں میں محسوس کرنے لگا تھا۔ وہ اس کی ہر سوچ میں شامل تھی۔ کوئی بھی خیال اس سے ہٹ کر نہیں تھا۔ پہلے وہ جس قدر نفرت اور حقارت سے شبانہ کے بارے میں سوچتا تھا۔ اب اس قدر محبت اور خلوص سے اپنے دل کی پنہائیوں میں محسوس کرتا تھا۔ ایک غیر مرئی قوت اسے ہر وقت سوچنے پر مجبور کیے رکھتی۔ ایسی کشش جسے وہ کوئی نام نہیں دے سکتا تھا۔ ہر لمحے اسے شبانہ سے باندھے رکھتی جس میں احترام ہی احترام تھا۔ رسائی میں سب سے بڑی رکاوٹ اس کی اپنی ذات تھی۔ کیونکہ جو سبق اُسے ملا تھا ،لفاظی نہیں، کردار تھا۔ اسے یقین تھا کہ کردار اپنا اثر ضرور رکھتا ہے۔ اس کی منزل تو شہادت تھی اور اس کا کردار خود ہی شہادت دے دیتا۔ یہ فیصلہ خود شبانہ کر لیتی کہ وہ حسینیت کو سمجھ سکا ہے کہ نہیں۔

جب تک اسے احساس نہیں تھا، وہ اپنی دنیا میں مست تھا لیکن جونہی اسے اپنا سبق ملا، جس میں مقصد پنہاں تھا۔ اس نے اپنے ارد گرد دیکھا۔ کئی راہیں اس کے اپنے ارد گرد دیکھیں۔ استاد جی سے بات کرنے کے بعد اس نے اپنے آپ ہی کو دیکھا۔ وہ کون ہے اور اس کی نسبت کن لوگوں سے ہے؟ وہ کیا تھے اور میں کیا ہوں۔ اس پر آشکار ہوا کہ اس کی نسبت تو ان لوگوں سے ہے جن کا پیغام محبت ہے۔ اگر وہ برصغیر تک محدود ہو کر دیکھتا ہے تو عظیم نام ہیں جن کی اس سے اور اس کے آباء کی نسبت تھی۔ آج کا صوفی ازم اس سے بہت دور ہے۔ اتنا دور کہ جس کا واسطہ ان لوگوں کی تعلیمات سے ہے ہی نہیں۔ اس نے بہت سوچ سمجھ کر بہت سارے لوگوں سے گفتگو و کلام کے بعد یہ فیصلہ کر لیا تھا کہ اسے کیا کرنا ہے۔ اس کی نیت درست تھی، پرخلوص تھی۔ وہ خود اللہ کی راہ میں جو ابد ہی کا تصور پوری طرح رکھتا تھا۔ دل کے نہاں خانوں میں کہیں سرگوشی ضرور پھوٹتی تھی کہ کاش شبانہ اس کی تائید کر دے تو وہ عزم سے پوری قوتوں کے ساتھ ڈٹ جائے لیکن یہ اس کے اپنے مقصد کا وہ مقام تھا۔ جہاں شبانہ سے کسی اذن کی ضرورت نہیں تھی۔ جب وہ اپنے اللہ کے لیے کر رہا ہے تو پھر سارے معاملات ہی سیدھے ہیں۔

شبانہ کی محبت اس کے من میں جاگزیں ہو گئی تھی۔ اس کے نام پر دل دھڑکنے سے لے کر اس مقام تک، جہاں قوتیں باہم مل کر مزید مستحکم ہو جاتی ہیں۔ تب تک اسے شبانہ کا احساس ضرور تھا۔ شعور میں کہیں یہ خواہش موجود تھی کہ شبانہ کی نگاہ اس پر پڑے۔ آج جبکہ گھر والوں نے اس کی شادی کر دینے کی بات کی تو شبانہ ہی اس کے تصور میں تھی۔ اس کے سوا کوئی اور نہیں تھا۔ اگرچہ اس نے کبھی بھی شبانہ پر اپنی نفرت و حقارت کا اظہار نہیں کیا تھا مگر وہ خود تو جانتا تھا ایک احساس شرمندگی اب بھی اس کے ساتھ بیل کی طرح لپٹا ہوا تھا۔ جس پر تصورات کے کئی رنگوں کے پھول مہکتے تھے تاکہ محبت کی وادی کو مہکایا جا سکے۔ مگر یہ سب کچھ اس کے اپنے من تک محدود تھا۔ اظہار نہیں تھا۔

اب تک اس نے جو گفتگو اور کلام کیا تھا۔ اس سے جو کچھ بھی ہو سکا تھا۔ اس کے بعد ایک مقام ایسا آنا فطری بات تھی جہاں سوچوں کی خوشبو نے اپنا اظہار کرنا تھا۔ اس نے اپنا میدان عمل بھی چن لیا تھا۔ روشنی کی وہاں ضرورت ہوتی ہے جہاں ظلمت ہو۔ اسے اپنی سوچوں کو عملی صورت دینا باقی تھا۔ یہ فیصلہ کسی دن بھی ہونا تھا اور اس دن اس نے فیصلہ کر لیا۔

صرف دو ہفتوں میں اس نے اپنا سیٹ اپ بنا لیا۔ اس نے جو بڑا سا گھر اپنے دوستوں اور دیگر مصروفیات کے لیے بنا رکھا تھا۔ اس کی ساری ہیئت ہی بدل دی۔ اسے رہائشی مقصد کی بجائے دفتر کی صورت دے دی۔ وہیں اس نے اپنی پروڈکشن کمپنی بنالی۔ جس کے افتتاح پر اس نے پریس کانفرنس کی اور اپنے مقاصد بیان کر دیئے۔



شبانہ معمول کے مطابق اپنے آفس میں آئی ہی تھی کہ سعدیہ مسکراتی ہوئی اس کے پاس آ کر بیٹھ گئی۔ اس کے ہاتھ میں اخبار تھا جو اس نے شبانہ کے سامنے پھیلا دیا۔ پھر ایک جگہ انگلی رکھتے ہوئے بولی۔

"یہ دیکھو۔"

"اخبار شبانہ نے پکڑ لیا اور پھر جوں جوں وہ پڑھتی گئی۔ اس کی حیرت بڑھتی گئی۔ پھر اخبار ایک طرف رکھتے ہوئے بڑبڑا کر بولی۔

"بڑی بات ہے' آخر وہ نسبت کو سمجھ گیا۔"

"کیا سمجھ گیا؟" سعدیہ نے پوچھا تو وہ چونک گئی پھر سنبھل کر بولی۔

"مطلب، یہ ڈاڑھی سے مزین چہرہ اچھا لگ رہا ہے اور اس کی باتیں اگر محض دعویٰ نہیں۔ وہ اس پر عمل بھی کرے گا تو وہ سمجھ گیا ہے کہ اسے کرنا کیا ہے۔"

"اس کے خیالات تو ٹھیک ہیں اور جس طرح وہ کام کرنا چاہتا ہے۔ وہ بھی بہت اچھا ہے لیکن جن موضوعات پر وہ ڈرامے بنانا چاہ رہا ہے، کیا وہ عوام میں مقبول ہوں گے۔ شوبز کی دنیا میں اس وقت کمرشل ازم اور گلیمر چل رہا ہے۔ یہ سب کچھ ہونے کے باوجود، جب تک ملٹی نیشنل کمپنیاں اس کا ساتھ نہیں دیں گی۔ تب تک تو یہ نقصان ہی کا سودا ہے نا' یہ کیسے کر پائے گا یہ سب کچھ؟" سعدیہ نے حیرت سے پوچھا۔

"اصل میں تم نے یہ فرض کرلیا ہے کہ ہمارے معاشرے میں بگاڑ ہی بگاڑ ہے، اس میں بہتری کی گنجائش نہیں ہے۔ جو بھی یہ بات سوچ رہا ہے۔ وہ غلط سوچ رہا ہے۔ پہلی بات تو ہے کہ انسان کے خمیر میں اچھائی ہے برائی نہیں۔ پھر یہ مان لیتے ہیں کہ ماحول اسے برائی کی طرف راغب کرتا ہے تو یہ کوئی اصول نہیں ہے۔ ماحول اچھائی کی طرف بھی تو راغب کر سکتا ہے۔ یہ تو معاشرتی رویہ ہے نا کہ وہ اپنا ماحول کیسا بنانا چاہتا ہے۔" اس نے کہا۔

"انفرادی رویہ ہی تو اجتماعی رویے کی تشکیل کرتا ہے نا۔" وہ بولی۔

"وہ ہی کہہ رہی ہوں۔ عوام میں اتنا بگاڑ نہیں ہے جتنا پیدا کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ ماضی میں اسلامی نظام کے لیے تحریکیں چلتی رہی ہیں۔ جتنی قربانی عوام نے دی۔ اسے رائیگاں کس نے کیا؟ انسان بنیادی طور پر اچھائی پسند کرتا ہے لیکن جب اسے بنیادی شعور ہی نہیں دیا جائے گا تو ماحول ہی سے اس نے اخذ کرنا ہے۔ اب رہی اس کے ڈراموں کی عوامی مقبولیت' اگر وہ اچھے ڈرامے بنائے گا۔ ان کا اسکرپٹ مضبوط ہوگا تو بغیر گلیمر اور کمرشل ازم کے بھی وہ مقبول ہوں گے۔" اس نے کہا۔

"کب تک' ایک وقت آئے گا کہ فنانس اس کی مجبوری بن جائے گا۔" وہ بولی۔

"یہ تصویر کا ایک رخ ہے۔ دوسرا رخ یہ بھی ہے کہ عوام نے پسند کیا تو یہی بھیڑ چال ہوگی' اصل میں مقبولیت کہتے کسے ہیں' یہی نا کہ جو عوام میں رجحان چل رہا ہے۔ اس کے مطابق بات کی جائے۔ عوام اگر خوبصورت عورتوں کے چہرے دیکھنا چاہتی ہے تو دوسری جانب نا انصافی سے نالاں بھی ہے۔ دولت کی غیر منصفانہ تقسیم سے جو برائیاں جنم لے رہی ہیں۔ عوام ان سے بھی تنگ ہیں۔ کیا یہ عوامی بات نہیں اور تم کیا سمجھتی ہو اس وقت جو ڈراموں میں چل رہا ہے کیا وہ عوام کی ترجمانی ہے؟" اس نے بھرائے ہوئے لہجے میں کہا۔

"نہیں بالکل نہیں' ایلیٹ کلاس کے مسائل، عوامی بہرحال نہیں ہیں۔" سعدیہ بولی۔

"میں مانتی ہوں کہ ڈرامہ بنیادی طور پر تفریحی شے ہے لیکن اس میں مقصدیت سے بھی انکار نہیں کیا جاسکتا۔ کھیت مزدور عورت کے مسائل کس قدر بیان کیے گئے ہیں۔" اس نے بڑے خلوص سے کہا۔

"چلیں' یہ تو وقت پر ہے کہ وہ کامیاب ہوتا ہے یا نہیں۔ میں یہ پوچھنا چاہتی ہوں کہ ہم اگر اس کی مدد کرنا چاہیں، یا اس سے مدد لینا چاہیں، تو وہ کیا اور کیسے ہو گا۔؟" سعدیہ نے بات کا رخ بدل دیا۔

"جو چاہے، ہم اس کی مدد کریں گے جو ہم سے متعلق ہوئی۔ ہم اسے اچھے اسکرپٹ دے سکتے ہیں۔ تحقیق کی بنیاد پر زمینی حقائق دے سکتے ہیں اور یہ بہت اچھی بات ہے کہ ہمارے کچھ پروڈکشن کے کام ہیں۔ اس کے حوالے کیے جا سکتے ہیں۔ بلکہ میں تمہیں بتاؤں کہ ایک چینل پر خواتین کے لیے ٹاک شو کا پروگرام بنایا جارہا ہے۔ اب وہ لوگ چاہ رہے ہیں کہ کم از کم حجاب میں کوئی لڑکی ہو۔ اب ان کے پاس کوئی ایسا ڈیپارٹمنٹ نہیں ہے جہاں وہ تحقیق کرسکیں۔ اس سلسلے میں وہ مجھ سے بات کرنا چاہ رہے ہیں۔" شبانہ نے دلچسپی سے بتایا۔

"ہمیں کرنا کیا ہوگا؟" اس نے پوچھا۔

"یہی کہ اسکرپٹ تیار کریں گے۔ ان کی مدد سے ماہرین کو بلوائیں گے۔ ان کی دلچسپی یہ بھی ہے کہ اگر سعدیہ تم' میرا مطلب تم میزبانی کرو تو یہ ایک اچھا پراجیکٹ ہوگا۔ جو وہ ہم سے چاہتے ہیں۔" اس نے بتایا۔

"دیکھ لیتے ہیں لیکن۔" وہ بجھے ہوئے لہجے میں بولی۔

"کیا بات ہے؟" اس نے پوچھا۔

"وہی۔ گھر میں مسئلہ شدت اختیار کر گیا ہے' جب تک وہ کسی کنارے نہیں لگے گا، میں کوئی فیصلہ نہیں کرسکتی۔" اس نے گمبھیر لہجے میں کہا تو ان کے درمیان خاموشی چھا گئی۔ کچھ دیر تک وہ دونوں اپنی اپنی جگہ سوچتی رہیں۔ پھر سعدیہ اٹھتے

ہوئے بولی۔ ”میں چلتی ہوں اپنی سیٹ پر۔“
”ٹھیک ہے۔“ شبانہ نے آہستگی سے کہا اور اسے جاتے ہوئے دیکھتی رہی۔ وہ آخر تنہا ہوئی تو اس کی نگاہ اخبار پر پڑی، زرق شاہ کی تصویر نمایاں تھی۔ وہ اسے بڑے غور سے دیکھتی رہی۔ آخری بار جب اس نے زرق شاہ کو دیکھا تھا۔ اس وقت وہ ایسا نہیں تھا۔ شبانہ نے اس وقت بہت کچھ کہا تھا اور یہ سب کہتے ہوئے اسے خود احساس نہیں تھا کہ زرق شاہ اس کا اتنا اثر لے گا۔ اس کی زندگی ہی بدل جائے گی۔ ظاہر ہے جب خیالات تبدیل ہوتے ہیں تو اس کا اظہار کردار سے ضرور ظاہر ہوتا ہے۔ پھر شبانہ سے اس کا کوئی رابطہ نہیں رہا تھا ورنہ وہ اس کے خیالات کے بارے میں ضرور آگاہ ہوتی۔ مگر اس نے اپنی ایک الگ دنیا بنالی تھی اور اسی میں وہ آگے بڑھنے کا عندیہ دے رہا تھا۔
”شبانہ! اب تو وہ بہت بدل گیا ہے۔ اس کے خیالات ویسے ہی ہو گئے ہیں جیسے تم چاہتی تھی۔ اب اگر وہ تمہاری طرف بڑھے تو کیا تم اسے قبول کرلوگی۔“
اس کے من سے آواز ابھری تو وہ بری طرح چونک گئی۔ یہ ایک ایسا سوال تھا جس کے جواب سے وہ نگاہیں چرانا چاہتی تھی لیکن پھر بھی وہ تن کر سامنے آکھڑا ہوا تھا۔
”ظاہر ہے میں ایک لڑکی ہوں۔ میرے والدین نے مجھے کہیں تو۔“
”نہیں، یہ سارے بہانے ہیں۔ سیدھی بات یہ ہے کہ کیا تم اس سے محبت کرتی ہو؟“
”محبت۔ اب وہ اس قابل ہونے جا رہا ہے کہ اس سے محبت ہی نہیں عشق بھی کیا جاسکتا ہے۔“
”اس کا مطلب ہے کہ تمہیں اس کی ذات سے نہیں اس کے خیالات سے محبت ہوسکتی ہے۔ اگر ایسے ہی خیالات کسی دوسرے کے ہوں تو کیا تمہارا دعویٰ اس کے لیے بھی یہی ہو گا؟“
”ہر انسان کے ذہن میں کوئی نہ کوئی آئیڈیل تو ہوتا ہے۔ یہ بھی حقیقت ہے کہ کشش ہی دونوں کو قریب لاتی ہے لیکن اگر محبت کی جاتی ہے تو وہ کردار سے ہوتی ہے۔ اب یہ اپنا اپنا آئیڈیل ہے کہ وہ کوئی کیسا کردار پسند کرتا ہے۔ اصل شے تو کردار ہے، ظاہری حسن تو عارضی شے ہے۔“
”اگر وہ اب تمہاری طرف بڑھے تو۔“
”میرے مقصد کو مزید تقویت ملے گی۔ میں نے اسے تب سے پیار کرنا شروع کر دیا تھا جب وہ پوری شدت سے میری مخالفت پر آمادہ تھا۔ میرے دل سے یہ ہوک اٹھی تھی کہ کاش یہ اس جیسا ہو جائے جیسا میں چاہتی ہوں۔ وہ میری دعاؤں میں شامل رہا ہے۔ اب اس رویے کو کیا کہیں گے؟ میں نہیں جانتی۔“
”مطلب، تم اسے قبول کرلوگی۔؟“
”وہ خود میری طرف نہیں بڑھے گا۔ اگر اس نے وہ سبق یاد کرلیا ہوا جو میں نے اسے پہنچایا تھا۔ کیونکہ ایسے خیالات رکھنے والے کا کردار اگرچہ مضبوط ہوتا ہے تاہم اس میں مقصدیت زیادہ اہم ہوتی ہے۔“
”بات تمہاری قبولیت کی ہے؟“
”کیوں نہیں، میں قبول کروں گی۔ جس کے لیے میں اتنی دعائیں کرتی رہی۔ اس سے اپنائیت محسوس کرتی ہوں میں۔ اسے اگر میری طرح ہی میرے مقصد سے عشق ہوا تو مجھے اور کیا چاہیے۔ دنیاداری کے سارے معاملات تو مجھے ویسے ہی مل جاتے ہیں۔“
”کیا یہ تمہارے لیے اللہ کی طرف سے انعام نہیں ہوگا۔“
”بے شک ہوگا۔“
”تو کیا تم انتظار ہی کرتی رہوگی یا آگے بڑھ کر اس کا ہاتھ تھامنے کی کوشش بھی کروگی۔“
”ایسے بامقصد لوگوں کو دنیاوی سہاروں کی ضرورت نہیں ہوتی۔ ان کی نگاہیں اپنی منزل پر اور بھروسہ اپنے خدا پر ہوتا ہے یہی تو کردار ہے۔“
”تم اس کا انتظار کروگی۔“
”مجھے اپنے مقصد سے غرض ہے۔ جب ایسا کوئی معاملہ سامنے آئے گا تو دیکھیں گے۔ میں بہرحال پورے خلوص سے اس کے لیے دعاگو ہوں۔ میں چاہتی ہوں کہ اسے اس کی منزل مل جائے۔“
انٹرکام کے بزر نے اس کی ساری محویت توڑ دی۔
”جی آپ سے کچھ لوگ ملنا چاہتے ہیں۔ ان میں دو خواتین اور ایک مرد ہے۔“ چوکیدار نے بتایا۔
”کہاں سے آئے ہیں اور کون ہیں۔“ اس نے پوچھا۔
”جی وہ کسی حکومتی ادارے کا۔ وہ جی لیں خود بات کر لیں۔“ چوکیدار نے کہا اور اگلے ہی لمحے ایک خاتون کی آواز

ابھری۔ "میں اپنا تعارف آ کر کرواتی ہوں۔ اگر آپ کو ہمارے ساتھ مرد پر اعتراض ہے تو وہ یہیں رک جاتے ہیں۔"

"آ جائیں آپ۔" اس نے کہا اور ریسیور رکھ دیا۔ کچھ ہی دیر بعد دو خواتین اس کے سامنے تھیں اور اپنا تعارف کروا چکی تھیں۔ وہ ریاستی خفیہ ادارے سے تعلق رکھتی تھیں۔ تب شبانہ نے ان کے مرد ساتھی کو بھی وہیں بلوالیا۔ تب ایک خاتون نے کہا۔

"آپ کے اس ادارے کے بارے میں ہمیں کچھ ایسی اطلاعات ملی ہیں۔ جو بہر حال ریاستی مفاد میں نہیں اور ہم اس سلسلے میں آئے ہیں۔ کیونکہ تفتیش تو ہم نے کرنا ہی ہیں۔"

"کیا میں یہ پوچھ سکتی ہوں کہ یہ اطلاعات کس نے دیں۔" شبانہ نے اعتماد سے پوچھا۔

"انہی لوگوں نے جنہیں آپ کے ادارے سے شکایت ہے اور وہ اس تجربے سے گذر رہے ہیں۔ کیا یہاں آپ کے ادارے میں مس سعدیہ کام کرتی ہیں؟ آپ انہیں بلوائیں۔"

"اوہ تو یہ بات ہے۔" شبانہ نے ساری بات سمجھتے ہوئے کہا۔ پھر انٹر کام پر سعدیہ کو بلوالیا۔

"صرف یہی نہیں، معلوم ہوا ہے آپ کے تعلقات بیرون ممالک کی کچھ تنظیموں سے ہیں۔ جو بظاہر شدت پسند نہیں لیکن ان سے تعلقات کیشواہد ملتے ہیں۔ ظاہر ہے ہمیں آپ پر اس معاملے میں بھی نظر رکھنا ہوگی۔" دوسری خاتون نے کہا۔ تب تک سعدیہ کمرے میں آ چکی تھی۔ شبانہ نے ان کی آمد کے بارے میں بتایا اور کہا۔

"یہ لوگ تم سے ملنا چاہ رہے تھے۔"

"میں جانتی ہوں کہ انہوں نے آنا ہی تھا۔ اسی وقت کے لیے کہہ رہی تھی کہ میں کہیں ایک اچھے مقصد کے لیے نقصان کا باعث نہ بن جاؤں۔"

"جہاں تک ہمیں معلوم ہوا ہے۔ یہاں خواتین، خصوصاً لڑکیوں کا برین واش کیا جاتا ہے اور انہیں شدت پسند بنایا جا رہا ہے۔" پہلی خاتون بولی۔

"یہی تو المیہ ہے کہ ہمارے اپنے ہی ہمیں کمزور کرنے پر تلے ہوئے ہیں۔ میں پورے ہوش و حواس سے اچھی مسلمان بننا چاہتی ہوں۔ اس پر کسی کو کیا اعتراض ہے۔" سعدیہ نے سخت لہجے میں کہا۔

"آپ کے والدین کو۔" دوسری خاتون بولی۔

"یہاں میں آپ سے یہ پوچھنا چاہوں گی کہ کیا آپ میرے والدین کے بھیجنے پر یہاں آئے ہیں یا اپنا فرض نبھانے۔"

"ظاہر ہے ہم اپنا فرض نبھا رہے ہیں۔" اس نے کہا۔

"ٹھیک ہے آپ اپنا کام کریں۔ میرے دل میں جو آئے گا میں وہ کروں گی۔" یہ کہہ کر اس نے اپنا سیل فون نکالا اور نمبر پش کرنے لگی۔ پھر چند لمحے انتظار کے بعد بولی۔ "پاپا! آپ کی طرف سے بھیجے ہوئے چند لوگ یہاں پر موجود ہیں۔ کیا اس طرح آپ میرے خیالات بدل لیں گے۔" "نہیں آپ میری بات سنیں، میں اپنی جان تو دے دوں گی لیکن کسی پر حرف نہیں آنے دوں گی۔ اگر آپ مجھ سے ناتہ توڑنا چاہیں تو توڑ دیں۔ میں اگر ادارہ چھوڑ بھی دوں تو آپ کے مقاصد میں بھی استعمال نہیں ہوں گی۔ میں اگر ان سے تعلق نہیں رکھوں گی تو میرا تعلق پھر آپ سے بھی نہیں ہے۔ میں جہاں بھی رہوں گی، ٹھیک رہوں گی۔ ٹھیک ہے، میں گھر آ کر آج حتمی بات کر لیتی ہوں۔ اللہ حافظ یہ کہہ کر اس نے فون بند کر دیا۔

"میرے خیال میں آپ کو اپنے والدین کی بات مان لینی چاہیے۔ اس میں مشکلات پیدا نہیں ہوں گی۔" پہلی خاتون نے کہا تو شبانہ نے انتہائی سنجیدگی سے کہا۔

"آپ نے سعدیہ کا موقف سن لیا۔ اس سے آگے میری ذمے داری بنتی ہے۔ آپ ایک ادارہ تباہ کر دیں گے تو کیا دوسرا ادارہ نہیں بن سکے گا۔ اب سعدیہ میری ذمے داری ہے۔ اس لیے آپ جو کچھ کر سکتے ہیں کر لیں اور جو ہم کر سکتے ہیں وہ ہم کریں گے، آپ جا سکتے ہیں۔"

"آپ کے لیے مشکلات پیدا ہو سکتی ہیں۔" دوسری خاتون نے کہا۔

"دھمکی مت دیں ہم کوئی غیر قانونی کام نہیں کر رہے ہیں۔" سعدیہ نے تیزی سے کہا تو وہ تینوں اٹھ گئے۔ وہ کوئی بات کیے بغیر باہر کی جانب چل دیئے۔ وہ انہیں دیکھتی رہی۔ پھر شبانہ سے بولی۔

"شبانہ! آج تم اکاؤنٹس مجھ سے لے لو پتہ نہیں کل کیا صورت بنے۔ میں نے اسے محض دھمکی تصور کیا تھا لیکن اب پانی سر سے گذر چکا ہے۔"

"ٹھیک ہے مگر تم اکیلی نہیں ہو۔ میں تمہارے ساتھ

ہوں۔" اس نے حوصلہ دیا تو وہ مسکرا دی۔

"لیکن ایک بات شبانہ، ہم عورتیں کیا کرسکتی ہیں۔ جب معاشرے میں بگاڑ زیادہ ہو۔ اب دیکھو، یہی زرق شاہ اکیلا ہے لیکن بھرپور انداز میں کام کررہا ہے۔" سعدیہ نے کہا۔

"تم کہنا کیا چاہتی ہو؟"

"یہی کہ اس وقت مجھے ایسے ہی کسی شخص کی ضرورت ہے۔ جو نہ صرف مجھے تحفظ دے بلکہ میں جب اپنا آپ ثابت کرنا چاہوں تو قدم قدم پر میرے ساتھ ہو۔ کیونکہ ہم دونوں کا مقصد ایک ہوگا۔" وہ جوش سے بولی۔

"کیا تمہیں زرق شاہ پسند ہے۔" شبانہ نے پوچھا۔

"کوئی ایسا ہی شخص، میں نے کہا ہے۔ ویسے وہ ٹھیک ہے۔ برائی تو اس میں نہیں۔ میرے کہنے کا مقصد یہ ہے کہ جیسے ناصر جمال تین ملکوں میں بزنس کررہا ہے، میں اسی طرح میں پوری اسلامی دنیا میں اپنا کام کرنا چاہتی ہوں، خیر دیکھتے ہیں کیا ہوتا ہے۔" وہ مسکراتے ہوئے بولی اور اپنے کمرے کی جانب چل دی۔ شبانہ گہری سوچ میں ڈوب گئی۔ یہی وقت تھا جب اس نے سعدیہ کو سنبھالنا تھا۔



انسان جس طرح سوچتا ہے اگر اسی طرح ہونے لگے تو پھر بہت گڑبڑ ہوجائے۔ ایک ایسی ہستی موجود ہے، جس نے انسان کو تخلیق کیا اور وہ اس کے بارے میں پوری طرح جانتا ہے۔ حضرت علی کرم اللہ وجہہ کا مشہور قول ہے کہ میں نے اپنے ارادوں کے ٹوٹنے سے اللہ کو پایا۔ سوچنے سے، منصوبہ بندی کرلینے سے لے کر عملی اقدامات کی شروعات تک میں انسان نتائج اپنے ارادے کے مطابق بنالیتا ہے لیکن جب وہ عملی میدان میں آتا ہے، دوسری قوتیں اپنے اثرات ظاہر کرنا شروع کردیتی ہیں۔ یہیں سے کشمکش کا آغاز ہوتا ہے۔ تبھی یہ تفریق نکھر کر سامنے آتی ہے کہ باطل قوتیں کیا ہیں اور حق کیا ہے؟

زرق شاہ اپنی تمام تر منصوبہ بندی کے ساتھ عملی میدان میں اتر آیا تھا۔ اس نے اپنے مقصد کے لیے بہترین اسکرپٹ پر کام کا آغاز کیا تو بہت ساری تنقید، حیرت انگیز سوال اور نجانے کیا کچھ شروع ہوگیا۔ جس کی اُسے توقع تھی۔ اسے یہ امید بھی تھی کہ بہت سارے لوگ اس کی حوصلہ فزائی کرنے والے بھی ہوں گے۔ کچھ لوگوں کے لیے، اس کے کام کرنے کا انداز ہی حیرت انگیز تھا۔ مثال کے طور پر جب کام کے دوران جہاں بھی نماز کا وقت آجاتا، وہ سارے کام روک دیتا۔ وہ کسی سے کچھ نہیں کہتا لیکن سب کے سامنے بڑے اہتمام سے وضو کرتا اور بڑے خشوع وخضوع سے نماز پڑھنے لگتا۔ پھر اس کے بعد کام شروع ہوجاتا۔ اس میں نقصان بھی ہوتا لیکن اسے کوئی پرواہ نہیں تھی۔ بعض لوگ تو اس کا مذاق اڑاتے لیکن وہ کسی کی بھی پروا کیے بغیر اپنا کام کرتا چلا جارہا تھا۔ یہاں تک کہ اسے مایوسی گھیرنے لگی۔

ہر چینل کا اپنا مزاج ومعیار ہے۔ اس کی اپنی پالیسی ہے اور وہ اسی کے مطابق اپنے پروگرام ترتیب دیتا ہے۔ یہ حقیقت ہے کہ کسی بھی چینل کو چلانے کے لیے فنانس سب سے بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ کمرشل ازم کی اس دنیا میں بزنس فوقیت رکھتا ہے۔ اسے زیادہ سے زیادہ ناظرین چاہیے۔ اب ان سے یہ گلہ نہیں کیا سکتا کہ وہ دوسرے کی مرضی پر کیوں نہیں چلتے۔ انہیں وہی دکھانا ہے، جو وہ بہتر سمجھتے ہیں۔ وہ چاہے آپ کے مزاج ومعیار پر پورا اترے یا نہیں۔ زرق شاہ اپنا سرمایہ لے کر ہی میدان میں اترا تھا لیکن وہ جو اپنی تخلیقات بنا رہا تھا۔ بیشتر سے زیادہ نے معذرت کرلی کہ وہ ان کے مزاج و معیار کے مطابق نہیں ہے۔ اگر وہ بزنس کرنا چاہتا ہے تو ان کے حساب سے چیز دے۔

یہ حقیقت بھی اپنی جگہ موجود ہے کہ گروہی مفادات کے لیے، اگر اس گروہ سے کوئی شے مطابقت رکھتی ہے تو اسے وہ گروہ فوراً قبول کرلیتا ہے۔ چاہے اس کا معیار جیسا بھی ہو۔ دوسرے گروہ کی شے چاہے جس قدر معیاری ہو وہ قبول نہیں کی جاتی۔ زرق شاہ کے پاس کوئی گروہ نہیں تھا جس کے مخصوص مفاد کے لیے وہ کام کرتا۔ تب چاہے جیسا بھی معیار ہوتا اسے قبولیت مل جاتی۔ بزنس تو اس کے ساتھ ہونا ہی تھا۔ وہ شدت سے اپنے ہی کسی چینل کی ضرورت محسوس کرنے لگا۔ جہاں ان کے اپنے مقاصد کی بات ہوتی۔ وہ ایک بار پھر ان ہی لوگوں کی جانب پلٹنے پر مجبور ہوگیا جن کے ساتھ اس نے گفتگو وکلام کیا تھا۔ یہ ایک نیا مسئلہ تھا جو وہ لے کر گیا کہ فقط باتوں اور گفتگو سے منصوبہ بندی تو ہوسکتی ہے لیکن اس کشمکش کی دنیا میں کوئی اور سکہ چل رہا ہے۔

"بیٹا! سکہ کردار ہی کا چلتا ہے، اگر تم کمزور کردار کے ہوتے تو اب تک مایوس ہوکر بیٹھ چکے ہوتے لیکن تمہارا کردار

ہی ہے۔ جو تمہیں اپنے مقاصد کی تکمیل کے لیے کشاں کشاں لیے پھرتا ہے۔ تمہارے کردار کی مضبوطی ہی تمہیں کامیاب کرے گی۔''

یہ ایک ایسا حوصلہ تھا جس نے اسے اندر سے مطمئن کر دیا۔ اسے احساس ہو گیا کہ وہ اکیلا نہیں ہے۔ وہ لوگ جو تبدیلی کے منتظر ہیں وہ کشمکشِ دہر میں اس کے ساتھ ہیں۔ وہ پوری کوشش اور خلوص سے سرگرم ہو گیا۔ اسے تو سبق ہی یہی ملا تھا کہ ہر باطل قوت کا انکار کرنا ہے۔ چاہے وہ نفسانی خواہش کی صورت میں من کے اندر پڑی ہے یا پھر فلاح انسانیت کی راہ میں شیطانی قوتیں موجود ہیں۔ اسے یہ کوئی شکوہ نہیں تھا کہ کوئی اس کی سوچ کے مطابق کیوں نہیں چلتا۔ وہ تو اپنے طور پر فقط اتنی کوشش کرنا چاہتا تھا کہ حق کی راہ میں جو رکاوٹیں ہیں ان کی نشاندہی کر دی جائے۔ بعض اوقات فقط نشاندہی ہی درست نہیں ہوتی۔ اس کا حل بیان کرنا ہوتا ہے۔ یہی میڈیا کی ذمے داری ہے۔ کسی مسئلے کا حل ہی رہنمائی ہوتا ہے۔ اس نے اپنی پروڈکشن نہیں روکی۔ مگر اس کے ساتھ ساتھ جہاں وہ ان لوگوں سے ملتا جو کسی نہ کسی حوالے سے قوت رکھتے تھے، وہاں اپنے شوبز کے لوگوں سے گفتگو بھی رہتی۔ وہ خود کبھی بات شروع نہیں کرتا تھا۔ بلکہ حیرت اور تجسس بھرے سوالوں کے جواب میں اپنا موقف ان کے سامنے رکھ دیتا۔ کردار کی خوشبو دھیرے دھیرے پھیلنے لگی تھی۔ ہر آنے والے دن کے ساتھ اسے اپنے اردگرد لوگ مظلوم دکھائی دیتے۔ وہ خود کو قصوروار سمجھنے لگتا کہ وہ اپنا پیغام ان تک کیوں نہیں پہنچا سکا۔

ان دنوں اسے شبانہ کی وہ باتیں شدت سے یاد آتی تھیں جو وہ ملاقات میں یا فون پر کرتی تھی۔ اگرچہ انہیں اس نے اہمیت نہیں دی وہ تو اپنے ہی مقصد میں تھا لیکن ان کی حقیقت کھلی تو اسے افسوس ہونے لگتا کہ کیوں نہ ان باتوں کو راسخ کیا۔ شبانہ نے جو بیج اس کے من دھرتی پر پھینکا تھا، وہ خوشبو دینے لگا تھا۔



انسان چاہے جتنا مضبوط اور حوصلہ مند ہو، خوشی یا غمی اس پر اثر انداز ضرور ہوتی ہے۔ اس طرح کامیابی اور ناکامی یا پھر انبساط و پریشانی اپنا رنگ ضرور دکھاتی ہے۔ اگرچہ شبانہ وقار کو اللہ پر پورا بھروسہ تھا۔ تاہم حالات میں آ جانے والی اچانک تبدیلی نے اسے پریشان ضرور کیا تھا۔ اسے یہ تو احساس تھا کہ سعدیہ کے گھر والوں نے خفیہ والوں کو اگر بھیجا ہے تو اپنے تعلقات کی بناء پر محض دھمکی دی ہے۔ وہ اپنے تعلقات اور دائرہ اختیار کو ان پر ظاہر کر کے خوف زدہ کرنا چاہتے تھے لیکن سعدیہ نہیں ڈری وہ اسی طرح ادارے میں آتی رہی۔ اس نے سب سے پہلا یہ کام کیا کہ ان چینل والوں کے ساتھ رابطہ کیا جو ٹاک شو چاہتے تھے۔ سعدیہ نے اچانک یہ فیصلہ اس لیے کر لیا تھا کہ اگر اسے گھر والوں کو چھوڑنا بھی پڑا تو چھوڑ دے گی۔ اسے اپنی ذات پر بھروسہ ہے اگر وہ ہمیں خوف زدہ کرنا چاہتے ہیں تو ہم بھی کمزور نہیں۔ شبانہ اس سر پھری لڑکی کو بہت غور سے دیکھ رہی تھی۔ اس کے ایک ایک عمل کا مشاہدہ کرتی چلی گئی تھی۔ اسے کبھی کبھی لگتا کہ وہ خود تو تحمل اور برداشت کر لیتی ہے لیکن اس کے اندر جو شعلہ جوالہ بننے کو تیار شبانہ موجود ہے۔ اس کا سارا عکس اب سعدیہ بنتی چلی جا رہی ہے۔ اس نے اپنے والدین کو کہہ دیا تھا کہ وہ اپنی دنیا آپ پیدا کر سکتی ہے۔

ذہنی پریشانی انسان کے کام میں رکاوٹ ضرور ڈالتی ہے۔ یہاں تک کہ پوری یکسوئی حاصل نہیں ہو سکتی۔ شبانہ کا کام بھی متاثر ہو رہا تھا۔ ظاہر ہے دھمکی کے ردعمل میں اسے اپنے آپ کو اور اپنے ادارے کے تحفظ کے لیے کچھ نہ کچھ تو کرنا ہی تھا۔ اس نے مقدور بھر اپنے تعلقات کو آزمایا۔ ان تک رسائی حاصل کی۔ وہ لوگ جن سے وہ حوصلہ پاتی تھی انہیں بتایا۔ اس کی ابتداء اس نے اپنے ابا وقار الدین سے کی تھی۔ یہ سلسلہ چل رہا تھا۔ اس کا کوئی حتمی نتیجہ سامنے نہیں آیا تھا۔

اس دن وہ آفس جانے کے لیے تیار ہو رہی تھی کہ ملازمہ نے حضرت صاحب کے آنے کے بارے میں بتایا۔ ان کی غیر متوقع آمد سے وہ حیران ہو گئی۔ یوں اچانک صبح صبح آنا کسی خاص مقصد کے لیے ہی ہو سکتا تھا۔ وہ جلدی جلدی تیار ہو کر ڈرائنگ روم میں پہنچی تو وہاں حضرت صاحب کے ساتھ ان کی بیگم بھی تھیں جن کے پاس شبانہ نے تعلیم و تربیت حاصل کی تھی۔ وہیں وقار الدین اور بڑی سی چادر میں ملبوس اس کی امی بھی موجود تھیں۔ ایک جانب طارق بیٹھا ہوا تھا۔ وہ ان سے ملی اور ایک طرف ہو کر بیٹھ گئی۔ اس کے آنے سے پہلے یقیناً ان میں کوئی بات چل رہی تھی۔ اس کے بیٹھتے ہی حضرت صاحب نے شبانہ سے پوچھا۔

''کیسا چل رہا ہے تمہارا ادارہ؟''

''جی الحمدللہ آپ کی دعائیں ہیں۔ ممکن حد تک کوشش کر

رہی ہوں۔" وہ ادب سے بولی۔
"سنا ہے کچھ لوگ تمہیں خوف زدہ کرنا چاہتے ہیں۔" انہوں نے پوچھا۔
"جی ایسے معاملات میں امتحان تو درپیش ہوتا ہی ہے۔ رکاوٹیں آتی ہیں۔" یہ کہتے ہوئے اس نے انتہائی اختصار سے سعدیہ کے بارے میں بتایا جیسے وجہ تنازع بنایا جا رہا تھا۔ یہ سب سن کر وہ بولے۔
"ٹھیک، یہ تو ایک وجہ ہو سکتی ہے۔ کوئی اور معاملہ۔"
"میرے خیال میں نہیں ہے۔" اس نے سوچتے ہوئے کہا۔
"تمہارا کام کس نہج پر ہے۔" انہوں نے کریدا۔
"دراصل میں میڈیا کے ذریعے اپنا پیغام لوگوں تک پہنچانا چاہتی ہوں۔ میں نے مختلف سروے اور تحقیق کی ہیں۔ ان میں آج کی نوجوان نسل پڑھنے سے زیادہ دیکھنے کو پسند کرتی ہے لیکن ایک خاص وقت کے بعد وہ پڑھنے کی طرف لوٹ رہے ہیں اور یہ عمل تجسس و تحقیق کے جذبے کے تحت ہوتا ہے۔"
"اپنی اس بات کے حق میں کوئی دلیل ہے۔" انہوں نے تحمل سے پوچھا۔
"جی، جب الیکٹرونک میڈیا نہیں تھا۔ اس وقت اخبارات کی تعداد کتنی تھی۔ میگزین کتنے تھے۔ کتابوں کی کتنی تعداد چھپتی تھی اور ان میں موضوعاتی وسعت کیا تھی۔ کہا یہ جا رہا تھا کہ الیکٹرونک میڈیا آجانے سے پرنٹ میڈیا متاثر ہوگا لیکن ایسا نہیں ہوا۔ اب آپ خود اندازہ لگا سکتے ہیں کہ صورت حال کیا ہے۔" اس نے بتایا۔
"کیا تم اس سے مطمئن ہو؟" انہوں نے پوچھا۔
"نہیں، کیونکہ جو دکھایا جا رہا ہے اور جو زمینی حقائق ہیں، ان میں بہت فرق ہے۔ جب نوجوان تحقیق کے لیے کتابی دنیا کی جانب پلٹتا ہے تو وہاں ایک نئی دنیا اس کی منتظر ہوتی ہے۔ مطابقت نہیں ہے تو الجھن بڑھتی ہے۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ انتہائی موثر انداز میں اس مطابقت کو قائم کیا جائے۔" اس نے ادب بھرے لہجے میں بتایا۔
"مطلب تم الیکٹرونک میڈیا کو ترجیح دے رہی ہو۔" وہ بولے۔
"جی، کیونکہ اسی ظلمت میں روشنی پہنچانا ہمارا فرض ہے۔" اس نے کہا۔
"کیا تم سمجھتی ہو کہ آج کا میڈیا تمہیں کہیں نہ کہیں جگہ دے گا۔"
"نہیں، بہت کم مواقع ہیں۔ اس میں بھی ہم پوری طرح اپنی بات نہیں کہہ پائیں گے۔ میں نے کوشش کر دیکھی ہے۔" اس نے صاف انداز میں کہا۔
"پھر......کیا ہوگا؟" انہوں نے پوچھا۔
"میں خود ایک چینل کے لیے کوشش کر رہی ہوں۔ ظاہر ہے میرے پاس اتنے وسائل نہیں ہیں۔ میں نے دنیا بھر کی مختلف خواتین کی تنظیموں سے رابطے کیے ہیں۔ وہاں سے مجھے امید بھی ہے۔ ظاہر ہے ہمارے ملک میں اس کی سہولیات نہیں ہیں۔" اس نے کہا تو حضرت صاحب کی بیگم بولیں۔
"مجھے خوشی ہوئی ہے بیٹی کہ تم اپنے مقصد کے لیے پوری محنت کر رہی ہو۔ تم حوصلہ رکھنا۔ ہماری تمام تر نیک تمنائیں تمہارے ساتھ ہیں۔ بدلتے ہوئے حالات کے مطابق انسان کو کچھ فیصلے ایسے بھی کرنا پڑتے ہیں جنہیں فوری طور پر سوچا نہیں ہوتا۔ آنے والے دنوں میں تمہاری ذمے داریاں بڑھتی چلی جائیں گی۔ ان سے تمہیں نبرد آزما بھی ہونا ہے تم چار دیواری میں بیٹھ کر دستیاب سہولتوں کے ذریعے دنیا بھر سے رابطہ کیے ہوئے ہو۔ مجھے یہ بتاؤ، اگر کسی ملک کا سفر کرنا پڑے تو کیا تمہیں محرم کی ضرورت نہیں ہوگی؟" انہوں نے اپنی بات ایک سوال پر چھوڑ دی۔
"جی، بلاشبہ ہوگی۔" وہ ہولے سے بولی۔
"تو بیٹی، وقت آگیا ہے ہم تمہیں ازدواجی زندگی دے دیں۔ تاکہ تمہیں تحفظ ہو اور تمہارے مقصد میں مضبوطی آئے، کیا خیال ہے؟" انہوں نے پوچھا جبکہ باقی سب خاموشی سے سن رہے تھے۔
"آپ سب میرے بارے میں بہتر فیصلہ کر سکتے ہیں اور آپ کا فیصلہ مجھے دل سے قبول ہوگا۔"
"الحمدللہ! ہم تم سے کسی ایسی ہی بات کی توقع کر رہے تھے۔" حضرت صاحب کی بیگم نے خوشی سے بھرپور لہجے میں کہا۔
"یہ آپ ہی کی تربیت کا اثر ہے محترمہ۔" وقارالدین کے لہجے میں سے خوشی چھلک رہی تھی۔
"تو بیٹی! اگرچہ تمہارے لیے رشتوں کی کمی نہیں۔ بہت

سارے والدین خواہش کر رہے۔ جن کے بیٹے بڑے متقی ہیں لیکن ان میں سے ہمارے سامنے ایک بہت اچھا رشتہ موجود ہے۔ وہ تمہارے کام اور مقصد میں پوری طرح تعاون کرنے والا ہے۔ کیونکہ کچھ ایسا ہی مقصد اس کا بھی ہے۔ دونوں کا ایک مقصد بہتر نتائج کی ضمانت بن سکتا ہے۔'' حضرت صاحب نے بڑے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا تو شبانہ کا دل ایک بارگی زور سے دھڑکا۔ ایک خیال تیزی سے آکر گزر گیا۔

''کیا میں جان سکتی ہوں کہ وہ کون ہے؟'' اس نے آہستگی سے پوچھا۔

''یہ تمہارا حق ہے۔ کیونکہ زندگی بہر حال تم نے گزارنی ہے۔ ممکن ہے تمہاری اس سے اخبارات وغیرہ کے ذریعے شناسائی ہو، اس کا ماضی جیسا بھی ہے لیکن ان دنوں اس کے پاس سوائے فلاح انسانیت کے دوسرا کوئی مقصد نہیں ہے۔ اس کا نام زرق شاہ ہے۔'' حضرت صاحب نے کہا تو شبانہ جیسے بے ہوش ہوتے ہوتے بچی۔ فطری طور پر اس نے سامنے بیٹھے ہوئے طارق کو دیکھا جو حیرت انگیز نگاہوں سے حضرت صاحب کو دیکھ رہا تھا۔ وہ ایک لفظ بھی نہیں بولا تھا۔ تبھی بیگم صاحبہ بولیں۔

''اصل میں چند دن پہلے ہی اس کے بارے میں ہمیں بتایا گیا۔ وہ لوگ بھی تمہارے کام سے اچھی طرح واقف ہیں۔ پھر یہ واقعہ پیش آ گیا۔ تب بہت سارے لوگوں نے مل کر یہ فیصلہ کیا ہے کہ اس وقت دونوں کو ایک دوسرے کی ضرورت ہے۔ اب تمہارا جو فیصلہ ہوگا۔ بیٹی ہمیں منظور ہوگا۔''

''کیا مجھے دو چار دن سوچنے کے لیے دے سکتی ہیں؟''

''کیوں نہیں۔ تم اچھی طرح غور کرو، پھر اپنے فیصلے سے آگاہ کر دینا۔ ہماری طرف سے کسی بھی قسم کا ذرہ برابر بھی دباؤ نہیں ہوگا۔ تمہاری عائلی زندگی تمہارا حق ہے۔ یہاں مقصد بہت ثانوی حیثیت میں ہے۔'' انہوں نے انتہائی سنجیدگی سے کہا۔

''جی، میں بتا دوں گی۔'' اس نے ہولے سے کہا تو پھر ان کے درمیان موضوع بدل گیا۔ وہ کچھ دیر مزید بیٹھ کر چلے گئے۔

شبانہ اپنے کمرے میں بیٹھی سوچ رہی تھی۔ کیا زرق شاہ اس کی اپنی دعاؤں کا صلہ ہے یا قدرت کی جانب سے انعام کی ایک صورت؟'' اس کی شادی کہیں بھی ہو سکتی تھی لیکن اس کا سامنے آجانا، اس کے اندر پڑے عشق کا نتیجہ ہے؟ کیا اسے اپنی قسمت پر نازاں ہونا چاہیے کہ پوری زندگی میں فقط ایک فرد کے لیے اس کے ذہن میں اپنائیت بھرے جذبات عشق تک جا پہنچے تھے۔ اس نے پورے خلوص سے اس کے بارے میں سوچا تھا اور وہ اس کی دسترس میں تھا۔ انہی لمحات میں ایک خیال اس کے دماغ میں یوں دبے پاؤں آیا کہ اسے پتہ ہی نہیں چلا۔ جب وہ تن کر سامنے آ کھڑا ہوا تو وہ چونک گئی۔ وہ ایک دم سے پریشان ہو گئی۔ تبھی اس نے زرق شاہ سے ملنے کا فیصلہ کر لیا۔



زرق شاہ نے اسی پارک میں گاڑی روکی جہاں وہ آخری بار شبانہ سے ملا تھا۔ یہیں سے اسے آگہی ملی تھی۔ جس کے لیے وہ پوری جان سے لگا ہوا تھا۔ وہ گاڑی سے باہر نکلا اور اس پیڑ کی طرف دیکھا جہاں وہ شبانہ سے ملا تھا۔ تب اس کے من میں خوشگواریت پھیل گئی۔ شبانہ وہاں پہلے ہی سے موجود تھی۔ وہ تیز قدموں سے چلتا ہوا اس کے قریب جا پہنچا۔ علیک سلیک کے بعد وہ بیٹھتے ہوئے بولا۔

''مجھے خوشی ہے شبانہ کہ آپ نے مجھے بلایا، مجھ سے رابطہ کیا۔ یہ میرے لیے اعزاز سے کم نہیں۔''

''مجھے بھی آپ کے بارے میں جان کر بہت خوشی ہو رہی ہے۔'' اس نے ہولے سے کہا۔

''یہاں اس پارک میں آپ نے اگر مجھے بلوایا ہے تو اس سے میں اندازہ لگا رہا ہوں کہ آپ مجھ سے کوئی اہم بات کرنا چاہ رہی ہوں گی۔'' وہ خوشگوار لہجے میں بولا۔

''جیکیونکہ آپ کو یاد ہوگا۔ جب ہم یہاں ملے تھے۔ ہمارے درمیان بہت سنجیدہ گفتگو ہوئی تھی۔ میں سمجھتی ہوں جس کا اظہار آپ کا کردار ہے۔ اس وقت آپ نے کہا تھا کہ آپ کو مجھ سے محبت ہے۔ کیا اب بھی وہی محبت ہے؟'' شبانہ نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں پوچھا۔

''نہیں، وہ محبت نہیں، جو اس وقت تھی۔ اس وقت میرے نزدیک معیار محبت کچھ اور تھا لیکن اب میں سمجھتا ہوں کہ محبت کیا ہوتی ہے۔''

''میں یہ نہیں پوچھوں گی کہ محبت کے بارے میں آپ کا نظریہ کیا ہے۔ لیکن یہ ضرور جاننا چاہوں گی کہ آپ نے اپنی عائلی زندگی کے لیے مجھے ہی کیوں چنا؟'' اس نے سنجیدگی سے پوچھا۔

''اوہ، تو بات آپ تک جا پہنچی۔'' وہ حیرت زدہ لہجے میں

بولا۔
"مطلب؟" اس نے پوچھا۔
"اصل میں میرے والدین میری شادی کر دینا چاہتے ہیں۔ میری پسند کے بارے میں تجسس انہیں آپ تک لے گیا۔ جبکہ میں آپ تک رسائی کا حوصلہ ہی نہیں پا رہا ہوں مگر یہ حقیقت ہے کہ میں آپ سے عشق کرتا ہوں۔" وہ بولا۔
"آپ کے نزدیک عشق کیا ہے؟" اس نے پوچھا۔
"اپنے کردار سے شہادت دینے کا نام عشق ہے۔" اس نے کہا تو شبانہ چونک گئی۔
"تو پھر مجھ تک رسائی؟"
"تا کہ اگر ایسی کوئی صورت بن جائے تو میں آپ پر بھی یہ ثابت کر سکوں کہ میں نے جو حسینیت کا سبق آپ سے لیا، اس پر ثابت قدم رہتے ہوئے اپنے کردار سے شہادت دے دوں۔" وہ جذب سے بولا۔
"کیا اس کے لیے میرا ساتھ ہی ضروری ہے؟" شبانہ نے پوچھا۔
"میں سمجھا نہیں۔" وہ الجھتے ہوئے بولا۔
"مطلب اگر میرا ساتھ نہ ملے تو پھر آپ ثابت نہیں کر سکتے۔" اس نے پوچھا۔
"وہ تو میں اس راہ پر گامزن ہوں کسی کا ساتھ ہو یا نہ ہو لیکن آپ کا ساتھ مجھے مزید مضبوط کر دے گا۔" اس نے جذب سے کہا۔
"میں اب تک یہ نہیں سمجھی، کہ آپ مجھے مقدم سمجھ رہے ہیں یا اپنے مقصد کو۔ اگر دونوں میں سے کسی ایک کو چھوڑنا پڑے تو آپ کس کو ترجیح دیں گے۔" اس نے سنجیدگی سے پوچھا۔
"آپ کو۔" زرق شاہ نے فوراً کہہ دیا تو شبانہ نے من میں خوشی کی ایک لہر دوڑ گئی۔
"یعنی آپ کا مقصد آپ کے نزدیک زیادہ اہم ہے۔" اس نے پوچھا۔
"جی میں سمجھتا ہوں کہ آپ کی تمام تر روحانی نگاہ مجھ پر ہے۔ آپ سے جسمانی قربت تو دنیاوی معاملہ ہے، جبکہ میرا مقصد ہی میری شناخت ہے جو دو جہانوں میں مجھے سرخرو کرنے والا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ آپ کا قرب اگر نہ بھی ملا مگر آپ کی دعائیں میرے ساتھ ہوں گی۔" وہ جذب سے بولا۔
"شاہ صاحب! مجھے اچھا لگا آپ کے خیالات جان کر، ایک درخواست میں آپ سے کرنا چاہوں گی۔" اس نے بڑے نرم لہجے میں کہا۔
"نہ......نہ......آپ کا مقام یہ نہیں کہ آپ درخواست کریں، آپ حکم دیں، انشاءاللہ مجھے ثابت قدم پائیں گی۔"
تب شبانہ نے سعدیہ کے بارے میں تفصیل بتائی۔ وہ سکون سے سنتا رہا۔ سب کچھ کہہ دینے کے بعد وہ بولی۔
"میں چاہتی ہوں کہ آپ اس سے شادی کر لیں۔ اسے تحفظ ہی کی نہیں، اخلاقی مدد کی بھی ضرورت ہے۔ اگر وہ حالات کے ہاتھوں مجبور ہو کر انہی راہوں پر پلٹ گئی تو میری ریاضت رائیگاں جائے گی۔"
"آپ۔" اس نے پوچھا۔
"سعدیہ کی طرح کئی لڑکیاں میری منتظر ہیں۔" وہ آہستگی سے بولی۔
"جیسے آپ کا حکم۔" زرق شاہ نے سکون سے کہا۔
"اور یہ خواہش آپ حضرت صاحب سے خود کریں گے۔"
"ٹھیک ہے۔" وہ بولا۔
"اب ہمیں چلنا چاہیے۔" شبانہ نے کہا تو زرق شاہ فوراً اٹھ گیا۔ دونوں آگے پیچھے چلتے ہوئے اپنی اپنی گاڑی تک آپہنچے اور پھر وہاں سے چلے گئے۔



وہ تینوں ائیرپورٹ پر کھڑے تھے۔ شبانہ نے پہلے سعدیہ اور پھر زرق شاہ کے چہرے پر دیکھا۔ دونوں کے چہرے پر اطمینان اور سکون تھا۔ ان کی شادی ہوئے محض ایک ہفتہ ہوا تھا اور اب وہ مختلف ممالک کی ان تنظیموں سے ملنے کے لیے جا رہے تھے جنہوں نے انہیں دعوت دی تھی۔ اسی میں انہوں نے چینل کے لیے بات کرنا تھی۔ وہ دونوں باطل قوتوں کے انکار کے لیے ایک ہو چکے تھے۔ یہی وہ لمحہ تھا۔ تینوں اپنا اپنا کردار لیے شہادت دے رہے تھے کہ اصل میں عشق اور حاصلِ عشق کیا ہیں؟ شاید انہیں یہ سمجھنے کے لیے کچھ وقت چاہیے تھا کہ عشق کسی کی ذات نہیں ہوتی۔



راہ پرخار

محمد یاسین صدیق

انسان محبت میں بہت سی غلطیاں کر جاتا ہے جس کا احساس اسے بعد میں ہوتا ہے اور پھر پچھتاوے کے سوا کچھ نہیں رہتا۔
ایک ایسی ہی محبت کی داستان جس میں برسوں بعد محبوب نے پہنچاننے سے انکار کر دیا۔

"نہیں یہ نہیں ہوسکتا۔"

وہ بڑبڑائی لیکن وہ اس کے سامنے ایک ناقابل تردید ثبوت کی مانند ایک ریڑھی کے پاس کھڑا تھا۔فرح نے اسے بیس سال بعد دیکھا تھا۔وہ اپنے بیٹے کی انگلی پکڑے اس کی طرف کھنچی چلی گئی۔وہ اسے غور سے دیکھتی جارہی تھی۔اس میں بہت سی تبدیلیاں آچکی تھیں۔ایک بارتو اس نے سوچا کوئی دوسرا اس کا ہم شکل ہوگا۔آخر وہ اس کے نزدیک پہنچ گئی۔فرح نے اسے پھر غور سے دیکھا۔اس کے آدھے سے زیادہ بال سفید ہوچکے تھے،چہرہ وہی تھا،رنگ روپ،قد کاٹھ بھی وہی، لیکن وہ اس کا تو تصور بھی نہیں کرسکتی تھی کہ وہ ریڑھی لگائے ہوئے ہوگا۔جب وہ سڑک کے پار کھڑی تھی اور اب اس کی جانب بڑھ رہی تھی،تب وہ اس کی جانب دیکھ رہا تھا۔مگر جیسے جیسے وہ اس کے پاس آتی چلی گئی،وہ اپنا رخ پھیرتا چلا گیا۔

"جی فرمایئے کیا لینا ہے؟" اس نے جانی پہچانی آواز میں اجنبی سے انداز میں پوچھا،تو فرح نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا

"تم ......تم ......فاروق۔ہونا؟میں......میں ...... میں فرح شکیل......"

"بی بی!میں آپ کو نہیں جانتا اور میرا نام فاروق نہیں ہے۔"

اس نے اپنا سر جھکاتے ہوئے جواب دیا،اس کا لہجہ اور بات کرنے کا انداز اس کے جھوٹ کی چغلی کھا رہا تھا۔فرح بے یقینی سے اسے دیکھنے لگی۔وہ دوبارہ گویا ہوا۔"جی!آپ نے کیا لینا ہے؟ہر مال دس روپے کا ہے۔" اس نے ریڑھی پر رکھی اشیاء کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا تھا۔

وہ بھرے بازار میں تماشا نہیں بننا چاہتی تھی۔اس کے ساتھ اس کا دس سال کا بیٹا بھی تھا۔اس نے ریڑھی پر سے اپنے بیٹے ذیشان کی پسند کی چند اشیاء خریدیں۔اس دوران وہ غور سے اسے دیکھتی رہی۔فرح نے پیسے دیے اور چل دی۔اس کا رخ ڈاک خانہ کی گلی کی جانب تھا۔جیسے ہی وہ نظروں سے اوجھل ہوئی،ریڑھی والا اپنی ریڑھی کو دھکیل کر جلد از جلد وہاں سے جانے لگا،جیسے اس کے دوبارہ آنے کا ڈر ہو۔کالج روڈ پر وہ صرف اتوار کو ریڑھی لگایا کرتا تھا۔اس دن طلباء کی چھٹی ہوتی تھی اور اس کی اچھی خاصی سیل ہوجاتی تھی۔اس نے ادھر ادھر دیکھا،وہ عورت اسے نظر نہیں آئی،تو اس نے سکون کا سانس لیا۔اس کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا تھا۔اس نے بھی تو سوچا نہیں تھا کہ کبھی ایسا ہوگا کہ وہ یوں اچانک اس کے سامنے آکھڑی ہوگی۔وہ ریڑھی کو مزید تیزی سے دھکا لگا کر وہاں سے جانے لگا۔اسے یہ خبر نہیں تھی کہ بہت دور ایک رکشہ بہت آہستگی سے اس کی طرف بڑھ رہا تھا اور اس رکشے میں دو آنکھیں اس کا مسلسل تعاقب کررہی تھیں۔وہ تیزی سے اپنی ریڑھی کو ایک طرف لیے جارہا تھا۔اسے ساری سڑک دھندلی سی نظر آرہی تھی،اس نے آنکھوں کو صاف کیا تو علم ہوا کہ اس کی آنکھوں میں آنسو تھے۔اسے ایک دم تھکن محسوس ہونے لگی تھی۔اس نے ریڑھی کو اپنے گھر کی طرف موڑ لیا،جو وہاں سے زیادہ دور نہیں تھا۔

☆......☆......☆

فاروق انیس سال کا خوب صورت،درمیانہ قد،سانولی رنگت،چھریرے بدن کا نوجوان تھا۔انٹر کا امتحان دے کر فارغ ہوا تھا۔اس کے والد پٹواری تھے،پورا شہر جن کی عزت کرتا تھا۔اس میں وہ تمام برائیاں تھیں،جو ایسے نوجوانوں میں ہوتی ہیں۔انڈین ثقافت نے جس طرح پاکستان کے نوجوان طبقہ کو متاثر کیا ہے ان متاثرین میں سے ایک وہ بھی تھا۔ویسے انڈین



ثقافت کو تو یوں ہی بدنام کیا جاتا ہے، ہماری اپنی پاکستانی ثقافت بھی کوئی قابل فخر نہیں ہے۔ فاروق کا کام آوارہ گردی کرنا، فلمیں دیکھنا، کرکٹ کھیلنا، لڑکیوں کے پیچھے پھرنا وغیرہ تھا۔

اس صبح وہ اپنے ایک دوست سے ملنے کے لیے مارکیٹ میں گیا۔ اس کا دوست بلال ایک جنرل اسٹور میں کام کرتا تھا یہ مارکیٹ ہی خواتین کی ضروریات کے سامان کی تھی، مثلاً چوڑیاں، کپڑے، میک اپ کا سامان وغیرہ۔ فاروق اپنے دوست بلال کے اسٹور پر پہنچا۔ وہ دونوں کھڑے ادھر ادھر کی باتیں کر رہے تھے کہ چار خواتین کچھ سامان خریدنے سٹور میں داخل ہوئیں۔ بلال، فاروق کو چھوڑ کر ان کی جانب متوجہ ہو گیا۔ فاروق ان کو مول تول کرتے، مختلف اشیاء پسند کرتے دیکھتا رہا، ان میں صرف ایک ہی لڑکی تھی۔ فاروق نے اسے دیکھا، تو ساکت رہ گیا۔ اس کے سامنے ایک سحر انگیز حسن کی مالک لڑکی کھڑی تھی۔ لڑکیاں تو اس نے بہت دیکھی تھیں، لیکن یہ ان سب سے الگ تھی منفرد تھی۔ اس کا سوٹ سادہ تھا، جسم متناسب، کسی حد تک بھرے بھرے جسم کی مالک، اس کی عمر سترہ یا اٹھارہ سال ہوگی۔ وہ بھی بار بار فاروق کی طرف دیکھ رہی تھی۔ ہر بار وہ پلٹ کر دیکھتی اور جلدی سے اپنا چہرہ پھیر لیتی، ہر بار فاروق کا دل اچھل کر حلق میں آجاتا۔ خریداری کرنے کے بعد وہ دکان سے باہر آئیں۔ اس کے ساتھ ہی وہ بھی دکان سے باہر نکل آیا اور ان کے پیچھے پیچھے چلنے لگا۔ وہ چلتی تھی، تو اس کا دل ڈول ڈول جاتا تھا۔ متناسب جسمانی خدوخال کی بھی اپنی ہی کشش ہوتی ہے۔ لڑکی نے تھوڑی دیر بعد اسے مڑ کر دیکھا اور پھر سامنے دیکھ کر چلنے لگی۔ ایک بات فاروق نے محسوس کی کہ اس کے پلٹ کر دیکھنے کے بعد اس کی چال بدل گئی تھی، اب چال میں غرور تھا۔ مردوں کو بے خود کر دینے والی ادائیں تھیں۔ وہ ان کے پیچھے چلتا رہا یہاں تک کہ ان کے گھر تک جا پہنچا۔ لڑکی نے گھر میں داخل ہوتے وقت اسے مڑ کر دیکھا تھا۔ اسی وقت فاروق نے ہاتھ ہلا دیا تھا۔ وہ مسکرائی تھی۔ واپسی میں فاروق کے قدم بھاری ہو گئے تھے۔ وہ خوشی اور بے چینی محسوس کر رہا تھا اسے نہیں معلوم تھا کہ وہ بے چین زیادہ تھا یا خوش زیادہ تھا۔

فاروق اب تک لگی بندھی زندگی گزار رہا تھا۔ دوستوں سے ملنا، کرکٹ کھیلنے جانا، جی بھر کے سونا، فلمیں دیکھنا، یہ اس کی مصروفیت تھیں۔ اب ان میں ایک اور مصروفیت کا اضافہ ہو چکا تھا۔ وہ ہر روز دو مرتبہ صبح شام اس حسینہ کے گھر کا چکر ضرور لگاتا۔ آج بھی وہ وہاں سے واپس آرہا تھا کہ اسے نبیل ملا۔ نبیل اس کا کلاس فیلو تھا۔ نبیل کا گھر اس حسینہ کے گھر کی دوسری گلی میں تھا۔ نبیل نے فاروق کو دیکھتے ہی کہا۔

"میں تمہارے گھر گیا تھا اور تم میرے گھر سے آرہے ہو، خیر تو ہے۔"

فاروق نے حیرانی سے کہا۔

"کیا کہہ رہے ہو یار......! ادھر میں تو...... میں وہ ایک لڑکی کے چکر میں آیا تھا۔"

"اچھا! کون سی حسینہ ہے اور کہاں رہتی ہے؟"

فاروق نے اس کا سوال نظر انداز کر کے پوچھا۔

"یار! ایک لڑکی ہے تمہارے محلے کی، میں اس کا گھر دکھا دیتا ہوں، نام کا مجھے علم نہیں ہے۔"

نبیل یہ کہتے ہوئے اپنے گھر کی طرف چل پڑا۔

"چلو! آؤ......کون سا ہے گھر؟"

فاروق نے دور سے ہی اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

"وہ نیلے گیٹ والا گھر ہے۔"

نبیل نے گھر دیکھتے ہوئے کہا۔

"اچھا! تو تم فرح کی بات کر رہے ہو۔ ہاں! وہ ہے بھی بہت حسین...... میٹرک کا امتحان دیا ہے اس نے۔"

فاروق کے لیے یہ بڑی کامیابی تھی کہ اسے اس حسینہ کا نام معلوم ہو گیا تھا۔ اب وہ نام لے کر یاد کر سکتا تھا۔ نبیل نے اسے مزید بتایا۔

"فرح کے والد کا نام شکیل ہے، لیکن وہ ملک سے باہر ہوتے ہیں، اس کے ماموں کا نام چودھری عظیم ہے۔ وہی سرپرست ہے، وہ بڑی کرخت طبیعت کا مالک ہے۔"

فاروق کے پوچھنے پر نبیل نے مزید بتایا۔

"فرح میٹرک کی تیاری کر رہی ہے۔ ہمارے گھر سے دوسری گلی میں فائن اکیڈمی میں شام کو پڑھنے جاتی ہے۔"

وہ واپسی پر خوش خوش تھا، اس کے لیے یہ بھی اچھی بات تھی کہ وہ نبیل سے ملنے کے بہانے اس گلی کے چکر لگا سکتا تھا اور یہ بھی پتا چل گیا تھا کہ وہ فائن اکیڈمی میں جایا کرتی ہے۔

ایک شام وہ نبیل کے دروازے پر کھڑا تھا۔ اس نے ابھی تک دروازے پر دستک نہیں دی تھی۔ وہ تو وہاں بہانے سے

کھڑا تھا جیسے نبیل سے ملنے آیا ہو۔ کافی دیر گزر گئی، وہ شاید وقت سے پہلے آ گیا تھا۔ آخر اس کے من کی مراد پوری ہوئی۔ فرح دو لڑکیوں کے ساتھ اپنے گھر آنے والے موڑ پر ظاہر ہوئی۔ وہ دھڑکتے دل سے ادھر متوجہ ہو گیا۔ جیسے جیسے فرح اور اس کی سہیلیاں قریب آ رہی تھیں، فاروق کے دل کی دھڑکن بڑھتی جا رہی تھی اور جب وہ بالکل قریب آ گئی، تو اس کی دھڑکن جیسے رک ہی گئی، فرح کے چہرے پر مسکان تھی۔ یعنی وہ اسے پہچان چکی تھی۔ اس نے بالکل قریب سے گزرتے ہوئے فاروق کو آنکھوں ہی آنکھوں میں کوئی اشارہ بھی کیا تھا۔ فاروق کو ہوش تو اس وقت آیا جب وہ پاس سے گزر گئی۔ وہ فرح کے پیچھے ہو لیا تھا، وہ جانتا تھا یہ گلی آگے جا کر دوسری طرف نکل جائے گی۔ وہاں سے مین روڈ پر جانا مشکل نہ تھا۔ گلی کے موڑ کے ساتھ ہی فائن اکیڈمی تھی جس میں فرح اپنی سہیلیوں کے ساتھ داخل ہوئی۔ جب وہ اکیڈمی کے دروازے پہ پہنچا، تو اس نے فرح کو دروازے میں کھڑے پایا۔ دونوں نے ایک دوسرے کی طرف مسکرا کر دیکھا۔ اب فرح بھی فاروق سے دلچسپی لینے لگی تھی۔

پانچ دن بعد کی بات ہے۔ فاروق، اس کے والد اور والدہ سب ناشتہ کر رہے تھے، جب اس کے والد نے فاروق سے کہا۔

''آج کل کیا کرتے پھر رہے ہو؟''

''کچھ بھی نہیں۔'' فاروق نے مختصر جواب دیا۔

''وہ فلمیں دیکھنی ذرا کم کرو اور کسی اکیڈمی میں داخلہ لے کر کمپیوٹر کا کوئی کورس کر لو...... سنا ہے کہ آنے والا دور کمپیوٹر کا دور ہے۔''

''جی اچھا!''

''جتنے پیسے چاہیے ہوں، اپنی ماں سے مانگ لینا اور کسی اکیڈمی میں داخلہ لے لو۔'' فاروق کے والد عبدالجبار نے کہا تو اکیڈمی سے اسے فرح یاد آ گئی، ساتھ ہی اکیڈمی کا نام بھی یاد آ گیا۔

گلی میں لڑائی ہوئی معمولی ہاتھا پائی ہوئی تھی، تو محلے کی ساری خواتین و حضرات باہر نکل آئے، ان میں ایک فرح بھی تھی جو کہ ٹیوشن پڑھنے آئی تھی۔ وہ بھی دیگر طلبہ و طالبات کے ساتھ باہر نکل آئی تھی۔ اس لمحے کسی نے اس کا ہاتھ پکڑا اور چھوڑ دیا۔ اس نے تیزی سے پلٹ کر ہاتھ پکڑنے والے کو دیکھا، تو اس کی سانس رک گئی۔ یہ تو وہی تھا جو اس دن اسے اسٹور میں ملا تھا اور جواب گزشتہ دو ہفتوں سے اسے اپنے گھر کے سامنے سڑک پر نظر آتا تھا۔ وہی لڑکا جو پانچ دن سے اس کی اکیڈمی کے چکر لگا رہا تھا وہ کہہ رہا تھا۔

''مجھے تم سے بات کرنی ہے۔''

فرح نے ادھر ادھر دیکھا، سب جھگڑا کرنے والوں کی طرف متوجہ تھے۔ اس نے نرمی سے فاروق کے ہاتھ سے اپنا ہاتھ چھڑا لیا۔

''میرے پیچھے اکیڈمی میں آ جاؤ۔'' ناچاہتے ہوئے اس نے کہا۔

دونوں دفتر میں آ گئے، جو کہ خالی تھا سب تو باہر تھے۔

''بیٹھ جاؤ۔'' فرح نے کہا۔

وہ کرسی پر بیٹھ تو گئی، لیکن اس نے کمر کرسی سے نہیں لگائی۔ اس طرح اس کے بیٹھنے سے اس کا پوز کتنا خطرناک تھا۔ فاروق متاثر ہوئے بنا نہ رہ سکا۔

''کیا بات کرنی ہے، مجھ سے؟''

فرح نے سب کچھ جانتے ہوئے بھی اس سے پوچھا تھا۔ فاروق کو اب سمجھ نہیں آ رہی تھی وہ کیا کہے۔

''فرح! تم مجھے اچھی لگتی ہو...... بہت ہی اچھی......''

اپنا نام سن کر فرح کو حیرانی ہوئی۔

''میرا نام کیسے پتہ چلا؟''

فاروق نے اس کے سوال کو نظر انداز کر دیا اور کہا۔

''میں ادھر ٹیوشن پڑھنا چاہتا ہوں۔''

وہ کچھ دیر اسے دیکھتی رہی، سوچتی رہی، مسکرا کر اسے دیکھا۔ یہ مسکراہٹ بڑی جاندار تھی اور کہا۔

''اس کے لیے سر رضوان سے بات کر لو۔''

وہ وہاں سے اٹھی اور اندر کلاس روم میں چلی گی، فاروق وہیں بیٹھا رہا۔ ایک گھنٹے میں اس نے فائن اکیڈمی میں انگلش اسپوکن اور کمپیوٹر کلاس میں داخلہ لے لیا تھا۔ وہ خوش خوش گھر آیا۔ اندر کا موسم بدلا ہو تو ساری دنیا حسین لگنے لگی۔

اب ان کی ملاقاتیں ہونے لگیں۔ فرح نے بھی فاروق کے کہنے پر انہی کلاسوں میں داخلہ لے لیا۔ اس طرح وہ دونوں ایک گھنٹا صرف چھ دیگر طلبہ اور تین طالبات کے ساتھ ایک ساتھ گزارنے لگے۔ وقت پر لگا کر اڑنے لگا۔ وہ دونوں سب سے پہلے اکیڈمی میں آ جاتے، اس وقت صرف صفائی کرنے

والا ہوتا تھا۔ وہ دونوں انگلش اسپیکنگ کلاس روم میں بیٹھے باتیں کرتے رہتے۔ اگر صفائی والا لڑکا وہاں صفائی کرنے لگتا، تو وہ کمپیوٹر اکیڈمی میں آ جاتے۔ ایسے تنہائی کے لمحات میں وہ ایک دوسرے کے بہت قریب آ گئے۔ ان لمحات میں دونوں بہت سے نرم و گرم تجربات سے گزرے، جن کا دورانیہ بہت ہی مختصر ہوتا تھا۔ ہر وقت کسی کے آنے کا ڈر رہتا، اسی خوف نے ان کو زیادہ بہکنے نہ دیا۔ ایک حد تک ہی وہ ان مختصر لمحات سے فائدہ اٹھا سکتے تھے۔ جس دن فرح دیگر طلبہ و طالبات کے بعد آتی، اس دن فاروق اس سے ناراض رہتا، لیکن پھر لبوں کی رشوت سے وہ مان جاتا۔ ساتھی طلبا سے ان کی محبت چھپی نہ رہ سکی لیکن کسی نے ان کی مخالفت نہیں کی تھی۔ ان کو جو لیکچر ملتا اس کے ساتھ کہا جاتا کہ ایک دوسرے سے انگلش میں بات کریں، ہر روز انھیں آدھا گھنٹا اس مشق کا ملتا۔ اس دوران وہ دونوں فوراً ایک دوسرے سے گفتگو کرنے لگتے، پہلے پہل تو بہت سے لطیفے ہوئے، جب وہ آدھی بات انگلش میں اور آدھی اردو میں کرتے، مسلسل مشق سے ان کے اندر رفتہ رفتہ یہ صلاحیت آنے لگی کہ وہ انگلش میں گفتگو کرنے کے قابل ہو گئے۔ ایک ماہ کے بعد فرح کے میٹرک کا رزلٹ آ گیا اور اس نے کالج میں داخلہ لے لیا، لیکن شام کی کلاس لینے وہ اکیڈمی میں آتی رہی۔ شروع شروع میں وہ اس ڈر سے کہ ان کی کلاس کے طلبا و طالبات کو ان کی محبت کا علم نہ ہو جائے ایک دوسرے سے کم ملتے تھے یا اس بات کا خیال رکھتے تھے۔ لیکن اب کلاس روم میں اپنے سر کے علاوہ ان کو کسی سے ڈر نہیں رہا تھا۔ وہ سمجھتے تھے کہ سر رضوان صاحب کو اس کا علم نہیں تھا جب کہ حقیقت اس کے برعکس تھی انھوں نے انھیں ایک دوسرے کو کن اکھیوں سے دیکھتے ہوئے دیکھا تھا اور نظر انداز کر دیا تھا۔

لیکن ایسا ہمیشہ تو نہیں رہنا تھا۔ ان کو ملنے والی تنہائی نے انھیں ایک دوسرے کے بہت قریب تو کر دیا تھا لیکن قربت کے یہ لمحات مختصر ہوتے۔ نا آسودگی کی جلن میں جلتے ہوئے وقت گزرتا رہا اور چھ ماہ گزر گئے۔

آخر وہ دن آ گیا کہ فاروق اور فرح کو اکیڈمی سے نکال دیا گیا۔ اس دن وہ دونوں بہک ہی گئے تھے۔ دونوں ایک دوسرے سے بری طرح لپٹے ہوئے تھے کہ اکیڈمی کے چند طلبا وہاں آ گئے۔ وہ ایک دوسرے میں اتنے مگن تھے کہ ان کو آنے والے قدموں کی آواز بھی سنائی نہ دی تھی۔ طلباء نے سر رضوان کو بتایا، جس نے انھیں فوراً اکیڈمی سے دفع ہونے کا کہہ دیا تھا اور وہ دفع ہو گئے تھے۔

سر رضوان انھیں ایک حد تک برداشت کر سکتے تھے، لیکن اب جب انھوں نے اس کی اکیڈمی کا تقدس پامال کرنے کی کوشش کی، تو اس نے بہتر سمجھا انھیں اکیڈمی سے نکال دیا۔

فرح کی ایک سہیلی نادیہ نے فرح کی ماں کو اکیڈمی چھوڑنے کی وجہ صاف صاف بتا دی۔ فرح نے سارا الزام فاروق پر ڈال دیا۔

"امی! وہ میرے پیچھے پڑا ہوا ہے۔ گلی میں کھڑا ہوتا ہے۔"

فرح کی ماں نے بھی ان چھ ماہ میں درجنوں بار فاروق کو اپنے گھر کے سامنے سے گزرتے ہوئے دیکھا تھا۔ فرح اور اس کی سہیلوں کے بیانات سے فرح کی ماں کے ذہن میں یہ بات بیٹھ گئی کہ سارا قصور فاروق کا ہے۔ اس نے فرح کے اکیڈمی چھوڑنے کا سبب فاروق کو قرار دے کر اپنے بھائی چودھری عظیم سے اس کی شکایت کر دی۔

"فرح کا گھر سے نکلنا اس بدمعاش نے بند کر دیا ہے۔"

چودھری نے کہا۔

"اچھا! میں دیکھ لوں گا۔"

اس شام چودھری عظیم اکیڈمی جا پہنچا۔ سر رضوان سے ملا، وہاں جا کر اسے جو کچھ معلوم ہوا وہ غصے سے بھرا ہوا واپس گھر آیا۔ دوسرے دن اس نے عبدالجبار پٹواری کو اس کے بیٹے کی شکایت لگائی ساتھ یہ بھی بتا دیا۔

"اگر فاروق باز نہ آیا تو وہ دوسری طرح اس معاملے کو ہینڈل کرے گا۔"

پھر وہی ہوا جو ایسے کاموں میں ہوتا ہے۔ فاروق اور فرح دونوں پر پابندیاں لگ گئی۔ فاروق کا اس گلی میں جانا بند کر دیا گیا۔

☆......☆......☆

اب فاروق اس محلے میں بھی نہیں جا سکتا تھا۔ وہ اکیڈمی سے بھی بڑا بے آبرو ہو کر نکلا تھا اور اب نبیل سے بھی اس کی دوستی نہ ہونے کے برابر تھی۔ وہ چھٹی کے وقت گرلز کالج کے باہر فرح کا انتظار کرتا۔ فرح ایک رکشے پر کالج جاتی تھی اس رکشے میں کئی اور بھی طالبات اس کے ساتھ ہوتی تھیں۔ واپسی بھی اسی رکشے پر ہوتی، اس لیے اب پہلے سی ملاقات ممکن نہیں رہی تھی، کیوں کہ پہلے سے حالات بھی نہیں رہے تھے۔

کافی دنوں تک ایسا رہا فاروق کے دل میں چودھری عظیم، سر رضوان اور اپنے والد کے لیے نفرت تھی۔ اسی طرح تین ماہ گزر گئے۔

فرح نے ان تین ماہ میں بہت مرتبہ فاروق کو دیکھا تھا جو اس کے رکشے کا پیچھا کرتا، لیکن جب سڑک ان کے گھر کی طرف مڑتی تو وہ دوسری طرف پلٹ جاتا۔ کتنے حسین تھے وہ دن۔ ایسے دن ہمیشہ کیوں نہیں رہتے، وہ جانتی تھی کہ ان دونوں کی محبت عبدالجبار پٹواری اور اس کے ماموں چودھری عظیم کے درمیان لڑائی کا سبب بن جائے گی۔ اس نے دل پر پتھر رکھا ہوا تھا، وہ سمجھتی تھی یہ ہی بہتر ہے، وہ یہ بھی چاہتی تھی کہ اب فاروق بھی اسے بھول جائے، اس کے لیے سڑکوں پر دھکے نہ کھائے، اس کا ملنا اب ممکن نہیں رہا۔ وہ دیکھ رہی تھی کہ پچھلے تین ماہ سے مسلسل وہ اس کی چھٹی کے وقت کالج کے گیٹ سے کافی دور، ایک ہی جگہ کھڑا ہوتا، جب وہ رکشے میں سوار ہو جاتی، رکشہ چل پڑتا تو وہ پیچھے کافی فیصلہ رکھ کر پیچھا کرتا۔ فاروق کی پریشانی اب عروج پر تھی۔ وہ اتنا بے چین تھا کہ اسے اب زندگی میں کچھ بھی اچھا نہیں لگتا تھا، جس جگہ بھی رہتا، اکتائے ہوئے رہتا والا حال ہو گیا تھا اس کا۔ انسان کی نفسیات بھی عجیب ہوتی ہے جو حاصل نہ ہو وہی جنون بن جاتا ہے۔

اس نے چند دن قبل ہی سگریٹ پینا شروع کیا تھا۔ ابھی تک وہ سب سے چھپ کر ہی اس شوق کو پورا کر رہا تھا۔ اس کی اس عادت کا صرف چند دوستوں کو علم تھا، آج ہر کش پر اسے کھانسی آ رہی تھی، اسے بلال نے بتایا کہ آج کل دو نمبر سگریٹ بازار میں زیادہ بک رہی ہیں۔ فاروق کو بہت غصہ آیا اس کے پوچھنے پر بلال نے بتایا۔

''شہر میں سب سے بڑا سگریٹ کا ڈیلر چودھری عظیم ہے اور وہ اس دو نمبر دھندے سے مال کما رہا ہے۔ ہر دکاندار کو ایک اصل اور دو عدد دو نمبر مال کے کارٹن دیے جاتے ہیں۔''

اس وقت تو فاروق خاموش رہا، لیکن آنے والے تین چار دن میں اس نے چودھری عظیم کے بارے میں کافی معلومات اکٹھی کر لیں۔

فاروق نے پریس کلب سے رابطہ کیا، وہاں وہ اپنے والد کے دوست اختر رسول سے ملا، جو ایک دو اخبارات کا نمائندہ تھا۔ فاروق نے اسے ساری صورت حال بتائی کہ ہمارے شہر میں دو نمبر سگریٹ فروخت ہو رہے ہیں اور اس دھندے میں چودھری عظیم ملوث ہے۔ اختر رسول اس کی جذباتی باتیں سن کر مسکراتا رہا۔ وہ اسے کیا بتاتا کہ ہمارے ملک میں اکثریت ہی دو نمبر ہے، ہر شے میں ملاوٹ ہے اور عوام نے بھی اس ملاوٹ کو قبول کر لیا ہے۔ اختر رسول نے فاروق کی ساری باتیں سن کر کہا۔

''میں ایک صحافی ہوں میں خبر دے سکتا ہوں اس خبر سے کچھ ہونے والا نہیں، ہمارے نظام کو سرمایہ داروں نے جکڑا ہوا ہے یہاں قانون صرف اس کا ہے جس کے پاس پیسے ہیں یا جس کے پاس عہدہ ہے اور چودھری عظیم شہر کی طاقت ور شخصیت ہے۔ خیر تم جاؤ کل اخبارات دیکھ لینا اس میں خبر ہوگی۔''

فاروق وہاں سے اٹھ آیا۔ دوسرے دن اخبار میں خبر تھی۔

''تحصیل بھر میں دو نمبر سگریٹوں کی بھرمار، مقررہ قیمتوں سے زائد قیمتیں وصول کی جانے لگیں۔ صارفین نے اعلیٰ حکام خصوصاً صارفین کے حقوق کی تنظیموں اور ڈی سی او ز، اے سی سے اصلاح احوال کی اپیل کی ہے۔''

جن دنوں کی یہ بات ہے ان دنوں وہاڑی ایک تحصیل تھی۔ فاروق کی کوشش سے یہ خبر تو اخبارات میں لگ گئی لیکن اس کا کوئی رد عمل نہیں ہوا۔ اس کی معلومات کے مطابق کسی ڈیلر کو گرفتار تو دور کی بات ہے، تنبیہ تک نہ کی گئی۔ کئی دن انتظار کرتا رہا لیکن کچھ بھی نہیں ہوا اور اسے ماننا پڑا کہ اختر رسول سچ کہتا تھا۔ یہاں جس کی لاٹھی اس کی بھینس والا قانون ہے۔

آسمان پر بادل چھائے ہوئے تھے اور محکمہ موسمیات کے مطابق چند دن مزید مسلسل بارش کا امکان تھا۔ اس وقت ہلکی ہلکی بارش ہو رہی تھی جب وہ کھیل کر واپس آ رہے تھے۔ اس شام اس نے اپنے دوست بلال سے کہا۔

''ملاوٹ کی کسی بھی طرح حوصلہ افزائی نہیں کی جا سکتی۔ چاہیے وہ دودھ میں ہو یا کسی اور چیز میں۔ ہمیں ملاوٹ کے خلاف جہاد کرنا چاہیے اب دیکھو نا سگریٹ میں بھی ملاوٹ ہو رہی ہے ایک تو سگریٹ پہلے ہی نقصان دہ ہوتی ہے۔''

بلال کو اس موضوع سے کوئی دلچسپی نہیں تھی وہ ہوں ہاں کرتا رہا فاروق کہہ رہا تھا۔

''میں سوچتا ہوں اگر چودھری عظیم کے گودام سے ہم دو نمبر سگریٹ کے سارے کارٹن چوری کر لیں تو اس کو اچھا خاصا سبق مل جائے گا۔''

بلال اسے حیرت سے دیکھتا ہوا چلا گیا۔ فاروق رات گئے تک منصوبے بناتا رہا۔ اس نے چار دوستوں سے صبح بات کرنے کا سوچا اور سو گیا۔

دوسرے دن اس نے اپنے سب دوستوں کو ایک جگہ اکھٹے ہونے کا کہا۔

شام کو اس کی اپنے دوستوں کے ساتھ میٹنگ تھی۔ وہاں بلال نبیل پہلے سے موجود تھے۔ فاروق کے آنے کے بعد وہ سب ایک پلاٹ میں جا بیٹھے، فاروق نے بات کی ابتدا کی۔

"ہمارے شہر میں دو نمبر سگریٹ کا دھندہ عروج پر ہے اور یہ ایک ہی آدمی کر رہا ہے، جس کا نام چودھری عظیم ہے۔ جس کا گودام شہر سے دو کلو میٹر دور چونگی کے پاس ہے۔ وہاں ایک نمبر اور دو نمبر سگریٹ کے کارٹن آتے ہیں، جہاں سے سیلز مین انھیں پورے شہر میں سپلائی کرتے ہیں۔ میں نے سوچا ہے کہ ایک نیک کام کریں کہ اس کے گودام سے صفائی کر دیں شائد اس کی عقل ٹھکانے آجائے......"

نبیل نے بات کاٹ کر کہا۔

"اگر پکڑے گئے تو ہماری عقل ٹھکانے آجائے گی۔"

بلال نے فاروق کی حوصلہ افزائی کی۔

"میں تیرے ساتھ ہوں۔ ہر ملاوٹ کرنے والے کو ضرور سبق سکھانا چاہیے، عوام کی خاموشی کی وجہ سے ہی ملاوٹ کا کام عروج پر ہے۔ رہ گئی بات چوری کرتے پکڑے جانے کی تو دیکھا جائے گا۔"

فاروق نے انھیں مزید بتایا۔

"گودام میں رات کو صرف ایک چوکیدار ہوتا ہے، جہاں گودام ہے، وہاں زیادہ آبادی نہیں ہے۔ اس گودام سے تھوڑی دور ایک ہوٹل ہے جو ساری رات کھلا رہتا ہے۔ چوری کرنے میں کوئی خطرہ نہیں ہے۔"

انھوں نے فلموں میں چوری کی جو وارداتیں دیکھی تھیں، ان کے مطابق رسی، ٹارچ، اسلحہ کے نام پر ہاکی، چاقو ساتھ لے جانے کا پروگرام بنایا۔ چوری کا مال لوڈ کرنے کے لیے انہیں ایک لوڈر رکشہ کی ضرورت تھی جو بلال نے اپنے ذمہ لے لیا اور بتایا کہ اس کا پڑوسی شفقت رکشہ چلاتا ہے، وہ اسے اپنے ساتھ لے آئے گا اور اسے سب بتا بھی دے گا۔ اس طرح ان کی یہ میٹنگ برخاست ہو گئی۔ اب سب کو اتوار کی رات کا انتظار تھا۔

☆......☆......☆

اتوار کی رات بارہ بجے وہ چاروں فاروق، نبیل، بلال اور شفقت ایک رکشے میں بیٹھے گودام کی طرف جا رہے تھے۔ شفقت رکشہ ڈرائیو کر رہا تھا۔ جی ٹی روڈ پر کافی گاڑیاں آجا رہی تھیں۔ ان کی زندگی کی یہ پہلی چوری تھی اس لیے ان کے دل زور زور سے دھڑک رہے تھے، جب وہ گودام کے سامنے پہنچے تو گیٹ کو تالا لگا ہوا تھا اور چوکیدار گیٹ کے سامنے چارپائی پر سو رہا تھا۔ اس کے سرہانے سے فاروق نے چابیوں کا گچھا اٹھایا اور بڑی آہستگی سے گیٹ کھولا اور شفقت سے کہا۔

"تم اس کا خیال رکھو، اگر بیدار ہو جائے تو اسے ہاکی سے دوبارہ سلا دینا۔"

پھر بڑی آسانی سے انھوں نے گودام کے اندر جا کر تالے کھولے اور دو دو کارٹن اٹھا کر رکشے میں رکھنے شروع کر دیے۔ فاروق گیٹ بند کر رہا تھا جب چوکیدار بیدار ہو گیا۔ ابھی فاروق تالا لگا ہی رہا تھا کہ چوکیدار گرج کر بولا۔

"کون ہو تم اور یہاں کیا کر رہے ہو؟"

فاروق یک دم پلٹا اور ہاتھ میں پکڑی ہاکی گھمائی جو کہ چوکیدار کے دونوں ہاتھوں پر لگی جو اس نے ہاکی کے حملے سے بچنے کے لیے اوپر اٹھا دیے تھے لیکن فاروق نے دوسرا وار کرنے میں دیر نہیں لگائی۔ اب اس کا وار درست لگا چوکیدار کی پسلی میں، اس نے جیسے ہی اپنی پسلی پر ہاتھ رکھے، اس وقت اس کے سر پر قیامت ٹوٹ پڑی تھی، جس سے اس کی آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا گیا اور وہ نیچے گر گیا۔ پھر فاروق پارٹی نے وہاں سے غائب ہونے میں دیر نہیں لگائی۔ وہاں سے ایک کلو میٹر آگے ملتان جی ٹی روڈ پر سڑک کنارے درختوں کے جھنڈ میں بنے ایک گڑھے میں سگریٹ کے کارٹن پھینک دیے۔ ان کے خیال کے مطابق وہاں ان کو کوئی نہیں دیکھ سکتا تھا کیوں کہ یہ گڑھا آبادی سے دور جی ٹی روڈ سے تھوڑا ہٹ کر تھا جس سے مٹی نکال کر سڑک کے کنارے ڈالی گئی تھی۔ ایسے گڑھے سڑک کنارے اکثر دیکھے جا سکتے ہیں۔

☆......☆......☆

وہ مارے طیش کے اپنے ملازمین پر برس رہا تھا اور تمام نوکر دم سادھے کھڑے تھے۔ ان کی تعداد پانچ تھی، وہ ایک دوسرے کے آگے پیچھے نظر جھکائے کھڑے تھے، نوکروں کے لتے لینے والا بلند آواز سے ان کو نکما، کام چور کہہ رہا تھا ایک بات

وہ بار بار دہرا رہا تھا۔

"یہ کیسے ہو گیا...... یہ کس نے کیا...... اتنی جرات کس نے کی۔"

اس کے مخاطب وہ پانچ ملازم تھے، دھاڑنے والے کا سر آدھا سے زیادہ گنجا، عمر پچاس سال، قد درمیانہ، دبلا پتلا مگر صحت مند جسم کا مالک تھا۔ اس وقت اس کی چھوٹی چھوٹی آنکھوں سے غصے کی چنگاریاں نکل رہی تھیں اس کا نام چودھری عظیم تھا۔ جس کے غصے کو دیکھ کر ملازم تھر تھر کانپ رہے تھے۔

"تم کام چور ہو، اپنی ذمہ داری پوری نہیں کرتے، میں تم سب کو جیل میں بھیج دوں گا۔"

یہ کہتے ہوئے وہ ٹیلی فون کی طرف بڑھا، رابطہ ہونے پر اس نے سلام دعا کے بعد اپنے گودام میں ہونے والی چوری کی بابت بتایا اور کہا۔

"آپ فوراً آجائیں ملازم سب میں نے جمع کیے ہیں، انہیں لے جائیں۔ ان میں سے ہی کسی نے حرام زدگی کی ہے۔"

یہ کہہ کر اس نے فون رکھ دیا تھا۔ سب نوکروں کے چہرے پر پہلے حیرت پھر التجا کے رنگ آگئے۔ ان میں صرف ایک نوکر جس کا نام ریاض احمد تھا، وہ قدرے مطمئن تھا۔ اس کے اطمینان کی وجہ اس کا اپنے باس پر اعتبار تھا کہ اس کے باس کو اس پر اعتبار ہونا چاہیے، وہ ایسا نہیں کر سکتا۔ اسے چودھری عظیم کے پاس کام کرتے ہوئے دس سال ہو گئے تھے۔ وہ تب سے اس کے ساتھ کام کر رہا تھا جب چودھری عظیم نے اس کام کی ابتدا کی تھی۔ عظیم صاحب کے بزنس کو عظیم بنانے میں اس کا بہت ہاتھ تھا۔ لیکن اس کا یہ اطمینان اس وقت تک قائم رہا جب تک پولیس نہیں آگئی۔ چودھری کے کہنے پر پولیس ان سب کو جن میں ریاض بھی شامل تھا اپنے ساتھ لے گئی۔ وہاں جاتے ہی ان کی پانچ پانچ چھتروں سے آؤ بھگت ہوئی پھر ان کو حوالات میں بند کر دیا گیا۔ اس سے پہلے پولیس والوں نے ان کی تلاشی لے کر سب کچھ نکال لیا تھا اور ان اشیاء کو الگ الگ پیکٹ بنا کر مال خانہ میں جمع کروا دیا تھا۔

گزشتہ رات چودھری عظیم کے گودام سے درجنوں سگریٹ کے کارٹن جن میں دو نمبر اور ایک نمبر دونوں طرح کا مال تھا چوری ہو گئے تھے۔۔ چودھری کے خیال میں ان پانچوں میں سے کوئی ایک چوروں سے ملا ہوا تھا یا چور تھا، بے شک سب سے زیادہ ذمہ دار چوکیدار امجد تھا لیکن اسے شک پانچوں پر تھا اس لیے اس نے اپنے دوست ایس ایچ او زاہد بشیر کو فون کیا تھا جو ان ملازمین کو تھانے لے گیا تھا۔ امید تو کسی ملازم کو نہیں تھی کہ ان کے ساتھ ایسا ہو گا، لیکن ریاض کا دل سب سے زیادہ دکھا۔ ان میں چوکیدار امجد کی حالت سب سے بری تھی کیوں کہ رات چوروں نے اس کو زدوکوب بھی کیا تھا۔

☆......☆......☆

منگل کی بات ہے، وہ صبح سویرے نیوز ایجنسی جا پہنچا آج اخبارات میں ان کے کارنامے کی خبر موجود تھی اس نے چار اخبار خریدے۔ وہ اخبار بغل میں دبائے تیز تیز قدموں سے نبیل کے گھر کی طرف فرح کے بارے میں سوچتے ہوئے چل دیا۔ فرح کا گھر اور چودھری عظیم کا گھر ایک دوسرے کے قریب تھا۔ دوسری گلی میں محمد نبیل کا گھر تھا فرح شکیل کے گھر کے سامنے سے گزر کر اسے نبیل کے گھر جانا تھا۔ جب وہ فرح کے گھر کے سامنے پہنچا تو اس کے قدم آہستہ ہو گئے تھے۔ وہ شدید انتظار کر رہا تھا کہ اب دروازہ کھلا۔ اب کھلے گا۔ اور اس کے من کی مراد پوری ہو گئی۔ ایسا کچھ نہیں ہوا وہ فرح کے گھر کو دیکھتا ہوا گزرتا چلا گیا۔ محمد نبیل گھر میں نہیں تھا اس کی والدہ فاروق کو جانتی تھی اس لیے وہ گھر سے باہر آگئی فاروق کے پوچھنے پر بتانے لگی۔

"آج صبح صبح نبیل کی چاچی آئی تھی دیمے (ندیم) کے گھر والی۔"

نبیل کا چچا ندیم چودھری عظیم کے پاس سپلائی کا کام کرتا تھا وہ شہر کی مختلف دکانوں پر سگریٹ پہنچایا کرتا تھا، چودھری عظیم کا نام آیا تو فاروق دلچسپی سے سننے لگا، وہ کہہ رہی تھی۔

"دو دن قبل اتوار کی رات کو کسی نے عظیم صاحب کے گودام میں چوری کر لی تھی، اس کا لاکھوں کا سامان چوری کر لیا چودھری عظیم نے اپنے سارے ملازم تھانے دار کو بلا کر اس کے حوالے کر دیے ہیں، جن میں نبیل کا چچا دیما بھی تھا۔"

یہ سن کر فاروق پریشان ہو گیا۔ نبیل کی والدہ کہہ رہی تھی۔

"رات کو بھی ندیم گھر نہیں آیا تو ہم سب پریشان ہوئے لیکن سوچا شائد کسی ضروری کام سے کہیں گیا ہو آج صبح سویرے ریاض جو کہ دیمے کے ساتھ ہی کام کرتا ہے سیٹھ عظیم کا منشی ہے اس کی بیوی اور بیٹا آئے تھے، انہوں نے بتایا کہ دیما حوالات میں بند ہے، ریاض منشی بھی حوالات میں ہی تھا لیکن

اسے کل شام چھوڑ دیا گیا، نبیل کو جب ان سب باتوں کا پتہ چلا تو وہ تھانے گیا ہے، میں نے دیمے کے لیے ناشتہ بھیجا ہے۔ ابھی نبیل کے ابو کو بھی کال کی ہے۔" وہ وہاں سے چل دیا۔ جب وہ چودھری عظیم کے گھر کے سامنے سے گزر رہا تھا تو چودھری عظیم اپنی موٹر سائیکل اسٹارٹ کر رہا تھا اور اس کا ایک ملازم اس کے پاس کھڑا تھا۔ فاروق نہیں جانتا تھا کہ بازی پلٹ چکی ہے اور اس وقت نبیل چودھری کے گھر میں موجود ہے اور اپنے چچا کی رہائی کے بعد اس کا نام چودھری عظیم کو بتانے والا ہے۔

☆......☆......☆

اس صبح نبیل جب بیدار ہوا تو اس کے گھر میں شور برپا تھا۔ اس نے جلدی جلدی منہ ہاتھ دھویا اور صحن میں آ گیا۔ جہاں اس کی چچی، اس کی ماں اور بہنیں وغیرہ اس کے چچا ندیم عرف دیمے کی بابت باتیں کر رہی تھیں۔ اس نے ناشتہ بھی نہیں کیا اور پہلے سے تیار ناشتہ لے کر، اپنی چچی اور ماں کو حوصلہ دے کر تھانے کی طرف روانہ ہو گیا۔ خوف سے اس کی ٹانگیں کانپ رہی تھیں۔ اسے خوف تھا اگر اس کا راز کھل گیا تو وہ اپنے گھر منہ دکھانے کے قابل نہیں رہے گا، اس کا باپ تو اسے زندہ نہ چھوڑے گا اور چچا جس سے اسے بہت پیار تھا اس کو کیسے بتائے گا کہ وہ چوروں سے ملا ہوا تھا جس کا الزام اس کے چچا پر لگا اور وہ حوالات میں تھا۔ وہ ان لمحات کو کوس رہا تھا جب وہ فاروق کی باتوں میں آیا تھا اب تو وہ بری طرح پھنس چکا، وہ خود سے ہی الجھتے ہوئے تھانے جا پہنچا۔

تھانے میں اس کے محلے کے بھی چند افراد مل گئے جو ندیم سے ملنے آئے تھے۔ ان کے ساتھ وہ بھی اپنے چچا سے ملا اپنے چچا سے کوئی بات کرنے کی ہمت نہ ہوئی، اس کا دل کٹ گیا جب اس نے چاچا ندیم کو اتنی بری حالت میں حوالات میں ایسے جرم کی وجہ سے بند دیکھا جو انہوں نے کیا نہیں تھا۔ اس کے چچا نے بتایا۔

"کل سے پولیس والوں نے سونے نہیں دیا اور نہ ہی کچھ کھانے کو دیا گیا، تھوڑی تھوڑی دیر بعد ہم سے باری باری ساری رات چوری کے متعلق پوچھا جاتا رہا۔"

اسے علم ہوا کہ چودھری عظیم کے خاص ملازم منشی ریاض کو کل شام چھوڑ دیا گیا تھا۔ نبیل سے ویسے بھی وہاں کھڑا نہیں ہوا جا رہا تھا، جب ایک سپاہی نے انہیں وہاں سے جانے کا کہا تو وہ وہاں سے ہٹ گیا۔ اگر وہ خود اس چوری میں ملوث نہ ہوتا تو شائد وہ اپنے چچا سے بات کرتا۔ اسے چچا کی بے گناہی اور اپنی بے حسی پر شرم محسوس ہو رہی تھی اسے فاروق پر بھی غصہ آ رہا تھا۔

اس نے کچھ سوچا پھر اس کے قدم تیزی سے چودھری عظیم کے گھر کی طرف اٹھنے لگے۔ وہ سیدھا چودھری عظیم کے گھر پہنچا اور دروازے پر دستک دی، جواب میں اس کے نوکر ماجد نے دروازہ کھولا۔

"جا کر چودھری سے بول کہ نبیل آیا ہے ندیم عرف دیمے کا بھتیجا اور وہ اصل چور کے بارے میں بتانے آیا ہے۔"

تھوڑی دیر بعد چودھری گھر سے باہر نکل آیا تھا۔ نبیل کہہ رہا تھا۔

"آپ میرے چاچا کو رہا کروا دیں وہ بے قصور ہے میں آپ کو اس کے بارے میں بتا دوں گا جس نے آپ کے گودام میں چوری کی ہے۔"

اتنی بات سن کر چودھری نے نوکر سے کہا۔

"ڈرائنگ روم کھولو۔"

اندر بیٹھ کر نوکر کو چائے لانے کا آرڈر دینے کے بعد وہ نبیل کی طرف متوجہ ہوا۔

"ہاں بتا اس کا نام...... میں وعدہ کرتا ہوں اس میں تیرا نام نہیں آئے گا اور تمہارے چچا بھی آج ابھی رہا کروا دوں گا۔" نبیل نے کہا۔

"میں یہاں بیٹھا ہوں، آپ چچا کو رہا کروائیں، میں آپ کو سب بتا دوں گا۔"

چودھری نے اپنے نوکر ماجد کو آواز دی جو چائے کے ساتھ حاضر ہو گیا، چودھری نے بائیک نکالنے کا کہا۔

"ٹھیک ہے میں تھانے جا رہا ہوں، آدھے گھنٹے سے پہلے تمہارے چچا رہا ہو جائیں گے۔ اگر تم نے مجھے چوروں کے بارے میں نہ بتایا تو تمہیں حوالات میں بند کروا دوں گا۔"

پندرہ منٹ بعد چودھری عظیم تھانے بیٹھا ایس ایچ او سے کہہ رہا تھا۔

"آپ کا شکریہ کہ میری اتنی مدد کی۔"

اس نے جیب سے پانچ ہزار نکالے، ایس ایچ او نے جلدی سے پیسے پکڑ کر جیب میں ڈالتے ہوئے کہا۔

"یہ تو میرا فرض تھا۔"

ایک گھنٹہ کے بعد چودھری عظیم واپس آیا۔ انسان کو اپنے

حالات اس طرح مجبور کرتے ہیں کہ وہ بے وفائی کرنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ اب چودھری، نبیل سے چوروں کا پوچھ رہا تھا۔ اس نے نبیل کو یقین دلایا۔

''مجھے بس اپنا مال چاہیے، تم سب سچ بتا دو۔''

اس کے بعد نبیل نے بتایا کہ اسے خود فاروق، عبدالجبار پٹواری کے بیٹے نے بتایا ہے کہ اس نے چوری کی ہے۔ اس نے اختر رسول، بلال اور شفقت کے متعلق بھی بتا دیا۔

چودھری نے نبیل کو جانے کی اجازت دے دی۔ اس نے دیکھا نہیں تھا کہ چودھری کے چہرے پر مسکراہٹ تھی، وہ جان گیا تھا کہ نبیل سچ بول رہا ہے اور یہ بھی کہ نبیل خود بھی اس معاملے میں اتنا ہی شامل ہے جتنا کہ فاروق، اور شفقت۔ اس کی جہاں دیدہ نگاہوں سے یہ سچ چھپ نہیں سکا تھا۔ نبیل کے جانے کے بعد چودھری نے ٹیلی فون اٹھا کر اپنی گود میں رکھا اور نمبر ڈائل کرنے لگا۔

اس نے اختر رسول کو فون کیا تھا اور اسے ساری بات بتائی تھی یہ بھی کہ پٹواری کا بیٹا فاروق اس چوری میں ملوث ہے۔ اختر رسول نے کہا تھا کہ میں آپ کے پاس آ رہا ہوں۔ اس کے دو گھنٹے بعد اختر رسول چودھری عظیم سے ملنے کے بعد عبدلجبار پٹواری کے دفتر بیٹھا اسے آج کا اخبار دکھا رہا تھا جس میں چوری کی خبر صفحہ دو پر تین کالمی شائع ہوئی تھی۔

''سگریٹ ہول سیلرز کے گودام میں چوری کی واردات، نامعلوم چور گودام سے دو لاکھ مالیت کے سگریٹ لے اڑے، اس سلسلہ میں ملنے والی اطلاعات کے مطابق گزشتہ رات نامعلوم چوروں نے جی ٹی روڈ پر واقع گودام جو کہ علاقہ کی معروف سماجی شخصیت چودھری عظیم کی ملکیت ہے، سٹی پولیس نے مدعی چودھری عظیم کی اطلاع پر نامعلوم چوروں کے خلاف مقدمہ درج کر کے تفتیش شروع کر دی ہے۔''

اختر رسول جتنا چودھری عظیم کا دوست تھا اتنا ہی دوست وہ عبدالجبار پٹواری کا تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ ان کی صلح ہو جائے۔ وہ اسی کوشش میں ساری بھاگ دوڑ کر رہا تھا۔

فاروق پریشان تھا جب صبح وہ نبیل کے گھر گیا تھا، تو اسے پتہ چلا تھا کہ نبیل کا چچا بھی چودھری کا ملازم تھا اور وہ حوالات میں بند تھا۔ اسی وقت فاروق نے سوچ لیا تھا کہ کیا ہونے جا رہا ہے۔ پریشانی میں اس کے سر میں درد ہونے لگا تھا۔ اس نے سر درد کی گولیاں کھائیں اور لیٹ گیا تھا۔ نیند کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ اس کو صرف اپنے والد کا ڈر تھا کہ وہ اس کے ساتھ بہت برا سلوک کرے گا۔ کروٹ بدل بدل کر وہ تھک گیا، تو اٹھ بیٹھا۔ بلال، شفقت سے مل کر اس نے اپنے شک کا اظہار کیا کہ نبیل سب راز اگل دے گا وہ واپسی پر نبیل کے گھر گیا لیکن دروازے سے واپس پلٹ آیا۔ اس نے سوچ لیا تھا کہ اب نبیل سے الجھنے کا کوئی فائدہ نہیں، جو ہونا ہو گا دیکھا جائے گا۔ فاروق اس قدر پریشان تھا کہ اس کے پاس سے گزرنے والی دو لڑکیوں کو نہ دیکھ سکا، جو بغل میں کتابیں لیے ہوئے تھیں اور ان میں سے ایک اسے بڑی گہری نظروں سے دیکھ رہی تھی جو گلی کے موڑ تک بار بار پیچھے مڑ کر دیکھتی رہی تھی۔ اب فرح ایک گھر میں ایک میڈم کے پاس ٹیوشن پڑھنے جایا کرتی تھی۔

شام کے آٹھ بج رہے تھے۔ اختر رسول کے ڈیرے پر چودھری عظیم، ریاض، ندیم اپنے بھتیجے نبیل کے ہمراہ، عبدالجبار پٹواری اپنے بیٹے فاروق کو لیے، بلال، شفقت اور نمبردار برکت علی وغیرہ موجود تھے۔ اختر رسول نے شروع سے لے کر سب کچھ ان سب کو بتایا۔ اصل میں اختر رسول نے بھاگ دوڑ کر کے دونوں دوستوں کو سمجھا لیا تھا کہ بات کو زیادہ بڑھانا نہیں ہے۔

عبدالجبار نے صرف ایک بار اپنے بیٹے کو دیکھا اس کے بعد اپنا سر جھکا لیا۔ اختر رسول کہہ رہا تھا۔

''فاروق نے چوری کیوں کی جب کہ اس کو ضروریات زندگی کی بھی چیزیں دستیاب ہیں۔ مجھے جب چودھری عظیم نے بتایا کہ ان لڑکوں کے ساتھ آپ کا بیٹا بھی ہے تو ہم نے سوچا کہ بات آپس میں حل کر لیتے ہیں، بات پھیلے گی تو سب کی بدنامی ہے۔''

اس وقت فاروق نے بتایا کہ اس نے چوری کیوں کی تھی۔ فیصلہ یہ ہوا کہ جیسے گودام سے مال اٹھایا گیا ہے ویسے ہی وہاں پہنچا دیا جائے۔ عبدالجبار نے سب سے معافی مانگی کہ اس کا بیٹا بھی اس میں ملوث تھا۔

''میں بہت شرمندہ ہوں آپ سب سے......''

چودھری عظیم نے کہا۔

''کیسی بات کرتے ہو غلطیاں بچوں سے ہو جاتی ہیں فاروق میرا بھی تو بیٹے جیسا ہے۔''

اس دن باقی سب کی طرح بھاری قدموں سے فاروق بھی اپنے گھر لوٹ آیا تھا۔ اسے دوسری بار شکست ہوئی تھی۔ اب

اسے انتظار تھا کہ اس کے والد کب گھر آتے ہیں اور اس کی شامت آتی ہے۔اسے زیادہ انتظار نہیں کرنا پڑا جب اس کی شامت آئی۔اس کے والد نے اس کی اتنی پٹائی کی کہ آنے والے دو دن وہ سکون سے سو نہ سکا۔وہ تو اس کی والدہ نے اسے بچایا بلکہ وہ فاروق کو بچانے کی کوشش میں خود بھی مار کھاتی رہی۔ آخر عبدالجبار نے تھک کر خود ہی اسے چھوڑ دیا۔

وہ یہ ہی سمجھ رہا تھا کہ اس نے جو کیا ہے وہ درست کیا ہے۔اس نے ایک برائی کے خلاف جہاد کیا تھا۔جس کی پاداش میں اسے اپنے باپ نے بری طرح دھنک کے رکھ دیا تھا۔اسے اس بات کی اچھی طرح سمجھ آ گئی تھی کہ اس معاشرے میں تبدیلی ممکن نہیں ہے۔اس معاشرے میں برائی طاقت ور ہو چکی ہے۔اس نے سوچا صرف کہانیوں میں اور فلموں میں ہی برائی کے خلاف ہیرو دشمنوں کو شکست دے سکتا ہے۔حقیقی زندگی میں تو یہ ممکن نہیں ہے۔اس کا دل ٹوٹ گیا تھا۔اسے اپنے والد کی طرف سے پڑنے والی مار سے زیادہ دکھ اس بات کا تھا کہ اس نے ایک برائی کے خلاف آنکھیں بند نہیں کی تھیں بلکہ اسے ختم کرنے کی کوشش کی تھی۔اس پر اسے شاباش تو کیا ملتی بلکہ اسے ذلیل کیا گیا تھا۔وقت اپنی رفتار سے گزرنے لگا۔ رفتہ رفتہ فاروق کی زندگی پھر معمول کی طرف لوٹ آئی۔

چھ ماہ ہونے کو آ گئے تھے فاروق کی فرح سے ملاقات نہ ہو سکی تھی، وہ سخت بے چین تھا اب کہیں دل ہی نہیں لگتا تھا۔

ایک بار فرح نے اسے پنجابی کا شعر سنایا تھا جو کچھ ایسے تھا۔

شیشم دیاں ساتاں نے

سوہنیاں نوں کی کی کرنا دل ملیا دیا باتاں نے

اس یاد کے ساتھ ہی وہ اٹھ کھڑا ہوا۔اور برآمدے میں ٹہلنے لگا۔اس کا دل چاہتا تھا کہ وہ کوئی بندوق اٹھائے اور سیدھا فرح کے گھر گھس جائے۔اسے اپنے ساتھ بھگا کر لے جائے۔ فرح کے بارے میں سوچتے سوچتے نہ جانے کب اسے نیند آئی، دوسرے روز وہ بیدار ہوا تو اسے بخار تھا۔اس کا جسم درد کر رہا تھا اور سر میں دھماکے ہو رہے تھے۔آج بڑی ہمت کر کے فرح نے فاروق کے نام ایک مختصر سا خط لکھا، جس میں لکھا کہ ،ہم مل نہیں سکتے۔ہمارے خاندان کے لیے تباہی ہے۔میں بہت مجبور ہو کر لکھ رہی ہوں جب ہماری شادی نہیں ہو سکتی تو محبت کیوں کریں۔آپ میرا پیچھا چھوڑ دیں۔میں پہلے ہی بہت بدنام ہو چکی ہوں۔خوش رہیں۔اس کے مکمل خط میں یہ ہی باتیں تھیں۔جب وہ کالج سے باہر نکلی تو اس نے دیکھا فاروق اپنی جگہ پر موجود نہیں تھا۔انسان کو جو چیز آسانی سے مل جائے اس کی قدر نہیں کرتا۔اس نے بھی اس کی قدر نہ کی تھی شائد وہ ناراض ہو گیا ہو۔انسان مایوس بھی تو ہو جاتا ہے۔کیا وہ مجھے چھوڑ دے گا۔یہ سوچ کر تو وہ لرز گئی اس نے خط میں جدائی کا لکھا تھا اب جب وہ اسے تین دن نظر نہیں آیا تو جان پر بن آئی تھی۔

وہ نہیں جانتی تھی کہ فاروق بیمار ہے۔اس کی طبیعت کچھ سنبھلی تھی، پھر خراب ہو جاتی تھی۔اس کا سر درد کم ہونے کا نام نہیں لے رہا تھا۔سر درد کی گولیاں کھاتا تو تھوڑی دیر آرام رہتا آرام کیا درد کم ہو جاتی۔

محبت سر کو چڑھ جاتی ہے اکثر

دل میں اترتی کیوں نہیں

فاروق کی والدہ ان دنوں مسلسل اس کی دیکھ بھال کرتی رہی۔ذرا سی تکلیف پر تڑپ جاتی۔فاروق اس لیے آنکھیں بند کر کے سوتا بن جاتا کہ اس کی ماں آرام کر سکے۔اس کے والد نے پہلے تو اس کو اہمیت نہ دی لیکن جب ایک ہفتہ گزر گیا اور فاروق کے سر درد میں کمی نہیں آئی تو باپ کی محبت جاگی۔وہ اس کے پاس آیا۔

”کیا حال ہے تمہارا؟“

فاروق کی آنکھوں میں آنسو آ گئے

”پاپا سر درد کرتا ہے۔بہت درد کرتا ہے۔“

ایک گھنٹے بعد اسے دماغی ڈاکٹر کو دکھایا گیا۔اس نے چند رپورٹس لیں جو کہ نارمل تھیں یعنی اس کے دماغ میں کوئی ایسی خرابی نہیں تھی، اس کی نظر ٹسٹ کی گئی قبض کے بارے میں پوچھا گیا آخر ڈاکٹر نے سکون آور دوا دے دی۔جسے کھانے کے بعد فاروق چھ سات گھنٹے سو جاتا تھا۔دوا پابندی سے کھاتے ہوئے چوتھا دن تھا۔وہ اپنے اندر واضح تبدیلی محسوس کر رہا تھا۔یہ تبدیلی نفسیاتی بھی تھی اور جسمانی بھی۔اس کے سر درد میں کمی آ گئی تھی اور وہ خود کو فریش بھی محسوس کر رہا تھا۔ان چار دنوں میں اس نے فرح، زندگی، محبت، موت پر بہت سوچا تھا۔انسان ہے کیا؟ اس دنیا میں کیوں آیا ہے؟ انسان مر کیوں جاتا ہے؟ اتنا بے بس کیوں ہوتا ہے؟ اسے کئی سوالات کے جواب مل گئے تھے۔اللہ تعالیٰ نے قرآن پاک میں بار بار فرمایا

ہے کہ تم غور کیوں نہیں کرتے؟ غور نہ کرنے والے جانور ہیں بلکہ اس سے بھی بدتر ہیں...... فاروق مسلسل سوچ رہا تھا
انسان بچپن میں کتنا محتاج ہوتا ہے، جوانی آئی تو خود کو سورما سمجھتا ہے۔ آخر وہ بوڑھا ہو جاتا ہے اور موت کی آغوش میں جا سوتا ہے۔ فاروق نے جب اس پر سوچنا شروع کیا اپنی بے بسی پر، وہ کانپ گیا کہ کوئی انسان اس دنیا میں ہمیشہ نہیں رہ سکتا۔ ایسی سوچوں سے اس کا سر درد بڑھ جاتا۔ لیکن خود کو اس سوچ کے دھارے سے بچالینا اس کے بس میں نہیں تھا۔ اسے فرح یاد آتی تو وہ سوچنے لگتا۔ یہ معنی نہیں رکھتا کہ آپ کسی سے کتنی محبت کرتے ہیں، اس بن چین کیوں نہیں پڑتا۔ کیا محبت کے لیے ملنا ضروری ہے۔ ملنا ضروری ہے تو اسے جسمانی محبت کہا جاتا ہے، محبت کیا صرف جسمانی ملاپ کا نام ہے، تو اسے ہوس بھی کہتے ہیں۔ وہ خود الجھا تھا تو سوچیں بھی الجھ گئی تھیں۔ کوئی سرا ہاتھ نہیں آ رہا تھا اور جب کسی مسئلے کا کوئی حل نہ ملے تو نیند کہاں آتی ہے۔ وہ مسلسل جاگ رہا تھا جس وجہ سے اس کے سر میں درد رہنے لگا تھا۔ کچھ پریشانی کا بھی اثر تھا۔ ڈاکٹر بی اے خرم نے اس بات کو جان لیا تھا کہ اسے ذہنی دباؤ ہے، اس لیے اسے نیند کے لیے ادویات دی تھیں جس وجہ سے صرف 24 گھنٹے میں اس کے سر درد میں کمی آ گئی۔ کیا محبت صرف ایک لڑکی اور لڑکے کے درمیان پانچویں رشتے کا نام ہے۔ جس کو یہ معاشرہ جائز نہیں سمجھتا، اسی رشتے کو کیوں اتنی اہمیت دی جاتی ہے، اسی رشتے پر اتنی شاعری، ناول، فلمیں، ڈرامے کیوں لکھے گئے ہیں۔ یہ ناجائز رشتہ ہے۔ اس نے فرح سے لاتعلقی اختیار کرنے کا فیصلہ کیا۔ تعلق روگ بن جائے تو اسے توڑنا اچھا۔ وہ بستر سے اٹھا تو فرح کی محبت سے ہاتھ اٹھا دیا۔

☆......☆......☆

اب اس کی زندگی کا مقصد مجبوروں کے کام آنا تھا۔ اس سے جو بھی بن پڑتا وہ کسی ضرورت مند کے کام آتا۔ اس سے جو اسے ذہنی سکون ملتا اس کا کوئی مول نہیں تھا۔ اس نے نماز پابندی سے ادا کرنی شروع کر دی۔ جس لذت سے وہ آشنا ہوا یہ اس وقتی لذت سے کہیں زیادہ سکون آمیز تھی۔ ایسے ہی زندگی گزرتی چلی گئی۔ کئی تبدیلیاں آتی رہیں اب اس کے دوست بدل گئے۔ مشغلے اور شوق بدل گئے۔ اس کی زندگی میں آنے والی تبدیلیاں گھر والوں نے جلد محسوس کر لیں۔ اس کی والدہ اب مطمئن تھیں، خوش تھیں۔ کالج سے آنے کے بعد وہ زیادہ وقت مطالعے میں صرف کرتا۔ بی اے کرنے کے بعد اس نے ایم اے اردو میں کرنے کا سوچا کیوں کہ اسے ادب سے لگاؤ تھا کہ ایک دن اچانک اس کے والد کو دل کا دورہ پڑا۔ انہیں اسپتال لے جایا گیا۔ وہ جب تک ہسپتال پہنچا اس کے والد اگلی دنیا میں پہنچ گئے۔ وہ اپنے والدین کا اکلوتا تھا۔ والد کی وفات کے دو سال بعد، اس کی شادی اس کی خالہ زاد طاہرہ سے ہوگئی۔ اس کے سسرال اوکاڑہ میں رہتے تھے۔ اس کی شادی کے چند ماہ بعد اس کی والدہ بھی اس جہان فانی سے کوچ کر گئیں جیسے وہ اس کی شادی کا ہی انتظار کر رہی ہوں۔ اس کی بیوی اس کی کسی نیکی کا پھل تھی اس کی ہم خیال، ہم عمر تھی۔ اس کی تعلیم واجبی تھی والدین غریب تھے، زیادہ تعلیم نہ دلا سکے۔ طاہرہ کی سب سے زیادہ بڑی خوبی اس کی شکر گزار ہونا تھا وہ ہر بات میں اللہ کا شکر کرتی رہتی۔ چھوٹی موٹی کوئی خواہش پوری ہوتی، وہ اللہ کا شکر کرتی نہ تھکتی تھیں۔ فاروق نے ابھی تک کوئی کام شروع نہیں کیا تھا اس کے والد کی جمع پونجی کاٹی تھی سب کچھ تو اس کے نام تھا۔ ایک دن طاہرہ نے اس سے کہا۔
”آپ کوئی کام کر لیں۔“
”ہاں! میں سوچ رہا ہوں کوئی کام کر لوں مگر کون سا کام کروں...... یہ سوچ رہا ہوں۔“
فاروق جب کام کی تلاش میں نکلا تو اسے محسوس ہوا کوئی بھی کام اس کے بس کا نہیں۔ اس نے دو سال میں، بہت سے تجربات کیے اور چھ لاکھ کا نقصان اٹھایا۔ اس کا تو کوئی ایسا دوست بھی نہ تھا جس سے مشورہ کرتا اسے تنہائی کا شدت سے احساس ہوا۔ اس کے اپنے خاندان میں بہت کم گھروں میں آنا جانا تھا۔ دو پھوپیاں، ایک تایا جان، تایا جان تو گاؤں میں ہی ہوتے تھے۔ اس کے تایا زاد بھائی بھی سب زمینداری کرتے تھے۔ ایک کوٹھی نما مکان وہ تھا جس میں وہ رہ رہا تھا۔ اس کے علاوہ ایک دکان تھی اس کے والد نے جو چودھری عظیم کو کرائے پر دی ہوئی تھی۔ وہاں سے ہر ماہ دو ہزار آ جاتے تھے جن میں اب گزارا مشکل تھا۔ دوسرے دن وہ اپنی دکان پر گیا جو چودھری عظیم کے پاس تھی یہ ایک مین بازار میں سگریٹ کا ڈپو تھا اس نے چودھری عظیم سے کہا۔
”میں خود اب اپنا کام کرنا چاہتا ہوں اس لیے اس دکان کو خالی کر دیا جائے۔“
چودھری نے ایک ماہ کا وقت مانگا جو اس نے دے دیا۔ یہ

ایک ماہ اس نے کریانہ کی دکان پر گزارا، وہ اس کام کو سیکھنا چاہتا تھا۔ یہ دکان حاجی رمضان کی تھی جو اس کے والد کے دوست تھے۔ وہ بڑا حیران ہوا کہ حاجی صاحب اکثر ایسی اشیاء خرید لیتے جن کے بارے میں علم بھی ہوتا کہ وہ ملاوٹ والی ہیں۔ وہ دل لگا کر اس کام کو سمجھنے، سیکھنے لگا۔ گھر آ کر وہ سب ایک ڈائری میں لکھتا جو بعد میں اس کے کام آتا۔ اس نے دو نمبر اور ایک نمبر اشیاء کے ریٹ لکھے۔ اس نے فیصلہ کیا کہ وہ صرف ایک نمبر مال ہی دکان میں رکھے گا۔ ایک ماہ کے بعد اس نے ایک لاکھ روپے کی جو اس کی آخری پونجی تھی جسے اس کا والد اس کے لیے چھوڑ گیا تھا کریانہ کی دکان کھول لی۔ یہ ان دنوں کی بات ہے جب ایک لاکھ معنی رکھتا تھا۔

دکان پر اس کا پہلا دن تھا اس نے ایک ملازم لڑکا بھی رکھ لیا جو اسے حاجی رمضان نے ہی فراہم کر دیا تھا۔ حالاں کہ حاجی صاحب نے اسے ہر طرح کا مال رکھنے کا مشورہ دیا تھا لیکن اس نے ملاوٹ سے پاک اشیاء ہی خریدی تھیں۔ ان دنوں اس کی بیوی کی طبیعت بھی خراب تھی، وہ حاملہ تھی۔ بازار سے ناشتہ لا کر اس نے خود کیا اور اپنی بیوی کو بھی کروایا اور پڑوسن کو اس کا خیال رکھنے کا کہہ کر وہ دکان پر پہنچا۔ اس کی دکان پر آنے والے پہلے ہی گاہک نے اس کی آنکھیں کھول دیں۔ اس نے گھی خریدنا تھا۔ فاروق نے اسے دو کلو گھی دیا اور اسے جب پیسے بتائے کہ ایک سو بیس روپے تو وہ حیران ہو گیا۔ کہنے لگا۔

"تمہارا دماغ تو ٹھیک ہے اتنا مہنگا؟"

فاروق نے بتایا۔

"یہ خالص ہے ایک نمبر کمپنی کا ہے۔"

گاہک نے کہا۔

"تم کمپنی کو چھوڑو، مجھے چالیس روپے کلو والا دو۔"

"یہ خالص ہے تم اپنے بچوں کو کیوں زہر کھلانا چاہتے ہو؟"

"تم خالص کہہ کر دو نمبر دے رہے ہو اور قیمت اتنی زیادہ مانگ رہے ہو۔"

"نہیں، نہیں یہ ایک نمبر ہی ہے اور میں جھوٹ نہیں بولتا۔"

فاروق نے صفائی پیش کی۔

"جی! سب دکاندار یہی کہتے ہیں۔"

فاروق نے اسے یقین دلانے کی ہر ممکن کوشش کی کہ اسے دیا جانے والا گھی ایک نمبر ہے اور یہ کہ وہ اپنے بچوں کو دو نمبر ملاوٹ والا گھی نہ کھلائے۔ لیکن وہ گاہک کو یہ یقین نہ دلا سکا بلکہ مزید گاہک کا یقین پختہ ہوا کہ وہ جھوٹ بول رہا ہے۔ فاروق کو غصہ آ گیا۔ ان میں تو تو میں میں ہو گئی۔ گاہک تو جیسے گھر سے لڑنے کے لیے ہی آیا تھا۔ جب فاروق نے کہا۔

"اچھا جاؤ دفع ہو جاؤ اور کسی اور دکان سے جا کر 'اصلی' خرید لو۔"

گاہک نے جواب میں اسے جو کہا، وہ فاروق کے لیے ناقابل برداشت تھا۔

"اگر تم نے اصلی گھی بھی نہیں رکھا (گالی) کے لیے دکان کھولی ہے۔"

فاروق اٹھ کھڑا ہوا اور پہلے گاہک کو دھکا دے کر دکان سے نکالنے لگا۔ اس وقت تک اس کے ساتھ والے دکاندار بھی جمع ہو گئے۔ جنھوں نے بڑی مشکل سے معاملہ رفع دفع کروایا۔ ایک ہفتہ ایسے ہی گزرا سارا دن آنے والوں گاہکوں نے اس کا اتنا سر کھایا تھا کہ اس کے سر میں درد اتر آیا تھا۔ اس کی بیوی کو جب سب باتوں کا علم ہوا تو وہ پریشان ہو گئی۔ وہ سمجھ گئی کہ اس کا خاوند اس دو نمبر کی دنیا میں مس فٹ تھا۔ چاروں طرف جھوٹ کی حکمرانی ہو تو سچ تنہا رہ جاتا ہے۔ اس لیے طاہرہ نے اپنے خاوند کا دل لگانے کے لیے جب وہ گھر آتا ہنسی مذاق میں وقت گزارنے کی کوشش کرنے لگی۔

صرف ایک ماہ کے بعد اس کی دکان پر چند مخصوص گاہک رہ گئے۔ وہ سارا دن دکان پر مکھیاں مارتا۔ وہ تو شکر تھا دکان اس کی اپنی تھی اگر کرایہ دینا ہوتا تو اس کے لیے مشکل ہو جاتی۔ سارے ماہ میں صرف دو ہزار بچت آئی جو اس نے لا کر اپنی بیوی کے ہاتھ پر رکھے تو اس نے اللہ کا شکر کیا۔ اگلے ماہ اس نے ملازم لڑکے کی بھی چھٹی کروا دی کہ کام کم ہوتا تھا۔ اس دوران اس کی بیوی ہی واحد ایسی ہستی تھی جو اس کی قدر کرتی تھی۔ بازار میں تو کوئی اسے منہ نہیں لگاتا تھا۔ بلکہ اس کے منہ پر ہی اس کو طنز کا نشانہ بناتے۔ اسے سمجھ نہیں آتی تھی کہ لوگ آخر اس سے بغض کیوں رکھتے تھے۔ اسے کیا علم تھا کہ اس کا سب سے بڑا جرم اس کا سچا ہونا ہے۔ وہ کسی کی غیبت نہیں کرتا تھا۔ کسی سے نفرت نہیں کرتا تھا۔ سکھ میں تو سب ساتھی ہوتے ہیں جو دکھ میں بھی ساتھی ہوں وہ ہوتے ہیں ہم سفر، شریک زندگی، جو دکھوں میں شریک ہی نہ ہوں اس کو کیسے شریک زندگی کہا جا سکتا ہے میاں بیوی کو ایک دوسرے کا شریک حیات کہا جاتا ہے،

اس لفظ کو پوری طرح سمجھنے کی ضرورت ہے، میاں اور بیوی ایک دوسرے کے شریک زندگی ہوتے ہیں، سب سے بہترین رفیق، شریک زندگی کا مطلب شریک غم، شریک خوشی بھی ہے۔

انہی دنوں وہ حرام وحلال کے موضوع پر ایک کتاب پڑھ رہا تھا۔ اسے ایسا محسوس ہوا کہ اس کے والد کی کمائی حرام تھی تو اس نے ایک فیصلہ کر لیا۔ اس نے جب اپنی ساری جائیداد بیچ کر اللہ کے راہ میں خرچ کرنے کا اپنی بیوی طاہرہ کو بتایا تو وہ اس سے زیادہ خوش ہوئی۔

''ہمیں اپنی اولاد کی پرورش حلال کے پیسے کما کر کرنی ہے۔'' اس نے کہا۔

اس فیصلے پر عمل میں انہوں نے دیر نہیں لگائی۔

انہوں نے سب جائیداد بیچ کر اللہ کی راہ میں خرچ کر دی کیوں کہ فاروق سمجھتا تھا اس کے والد نے یہ سب کچھ بے ایمانی سے بنایا تھا۔ مکان بیچ کر اس نے ایک مدرسے کو سارے پیسے دے دیے جس سے مدرسہ کی توسیع کر لی گی اور وہ خود ایک کرائے کے مکان میں رہنے لگے۔ اپنی دکان بیچ کر اس نے سارے محلے کے غربا کو پیسے بانٹ دیے۔ اس کی دکان چودھری عظیم نے خرید لی تھی۔ ایک دو دن تو اس کے اس نیک کام کا چرچا رہا پھر سب بھول گئے۔ وہ حاجی صاحب کی دکان پر کام کرنے لگا جہاں سے اسے چار ہزار مل جایا کرتے تھے۔ جس سے گھر کا خرچ نکل آتا تھا۔ ان کے اخراجات تھے ہی کتنے۔ اس سے تقریباً تین ماہ بعد اللہ نے ان کو ایک بیٹے کی دولت سے نواز دیا، طاہرہ بچے کی پیدائش سے ایک ماہ قبل ہی اپنے ماں باپ کے پاس جا کر رہنے لگی تھی جو کہ اوکاڑہ شہر کے ایک درمیانہ درجے کے محلے میں رہتے تھے۔ بیٹے کی ولادت ہوئی تو اس کا نام عبدالجبار رکھا گیا۔ طاہرہ کی ماں جو کہ فاروق کی خالہ تھی، نے فاروق سے کہا۔

''جب تک تمہارا بھائی حبیب واپس نہیں آ جاتا تم ہمارے ساتھ ہی رہو۔ میں اکیلی یہاں کیسے رہوں گی۔ جب طاہرہ کا بھائی واپس آ جائے گا تو تم الگ مکان لے کر رہنا۔ ویسے بھی تمہارے انکل بیمار رہتے ہیں۔''

طاہرہ کا بھائی سعودیہ گیا ہوا تھا۔ فاروق نے اپنی خالہ کی بات مان لی۔

اور وہاڑی سے اپنا سامان اوکاڑہ شفٹ کر لیا ان کو ایک کمرہ دے دیا گیا۔ اب اسے کام کی تلاش ہوئی لیکن کوئی بھی معقول نوکری نہ مل سکی اسے۔ اس کی بیوی نے اسے اپنے زیور دیتے ہوئے کہا۔

''ان کو بیچ لیں اور کوئی اپنا کام کر لیں کب تک ہم امی ابو کے ساتھ رہیں گے اور بھائی کے بھیجے پیسوں سے اپنے بچوں کو پالیں گے۔''

فاروق کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

اس نے خود کو بالکل ایک ناکام انسان محسوس کیا۔ وہ کر بھی کیا سکتا تھا۔ زیور بیچ کر اس کے پاس صرف 20 ہزار تھے۔ اتنے پیسوں سے اتنی مہنگائی کے زمانے میں کون سا کام ہو سکتا تھا۔ اس کے سسرال کے بھی مالی حالات اتنے اچھے نہیں تھے کہ ان سے مانگ لیتا۔ اس نے ریڑھی پر ہر مال دس روپے کے حساب سے لگانے کا فیصلہ کیا اور چند دن بعد ریڑھی خرید کر یہ کام کرنے لگا۔ اس کا مشورہ اسے ان کے پڑوسی اکبر نے دیا تھا وہ خود بھی یہ ہی کام کرتا تھا۔ اس سے روزانہ سو یا ڈیڑھ سو روپے کی بچت آ جاتی۔ رفتہ رفتہ اسے تجربہ ہوتا چلا گیا۔ چار سال بعد طاہرہ کا بھائی حبیب وطن واپس آیا۔۔ ان چار سال میں اس نے اتنے پیسے جمع کر لیے تھے کہ ایک پلاٹ خرید سکے اب اس پر مکان تعمیر کرنا تھا۔ حبیب کی شادی کر دی گئی۔ فاروق محلے میں مکان کرائے پر لے کر اس میں شفٹ ہو گیا۔ تھوڑی تھوڑی بچت کر کے اس نے اتنے پیسے جمع کر لیے کہ اپنا مکان بنا سکے۔ بے شک کہ اس میں اس کو ایک مدت لگ گئی۔ اب اس نے اپنا مکان بنا لیا تھا یہ ایک چھوٹا سا مکان تھا صرف چار مرلے کا۔ لیکن یہ اس نے حلال کمائی سے بنایا تھا۔ جس دن وہ اس مکان میں شفٹ ہوئے اس کی بیوی کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ یہ آنسو خوشی کے تھے۔ وقت گزرتا چلا گیا۔ اس کے دو بچے تھے بڑا بیٹا عبدالجبار اب جماعت دہم کا طالب علم تھا۔ اور اس سے چھوٹی بیٹی مڈل میں تھی۔ اس کی زندگی ہنسی خوشی گزر رہی تھی۔ وہ صبح دس بجے ریڑھی پر سامان لگاتا اور شہر کے چند مخصوص بازاروں میں جایا کرتا۔ اس کی اچھی خاصی سیل ہو جاتی۔ اب اسے اس شہر میں آئے ہوئے سترہ برس گزر گئے تھے۔ پھر اس کی پرسکون زندگی میں ایک طوفان آیا، اس بابت تو اس نے سوچا بھی نہیں تھا کہ کبھی ایسا ہو سکتا ہے۔ اتوار کا دن تھا اور اس کا گذشتہ دس سال سے یہ معمول تھا کہ ہر اتوار کو وہ اپنی ریڑھی کالج روڈ پر لگایا کرتا تھا۔ اب تو وہاں اس کے بہت سے مخصوص گاہک بھی تھے لیکن جو گاہک آج آیا، اس

کا تو اس نے سوچا ہی نہیں تھا، وہ تو اس کو بھول ہی گیا تھا۔ اس گاہک کے جانے کے بعد وہ وہاں ٹھہر نہ سکا۔

فاروق گھر آ گیا اور کچھ پریشان بھی دکھائی دے رہا تھا۔ اس نے ریڑھی کھڑی کی اور سیدھا کمرے میں چلا گیا۔ طاہرہ پانی کا گلاس لیے اس کے پیچھے ہی تھی۔

”کیا ہوا پریشان لگ رہے ہو؟“

”کچھ نہیں بس دل نہیں کر رہا تھا اس لیے چلا آیا۔“

”دل کس کو کر رہا ہے؟“ طاہرہ نے شرارت سے پوچھا۔ اب بچے بڑے ہو گئے تھے، میاں بیوی کو چونچلے کرنے کا وقت کم ملتا تھا، اس لیے طاہرہ نے اسے چھیڑا تھا۔ لیکن اس نے اداسی سے کہا۔

”بیٹھ جاؤ۔“

”نہیں آپ بیٹھیں، میں چائے بنا کر لاتی ہوں۔“

یہ کہہ کر طاہرہ باہر نکل گئی۔

چند منٹ بعد طاہرہ اور فاروق چائے پی رہے تھے۔

”ہاں اب بتاؤ پریشان کیوں لگ رہے ہو؟“

طاہرہ نے اپنے خاوند کو مسکرا کر دیکھتے ہوئے کہا۔ فاروق نے ایک لمحہ سوچا اور پھر کہنے لگا۔

”میری ناکامیوں کا آغاز برسوں پہلے ہوا تھا، جب میں نے راہ پرخار میں قدم رکھا تھا......“

فاروق اسے پھر وہی کہانی سنانے لگا۔ طاہرہ، فرح کے بارے میں پہلے بھی فاروق سے کئی بار سن چکی تھی۔ وہ حیران تھی آج گھر جلد آ جانے سے فرح کا کیا تعلق ہو سکتا ہے۔ یہ ہی سوال اس نے فاروق کی بات کاٹ کر اس سے پوچھا۔ فاروق نے ساری بات طاہرہ کو بتا دی۔ وہ چہک کر بولی۔

”واہ جی واہ! آپ کو تو خوش ہونا چاہیے کہ آپ کی محبوبہ ملنے آئی تھی۔ آپ کی جگہ میں ہوتی تو اس کو ایسے نہ جانے دیتی۔“

فاروق نے اپنی بیوی کو ایسے دیکھا جیسے اس کی دماغی حالت پر شبہ ہو۔ وہ کہہ رہی تھی۔

”تم نے اس کے ساتھ اچھا نہیں کیا فاروق!“

وہ ہکا بکا اسے دیکھ کر کہنے لگا۔

”تم سوچو اب میں دو بچوں کا باپ، ایک عام سا مزدور، وہ ایک بڑے گھر کی بیٹی اور کسی گھر کی بہو، اتنے سال کے بعد ایسی حالت میں اسے کیسے مل سکتا تھا؟“

اس کے چپ ہونے پر طاہرہ نے جلدی سے کہا۔

”آپ، آپ احساس کمتری کا شکار کیوں ہیں، یہ راستہ تو ہم نے سوچ سمجھ کر چنا تھا آج محبوبہ کو دیکھا تو اپنی کم تر حیثیت کا اتنا احساس کیوں ہوا؟“

طاہرہ کے سوال پر وہ اسے شرمندگی سے اسے دیکھنے لگا۔ وہ اس کے مزید قریب ہو گئی۔

”مجھے تم پر اعتبار ہے، اب ملے تو اسے گھر لے آئیں محبت کبھی بوڑھی نہیں ہوتی۔“

طاہرہ نے خاوند کو خاموش دیکھ کر کہا۔

”اس کے ساتھ ایک دس سال کا بچہ بھی تھا، وہ شائد اس کا بیٹا ہو، وہ اس شہر میں کیا کر رہی تھی شائد اس کی شادی یہاں ہوئی ہو“۔ فاروق نے خود کلامی کے انداز میں کہا۔

”آپ سے اب کہیں اس کا سامنا ہو جائے تو اس کو گھر لے آئیں۔ میں خود بھی اسے دیکھنا چاہتی ہوں۔“

طاہرہ کی اس بات پر فاروق نے ایک طویل سانس لی اور طاہرہ کو پکڑ کر اپنے مزید قریب کر لیا۔ طاہرہ کی آنکھوں میں شوخی ناچنے لگی۔ وہ کہہ رہا تھا۔

”شاید تمہیں احساس نہ ہو کہ میں اسے کس قدر چاہتا تھا اس کے تانبے جیسے بال تھے......“

طاہرہ اس کی بات کاٹ کر کہنے لگی۔

”ہرنی جیسی یا جھیل جیسی آنکھیں تھیں، بگلے جیسی ٹانگیں، چاندی جیسے دانت......“

فاروق نے طاہرہ کے خاموش ہونے پر کہا۔

”میں اس سے بہت محبت کرتا تھا......“

طاہرہ نے اس کی پھر بات کاٹ دی اور کہا۔

”اس کی ایک مسکراہٹ پر جان وار سکتا تھا، میں اس سے شادی کر لیتا، لیکن ظالم سماج ہمارے درمیان آ گیا۔ میں دن رات اس کی یاد میں آہیں بھرتا رہا۔ پھر اس کے والدین نے اس کی شادی کہیں اور کر دی۔ قصہ ختم!“

ابھی اس نے کچھ کہنے کے لیے منہ کھولا ہی تھا کہ دروازے پر دستک ہوئی دونوں ایک دوسرے کو دیکھنے لگے۔

......☆☆☆......

فرح سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ اس طرح اچانک وہ اسے نظر آ جائے گا اور وہ بھی اس حال میں کہ ایک ریڑھی پر روزگار کما رہا ہوگا۔ وہ اس کے بہت قریب رہی تھی، یہ کیسے ممکن تھا کہ وہ اسے پہچان نہ سکے، اس نے گزرے ہوئے دن رات اسے

تصور کی آنکھ سے دیکھا تھا، اس کے بارے سوچا تھا، وہ اس سے اچانک ہی دور ہو گیا تھا، اس کے لیے یہ بات بھی بڑی حیرت انگیز تھی، وہ تو اس پر مرتا تھا، اسے بھول کیسے سکتا تھا۔ وہ جب اس سے جدا ہوا تو اس کے بعد کبھی اس کی جھلک بھی نہ دیکھ سکی۔ اسے یاد تھا کہ ان دنوں وہ کالج جا رہی تھی، فاروق اس کا روز کالج جاتے یا آتے ہوئے پیچھا کیا کرتا تھا۔ اس نے فاروق کو خط بھی لکھا تھا، لیکن اسے دینے کی نوبت نہیں آئی۔ وہ یک دم غائب ہوا تھا اور آج بیس سال بعد نظر آیا تھا۔ اس کے کھڑے ہونے کا انداز، اس کا قد، شکل صورت، رنگ روپ بالکل وہی تھا حتی کہ مانگ نکالنے کا اسٹائل بھی ویسا ہی تھا، وہ ایک لمحہ پہلے اس کی طرف دیکھ رہا تھا، لیکن جب اس نے فرح کو اپنی طرف غور سے دیکھتے پایا تو منہ پھیر لیا۔ وہ تو پاس سے گزرتی تو مرد دل تھام کر رہ جاتے تھے اور اس کے سراپا سے نظر نہ ہٹاتے تھے جب تک وہ نظروں سے دور نہ ہو جاتی تھی۔ کیا پتہ اس کے بعد خیالوں میں کتنی دیر دیکھتے ہوں گے، فاروق بھی تو اسے پہلی نظر دیکھ کر اس پر عاشق ہوا تھا۔ وہ کیسے اسے نظر انداز کر سکتا تھا، پھر اس نے فاروق کے ساتھ بہت سے رنگین لمحات گزارے تھے۔

وہ ہی آنکھیں وہ ان آنکھوں کو لاکھوں میں پہچان سکتی تھی، وہ ہی ہونٹ جنہوں نے اس کے لب و رخسار کے بوسے لیے تھے، وہ ہی پیشانی، ناک، سب وہ ہی تھا، وہ پیسے دینے کے بہانے اس کے بالکل نزدیک ہو گئی اور دیکھتے ہوئے ایک گہری سانس لی، فاروق پریشان سا اس سے دور ہو گیا تھا لیکن وہ اس کی خوشبو سونگھ چکی تھی بالکل فاروق کی مہک...... اس نے دل میں سوچا، لیکن فاروق نے اسے پہچاننے سے انکار کر دیا، اب بیچ بازار تماشا نہیں بننا چاہتی تھی اس لیے اس کی بات مان لی کہ وہ فاروق نہیں ہے اور ایک طرف جانے لگی، کالج کی دیوار ختم ہوئی تو اندر کو ایک سڑک مڑتی تھی۔ وہ اس میں داخل ہو گئی۔ یہ گلی نما سڑک آگے جا کر مین بازار سے ملتی تھی، چند قدم آگے جانے کے بعد جب اس کے پاس سے ایک رکشہ والا گزرا تو اس نے اسے روک لیا یہ چاروں طرف سے بند رکشہ تھا اس میں بیٹھ کر اس کا دیکھا جانا مشکل تھا۔ اس نے چاروں طرف دیکھا تو ڈاک خانہ والی گلی کی طرف عین موڑ پر اس نے دیکھا فاروق اپنی ریڑھی کو تیز تیز چلا کر لے جا رہا تھا۔ فرح نے سوچا۔

”مجھے لگتا ہے کہ یہ اپنے گھر جا رہا ہے۔“

وہ رکشے والے سے مخاطب ہوئی۔

”بھائی! ڈاک خانہ والی گلی میں ایک ریڑھی والا ابھی داخل ہوا ہے، اس سے کافی فاصلہ رکھ کر اس کا پیچھا کرو...... میں تمہیں جتنا تمہارا کرایہ بنا دے دوں گی، لیکن اس ریڑھی والے کو تعاقب کا علم نہیں ہونا چاہیے۔“

”مما! گھر چلتے ہیں، آپ اس کا پیچھا کیوں کرنا چاہتی ہیں؟“ اس کے بیٹے نے اس کی بات سن کر کہا۔

رکشہ والے نے اس وقت رکشہ ڈاک خانہ والی گلی میں موڑ دیا تھا۔ گلی کی دوسری نکڑ پر فاروق ریڑھی لیے جا رہا تھا۔

”بیٹا! وہ تمہارے انکل ہیں، ناراض ہیں، ہم ان کا گھر دیکھ لیں گے، پھر تمہارے پاپا کو بتائیں گے وہ انہیں منا کر لے آئیں گے۔“

اسے وہ اکیڈمی کا آخری دن یاد آ رہا تھا۔ اگر وہ فاروق کو ایک حد سے آگے نہ بڑھنے دیتی، اس کی وجہ صرف ڈر تھا، کسی کے اچانک آ جانے کا ڈر، جس نے ان کو گناہ سے بچایا ہوا تھا لیکن اس دن فاروق کو نہ جانے کیا ہو گیا تھا۔ جب فرح نے اسے خود سے دور کیا تو وہ جل رہا تھا۔ وہ اس سے ہٹ تو گیا لیکن اپنا سر جا کر دیوار پر دے مارا۔ صفائی والا لڑکا اس کمرے سے صفائی کر کے جا چکا تھا۔ اس کے باہر جاتے ہی فاروق نے فرح کو ہمیشہ کی طرح اپنی طرف کھینچ لیا تھا، جو خود بھی اس کے لیے تیار تھی، اس نے خود کو فاروق کے حوالے کر دیا۔ اسے علم تھا کہ ابھی کم از کم دس منٹ تو کوئی نہیں آنے والا۔ آج فاروق کی دست درازیاں بھی حد سے بڑھ رہی تھیں۔ فرح کی سانس پھول گئی تھی۔ جذبات کی شدت سے وہ کانپ رہی تھی۔ وہ چاہنے کے باوجود فاروق کو نہیں روک رہی تھی۔ لیکن جب فاروق نے اس کو پکڑ کر جکڑ لیا اور اس نے محسوس کیا کہ وہ اب خود بھی بہک جائے گی تو فرح نے زور لگا کر اپنے پر سے فاروق کو دور کر دیا۔ جو دور تو ہوا لیکن اس نے نا آسودگی کی آگ میں جلتے ہوئے اپنا سر دیوار پر دے مارا۔ وہ تڑپ کر اس کے پاس جا پہنچی۔

”فاروق! خود کو سنبھالو۔“

فاروق نے اسے جن آنکھوں سے دیکھا تھا، اسے اندر تک اس کی آنکھیں برساتی ہوئی محسوس ہوئیں تھوڑی دیر وہ اسے دیکھتی رہی۔۔ پھر پگھل گئی اور خود ہی فاروق سے جا لپٹی۔ وہ دونوں اتنے مدہوش ہوئے کہ انہیں قدموں کی چاپ تک سنائی

نہ دی کہ کب تین طالب علم ان کے پاس پہنچ گئے۔اس سے پہلے وہ اس بات کا خیال رکھتے تھے لیکن آج جذبات میں بہہ کر وہ ایک دوسرے میں اتنے مدہوش ہوئے کہ خیال رکھنے کا خیال نہ رہا۔اس کے بعد ان دونوں کو اکیڈمی سے نکال دیا گیا تھا۔

وہ اپنے ہم مکتبوں کو منہ دکھانے کے قابل نہیں رہے تھے۔بات کا بتنگڑ بن گیا۔ان پر آوازے کسے گئے۔یہ ان کی ملاقات کا آخری دن تھا۔اس کے بعد وہ ایک دوسرے سے مل نہ سکے تھے آج بھی ان لمحات کو یاد کر کے فرح کے چہرے پر افسردہ مسکراہٹ تھی۔اس کی شادی اس کے کزن اکمل سے آج سے بارہ برس قبل ہوئی۔اس کے سسرال اوکاڑہ میں رہتے تھے۔وہ گزشتہ بارہ برس سے اس شہر میں رہ رہی تھی لیکن اس کا فاروق سے ایک بار بھی سامنا نہیں ہوا تھا۔اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ بہت کم گھر سے نکلتی تھی۔آج ذیشان کی کتابیں کاپیاں لینے کے لیے آئی تھی، اسے کچھ اپنے لیے بھی شاپنگ کرنا تھی۔اس نے اکمل سے کہا بھی لیکن اکمل نے اس سے کہا۔

''ذیشان کو لے جاؤ میں گھر میں ہوں......ایک دن چھٹی کا ہوتا ہے، وہ بھی تم نے کام نکالے ہوتے ہیں۔'' اس نے ٹی وی کی آواز بلند کرتے ہوئے کہا۔

اس کا مطلب تھا کہ اسے اکیلی ہی بازار جانا تھا۔وہ ذیشان کو ساتھ کر آ گئی تھی۔

اب ذیشان کو بھی اپنے انکل کا پیچھا کرنے میں دلچسپی ہو گئی، وہ بھی شوق سے اس ریڑھی والے انکل کا پیچھا کرنے لگا۔جب ریڑھی اور رکشے کا فاصلہ کم ہوا تو رکشے والے نے رکشہ روک دیا اور اتر کر سامنے ایک سگریٹ کی دکان سے سگریٹ لینے چلا گیا۔جب وہ واپس آیا تو ریڑھی اور رکشے میں کافی فاصلہ پیدا ہو چکا تھا۔ایسا رکشے والے کو دو تین بار کرنا پڑا تھا کہ ایک گھر کے سامنے ریڑھی جا کر رک گئی۔فرح عجیب شش و پنج میں تھی۔وہ فاروق سے بہت سے سوال کرنا چاہتی تھی۔وہ کہاں غائب ہو گیا تھا؟ اور سب سے بڑھ کر یہ کہ وہ اس حال کو کیسے پہنچا؟ کیا اس نے شادی کر لی ہے؟ ایسے بے شمار سوال تھے۔

آگے جا کر موڑ پر فرح نے رکشہ والے کو رکنے کا کہا۔اسے کرایہ دیا۔وہاں تو بازار تھا، یہاں گھر تھا اس لیے اب اس کا تماشا بن بھی جاتا تو کوئی حرج نہیں تھی۔پہلے بھی تو ایک بار وہ تماشا بن چکی تھی۔اس نے ذیشان سے کہا۔

''ہم انکل سے مل کر چلتے ہیں۔''

''ٹھیک ہے۔'' ذیشان نے خوش ہو کر کہا۔

وہ تیز تیز قدم اٹھاتے ہوئے اس گھر کے سامنے جا پہنچے اور دھڑکتے دل کے ساتھ دستک دے ڈالی۔

دروازے کو کھٹکھٹانے پر سانولی سی عورت نے دروازہ کھولا، فرح نے اپنا نام بتایا اور کہا۔

''میں آپ سے ملنا چاہتی ہوں۔''

''ہاں......ہاں! آیئے......کیوں نہیں۔''

اس خوش بدن سانولی حسینہ نے دروازے کے ساتھ بازو بھی کھول دیے۔فرح ہکا بکا اندر داخل ہو گئی۔اسے اس طرح کے استقبال کی امید نہیں تھی۔وہ شرمندہ شرمندہ طاہرہ کے پیچھے ڈرائنگ روم میں جا پہنچی۔

''بیٹھیں فرح صاحبہ! گرم یا ٹھنڈا......ویسے ٹھنڈا ہی ٹھیک رہے گا۔''

فرح نے سر ہلا دیا، طاہرہ اندر غائب ہوئی تو فرح کو سانسیں بحال کرنے کا وقت مل گیا۔

''یہ لیجیے......!''

طاہرہ نے فرح کو ایک گلاس پکڑایا جس میں کولڈ ڈرنک تھی اور اس کے سامنے بیٹھ کر ایک ٹک فرح کو دیکھنے لگی۔جب کافی دیر گزر گئی، دونوں چپ تھیں، فرح نے آخر پوچھا۔

''فاروق صاحب سے آپ کا کیا رشتہ ہے؟''

''میں فاروق کی بیوی ہوں۔'' طاہرہ نے بتاتے ہوئے ساتھ ہی پوچھا۔''اور آپ کا؟''

فرح نے سر جھکا لیا۔محبوبہ کا رشتہ ایسا ہی ہوتا ہے کہ سر جھکا دیتا ہے۔

''میں فاروق کی کلاس فیلو تھی ہم ایک ساتھ پڑھتے تھے میری شادی......''

اس نے اتنا ہی کہا تھا کہ اس نے دیکھا ڈرائنگ روم کے اندر والے دروازے پر فاروق کھڑا تھا اس کی زبان رک گئی۔اسے پتہ ہی نہ چلا کہ وہ اٹھ کر کھڑی ہو چکی تھی۔اس کے ہونٹ لرز کر رہ گئے۔فاروق نے اسے سلام کیا۔ان دونوں کا حال ایک جیسا ہی تھا۔صرف طاہرہ مکمل حواس میں تھی وہ خاموشی سے اٹھی اور اندر چلی گئی۔وہ ذیشان کو بھی اپنے ساتھ لے گئی تھی۔

''آؤ بیٹے! تمہیں گھر دکھاؤں۔''

ذیشان نے اپنی ماں کو دیکھا تھا، لیکن وہ کہاں ہوش میں تھی، کچن میں آ کر اس نے ذیشان کو بسکٹ دیے اور بچی ہوئی چائے اور خود چائے بنانے لگی۔ وہ اس لیے بھی وہاں سے اٹھ آئی تھی کہ وہ جانتی تھی دو پیار کرتے والے بیس برس بعد ملے تھے، انھیں یہ حق تھا کہ تھوڑا وقت تنہا گزار لیں۔ اس نے چائے بنانے میں کافی دیر لگائی فاروق کے آواز دینے پر ہی وہ دوبارہ اندر گئی۔ وہ دونوں صوفوں پر بیٹھے تھے اور فرح اپنے بارے میں بتا رہی تھی۔ طاہرہ نے ان کے سامنے بسکٹ اور چائے رکھی اور خود بھی فاروق کے ساتھ بیٹھ گئی۔ ذیشان اپنی والدہ کے ساتھ بیٹھ گیا۔

فرح نے اپنی بات جاری رکھی۔

"اکمل ایک فیکٹری میں کام کرتے ہیں۔ میرے دو بچے ہیں بڑا یہ ذیشان ہے چھوٹی نمرہ ہے جو اس وقت اپنے پاپا کے ساتھ ہوگئی۔ میں بازار سے ذیشان کے لیے یہ کتابیں اور دیگر سامان لینے آئی تھی۔"

جب فرح چپ ہوگئی تو طاہرہ نے اسے بتایا کہ فاروق کے والد کی وفات کے بعد ہماری شادی ہوئی، چند برس بعد والدہ کی بھی وفات ہوگئی۔ ان دنوں میرے والد بیمار تھے اور میں امید سے بھی تھی اس لیے یہاں آگئی۔ فاروق کا خیال تھا کہ اس کے والد نے جو بھی جائیداد بنائی ہے وہ حرام کے پیسوں سے بنائی ہے اس لیے سب پراپرٹی بیچ کر اللہ کی راہ میں دے دی اور میرے والد کی وفات کے بعد وہ بھی یہاں آگئے۔ تب سے اب تک ہم یہاں ہی ہیں۔ یہ مکان اپنا بنایا ہے، اتنی آمدن ہو جاتی ہے کہ گھر چل رہا ہے، بچے پڑھ رہے ہیں۔ مزید تھوڑی دیر بیٹھ کر فرح نے اجازت چاہی۔

"میں چلتی ہوں اکمل انتظار کر رہے ہوں گے۔"

فاروق بھی اٹھ کھڑا ہوا۔ ایک دوسرے کو کہنے کے لیے ان کے پاس کچھ نہیں تھا۔ پھر بھی طاہرہ نے فرح سے کہا۔

"اپنے میاں کو کسی دن لائیے گا۔"

فرح نے کہا۔

"ہاں ان شاءاللہ ضرور۔"

طاہرہ اسے باہر تک چھوڑنے آئی۔

اس کے خاوند اکمل گھر پر ہی تھے۔ ذیشان سیدھا اکمل کے پاس جا پہنچا اور اپنے والد کا اپنے آج کے ایڈونچر کے متعلق بتانے لگا۔ فرح شاپنگ کے سامان کو رکھ کر، چائے بنانے کے بعد جب دو کپ لیے وہ اکمل کے پاس آئی جو کہ خبریں سن رہا تھا۔ فرح کو دیکھ کر کہنے لگا۔

"ہاں بھئی! کس کی جاسوسی کر کے آئی ہو...... میڈیم جیمز بانڈ!"

"میرے ابو کے ایک دوست عبدالجبار پٹواری تھے۔ سنا ہے ان کا انتقال ہو گیا تھا۔ ان کا ایک بیٹا فاروق اکیڈمی میں میرے ساتھ انگلش سپوکنگ کا ڈپلومہ کرتا رہا تھا، ان کا خاندان بہت امیر تھا، میں تو حیران رہ گئی جب میں نے آج فاروق کو ایک ریڑھی پر دیکھا۔ میں اور ذیشان اس کے پاس گئے، اس سے میں نے پوچھا کہ کیا تم فاروق ہو۔ لیکن اکمل کیا بتاؤں وہ مکر گیا۔ مجھے پہلے حیرانی ہوئی پھر پریشانی ہوئی کہ ایک کھاتے پیتے گھرانے کا فرد آج ریڑھی پر ہر مال دس روپے کے حساب سے بیچ رہا تھا۔ جب ہم ایک رکشے میں بیٹھ رہے تھے تو وہ اتنی تیزی سے وہاں سے جا رہا تھا جیسے اس کی چوری پکڑی گئی ہو۔ اس لیے میرا جو تھوڑا بہت شک تھا وہ یقین میں بدل گیا کہ یہ فاروق ہی ہے۔ اس لیے رکشہ میں بیٹھ کر ہم نے اس کا پیچھا کیا۔"

اس کے بعد فرح نے اکمل کو سب کچھ بتا دیا۔ فرح نے اکمل کو فاروق کا ماموں عظیم کے گودام سے سگریٹ چوری کرنے کا واقعہ سنایا جو اکمل نے پوری توجہ سے سنا۔ اس نے موجودہ ملاقات کا بتایا کہ اس نے اپنی ساری جائیداد بیچ کر اللہ کی راہ میں تقسیم کر دی ہے کہ اس میں حرام کی کمائی کا شائبہ تھا۔ فاروق کے اس کردار سے اکمل متاثر ہوا۔ اب ایسے لوگ کہاں پائے جاتے ہیں۔ فرح کھانا تیار کرنے کے لیے اٹھ گئی اس کا رخ کچن کی طرف تھا۔ اکمل سوچ رہا تھا اس زمانے میں بھی ایسے لوگ تھے جو ملاوٹ سے نفرت کرتے تھے۔ جو اپنے بچوں کو حلال کما کر کھلا رہے تھے۔ بے شک وہ ٹھیلے والے ہوں جن کو دنیا میں حقارت کی نظر سے دیکھا جاتا ہے۔ ایسے جو دنیا کے لیے آخرت خراب نہیں کرتے۔ اور دوسری طرف فرح کچن میں پیاز کاٹتے ہوئے اپنی ناکام محبت اور فاروق کے انجام پر آنسو بہا رہی تھی۔



لبِ بام

شاہدہ صدیقی

وہ جلد ہی تمام جائیداد اور دولت سے بھرے اسٹور کا مالک بننے جارہا تھا لیکن اس کا المیہ یہ تھا کہ وہ جلد باز تھا۔
مغربی ادب سے انتخاب ایک خوب صورت کہانی۔

وِلس پکنی اپنے نئے اسٹور پکنی پان اینڈ فائن جیولری کے عقبی حصے میں کھڑا دائیں پیر سے فرش پر دھم دھم کررہا تھا اور اس کی نظر گھڑی پر تھی۔ بیس منٹ ہو چکے تھے۔ اس کے اسٹور میں الارم بیس منٹ پہلے بجا تھا۔ لیکن پولیس ابھی تک نہیں پہنچی تھی۔

اسٹور کے اگلے حصے میں اس کی اکلوتی ملازمہ فریڈا ہیرس ایک نوجوان گاہک کو نمٹا رہی تھی۔ وِلس نے سوچا کوئی قسمت کا مارا اپنی بیوی کے خاندانی زیورات میں سے کوئی زیور گروی رکھنے آیا ہوگا۔ ابھی اسے اس کاروبار کو شروع کیے ایک ہفتہ ہی گزرا تھا لیکن وہ ابھی سے تنگ آچکا تھا۔

آخر کار ایک نیلی اور سفید اسکواڈ کار سامنے سے گزری، اس کی روشنیاں فلیش کررہی تھیں۔ ایک باوردی پولیس افسر تیزی سے اندر آیا، اس کے ساتھ ہی باہر کی برفیلی ہوا کا جھونکا اندر داخل ہونے میں کامیاب ہوگیا تھا۔ وِلس نے اپنے چہرے پر حیرت طاری کرتے ہوئے کہا۔ ''یہ مت کہنا کہ الارم پھر بج گیا۔ اس ہفتے یہ تیسری بار ہورہا ہے۔''

افسر نے ٹھنڈی سانس لی اور اپنا ریوالور واپس ہولسٹر میں ڈالتے ہوئے بولا۔ ''ہاں! ایک اور غلط الارم۔''

وِلس شانے جھٹکا کے بولا۔ ''لگتا تو یہی ہے۔ جب میں نے یہ الارم سسٹم لگایا تھا تو میرا خیال تھا کہ کہیں ہم غلطی سے اسے بند نہ کردیں۔ لیکن یہ تو الٹا ہی ہورہا ہے۔''

پولیس افسر نے خاموشی سے اپنے پیڈ پر ایک نوٹ لکھا اور کہنے لگا

''کبھی کبھی اس میں کیڑے گھس جاتے ہیں اور صفائی کرکے وہ نکالنے پڑتے ہیں، لیکن میں نے ایسا الارم کبھی نہیں دیکھا۔ تم یہ بھی چیک کرو کہ کہیں شارٹ سرکٹ تو نہیں ہورہا۔'' نوجوان افسر خاصا مہذب نظر آرہا تھا لیکن اس کا لہجہ بتا رہا تھا کہ وہ وِلس اور اس کے خواہ مخواہ بج اٹھنے والے الارم سے ناخوش تھا۔

وِلس نے اسے دروازے تک چھوڑا تھا اور پھر کاؤنٹر کی طرف پلٹا، فریڈا جلدی سے بولی۔ ''یہ میری غلطی نہیں ہے مسٹر پکنی۔ میں تو الارم بٹن کے پاس بھی نہیں گئی۔''

وِلس نے کچھ سوچتے ہوئے فریڈا کی طرف دیکھا۔ اسے معلوم تھا کہ فریڈا نے الارم نہیں چھوا تھا۔ کیونکہ اس نے تو خود پیر سے الارم بٹن دبایا تھا اور فریڈا چونکہ گاہک کے ساتھ مصروف تھی اس لیے اس کو پتا بھی نہیں چلا۔ یہ الارم سسٹم گروی رکھنے والی قیمتی اشیا جیسے پرخطر کاروبار کے لیے خصوصی طور پر بنایا گیا تھا۔ یہ الارم اسٹور میں نہیں بجتا تھا کہ کہیں مسلح ڈاکو خوفزدہ ہوکے فائر نہ کردیں۔ بلکہ کاؤنٹر کے نیچے لگے بٹن کو دبانے سے سیدھا پولیس اسٹیشن میں بجتا تھا۔ رات کو اسے لگا دیا جاتا، اسٹور کے عقبی حصے میں ایک حرکت محسوس کرنے والا آلہ لگا تھا جس سے الارم بھی بج سکتا تھا اور کھڑکیوں پر بھی ایسے سینسر لگائے گئے تھے کہ اگر کوئی انہیں توڑنے کی کوشش کرے تو الارم بج جائے۔ یہ بہت موثر نظام تھا اور وِلس کے منصوبے کے لیے بیحد موزوں۔

''جو بھی ہوا ہو۔'' وہ بولا۔ ''ہمیں بہت احتیاط کرنا پڑے گی۔ پولیس یہاں بار بار آنے سے تنگ آجائے گی اور اگر کبھی واقعی ضرورت پڑ گئی تو مسئلہ ہوجائے گا۔''

اسی لمحے ایستھر فانی اندر آئی جو غباروں کا ایک بڑا گچھا لیے ہوئے تھی۔ ان پر 'گڈ لک' اور 'نیک تمنائیں' لکھا ہوا تھا۔ اس نے غباروں کا گچھا کاؤنٹر پر رکھا اور ولس کے رخسار پر اپنے مرجھائے ہوئے ہونٹوں سے پیار کیا، ولس کپکپا سا گیا۔

"میں تمہیں صرف شاندار افتتاح کی مبارکباد دینے آئی ہوں۔ صبح بخیر فریڈا۔" اس نے ملازمہ سے کہا۔ "تمہیں کام میں مزہ آرہا ہے نا؟؟"

فریڈا نے اثبات میں سر ہلایا اور کاؤنٹر کے پیچھے مصروف ہوگئی۔ ولس کو صاف محسوس ہورہا تھا کہ ایستھر فریڈا کو خوفزدہ کرنا چاہتی ہے۔ بہرحال وہ اپنی بوڑھی پھوپی سے خوفزدہ نہیں تھا، چاہے لاکھ یا نہ ملے۔

فریڈا پر ایک نظر ڈالتے ہوئے ایستھر نے ولس کو ایک طرف کھینچا۔

"ولس ڈیئر۔" اس کی آواز دھیمی اور رازدارانہ تھی۔ "تمہیں تو معلوم ہے کہ میں نے یہ اسٹور خریدنے کے لیے تمہیں بڑی خوشی سے قرضہ دیا ہے۔" یہ کہتے ہوئے بوڑھی عورت کی آنکھیں بھیگ گئیں۔ "تم میرے اکلوتے بھتیجے ہو، فرینکلن کو جیل جانے کے بعد عاق کردینے سے تم میرے واحد رشتے دار بچے ہو۔ میں چاہتی ہوں کہ تم خوب کامیاب رہو۔" ایستھر نے یہ کہتے ہوئے اپنی بات پر زور دینے کے لیے اس کا بازو بھی دبایا تھا۔

ولس نے سر ہلا دیا۔ ان سے پیسے لینے کے بعد اتنا تو کرنا ہی پڑتا تھا۔ وہ جتنی بار جاتیں اسے سننا ہی ہوگا۔

کچھ عرصے کے لیے ہی سہی، امید تو تھی کہ یہ مدت بہت مختصر ہوگی۔

"لیکن پچھلی بار جو ہوا..." ایستھر بولی۔ ولس اس سے الگ ہٹ گیا اس کے چہرے پر دکھ کی کیفیت تھی۔

"میں اب جوا نہیں کھیلتا آنٹی۔" اس نے سخت لیکن دبے ہوئے لہجے میں کہا۔ اسے احساس تھا کہ فریڈا کی نظریں ان پر تھیں۔ "میں نے تو آپ سے وعدہ کیا ہے۔"

ایستھر نے اس کے بازو پر تھپکی دی۔

"مجھے معلوم ہے ڈیئر۔ مجھے بس تمہاری فکر رہتی ہے۔ میں چاہتی ہوں کہ تمہارا یہ کاروبار کامیاب ہوجائے۔ بہرحال مانتا یہ تمہارے لیے آخری موقع ہے۔"

ولس نے انہیں گھورا۔ "آخری موقع، کیا مطلب؟"

"مطلب یہ کہ اگر یہ کاروبار نہ چلا تو میں آئندہ تمہیں کوئی قرضہ نہیں دوں گی۔ مجھے یہ اچھا تو نہیں لگے گا لیکن میں ایمانداری سے تمہیں بتا رہی ہوں۔"

"آپ میری فکر نہ کریں۔" وہ دانت پیستے ہوئے بولا۔ "میں بہت دولتمند بننا چاہتا ہوں اور بنوں گا آپ دیکھیے گا۔"

اسٹور بند ہونے کے کئی گھنٹے بعد ولس اسٹور کی عقبی گلی کے دروازے سے اندر آیا اور جلدی سے دیوار پر لگے الارم کو بند کیا۔ اسٹور میں سیکورٹی لائٹس کی وجہ سے ہلکی سی روشنی تھی جو اس کے لیے کافی تھی۔ وہ زیورات

کے کاؤنٹر پر گیا اور سونے اور چاندی کے زیورات کی جھلملاہٹ کو ستائشی نظروں سے دیکھنے لگا۔ ان میں سے کچھ زیور تو بے کار تھے لیکن کچھ بڑے قیمتی بھی تھے۔ خوش قسمتی سے اس نے یہ اسٹور پچھلے مالک سے بھرپور اسٹاک کے ساتھ خریدا تھا۔

اس کے پاس چابی تو تھی لیکن اسے حقیقی ڈکیتی کا رنگ دینے کے لیے اس کی ضرورت نہیں تھی۔ چنانچہ اس نے ایک چھوٹے سے ہتھوڑے سے شیشے کو توڑا اور سونے چاندی کے زیورات کو تکیے کے غلاف کے اندر سمیٹ لیا جو وہ اپنے ساتھ لایا تھا اور اگلے کیبنٹ کی طرف بڑھ گیا۔

اتنے میں اس کی نظر ایستھر کے لائے ہوئے غباروں پر پڑی جو زیورات کے کاؤنٹر پر رکھے ہوئے تھے۔ یکدم جھنجلاہٹ میں اس نے غباروں کو ایک ہاتھ مارا اور وہ کمرے میں پھیل گئے۔ گیس بھرے غباروں کے ساتھ انہیں نیچے باندھ رکھنے کے لیے لگا ہوا ریت بھرا تھیلا پھٹ گیا اور ریت قالین پر بکھر گئی، غبارے اوپر اٹھ کر چھت سے چپک گئے، گویا اس کا مذاق اڑا رہے ہوں۔ یہ سب بوڑھی پھوپی کی غلطی تھی۔ ان کی عمر اب 75 سال تھی اگر وہ اپنی ساری ملکیت اس کے حوالے کر دیتیں اور تر ساتر سا کر نہ مارتیں تو وہ اس حالت میں کیوں ہوتا۔ جب وہ اس 'ڈکیتی' کے بعد انشورنس کی رقم وصول کرلے گا اور چوری شدہ زیورات بیچ دے گا تو اسے اپنی وراثت کے معاملے کو بھی جلد نمٹانا پڑے گا۔

غصے کی حالت میں ہی اس نے جلدی جلدی باقی زیورات بھی غلاف میں ٹھونس دیئے اور اسلحے کے کیبنٹ کا شیشہ توڑ ڈالا۔ چھوٹے موٹے ریوالور اور دیگر ہتھیار تو وہ آسانی سے بیچ ہی سکتا تھا۔ ایک آدھ وہ اپنے لیے رکھ لے گا کہیں پھوپی ایستھر سے نمٹنے کے لیے ضرورت پڑ جائے۔ انہیں بھی غلاف میں ڈال کر اس نے بھاری تھیلا اٹھایا اور خود ہی مسکرا دیا۔ کتنی آسانی سے یہ کام چند گھنٹے میں ہو گیا تھا۔ ساری زندگی کاؤنٹر کے پیچھے کھڑے رہ کر شکست خوردہ لوگوں سے ان کی قیمتی اشیا گروی رکھ کر چند ٹکوں کے عوض ٹرخانے سے تو یہ بدرجہا بہتر تھا کیونکہ وہ بخوبی جانتا تھا کہ وہ اپنی اشیا رہن سے کبھی چھڑا نہیں سکیں گے۔

اب اس کے منصوبے کا دوسرا مرحلہ آ پہنچا تھا۔ وہ عقبی دروازے کی طرف گیا اور الارم لگا کے باہر آتے ہی دروازہ مقفل کر دیا۔ بھرے ہوئے غلاف کو دروازے کے پاس رکھ کے اس نے کسی اینٹ یا پتھر کی تلاش میں اِدھر اُدھر نظر دوڑائی۔ وہ اینٹ سے سامنے کی کھڑکی کا شیشہ توڑے گا، اندر ہاتھ ڈال کے دروازے کا تالا کھولے گا اور اپنے فلیٹ کی طرف روانہ ہو جائے گا۔ پولیس تو اتنی جلدی آئے گی نہیں آج صبح کی طرح وہ صرف بیس منٹ میں پہنچنے کی بجائے شاید پہلے سے بھی زیادہ سستی کرے۔ جب وہ آئے گی اور اسٹور کا یہ حال دیکھے گی تو سوچے گی کہ چور ان کے پہنچنے سے پہلے نکلنے میں کامیاب ہو گئے، پھر پولیس اہلکار خود کو ہی الزام دیں گے کہ انہوں نے اتنی تاخیر کیوں کی۔ ولِس اندر ہی اندر ہنسا۔ اس کا کام جو ختم ہو گیا تھا اب شاید وہ شہر کی انتظامیہ پر نالش بھی کر دے کہ ان کی کارروائی اتنی سست کیوں رہی۔

گلی کے کونے پر اسے ایک گاڑی شاہراہ سے گزرتی دکھائی دی۔ ولِس نے خود کو دیوار سے چپکا لیا اور رک گیا۔ احتیاط پچھتاوے سے بہتر ہوتی ہے، اس کے پاس وقت کی تو کوئی کمی نہ تھی۔

اس نے تھوڑا انتظار کیا اور جب دیکھا کہ اس دوران کوئی گاڑی نہیں گزری تو ایک گہری سانس لی۔ سامنے ہی وہ ٹوٹی ہوئی اینٹ پڑی تھی جو اس نے دن میں دیکھی تھی۔ ہاں یہ کام دے جائے گی۔

گلی میں دونوں طرف ایک نظر دوڑاتے ہوئے وہ عمارت کے دوسری طرف اسٹور کے سامنے کے دروازے پر پہنچا۔ اسٹور کے قریب سڑک پر کوئی گاڑی نہیں نظر آ رہی تھی۔ اپنا بازو پوری طرح پیچھے لے جاتے ہوئے اس نے اینٹ ایک کھڑکی پر کھینچ ماری اور اندر ہاتھ لے جا کے دروازے کا اندرونی تالا کھول دیا۔ دروازے کو پورا کھول کے وہ عمارت کی عقبی گلی کی طرف دوڑا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ الارم پولیس اسٹیشن میں مسلسل بج رہا ہوگا۔ وہ تصور کر رہا تھا کہ ڈیسک سارجنٹ نے پکنی پان اسٹور کا نمبر دیکھتے ہوئے ایک گہری سانس لی

آزاد نظم

میں ہوں غزہ کی بیٹی
میرے بہت سے رنگ ہیں
میرا حوصلہ
میرا دبدبہ
سبھی دیکھ دیکھ کے دنگ ہیں
میرا قلم تلوار ہے
اس میں بلا کی دھار ہے
اک ہاتھ میں پرچم میرا
اک ہاتھ میں تلوار ہے
میں ہوں غزہ کی بیٹی
میرے بہت سے رنگ ہیں
میرا عہد ہے
میری ذات سے
لوں گی وطن
صیاد سے
میں ہوں غزہ کی بیٹی
میرے بہت سے رنگ ہیں
اک دن ضرور آئے گا
پرچم میرا لہرائے گا
میں ہوں غزہ کی بیٹی
میرے بہت سے رنگ ہیں

زرین قمر

ہوگی۔

ولس نے چوری کیے گئے مال سے بھرا تھیلا اٹھایا اور گلی میں دوڑ لگادی۔ جونہی وہ شاہراہ کے قریب پہنچا ایک پولیس کار اپنی فلیش کرتی روشنیوں کے ساتھ اس کے راستے میں آگئی۔ یہ اتنی جلدی کیسے یہاں پہنچ گئے؟ گھبرا کے وہ دوسری طرف دوڑا۔ ادھر سے دوسری روشنیاں فلیش کررہی تھیں۔ ولس نے لمحہ بھر کے لیے سوچا کہ وہ اسٹور میں گھس جائے اور معصوم شکار بن جائے، لیکن جونہی پولیس اس کی طرف اپنے ریوالور تانے ہوئے آئی وہ سمجھ گیا کہ وہ پھنس چکا ہے۔

ولس اپنے ہاتھوں میں ہتھکڑیاں لگائے کھڑا تھا اور لوٹ سے بھرا غلاف اس کے پیروں میں پڑا تھا۔ اس کی شعلہ بار آنکھیں پولیس افسر پر گڑی تھیں۔

''تم لوگ اتنی جلد یہاں کیسے پہنچ گئے؟'' اس نے سوال کیا۔ ''الارم کو بجتے ہوئے ابھی چند منٹ ہی ہوئے ہیں۔''

پولیس افسر نے نفی میں سر ہلایا۔ ''نہیں بچو! اسٹیشن میں الارم کوئی بیس منٹ سے بج رہا تھا۔''

''ہاں۔'' دوسرا اہلکار اسٹور سے باہر آتے ہوئے بولا وہ اندر کا جائزہ لینے گیا تھا۔ ''غباروں سے تو فوراً الارم بج جاتا ہے۔''

''کیا مطلب؟'' ولس کی سمجھ میں کچھ نہیں آیا تھا۔

''جیسے ہی الارم لگایا گیا ہوگا، اِدھر سے اُدھر ہلتے جلتے غباروں نے حرکت کے ڈیٹیکٹر کو آن کردیا ہوگا۔ تمہیں کیا معلوم کہ ہمیں کتنی بار مختلف عمارتوں میں رات کے وقت انہی غباروں کی وجہ سے جانا پڑتا ہے۔''

ولس کی بگڑی شکل دیکھنے سے تعلق رکھتی تھی۔ پھوپی ایستھر اور ان کے فضول غبارے! یہ سب پھوپی کی غلطی تھی!



پاداش

عامر زمان عامر

یہ حقیقت ہے کہ مرد اگر پھسلے تو وہ تنہا ہی گرتا ہے لیکن اگر عورت کے قدم بہکیں تو پورے کا پورا خاندان بدنامی اور تباہی کے گہرے گڑھے میں گر جاتا ہے۔
دو بچوں کی ماں کا قضیہ' اس کی ہوس نے کئی زندگیاں لے لی تھیں۔

شام کے اندھیرے گاؤں کے اجالے کو اپنی لپیٹ میں لینے کے لیے پر تول رہے تھے، تلاش روزگار میں دن بھر سرگرداں پرندے سرِ شام اپنے آشیانوں کی اور غول در غول آسمان کی بلندیوں پر لمبی اڑان بھرے اپنے ہدف کی جانب محو پرواز تھے، مدرسے کے ساتھ والے گراؤنڈ سے لڑکوں کے کھیلنے کی آواز، بحث و تکرار اور جیت بھرے جملوں کی گونج گاؤں کے آخری کونے تک سنائی دے رہی تھی۔

گلی کی نکڑ پر آخری مکان کے دروازے پر ہلکی سی دستک کے بعد وہ دروازے سے کچھ فاصلے پر سائیکل کے ساتھ ٹیک لگا کے انتظار کرنے لگا، گراؤنڈ سے لڑکوں کے کھیلنے کی آواز نے اسے پھر متوجہ کرلیا اسے میٹرک کے وہ دن یاد آنے لگے جب وہ امتحان کے بعد بالکل فارغ ہوتا تھا تو والد کے لاکھ منع کرنے پر اپنے ہم عمر دوستوں کے ساتھ کھیل کے میدان میں کھیلتے کودتے، لڑتے جھگڑتے صبح سے شام کر دیتا تھا۔ کوئی جواب نہ آنے پر وہ فکر مندی سے دوبارہ دستک دینے کے لیے دروازے کی جانب لپکا، اس سے پہلے کہ وہ دروازے کے پٹ بھرپور دستک سے پیٹتا، دروازہ کھل گیا اندر سے ایک خوبصورت عورت گہرے رنگ کے لون کے سوٹ میں سر پر دوپٹہ درست کرتے ہوئے ایک پٹ کھول کر اسے عجیب نظروں سے تک رہی تھی، وہ دروازے سے باہر تو نہ نکلی مگر اوٹ سے خوبصورت گلابی ہونٹوں پہ مچلتا سوال اسے صاف دکھائی دے رہا تھا، خدوخال بڑی حد تک سنی کے چہرے سے مشابہت رکھتے تھے۔

''جی میرا نام نعیم ہے، میں سنی کا دوست ہوں، اس کی سائیکل واپس کرنے آیا تھا، میں اسے مل سکتا ہوں؟'' اس نے نظریں جھکاتے ہوئے مدعا بیان کیا۔

وہ مسلسل گھورتے ہوئے ایک دم کھلکھلا کر ہنس دی۔

''تم ہنس کیوں رہی ہو، میں نے کچھ غلط کہہ دیا۔''

شرمندگی اور گھبراہٹ کے ملے جلے تاثرات اس پر طاری ہونے لگے۔

''ارے نہیں نہیں تمہاری غلطی نہیں ہے غلطی تو میری تھی جس کا آج تک خمیازہ بھگت رہی ہوں۔''

اس نے طویل سانس خارج کرتے ہوئے ادا سے اس کی طرف دیکھا۔

''میں کچھ سمجھا نہیں؟ یہ سنی کا ہی گھر ہے ناں کہیں میں غلطی سے؟''

اس نے تشویش سے گلی میں ادھر ادھر جھانکا۔

''تم نہیں سمجھو گے، اچھا...... سائیکل اندر لے آؤ، میں سمجھاتی ہوں۔''

اس نے پیچھے ہٹ کر دروازے کے دونوں پٹ کھول دیئے، نعیم گھبرا کر ایک ہاتھ سے ہنڈل پکڑے، دوسرا ہاتھ گدی پہ رکھے کبھی گلی کے آخری کونے تک دیکھتا تو کبھی کھلے دروازے کو، اس کے لیے فیصلہ کرنا مشکل ہوگیا تھا۔

''آؤ اندر...... گھبراؤ نہیں یہ سنی کا ہی گھر ہے، میں سنی کی ماں ہوں۔''

یقین دہانی پہ سائیکل ہاتھوں میں تھامے اندر تو داخل ہوگیا مگر اس کے منہ سے نکلا ہوا آخری جملہ گویا اس پر بم بن کر گرا۔

''سنی کی ماں...... ! حیرت کی بات ہے۔''

اس نے زیر لب جملہ دہرایا، اسے یقین نہیں آرہا تھا۔

''کیا نام بتایا تھا...... ؟ ہاں نعیم تو اس میں حیران ہونے

والی کوئی بات نہیں ہے تمہاری چھوڑو کوئی بھی یقین نہیں کرتا ہے کہ یاسمین سنی کی ماں ہو سکتی ہے سب تمہاری طرح مجھے اس کی بڑی بہن سمجھتے ہیں۔"

اس نے صحن میں پڑی کرسی پر بیٹھنے کا اشارہ کیا اور خود نعیم کے سامنے والی چارپائی پر بیٹھ گئی۔

"دراصل میری شادی بہت کم عمری میں ہو گئی تھی میں نے اپنی شادی کے خلاف بہت احتجاج کیا مگر والد کا سایہ سر سے اٹھ جانے کے بعد بھائی نے جلدی کر کے اوائل جوانی میں ہی شادی کے بندھن میں باندھ دیا، تب سے قسمت کا لکھا سمجھ کر جھیل رہی ہوں، خیر چھوڑیے ان باتوں کو میں بھی کن باتوں کو لے کر بیٹھ گئی تم بیٹھو تمہارے لیے چائے بنا کر لاتی ہوں۔"

"ارے نہیں تکلف کی کوئی ضرورت نہیں ہے میں تو بس سائیکل واپس کرنے آیا تھا چلتا ہوں سنی بھائی کا شکریہ ادا کر دیجیے گا، چائے پھر کبھی سہی میں پھر چکر لگاؤں گا۔"

"ارے ایسے کیسے تم جا سکتے ہو، پہلی بار ہمارے گھر آئے ہو چائے تو پینا پڑے گی۔"

نعیم کے لاکھ جان چھڑانے کے وہ بضد رہی اسے نہ چاہتے ہوئے بھی بیٹھنا پڑا۔

"ویسے تم کہاں رہتے ہو تمہارا گھر کون سے محلے میں ہے پہلے گاؤں میں تمہیں کبھی دیکھا نہیں ہے۔"

اس نے چائے کی پیالی بڑھاتے ہوئے سوالیہ نظروں سے آنکھوں میں جھانک کر پوچھا۔

"اسی گاؤں میں دو گلیاں چھوڑ کر رہتا ہوں، ویسے سامنے والوں سے سنی میرا دوست ہے مگر میں آج دوسری بار گھر آیا ہوں اور آپ سے کبھی ملاقات ہو گئی ویسے سنی کہاں ہے۔"

"پہلے تو گھر پہ ہی ہوتا تھا یا کبھی کبھار اپنے ابو کے ساتھ چلا جاتا تھا مگر ایک ہفتے سے اپنے ماموں کے پاس اس کی دکان پر جاتا ہے اس کے ماموں کی آٹو اسپیئر پارٹس کی دکان ہے وہیں دکان پر سیٹ ہو گیا ہے۔"

"اچھا جی بہتر اب میں چلتا ہوں۔"

"ارے بیٹھو ناں کچھ دیر بیٹھ جاؤ سنی تھوڑی دیر تک آ جائے گا پھر رات کا کھانا ہمارے ساتھ ہی کھا کر جانا۔"

اس نے اپنی ضد اور اصرار قائم رکھا۔

"نہیں مجھے پہلے ہی بہت دیر ہو چکی ہے رات ہونے والی ہے زیادہ دیر ہو گی تو امی پریشان ہوں گی اور پھر ابو بھی بہت غصہ ہوں گے۔" اس نے اٹھتے ہوئے حتمی لہجے میں کہا۔

"ٹھیک ہے آتے جاتے رہنا، سنی کو ہر جمعے چھٹی ہوتی ہے جمعہ کو تو لازمی آنا۔"

"جی ضرور...... خدا حافظ۔"

وہ سنی کے آنے سے پہلے ہی اپنے گھر لوٹ گیا، اس کے والدین کی خواہش تھی کہ وہ پڑھ لکھ کر بڑا افسر بن کے والدین کے بڑھاپے اور بہنوں کی خوشیوں کا نگہبان بنے، اس کا بوڑھا والد دن بھر اپنے کھیتوں میں سخت محنت کرتا اس کی پڑھائی کے اخراجات سے لے کر اس کی عیش و عشرت تک تمام ضروریات پوری کرتا تھا، بہنیں اس پر جان چھڑکتی تھیں، اس کے لاڈ اٹھاتی تھیں وہ کھیتوں میں اپنے بوڑھے باپ کی مدد کر کے خوش ہوتی تھیں اگر ماں باپ کام کرنے سے روکتے تو وہ اس پر ناراض ہو جاتیں کہ ہمارا ایک ہی تو لاڈلا بھائی ہے اگر اسے کھیتوں میں کام کاج پر لگا دیں گے تو وہ بھی کھیتوں میں مٹی سے مل کے مٹی بن جائے گا اور ابو کی طرح بس عام سا کسان بن کے رہ جائے گا اس لیے ہم اپنے بھائی کو ہرگز کھیتوں میں کام نہیں کرنے دیں گی ہم چاہتی ہیں ہمارا بھیا پڑھ لکھ کر بڑا افسر بنے دنیا کا سب سے کامیاب ترین انسان بنے۔

اسے کالج سے گھر اور گھر سے کالج کے علاوہ تیسرا کوئی کام نہ تھا وہ شہر سے آنے کے بعد کچھ دیر آرام کرتا پھر رات گئے تک پڑھائی میں کھویا رہتا، فہد اور سنی اس کے سب سے اچھے دوست تھے جن سے وہ اپنے دل کی ہر بات کرتا وہ ایک دوسرے کے بغیر نہیں رہ سکتے تھے مگر وقت کے ساتھ ساتھ جونہی عمر کے خدوخال میں تغیر رونما ہوتا ہے حالات کے ساتھ سمجھوتہ کرنا پڑتا ہے فہد کے والد کا ایک حادثے میں انتقال ہو گیا، والد کے بعد اس کا کوئی سہارا تھا نہ ہی زندگی کا پہیہ چلانے کے لیے کوئی ذریعہ معاش وہ اور اس کی ماں ہمیشہ کے لیے اس کے ننھیال سیالکوٹ چلے گئے، فہد کے بعد سنی ہی واحد دوست تھا مگر وہ بھی اپنے ماموں کے ساتھ دکان پر لگ کر اس سے دور ہو گیا تھا۔

نعیم اپنی عمر سے زیادہ گھبرو جوان لگتا تھا پانچ فٹ سے نکلتا ہوا قد کاٹھ، چوڑا چکلا کشادہ سینہ، مست بھوری گہری آنکھیں، گھنے ریشمی سلجھے ہوئے بال، انار کی طرح سرخ و سپید گال ان تمام خوبیوں نے اسے مکمل جاذب نظر بنا ڈالا تھا۔ گاؤں میں اور بھی اس کے ہم عمر لڑکے تھے مگر فہد اور سنی کے بعد اس کی کسی سے دوستی نہ جم پائی' اس نے خود کو کالج سے گھر اور گھر سے کالج تک محدود کر لیا۔ شہر سے آنے کے بعد اگرچہ اس کا دل گھر کے خاموش ماحول میں نہیں لگتا تھا مگر پھر بھی اس نے خود کو جبراً کتابوں میں گم کر لیا وہ ساری ساری رات کتابیں کھول کے خیالوں میں الجھا رہتا، پڑھنے کو دل چاہتا اور نہ ہی سو پاتا۔

سنی سے اس کی ملاقات ہفتے میں صرف جمعہ کے دن ہو پاتی، وہ دن اس کے لیے عید سے کم نہ ہوتا، وہ صبح سے شام تک اس کے گھر ہوتا کبھی کبھی تو رات بھی انہی کے گھر رک جاتا سنی کے مصروف ہو جانے کے بعد اسے ایک اچھے دوست کی ضرورت تھی جو تنہائی میں اس کے دکھ سکھ کا ساتھی ہو جو اس کی کمی پوری کر سکے۔ اسے گھر کے کام کرنا اور سنی کی عدم موجودگی میں اس کے گھر وقت گزارنا اچھا لگنے لگا۔

"آج تو جمعہ ہے ناں تو آج صبح سویرے یہ سنی کا بچہ کہاں غائب ہو گیا۔"

اس نے سنی کو گھر میں نہ پا کر حیرت سے سوال کیا۔

"ارے سنی کے علاوہ تجھے اس گھر میں کوئی اور بھی دکھائی دیتا ہے کہ نہیں آج اسے چھٹی تھی مگر کافی عرصے سے اس کے ابو کا رکشہ خراب تھا سنی اگلے سے اگلے جمعہ تک ٹال رہا تھا، آج صبح سویرے ہی اس کا باپ اسے کان سے پکڑ کر لے گیا ہے ہو سکتا ہے وہ رات کافی دیر سے لوٹیں آؤ بیٹھو اندر چلتے ہیں آرام سے باتیں کرتے ہیں۔"

اس نے معنی خیز شرارت بھری آنکھوں سے پیش کش کی نعیم عرصہ دراز سے اپنے دوست کی جواں سال ماں کا غیر معمولی رویہ دو طرفہ مراسم کی طلب اور اس کی حرکات سے بخوبی اندازہ لگا چکا تھا۔ وہ اس کا کوئی جواب سنے بغیر ہاتھ کھینچ کر کمرے میں لے آئی نعیم نے جینز کے ساتھ مہرون رنگ کی شرٹ پہن رکھی تھی، وہ چپکے چپکے یاسمین کے دل میں اترتا جا رہا تھا۔

"اچھا تو سنی کے بغیر تمہارا کہیں دل نہیں لگتا، اس کی غیر موجودگی میں تمہیں ایک اچھے دوست کی ضرورت ہے۔"

اس نے کوئی جواب نہ دیا وہ چپ سادھے خلاؤں میں

گھورتا رہا۔
"اچھا نعیم ایک بات کا جواب دو۔"
"جی پوچھو۔"
"اگر تمہیں کوئی ایسا دوست مل جائے جو تمہارا سنی سے بڑھ کر خیال رکھے تو تمہارا ردعمل کیا ہوگا؟"
"ظاہر ہے خوشی ہوگی۔"
"تو سمجھ لو آج سے تجھے وہ دوست مل گیا۔"
"کون مل گیا...... کون دوست......"
اس نے تہہ تک پہنچنے کے لیے جان بوجھ کر لاعلمی کا اظہار کیا تو یاسمین ایک دم پکے پھل کی طرح اس کی گود میں گر کر اس کے ہاتھوں کو دیوانگی سے چومنے لگی۔
"آج سے میں تمہاری دوست ہوں میں تجھے اتنا پیار دوں گی کہ تم سب کچھ بھول جاؤ گے۔"
نعیم خود کو چھڑا کے بوکھلا کے جلدی سے اٹھ کے دروازے کی جانب بڑھنے لگا وہ اس کے سامنے تن گئی، اپنے دل میں پلنے والے یک طرفہ عشق کا کھل کے اظہار کر ڈالا کرنٹ کی تیز لہر اس کے رگ و پا میں اترنے لگی اسے اتنا تو اندازہ ہوگیا تھا کہ وہ گزشتہ کئی دنوں سے مختلف حیلے بہانوں سے قریب آنے کی کوشش کر رہی تھی مگر اس حد تک پہنچ جائے گی اس کے وہم و گمان میں بھی نہ تھا وہ پسینے سے شرابور خوف سے تھر تھر کانپنے لگا۔
"دیکھو تم سنی کی ماں ہو اور اس رشتے سے۔"
نعیم نے اسے باز رکھنے کے لیے سمجھانا چاہا لیکن وہ کوئی بات وضاحت کوئی دلیل سننے کے لیے تیار نہ تھی جذبات کے دھارے میں مسلسل بہتی جا رہی تھی، آخر زچ ہو کر نعیم بولا۔
"ٹھیک ہے مگر فی الحال جانے دو مجھے ضروری کام سے کہیں جانا ہے میں وعدہ کرتا ہوں تمہارے ساتھ دوستی ضرور کروں گا۔"
گھر آ کر نعیم نے خود کو کمرے میں بند کرلیا، وہ رات بھر بخار کی کیفیت میں مبتلا رہا، اس کا جسم جذبات کی آگ میں جھلس رہا تھا، وہ ان لمحوں کو کوسنے لگا جب سنی سے اس کی دوستی ہوئی تھی وہ اچھے خاندان سے تعلق رکھتا تھا اور دوستی جیسے مقدس رشتے کا تقدس بخوبی جانتا تھا اتنا بڑا گناہ کر کے دوست کو دھوکا دینے کے بارے سوچ بھی نہیں سکتا تھا، مگر

نظم (یو این او)

کیا شان یو این او کی نرالی ہے دوستو
کیا آن یو این او کی نرالی ہے دوستو
قوموں کی سالمیت محکمہ کا توڑ ہے
خود بے شمار بکھرے عناصر کا جوڑ ہے
آئی جو بزم امن سجانے کے واسطے
وہ اب ہے صرف ناچنے گانے کے واسطے
کشمیر ہو کہ ارضِ فلسطین و ویت نام
اے یو این او یہ سب ترے گیسو کے ہیں غلام
ڈھا کہ وہ پُرشکوہ شہر کس سے ہے نہاں
لیکن تری اداؤں میں مضمر ہیں بجلیاں
دھرتی سے تو نے چھین لیا ہے حجاب دے
ہر شہر تجھ سے پوچھ رہا ہے حساب دے

زرین قمر

وحشت بھرے عزائم نے اس کا خون خشک کر رکھا تھا یاسمین اس کے لیے شیدائی ہو رہی تھی اسے پانے کے لیے مرے جا رہی تھی، بچاؤ کا کوئی راستہ ذہن میں نہ آیا تو نعیم نے سنی کے گھر آنا جانا بالکل بند کر دیا، سنی بھی اپنے کام میں مصروف ہوگیا اگر سنی سے ملاقات ہو بھی جاتی تو وہ باوجود اصرار کے پڑھائی کا بہانہ کر کے گھر جانے سے کترا جاتا اس کے انٹرمیڈیٹ کے امتحان ہوگئے تھے مگر وہ پھر بھی پڑھائی کے بہانے کمرے میں لیٹا کتابوں سے دل بہلا رہا تھا، اس کی چھوٹی بہن نے دروازے پر دستک دی تو وہ ایک دم چونک اٹھا۔
"بھائی سنی آیا ہے۔"
اس سے پہلے کہ کوئی بہانہ کر کے ٹالتا، سنی اس کے اٹھنے سے پہلے کمرے میں پہنچ گیا۔
"واہ یار نعیم! تو پکا کتابی کیڑا بن کے رہ گیا ہے اتنے دنوں سے کوئی خیر خبریت نہیں، بڑا کٹھور ہوگیا ہے، میں سمجھ رہا تھا کم از کم تو گھر تو چکر لگاتا ہوگا۔ امی نے بتایا کہ اتنے دنوں سے تو گھر بھی نہیں آیا یار تیری پڑھائی ابھی مکمل نہیں ہوئی ہے ابھی تو بڑا افسر بنا نہیں ہے پہلے ہی ہم غریبوں سے منہ پھیر لیا ہے چل ذرا میرے ساتھ امی تیرے کان خوب

کھینچے گیں وہ نہ چاہتے ہوئے بھی انکار نہ کرسکا، سنی زبردستی اسے اپنے ساتھ گھر لے آیا، پھر آنا جانا شروع ہوا تو دن رات میں کوئی تفریق نہ رہی جس کسی کو بھی اس سے ملنا ہوتا یا کوئی کام ہوتا تو سب کو معلوم ہوتا اس کا ایک ہی ٹھکانہ تھا، وہ تھا سنی کا گھر۔

پہلی ہی دستک پر دروازہ جھٹ سے کھل گیا جیسے صدیوں سے اسی کا راستہ تک رہی ہو وہ دلفریب مسکراہٹ اپنے گلابی ہونٹوں پہ بکھیرے اس کے استقبال کے لیے کھڑی تھی اس نے ہلکے گلابی رنگ کا ریشمی سوٹ پہن رکھا تھا اپنے ہونٹوں کو سرخ لپ اسٹک سے اور بھی لال کر رکھا تھا، وہ ایک مکمل جواں سال حسین عورت کے روپ میں اپنے کم عمر محبوب کو فریب حسن کے جال میں پھنسانے کے لیے پوری تیاری کر چکی تھی اس نے اپنی چکنی چپڑی باتوں اور ظالم اداؤں سے اسے اپنے شیشے میں اتار لیا نعیم بھی شیطانی بہکاوے کی گرفت میں آ گیا آخر کار اس نے بھی ہتھیار ڈال دیئے۔

''اگر سنی آ گیا تو پھر کیا سوچے گا اس لیے میرا خیال ہے دروازہ بند کر دو۔''

''میری جان اس کی فکر مت کرو اس کا بندوبست میں نے پہلے سے ہی کر رکھا ہے سنی آج دکان پر مصروف ہے وہ آج رات نہیں آنے والا اس کا پیغام آ گیا تھا اور رہی بات اس کے ابو کی تو وہ آج صبح ہی گیا ہے تمہیں پتہ ہے وہ شہر میں دن رات رکشہ چلاتا ہے تیسرے، چوتھے روز لوٹتا ہے۔''

اسے مطمئن کر کے دروازے کے ساتھ لائٹ بھی بند کر دی گئی، رات کی تاریکی میں اخلاق و دوستی میں حائل تمام دیواریں چکنا چور ہو گئیں، ہر وہ حد عبور کر گئے جس کا کوئی تصور بھی نہیں کر سکتا تھا، رات بھر گناہ کی دلدل میں ڈوب کر صبح ہوتے ہی نعیم اٹھ کے اپنے گھر آ گیا۔

پھر خواہشات کی تسکین کے لامتناہی سلسلے شروع ہو گئے کبھی دن کے اجالے، تو کبھی رات کے اندھیرے میں وقت بے وقت اس کے قدم بے خوف و خطر سنی کے گھر کی جانب اٹھنے لگے، اس کھیل کو سال کا عرصہ بیت جانے کو تھا اس نے کمال مکاری سے کسی کو ذرا بھر شک تک نہ ہونے دیا ،نعیم گذشتہ دو راتوں سے گھر سے غائب تھا اس کے گھر والے ڈھونڈ ڈھونڈ کر پاگل ہو چکے تھے، اسے زمین نگل گئی یا آسمان کھا گیا کوئی اتہ پتہ نہیں تھا نہ جانے پراسرار طور پر کہاں غائب ہو گیا تھا، وہ جب بھی سنی گھر جاتا یا رات رکتا تو اپنے گھر ضرور بتا کر جاتا، وہ پراسرار روپوشی سب کی سمجھ سے بالاتر تھی ،بوڑھے باپ اور بہنوں نے گاؤں کے ہر دروازے پر دستک دی ہر کسی سے پوچھا ہر کسی نے سنی کے گھر کی طرف اشارہ کیا، جب کہیں سے بھی کوئی سراغ نہ ملا تو گاؤں والوں نے انہیں مجبوراً قانون کا دروازہ کھٹکھٹانے کا مشورہ دیا گاؤں کے چند سیانے لوگ نعیم کے باپ کے ساتھ ہو لیے اس کی مدعیت میں قریبی تھانے میں نعیم کی گمشدگی کی رپورٹ لکھوائی گئی تھانہ انچارج نے بھرپور تسلی سے کہا۔

''آپ گھبرائیں نہیں، بہت جلد آپ کے بیٹے کا سراغ مل جائے گا اس نے کچھ ضروری سوالات کے بعد کہا کہ آپ لوگ گھر جائیں ضرورت پڑنے پر آپ کو دوبارہ بلا لیا جائے گا۔''

ایف آئی آر کے تیسرے روز نعیم کے باپ کو تھانے بلایا گیا، پورے گاؤں کے سامنے نعیم کی روپوشی کا عقدہ کھلا تو سب کے ہوش اڑ گئے، حسن کے پنجرے میں قید نوعمر پرندہ اڑنے لگا تو یاسمین نے نئے طریقے سے جال میں پھنسانے کی کوشش کی وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ نعیم کے تقاضے بڑھتے گئے، اس نے باہمی مراسم قائم رکھنے کے لیے جو شرط عائد کی وہ یاسمین کے لیے ناممکن تھی، اسے کرتوت فاش ہونے کا ڈر کھائے جا رہا تھا، اس کے سر سے دیوانگی کا بھوت اتر چکا تھا، وہ کسی صورت بھی اپنی بیٹی کو نعیم کے حوالے کر کے بدکاری کی آگ میں نہیں جھونک سکتی تھی، لومڑی کی طرح مکار ذہن نے نعیم سے چھٹکارے کے لیے نئی منصوبہ بندی کا تانا بانا بن لیا۔

''نعیم تمہارا تقاضا ضرور پورا کروں گی مگر یاد رکھنا یہ تمہاری پہلی اور آخری خواہش ہوگی، آج رات پورے گیارہ بجے آ جانا۔''

نعیم خوش ہو کر اپنے گھر چلا گیا اور رات ہونے کا بے صبری سے انتظار کرنے لگا، اس کے جانے کے بعد یاسمین نے اپنے شوہر کو گھر بلا لیا مکاری سے اپنے کپڑے پھاڑ کر زار و قطار رونے لگی۔

''کہاں تھے آپ میں کب سے آپ کا انتظار کر رہی تھی

غزل

خود پہ گرتے شہابوں میں الجھی رہی
روشنی کے عذابوں میں الجھی رہی
اپنے دل کے خرابوں میں الجھی رہی
سرخوشی کے سرابوں میں الجھی رہی
باری باری جدا لوگ ہوتے رہے
میں دھنک رنگ خوابوں میں الجھی رہی
کس سے کہتی مقدر کی ناکامیاں
رخ بدلتے جبالوں سے الجھی رہی
اس کی چاہت کو دل میں بسائے ہوئے
میں اسی کے عتابوں میں الجھی رہی
سب ہی دل کی مرادوں کو پاتے گئے
میں گناہوں، ثوابوں میں الجھی رہی
زیست ہر دم نئی چال چلتی گئی
میں سلیس کے بالوں میں الجھی رہی
زریں منزل کو اپنی بھلائے ہوئے
عمر بھر کے حسابوں میں الجھی رہی

زرین قمر

غضب ہوگیا سنی کے دوست نے مجھے بے آبرو کرڈالا۔"

وہ سن کر غصے سے بھڑک اٹھا، اس نے فوراً سنی اور اس کے ماموں کو اپنے گھر بلایا، تمام صورت حال سے آگاہ کرکے سنی کو سمجھا کر بھیجا کہ نعیم کو کسی طرح اپنے ساتھ گھر لے آؤ، طے شدہ منصوبے کے تحت نعیم ان کے گھر پہنچ گیا، انہوں نے رات کی تاریکی میں نعیم کو چھریوں اور برچھیوں سے قتل کردیا، اس کے ٹکڑے کرکے دو حصوں میں الگ الگ بوریوں میں ڈالا اور اپنے گاؤں سے بیس کلو میٹر کے فاصلے پر پھینک دیا جسے بعد میں ان کی نشان دہی پر برآمد کرلیا گیا، ایف آئی آر کے بعد پولیس نے تفتیش کا آغاز سنی کے گھر سے کیا، شک اور گاؤں والوں کے بیانات کی روشنی میں پولیس سنی کی ماں کو تھانے لے آئی۔

تھانے میں پولیس نے تفتیش کے روایتی ہتھکنڈے بروئے کار لاتے ہوئے نہ صرف یاسمین کو جرم قبول کرنے پر مجبور کردیا بلکہ اعتراف جرم کے بعد اس کے شوہر، سنی اور یاسمین کے بھائی کو بھی اپنی حراست میں لے لیا۔

نعیم اور اس کی مکار محبوبہ کا گھناؤنا جرم منظر عام پر آنے کے بعد پورے علاقے میں تہلکہ مچ گیا، سفاک جرم کی پاداش میں جہاں سنی کا نشیمن اپنی ہی لگائی ہوئی آگ سے جل کر راکھ ہوگیا وہاں ایک ماں کی آنکھ کا تارا ہمیشہ کے لیے بجھ گیا۔

سفاک قاتلوں کی سزا وجزا کا معاملہ تو قانون کے ایوانوں میں نشان عبرت بنا، مگر دوطرفہ اجتماعی جرم کی پاداش میں تقدیر نے ایک بوڑھے باپ سے بڑھاپے کا سہارہ اور بہنوں کی آنکھوں سے مستقبل کے سنہرے خواب تعبیر سے پہلے ہی چھین کر چکنا چور کردیے۔

شیطان

عتیق حسن بیگ

انسان کی تخلیق سے قبل یہ زمین جنات کا مسکن تھی اور عزرایل (شیطان) جو جنات کا سردار تھا اور اپنی عبادات کے نتیجے میں فرشتوں کا سردار مقرر ہوا اور آدم کو سجدہ کرنے سے انکار پر راندہ درگاہ ہوا اور اسے واپس زمین پر بھیج دیا گیا۔ اس شیطان نے اپنی زریات کی مدد سے انسانوں کو تنگ کرنا اپنا شیوہ بنا لیا۔ مگر ہر موڑ پر اللہ کے نیک بندے اسے شکست دیتے رہے۔

اسی شیطان کے امتی کی روداد' وہ معصوم خواتین کو تنگ کرنے پر مامور تھا۔

قبرستان میں ہر طرف ہیبت ناک ویرانی اور سناٹے کا راج تھا۔ آم آدمی تو دن میں بھی خاموش کالونی سے گزرتے ہوئے کتراتے ہیں کجا یہ کہ سردیوں کی ٹھٹھرتی رات میں تنہا قبرستان آنا۔ یہ قبرستان اپنے قیام کے وقت شہر سے کافی دور بنایا گیا ہوگا مگر حیدر آباد شہر کی آبادی میں روز بروز اتنی تیزی سے اضافہ ہو رہا ہے کہ اب تو قبرستان کے ارد گرد گنجان آبادی کا راج ہو چکا ہے مگر بہر حال قبرستان کا اپنا ایک خوف ہوتا ہے جو اندھیری رات ہونے کے باعث کچھ زیادہ ہی پر رعب اور خوف آور محسوس ہو رہا تھا۔

میں اپنے دل سے ہر خوف کو جھٹکتے ہوئے مقدس قرآنی آیات کا ورد کرتا ہوا تیزی سے کچی پکی قبروں کو عبور کرتا ہوا بڑھتا جا رہا تھا۔

رات کے بارہ بجنے میں چند منٹ باقی تھے اور مجھے اپنی بغل میں دبی ہوئی سیاہ مرغی کو قبرستان کے وسط میں چھوڑنا تھا۔ پیر صاحب کی خاص ہدایت تھی کہ جب مرغی کو قبرستان میں چھوڑ دیا جائے تو مجھے واپسی کا سفر اختیار کرنا ہے۔ مگر کسی حالت میں پیچھے مڑ کر ہرگز نہیں دیکھنا ہے ورنہ شدید نقصان ہو سکتا ہے۔ مجھے پیر صاحب کی ہدایت اچھی طرح یاد تھیں۔ مجھے یہ بھی یاد تھا کہ مرغی کو رات بارہ بجے کے اریب قریب قبرستان کے تقریباً وسط میں چھوڑنا ہے۔ پیر صاحب نے نہایت سختی سے ہدایت کی تھیں کہ واپسی کے راستے میں میرے سامنے بہت سی غیر مرئی رکاوٹیں آئیں گی جو مجھے پیچھے مڑ کر دیکھنے پر مجبور کریں گی۔ بس یہی مرحلہ ہی میرے لیے کٹھن ہوگا اور مجھے اس جان لیوا مرحلے پر ثابت قدم رہنا تھا۔ انہوں نے بتایا تھا کہ میرے پیچھے مڑ کر دیکھنے سے نہ صرف ان کا تمام عمل ضائع ہو سکتا ہے بلکہ خود میری ذات کو بھی شدید نقصان پہنچ سکتا اور میں کسی بڑی مصیبت میں گرفتار ہو سکتا ہوں۔

سچی بات یہ ہے کہ شروع میں تو اس کام سے بھی خاصا گھبرایا تھا اور سوچ رہا تھا کہ اس خطرناک عمل سے انکار کر دوں۔ مگر میری والدہ کا معاملہ تھا ان پر کسی ہندو بد روح نے قبضہ کر لیا تھا جو اپنا نام وکرم سنگھ بتاتا تھا اور اس نے بہت پریشان کر رکھا تھا۔ اس کام کے لیے میرا چھوٹا بھائی حیدر حسین بھی تیار تھا مگر میرا دل نہیں مانا اور میں نے دل کڑا کر کے اس خطرناک کام کو کرنے کی ہامی بھر لی۔ اس میں میرا فطری تجسس بھی شامل تھا کیونکہ مجھے خود بھی شروع ہی سے عملیات وغیرہ اور دیگر پراسرار علوم سے گہری دلچسپی تھی اس لیے جب میری والدہ پر قابض شیطان وکرم سنگھ کو پیر صاحب نے اپنے عمل سے حاضر کیا اور میں نے دیکھا کہ والدہ ماجدہ کی آنکھیں چڑھ گئی ہیں اور گہری سرخ ہو گئیں نہ صرف یہ بلکہ ان کی آواز بھی بدل گئی اور وہ بھاری آواز میں بولنے لگیں۔

میں دم سادھے حیران حیران ساری کارروائی دیکھتا رہا گھر کے دیگر افراد کو دوسرے کمرے میں بھیج دیا گیا تھا اور اس کمرے میں والدہ پیر صاحب اور میرے علاوہ کوئی چوتھا

ممکن نہیں تھا۔ مگر ہاں یہ اتنا وجود موجود تھا اور وہ تھا وکرم سنگھ۔ کیونکہ میرے سامنے میری والدہ جسمانی طور پر ضرور موجود تھیں مگر ان کے وجود میں ایک شیطان حلول کر گیا تھا اور اب پیر صاحب کے عمل سے اس شیطان سے باقاعدہ مذاکرات جاری تھے۔

شروع میں تو وہ غیر مرئی وجود بنام وکرم سنگھ پیر صاحب کو بڑی بڑی دھمکیاں دیتا رہا مگر انہوں نے اس کی پروا نہیں کی اور اپنا عمل جاری رکھا اور کچھ پڑھ کر پھونکتے رہے ان کی ہر پھونک پر وہ غضب ناک آواز میں چیخنے لگتا اور تیز لہجے میں دھمکیاں دیتا۔ یوں محسوس ہو رہا تھا کہ گویا وہ شدید درد و کرب میں مبتلا ہے۔ اس کے ساتھ ہی والدہ اپنی گردن کو دائیں بائیں زوردار جھٹکے دیتے ہوئے اپنے ہاتھوں کو فرش پر مارنے لگتیں۔ میں نے کئی بار چاہا کہ بڑھ کر انہیں اپنی گود میں بھر لوں مگر پیر صاحب نے اسی شرط پر مجھے کمرے میں ٹھہرنے کی اجازت دی تھی کہ میں ان کے عمل کے دوران کوئی جذباتی حرکت نہیں کروں گا لہٰذا میں نے خود پر قابو رکھا اور خاموشی سے ساری کارروائی دیکھتا رہا۔

کافی دیر بعد جب وہ راہ راست پر آیا اور جب پیر صاحب کو مکمل یقین ہو گیا کہ اب اس سے براہ راست مذاکرات مفید ثابت ہو سکتے ہیں تو باقاعدہ گفتگو کا آغاز ہوا۔ اب وہ دھمکیاں دینے کے بجائے منت سماجت پر اتر آیا تھا مگر پیر صاحب بھی اس کا حسب نسب معلوم کرنے اور اسے بھگانے کا تہیہ کیے بیٹھے تھے۔ میں گہرے انہماک سے ان کی گفتگو سننے میں مشغول تھا دل میں ایک انجانا سا خوف بھی تھا مگر میں اپنے تجسس کے ہاتھوں مجبور ہو کر بیٹھا رہا۔

"نام کیا ہے تمہارا؟" پیر صاحب نے باقاعدہ مذاکرات کا آغاز کرتے ہوئے گونجتی ہوئی آواز میں کہا۔

"وکرم سنگھ۔ وکرم سنگھ نام ہے میرا۔" وہ شیطان چیخ سے مشابہ آواز میں بولا۔

"والد کا نام؟"

"معلوم نہیں۔"

"کیا بکتا ہے کمبخت! میرے سوالوں کا ٹھیک ٹھیک

جواب دے نہیں تو جلا کر بھسم کر دوں گا۔ پیر صاحب نے اس کے جواب پر مشتعل ہو کر پر جلال آواز میں کہا اور میں نے دیکھا کہ وہ واضح طور پر کانپ اٹھا تھا۔ مگر فوراً ہی بول پڑا۔

''میں ٹھیک کہہ رہا ہوں۔ میں تمہارے قبضے میں ہوں اور تم سے جھوٹ نہیں بولوں گا۔ میری ماں میری پیدائش کے بعد مجھے اناتھ آشرم کے دروازے پر چھوڑ کر چلی گئی تھی۔ مجھے معلوم نہیں میرے باپ کا کیا نام تھا اور میری ماں کون تھی۔'' شیطان وکرم سنگھ نے تفصیل سے جواب دیا۔ اس مرتبہ اس کا لہجہ مودبانہ تھا۔

''تجھے پالا پوسا کس نے۔'' پیر صاحب نے سوالات کا سلسلہ جاری رکھا۔

''میں وہیں اناتھ آشرم میں پلا بڑھا ہوں اور اب میری عمر چوبیس سال ہے۔'' اس بار بھی اس کا لہجہ مودبانہ تھا۔ یوں محسوس ہو رہا تھا کہ یا تو پیر صاحب کی دھمکی کارگر ثابت ہوئی ہے یا پھر پیر صاحب کے ہاتھ میں اس کی کوئی کمزوری آچکی ہے۔ جس کی وجہ سے وہ بالکل بے بس ہو چکا تھا وہ نہایت شرافت سے ہر بات کا جواب دے رہا تھا۔

''اس کو کیوں پریشان کر رہا ہے۔''

''میں اسے پریشان نہیں کر رہا بلکہ انہوں نے مجھے پریشان کیا تھا۔ میں سزا کے طور پر اس پر حاوی ہوا ہوں۔''

''انہوں نے تجھے کیوں پریشان کیا اور دیکھ بار بار کہنے کی ضرورت نہیں ہے ایک ہی بار تفصیل سے بتاتا چلا جا۔ میرے پاس زیادہ وقت نہیں ہے۔'' پیر صاحب نہایت پر جلال آواز میں بولے اور اس کا خاطر خواہ نتیجہ بھی دیکھنے میں آیا۔ وکرم سنگھ نے تیزی سے بولنا شروع کر دیا۔

''میں شاہین پر عاشق تھا۔ جو اس کی نواسی ہے مگر انہوں نے مجھے بہت تنگ کیا اس کی دوسری بیٹی ریحانہ اور داماد نے مل کر مجھ پر اپنے عملیات آزمائے اور نہ جانے کیا کچھ کیا کہ مجھے گھبرا کر فرار ہونا پڑا۔ میرے دل میں اس پورے خاندان کے لیے غصہ اور انتقام پیدا ہو گیا اس لیے میں جاتے جاتے اس پر آگیا۔ یہ اس گھر کی سب سے بڑی ہے یہ دکھ میں ہو گی تو سارا گھر دکھ میں ہو گا۔ یہی سوچ کر میں اس پر آگیا تاکہ میرا انتقام پورا ہو۔

''تیرے انتقام کی ایسی تیسی معصوم لوگوں کو پریشان کرتا ہے بدبخت تو جانتا ہے یہ کس کی منکوحہ ہے۔ میرے خلیفہ کی، سمجھا۔''

''مجھے معلوم ہے یہ ظہیر شاہ کی بیوی ہے۔'' اس نے مختصر جواب دیا۔

''اس بچی سے تیری کیا دشمنی تھی۔ کیونکہ تو شاہین کو پریشان کر رہا تھا اور تو کب سے اس کے پیچھے ہے؟''

پیر صاحب نے سوالوں کا رخ تبدیل کرتے ہوئے پوچھا۔

''چار سال پہلے وہ اسکول سے آرہی تھی میں ان کے راستے میں ایک خالی پلاٹ پر تنہا بیٹھا تھا یہ اپنی سہیلیوں سے ہنستی مذاق کرتی ہوئی پلاٹ سے گزری مجھے یہ بہت اچھی لگی میں اس پر عاشق ہو گیا۔ میرا ارادہ تھا کہ میں اسے اپنے ساتھ لے جاؤں گا مگر اس کی والدہ نے سخت مزاحمت کی اور مختلف عاملوں کے پاس جاتی رہی جس سے میرا منصوبہ ناکام ہو گیا۔

''میں نے تجھ سے یہ بھی پوچھا تھا کہ تیری شاہین سے کیا دشمنی تھی؟'' پیر صاحب نے زور دے کر اپنے سابقہ سوال کو پھر سے دہرایا۔ مگر وہ خاموش رہا تو پیر صاحب غضب ناک ہو گئے اور گرج دار آواز میں بولے ''میں تجھ سے کچھ پوچھ رہا ہوں بدبخت' تیری اس معصوم سے کیا دشمنی تھی اس نے تیری کون سی بھینس چرائی تھی۔''

''میں کہہ چکا ہوں وہ مجھے اچھی لگتی ہے کیا تیرے کان خراب ہیں۔ دیکھ صوفی مجھے پریشان مت کرو ورنہ میں تجھے نہیں چھوڑوں گا۔ مجھے جانے دے ورنہ اچھا نہیں ہو گا۔ وکرم سنگھ اچانک ہی ہتھے سے اکھڑ گیا اور اس کے ساتھ ہی والدہ زور زور سے زمین پر ہاتھ مارتے ہوئے حلق کے بل چیخنے لگیں۔ پیر صاحب نے دل ہی دل میں تیزی سے کچھ پڑھنا شروع کر دیا اور چند ہی لمحوں بعد وہ پرسکون ہو گئیں۔

اچانک قبرستان میں کسی آوارہ کتے کے بھونکنے کے باعث میں اپنے خیالات سے چونک پڑا۔ مجھے یاد آیا میں اس وقت ویران قبرستان میں تنہا ہوں اور ایک خطرناک عمل میں اہم کردار ادا کر رہا ہوں لہذا میرا حاضر دماغ رہنا ضروری ہے۔ کتوں کے بھونکنے سے یہ ضرور پتا چلا کہ اس خطرناک ماحول میں میرے علاوہ بھی کوئی اور زندہ موجود

ہے مگر اس احساس سے میرا خوف کم ہونے کے بجائے مزید بڑھ گیا۔ میری کلائی میں بندھی گھڑی ٹھیک شب کے بارہ بجنے کا اعلان کررہی تھی اور میں اس وقت قبرستان کے تقریباً وسط میں پہنچ چکا تھا۔ میں نے اللہ کا نام لیا اور مرغی کو زمین پر چھوڑ دیا۔

مرغی شور کرتی ہوئی کچی پکی قبروں کے درمیان دوڑتی چلی گئیں۔ میں فوراً مڑا اور واپسی کے راستے پر ہولیا۔ ابھی چند قدم ہی چلا ہوں گا کہ مجھے اپنے عقب میں زبردست شور کی آوازیں سنائی دیں۔ یوں محسوس ہورہا تھا جیسے بہت ساری بدروحیں آپس میں لڑ پڑی ہوں مجھے فوراً ہی پیر صاحب کی ہدایت یاد آگئی اور مرغی کو قبرستان کے وسط میں چھوڑنے کے بعد مجھے پیچھے مڑ کر ہرگز نہیں دیکھنا ہے اگر میں نے ان کی ہدایت پر عمل نہیں کیا تو مجھے نقصان پہنچ سکتا ہے۔ ان ہدایات کے یاد آتے ہی میرے قدموں میں تیزی آگئی میں دل ہی دل میں آیت الکرسی کا ورد کرتے ہوئے تیزی سے قبرستان سے نکاسی کے راستے پر ہولیا۔

''ارے بیٹا! مجھے ان درندوں میں کہاں چھوڑ کر جارہا ہے۔'' میری سماعت سے درد وکرب میں ڈوبی ایک آواز ٹکرائی اس آواز کو سن کر میرے رونگٹے کھڑے ہوگئے اور میں ٹھٹک کر رک گیا حالانکہ پیر صاحب نے قبرستان میں پیش آنے والے متوقع واقعات مجھے تفصیل سے بتائے تھے اور پیچھے مڑ کر دیکھنے سے سختی سے منع کیا تھا لیکن اس آواز میں دنیا جہاں کا کرب پنہاں تھا اور اس سے بھی حیرت انگیز بات یہ کہ وہ آواز کسی اور کی نہیں بلکہ میری والدہ کی آواز تھی۔ جی...... وہ سوفیصد میری اپنی والدہ ہی کی اواز تھی یہی وجہ تھی کہ میں ایک لمحے کے لیے پیر صاحب کی ہدایت کو نظر انداز کر بیٹھا تھا مگر دوسرے ہی لمحے میں نے خود کو سنبھالا اور اپنے آپ کو تسلی دی کہ یہ سب فریب نظر ہے دھوکا ہے' مجھے دھوکے سے خود بچانا ہے اور جلد از جلد قبرستان سے باہر نکلنا ہے۔ شعوری طور پر بہرحال یہ سمجھ رہا تھا کہ یہ غیر مرئی قوتوں کی جنگ تھی جس میں میری ذرا سی لغزش میرے لیے سخت نقصان دہ ثابت ہوسکتی ہے۔

بس ایک لمحے کے لیے میرے قدم رکے پھر میں نے اپنا سفر شروع کردیا۔ میرے عقب میں غیر انسانی چیخ وپکار جاری تھی یوں محسوس ہورہا تھا گویا میرے عقب میں دو

[illegible]

آپ کے ... قریب تھا کہ ... صاحب کی ... [illegible]

میں ان کے ... کے گھر سے ... [illegible] ... تھوڑی ... کے لیے ... [illegible] ... بالکل ... ایک ... [illegible] ... میں نے فوراً ... [illegible]

[illegible]

ان کی بال کا فاصلہ ... [illegible]

میری ... بیٹی اور میری بھانجی شاہین ... جماعت میں پڑھتی تھی چونکہ ان کا اسکول گھر سے کچھ فاصلے پر تھا ... [illegible] ... کے ساتھ ... میں مصروف ... [illegible] ... کی وجہ سے اسکول کی چھٹی جلد ہو گئی تھی اور اس وقت ... بارہ بجے کا عمل تھا۔ اسکول کی ... سے نکل کر ... ایک پلاٹ تھا ... [illegible] ... جھاڑیاں ... [illegible] ... راستے سے گزر کر اسکول جایا کرتی تھیں۔ کیونکہ پلاٹ عبور کرنے کے بعد ... گلیاں چھوڑ کر تیسری گلی میں ان کا مکان تھا۔ شاہین کے ساتھ ... دونوں سہیلیاں بھی اسی گلی میں رہتی تھیں۔

وہ اپنی باتوں میں مگن ... خالی پلاٹ عبور کر رہی تھیں

[illegible]

میرا ترکش اور میری ہدایت کے مطابق میں گیٹ کے سامنے میرا انتظار کر رہا تھا۔ رکشہ اسٹارٹ تھا اور میرے بیٹھتے ہی ... کی مکمل پوزیشن میں تھا۔ ... مجھے دیکھ ... [illegible] ... مشہور ہو گیا۔ ... مرکزی ... [illegible] ... کے فاصلے پر تھا کہ ... صاحب کی ... [illegible] ... حال ...

مسعود حسین ... تم نے میرا دل خوش کر دیا۔ تم نے میری ہدایات پر حرف بہ حرف عمل کر کے ... کو شکست دی ہے۔ اب تمہیں اپنی حفاظت کی ضرورت

کہ شاہین کو ہلکا سا چکر آیا۔ اسے یوں محسوس ہوا گویا اس کی آنکھوں کی بینائی یکا یک ختم ہوگئی ہو اور ذہن کسی انجانی قوت کے زیر اثر منجمد ہو کر رہ گیا ہو۔ اسے ہر طرف اندھیرا اور مکمل تاریکی بجھائی دی اور وہ ایک نامعلوم خوف کے تحت سر سے پاؤں تک کانپ اٹھی۔ اسے خود پتہ نہیں تھا کہ اس کی اچانک یہ کیفیت کیونکر ہوئی بس ایک لمحے کے لیے اس نے محسوس کیا جیسے کوئی غیر مرئی سایہ اس سے ٹکرایا ہو اس کے بعد اندھیرا چھا گیا مگر اس کی یہ کیفیت لمحاتی تھی اور چند ساعتوں کے بعد ہی وہ پہلے کی طرح نارمل ہو چکی تھی مگر اس کی لمحاتی کیفیت کا اثر بہت گہرا تھا اب اسے ایک انجانے خوف نے گھیر لیا تھا۔ یکا یک ہی سہیلیوں کی باتوں سے اس کی دلچسپی ختم ہوگئی اور اس کی آنکھوں میں نامعلوم خوف اور چہرے پر گہری سنجیدگی نے ڈیرہ ڈال لیا۔ اس کی سہیلیاں اس کی تبدیل شدہ حالت سے بے خبر ہنسی مذاق کرتی رہیں مگر شاہین کی ساری شوخی اور چلبلا پن کا فور ہو چکا تھا وہ جلد از جلد گھر پہنچنے کی فکر میں تھی۔

پلاٹ وہ کب کا عبور کر چکی تھیں اور اب اپنی گلی میں داخل ہو رہی تھیں۔ کچھ ہی دیر بعد اس کی سہیلیاں اپنے اپنے گھروں میں چلی گئیں اور وہ بھی گھر میں داخل ہوگئی۔

گھر میں داخل ہوتے ہی اچانک اسے رونا آ گیا مگر بے سبب رونے سے سبکی کا احساس بھی تھا۔ لہٰذا اپنی کیفیت کو چھپاتے ہوئے وہ تیزی سے باتھ روم میں گھس گئی اور بے اختیار رو دی۔ کچھ دیر دل کا بوجھ ہلکا کرنے کے بعد اس نے اچھی طرح منہ دھویا اور باہر آ گئی۔

اس کی امی نے اسے دیکھا تو فوراً سمجھ گئیں کیونکہ اس کی سرخ ہوتی آنکھیں اور ستا ہوا چہرہ صاف بتا رہا تھا کہ وہ روئی ہے مگر لاکھ پوچھنے پر بھی اس نے صرف اتنا بتایا کہ مجھے ڈر لگ رہا ہے اور رونا آ رہا ہے۔ بہر حال اس کی امی نے کچھ زیادہ خیال نہ کیا اور شاہین نے کپڑے وغیرہ تبدیل کیے اور کھانے کی میز پر آ گئی۔

کھانے کے دوران اچانک اسے زور کا اچھولگا اور وہ بے حال ہوگئی۔ ان کی امی نے فوراً ہی پانی دیا۔ کمر سہلائی مگر پھر بھی خاصی دیر بعد اس کی حالت اعتدال پر آ سکی۔ وہ کھانا چھوڑ کر اپنی امی کی گود میں لیٹ گئی۔ ماں کی ممتا بھری آغوش میں آئی تو رونا آ گیا۔ اس کی امی اسے چپ کرا تی رہیں مگر اس کے بلاوجہ رونے کا سبب ان کی سمجھ میں نہیں آ سکا۔ وہ یہی سمجھ رہی تھیں کہ شاید اس نے اسکول میں کوئی شرارت کی ہوگی اور ٹیچر نے اسے مارا ہوگا۔ روتے روتے اچانک وہ ہنس پڑی اور پھر مسلسل قہقہے لگانے لگی۔

والدہ نے ڈانٹا کہ یہ کیا بے وقوفی ہے کبھی بے وجہ رو رہی ہو اور کبھی ہنس رہی ہو۔ کیا پاگل ہوگئی ہو۔ مگر وہ خاموش رہی تھوڑی دیر بعد شاہین کو پھر اسی کیفیت نے آ لیا۔ اب کی بار امی نے ذرا سختی سے ڈانٹا جس کے نتیجے میں وہ سہم کر خاموش تو ہوگئی مگر ہر ایک کے چہرے کو اجنبی نظروں سے تکتی رہی۔

شام سے پہلے اسے تیز بخار ہوگیا۔ فوراً ڈاکٹر کے پاس لے جایا گیا جہاں ڈاکٹر نے اس کا ٹمپریچر چیک کر کے دوائیں دیں اور انجکشن لگا کر روانہ کر دیا۔ دواؤں کے اثر سے وہ سوگئی مگر نیند کے دوران اول فول بڑبڑاتی رہی۔

والدہ نے قرآنی آیات کا ورد کر کے اس پر پھونکا اور قرآن مجید کی ہوا دی۔ رات کے پچھلے پہر بخار کا زور ٹوٹا اور کچھ سکون ملا۔ صبح تک وہ بالکل بھلی چنگی تھی مگر چونکہ بخار کے باعث کمزوری پیدا ہوگئی تھی لہٰذا امی نے اسکول نہیں جانے دیا۔

ایک ماہ بعد پھر وہی صورت حال پیدا ہوگئی۔ شاہین اسکول سے آئی اور بے اختیار رونے لگی کبھی خود بہ خود ہنسنے لگتی۔ شام کو پھر بخار نے آ لیا۔ اب تو اس کے والد اور والدہ دونوں کو تشویش لاحق ہوئی۔ ماہر ڈاکٹر سے باقاعدہ مکمل معائنہ کروایا گیا کئی طرح کے ٹیسٹ کے بعد ڈاکٹر نے بہت سی دوائیں تجویز کیں جو باقاعدگی سے استعمال کرائی گئیں۔ مگر ایک مہینے سے بھی کم عرصے میں پھر وہی دورے کی کیفیت نے گھر کے سکون کو درہم برہم کر دیا۔

اس مرتبہ صورت حال یہ تھی کہ شاہین کبھی ہنستی کبھی روتی تھی ساتھ ساتھ مدہوشی کے عالم میں دونوں ہاتھوں کو زور زور سے زمین پر مارتی جس سے نہ صرف اس کے ہاتھوں کی چوڑیاں ٹوٹ گئیں بلکہ ہاتھ بھی زخمی ہوگئے۔ اس کی ابتر حالت کے سبب گھر کے تمام افراد ہی پریشان تھے۔

صبح ہوتے ہوتے اس کی حالت اعتدال پر آ گئی مگر والدین مطمئن نہیں تھے۔ شام کو سعید آباد میں ہی ایک

عامل کے پاس لے گئے۔ جس نے کافی دیر دھونی وغیرہ دینے کے بعد مختلف تعویز دیئے اور صدقے کے طور پر مرغی کا مطالبہ کیا جو پورا کر دیا گیا۔ واپسی کے سفر میں انہیں عامل کے ایک چیلے کی ہدایت پر باہر لگے لوہے کے باکس میں پانچ سو روپے بھی ڈالنے پڑے عامل نے بتایا کہ بچی پر سخت قسم کا ضدی جن ہے اور اس کا اتارا کرنے کے لیے مسلسل چار جمعرات دربار میں حاضری دینا ضروری ہے۔

ڈوبتے کو تنکے کا سہارا کے مصداق اس کی والدہ مسلسل چار جمعرات تک بچی کو عامل کے پاس لے جاتی رہیں جو اس پر اپنے عملیات آزماتا رہا اور ان کی جیب ہلکی کرتا رہا۔ ابھی چوتھی جمعرات گزرے دو دن ہی ہوئے تھے کہ پھر بچی کی وہی کیفیت ہوگئی۔ اس بار اس میں پہلے سے زیادہ جنون اور چیخ و پکار تھی شاہین فضا میں ہاتھ پیر مارتی اور زور زور سے چلاتی۔ وہ اپنے ہاتھ اور پاؤں اتنے وحشیانہ انداز میں زمین پر مارتی کہ کوئی بھی ہوش مند درد سے بلبلا اٹھے مگر وہ درد و تکلیف سے بے نیاز کبھی ہنستی اور کبھی رونے لگتی۔ فوراً ہی رکشہ میں ڈال کر انہی عامل صاحب کے پاس لے جایا گیا جنہوں نے تقریباً ڈیڑھ گھنٹے دھونی دی اور مختلف عملیات کا ورد کرتے رہے۔

شام تک اس کی حالت اعتدال پر آگئی۔ مگر اس کی والدہ ان عامل صاحب سے متنفر ہو چکی تھیں جن کے مسلسل ایک ماہ تک عمل کے باوجود کوئی افاقہ نہیں ہوا تھا۔

کئی لوگوں سے معلوم کرنے کے بعد پتا چلا کہ عثمان آباد میں کوئی بہت پہنچے ہوئے عامل ہیں جو جن وغیرہ اتارنے میں بڑی شہرت رکھتے ہیں۔ والدہ اسے لے کر فوراً وہاں پہنچ گئیں۔ عامل صاحب کے آستانے میں بڑا رش تھا نہ جانے کہاں کہاں سے لوگ اپنے مسائل کے سلسلے میں ان کے پاس آتے تھے۔

لوگوں کی اتنی بڑی تعداد دیکھ کر انہیں اطمینان ہوا کہ یقیناً بزرگ سے لوگوں کو فائدہ پہنچتا ہوگا جبھی اتنی مخلوق یہاں آتی ہے۔

خاصی دیر بعد ان کا نمبر آیا۔ مولوی صاحب نے پوری توجہ سے ان کی روداد سنی اور بڑے اخلاق سے پیش آئے۔ انہوں نے کئی طرح کے وظیفے بڑی بہن کو پڑھنے کے لیے بتائے اور تعویز وغیرہ دے کر رخصت کر دیا۔ بہن ہر ہفتے وہاں جاتیں اور دم وغیرہ کروا کر تعویز لے کر آجاتیں مگر اس بار بھی یہی ہوا۔ بلکہ اس مرتبہ ایک ماہ کے بجائے چوبیس دن بعد ہی دورے کی کیفیت طاری ہوگئی دورے کے دوران بچی کی حالت ایسی ہو جاتی کہ دیکھی نہیں جاتی اب تو پورے گھر کی پریشانی دیدنی تھی۔

محلے والوں اور پاس پڑوس کو بھی اس پراسرار بیماری کی خبر ہوگئی اور سب ہی اپنی اپنی معلومات کے دریا بہاتے ہوئے۔ اس کی امی کا یہ عالم تھا کہ جہاں بھی ذرا سی امید کی کرن نظر آتی چل دیتیں۔ پیسہ پانی کی طرح بہایا گیا مگر بجائے افاقہ کے ”درد بڑھتا گیا جوں جوں دوا کی“ والا حساب ہوتا رہا۔

شروع میں دورہ ایک ماہ بعد پڑتا تھا پھر پانچ دن کم ہوئے اور اس طرح کم ہوتے ہوتے اب صورت حال یہ تھی کہ دن میں کئی کئی بار دورے کی کیفیت طاری ہو جاتی اور دوران دورہ بچی کی حالت اس قدر ابتر ہو جاتی کہ دیکھا نہیں جاتا۔ عاملوں، پیروں، فقیروں کے آستانے کے چکر جاری تھے۔ ساتھ ہی طبی علاج بھی باقاعدگی سے جاری تھا مگر تمام تر کوششوں کے کوئی فائدہ نظر نہیں آرہا تھا۔

ماہ ربیع الثانی تیزی سے قریب آرہا تھا اس روز حیدر آباد میں ہمارے گھر میں ہر سال محفل سماع اور لنگر کا اہتمام ہوتا ہے۔ میرے والد ظہیر شاہ حضرت شاہ فیاض علی کے خلیفہ ہیں۔ محفل بابرکت میں تمام ہی پیر بھائی مریدین اور دیگر اہل ذوق بڑی تعداد میں شرکت کرتے ہیں۔ اس سال بہن نے بھی پختہ ارادہ کیا ہوا تھا کہ وہ بچوں سمیت اس محفل میں ضرور شرکت کریں گی۔ لہٰذا تیاریاں شروع ہوگئیں۔ یہ جمعرات کا دن تھا اور کل یعنی بروز جمعۃ المبارک محفل سماع اور لنگر خوانی کا پروگرام تھا۔

رات کو محفل سماع، فاتحہ خوانی اور لنگر کا پروگرام نہایت شاندار رہا اور رات لمحوں میں گزر گئی۔ کچھ لوگوں کو آج جانا تھا اور کچھ ایک دو روز ٹھہر کر جانے کا پروگرام بنائے بیٹھے تھے کہ شام کے وقت اچانک ہی شاہین پر دورے کی کیفیت طاری ہوگئی۔ تمام افراد کھانے سے فارغ ہو چکے تھے اور برتن اٹھائے جا رہے تھے۔ ”شاہین کیا ہفتے بھر کا کھانا اکٹھا کھا لوگی“۔ میری دوسری بھانجی نے مذاقاً کہا اور سب ہنسنے لگے۔ شاہین سب سے بے نیاز کھانے میں

مشغول رہی۔ "نیاز کی وجہ سے اس کی امی نے چار روز پہلے ہی کھانا پکانا بند کر دیا تھا۔" چھوٹی باجی نے کہا اور کمرہ قہقہوں سے گونج اٹھا۔

"تم سب کیوں میری بچی کے پیچھے پڑے ہو وہ آہستہ آہستہ کھاتی ہے۔ اسے اطمینان سے کھانا کھانے دو"۔ نانی نے سب کو پیار سے جھڑکا۔ مگر بچے بھی شرارت پر آمادہ تھے بھلا وہ کہاں مانتے۔

"کھانے کو ہم نے کب منع کیا ہے۔ مگر یہاں تو مالِ مفت دلِ بے رحم والا معاملہ ہے۔ اگر مال پرایا ہے تو کیا ہوا پیٹ تو اپنا ہے"۔ بڑی بھابی نے کہا۔ شاہین نے اپنی سرخ سرخ آنکھوں سے انہیں گھورا اور پانی سے بھرا گلاس اٹھا کر فرش پر دے مارا۔ چھناکے کی آواز سے کانچ کا گلاس کئی ٹکڑوں میں منقسم ہو گیا۔ تمام افراد زور زور سے ہنسنے لگے۔

"تم کسی کو کھاتے ہوئے بھی نہیں دیکھ سکتے۔ میں کھا رہی ہوں تو تمہیں کیوں تکلیف ہو رہی ہے"۔ شاہین غضب ناک تیوروں سے دھاڑی اس کی چیختی ہوئی بھاری آواز سن کر اس کی امی دوڑتی ہوئی دوسرے کمرے سے آئیں۔ بچے ابھی بھی ہنس رہے تھے۔

انہوں نے شاہین کو سینے سے چمٹا لیا۔ مگر شاہین تو گویا بھری بیٹھی تھی۔ اس نے پوری قوت سے ان کے ہاتھ جھٹکے اور اٹھ کھڑی ہوئی۔ باجی جھٹکے کے باعث گرنے ہی لگی تھیں کہ چھوٹے بھائی نے لپک کر انہیں سنبھال لیا۔

اب تو گویا سب کو سانپ سونگھ گیا۔ سب ہی کو علم تھا کہ شاہین پر شیطان کا سایہ ہے اور اس وقت شاید وہ اسی کے زیرِ اثر ہے۔ بچے کچھ زیادہ ہی خوفزدہ تھے دو تین بچے تو نانی کی گود میں دبک گئے۔ مگر چھوٹے بھائی حیدر حسین نے ہمت سے کام لیتے ہوئے باجی کو سہارا دیا اور شاہین کو بھی ہاتھ سے پکڑ لیا۔

شاہین نے اپنی انگارہ ہوئی آنکھوں سے حیدر کو گھورا۔ وہ گھبرا کر اس سے نگاہیں چرانے لگا۔ مگر اب گھر کے بڑے سنبھل چکے تھے اور یوں بھی وہ ایک صوفی بزرگ کا گھر تھا۔ گھر والوں کے لیے یہ معاملہ نیا نہیں تھا۔ خصوصاً چھوٹی باجی تو والد کے پیر صاحب کی بہو بھی تھیں اور اس سلسلے میں تھوڑا بہت علم بھی رکھتی تھیں انہوں نے اپنی گود میں موجود اپنی چھوٹی بیٹی کو باجی کے حوالے کیا اور لپک کر شاہین کی چٹیا پکڑ لی اور منہ ہی منہ میں کچھ پڑھنے لگے۔ چٹیا پکڑنے پر پہلے تو شاہین انہیں گھورتی رہی مگر کسی قسم کا ردعمل نہ پا کر زور آزمائی شروع کر دی۔ باجی کو بھی شاید یہی توقع تھی لہٰذا انہوں نے اپنی گرفت مضبوط رکھی اور پوری قوت سے چٹیا پکڑے زیرِ لب کچھ پڑھتی رہیں۔

چند لمحوں میں ہی شاہین کی حالت غیر ہونے لگی۔ اس نے فرش پر بیٹھ کر اپنی گردن گھٹنوں میں ڈال دی۔ چھوٹی باجی بدستور پڑھائی میں مشغول رہیں۔

"چھوڑ مجھے...... میں کہتا ہوں چھوڑ"۔ شاہین پوری قوت سے دھاڑی اگر چھوٹی باجی کی گرفت ذرا بھی کمزور ہوتی تو وہ اپنی چٹیا چھڑانے میں کامیاب ہو جاتی۔

اس کی زور آزمائی مردانہ بھاری آواز اور مردانہ جملوں سے سب ہی کو یقین ہو گیا کہ اس وقت شاہین اپنے ہوش میں نہیں ہے۔ اور ایک ایسے شخص کا وجود اس کمرے میں پایا جاتا ہے جو نظر نہیں آ رہا مگر شاہین کی کیفیت کے ذریعے اپنی اپنی موجودگی کا ثبوت پیش کر رہا ہے۔

مسئلہ یہ تھا کہ والد محترم بھی گھر پر نہیں تھے اور پیر صاحب بھی محفل میں شرکت کے بعد آج ہی کراچی روانہ ہو گئے تھے۔

شور و غل کے باعث دوسرے کمرے میں موجود چھوٹی باجی کے شوہر خلیل بھائی صاحب اور دیگر افراد بھی دوڑے چلے آئے۔ خلیل بھائی صاحب نے ایک ہی لمحے میں صورت حال کا ادراک کر لیا۔ انہوں نے کمرے میں موجود تمام افراد کو خاموش اور شاہین سے دور رہنے کا اشارہ کیا اور میرے چھوٹے بھائی کے کان میں کچھ ہدایت دیں جنہیں سن کر میرا چھوٹا بھائی دو زانو ہو کر بیٹھ گیا اور خلیل بھائی نے اپنی جیب سے رومال نکال کر سر پر باندھا اور قعدہ کی حالت میں بیٹھ گئے اور نہایت خشوع و خضوع سے قرآن مجید کی مخصوص آیات کا ورد کرنے لگے۔ ایک جانب میرا چھوٹا بھائی پڑھائی میں مشغول تھا تو دوسری جانب خلیل بھائی بھی مخصوص آیات کا ورد کر رہے تھے اور تیسری جانب چھوٹی باجی شاہین کی چٹیا پکڑے پڑھائی میں مصروف تھیں۔

تین طرفہ حملوں سے شاہین پر حاوی وہ شیطان تلملا اٹھا اور شاہین اندھوں کی طرح ہاتھ چلاتے ہوئے پوری قوت

سے اپنی چٹیا چھڑانے کی کوشش کرنے لگی۔
واضح طور پر محسوس ہو رہا تھا کہ ان تینوں کے مقدس آیات کے ورد کے باعث وہ شیطان سخت پریشان ہے اور ہر صورت میں فرار ہو جانا چاہتا ہے مگر ان لوگوں نے بھی ایک دوسرے کو آنکھ سے اشارہ کر کے اپنے اتحاد کی تجدید کی اور پڑھائی میں مشغول رہے۔
تقریباً پندرہ منٹ بعد ہی شاہین کی حالت غیر ہو گئی۔ وہ پوری قوت سے اپنے جسم کو جھٹکتے ہوئے دھاڑیں مار مار کر رونے لگی اور ساتھ ہی چٹیا چھوڑنے کے لیے منت سماجت پر اتر آئی۔ جب اس کی منت سماجت کا کسی پر کوئی اثر نہ ہوا تو اس نے دھمکیاں دینا شروع کر دیں۔ واضح طور پر یہ آواز شاہین کی نہیں تھی بلکہ اسی شیطان کی تھی جو عرصہ دراز سے اسے پریشان کرتا چلا آ رہا تھا۔
''دیکھ کمبخت مجھے چھوڑ دے۔ میں چپ چاپ چلا جاؤں گا''۔ شیطان گونجتی ہوئی رعب دار آواز میں بولا مگر اس کے لہجے میں شکست کا عنصر نمایاں محسوس کیا جا سکتا تھا۔ باجی سمجھ گئیں کہ وہ خالی خولی دھمکیاں دے رہا ہے۔ ورنہ در حقیقت اس مرحلے پر وہ بے بس ہو چکا تھا انہوں نے دل میں ایک فیصلہ کرتے ہوئے پڑھائی کے سلسلے کو ترک کیا اور بولیں۔
''چل اچھا میں تیری بات مان لیتی ہوں اور تجھے جانے بھی دوں گی مگر اس بات کی کیا گارنٹی ہے کہ تو دوبارہ نہیں آئے گا''۔
''میں وعدہ کرتا ہوں۔ دوبارہ کبھی نہیں آؤں گا''۔ شیطان نے باقاعدہ ہاتھ جوڑتے ہوئے کہا۔
''مجھے مت چلا، شیطان کے چیلے جو پوچھ رہی ہوں وہ بتا۔ تو دوبارہ نہیں آئے گا میں کیسے یقین کر لوں''۔ باجی نے سختی سے کہا۔
تم جیسی چاہو قسم لے لو۔ میں دوبارہ نہیں آؤں گا''۔ وہ منمناتے ہوئے بولا۔ خلیل بھائی اور میرا چھوٹا بھائی حیدر بدستور پڑھائی میں مصروف تھے اور شاید اس پڑھائی کی تپش ہی تھی جو اس شیطان کو جھلسائے دے رہی تھی اور وہ جلد از جلد فرار کی فکر میں تھا۔
''تیرا نام کیا ہے؟'' باجی نے گفتگو کا رخ تبدیل کرتے ہوئے سوال کیا۔
''وکرم سنگھ'' اس نے فوراً جواب دیا۔
''بچی کو کیوں پریشان کر رہا ہے؟'' چھوٹی باجی پھر بولیں۔
''یہ مجھے اچھی لگتی ہے''۔ اس نے عجلت سے نہایت مختصر جواب دیا۔
''کیا خیال ہے تجھے جلا کر ہمیشہ کے لیے بھسم کر دیا جائے؟'' باجی چبھتے ہوئے لہجے میں بولیں۔
''نہیں یہ غضب مت کرنا۔ مجھ سے غلطی ہو گئی۔ میں بھگوان کی قسم کھا کر کہتا ہوں کہ آئندہ پھر کبھی نہیں آؤں گا''۔ وہ باقاعدہ گڑگڑانے لگا۔
''کب سے اس بچی کا پیچھا کر رہا ہے؟'' باجی نے اس کے گڑگڑانے کو نظر انداز کرتے ہوئے سوالات کا سلسلہ جاری رکھا۔
''چار سال سے۔ میں نے تمہارے سوالات کے جواب دیدیئے ہیں اب تو مجھے جانے دو''۔ شیطان تقریباً روتے ہوئے بولا۔ مگر باجی نے بھی شاید دل میں عہد کر لیا تھا کہ وہ اس شیطان کی پوری ہسٹری معلوم کر کے رہے گی۔
''تیرے باپ کا کیا نام ہے اور تو کس خاندان سے تعلق رکھتا ہے''۔ باجی اس کی کیفیت سے محظوظ ہوتے ہوئے بولیں۔ وہ دل ہی دل میں اپنی اس کامیابی پر خوش بھی تھیں۔
اچانک شاہین نے زور کا جھٹکا مارا اور باجی کی گرفت سے اس کی چٹیا نکل گئی۔ باجی فتح کے نشے میں اس کی چٹیا پر اپنی گرفت مضبوط نہ رکھ سکی تھیں۔ اس شیطان نے اپنی بے بسی کا اظہار کرتے ہوئے باجی کو خوش فہمی میں مبتلا کر دیا تھا اور اپنی ناکامی کا تاثر دیتے ہوئے باجی کے سوالات کے جوابات دیتا رہا پھر جوں ہی اسے باجی کی غفلت کا اندازہ ہوا اس نے مکاری سے کام لیتے ہوئے اپنی تمام تر توانائی استعمال کی اور خود کو ان کی گرفت سے آزاد کر لیا۔
باجی نے ایک عامل کی نگاہ سے دیکھا کہ ایک سایہ بیرونی دروازے کی جانب دوڑا مگر وہاں پر لوبان جل رہا تھا۔ وہ وہاں سے پلٹا اور تیزی سے اوپر جانے والی سیڑھیوں کی جانب ہو لیا۔ اس کے بعد کچھ خبر نہیں ہوئی کہ وہ کہاں گیا۔

شاہین بے سدھ ہو کر لیٹ گئی۔ بڑی باجی نے لپک کر اسے اپنی گود میں بھر لیا اور پیار سے اس کی پیٹھ سہلانے لگیں۔ تھوڑی دیر بعد وہ مکمل ہوش میں تھی۔ ہوش میں آتے ہی اس نے کمرے میں موجود افراد کو ایسے دیکھا گویا پہلی بار دیکھ رہی ہو۔

''تم لوگ یہاں بیٹھے کیا کر رہے ہو؟'' اس نے حیرت سے کہا پھر مزید بولی۔ ''میرا کھانا کہاں؟ امی مجھے بھوک لگ رہی ہے۔ میں نے کھانا نہیں کھایا''۔ وہ معصومیت سے بولی اور سب کے ہونٹوں پر پھیکی سی مسکراہٹ پھیل گئی۔ وہ دوسروں کی کیفیت سے بے خبر اپنی والدہ کی گود میں سر رکھ کر لیٹ گئی۔

اس واقعے کے بعد تو چھوٹی باجی پورے گھر میں ہیرو بن گئیں۔ سب ہی چھوٹے بڑے ان کی تعریف کر رہے تھے اور وہ فخر سے ہر ایک کو اپنے کارنامے کی تفصیل سنا رہی تھیں۔ مگر باجی دل ہی دل میں خوفزدہ بھی تھیں۔ دراصل انہیں اس قسم کے شیطانی عمل اتارنے کا نہ تو کوئی تجربہ تھا اور نہ ہی پیر صاحب کی طرف سے کسی قسم کی اجازت تھی۔ چونکہ اس قسم کے مشاہدات درجنوں بار ان کی نظر سے گزر چکے تھے۔ لہٰذا اپنے مشاہدات کی روشنی میں دونوں میاں بیوی عمل تو کر گزرے مگر اب یہ خوف لاحق تھا کہ کہیں وہ شیطان بدلہ لینے کی غرض سے کسی بچے وغیرہ کو تنگ کرنا شروع نہ کر دے۔

بظاہر وہ بڑی مطمئن اور فتح پر نازاں تھیں مگر دل کے کسی انجانے گوشے میں ایک نامعلوم سا خوف بھی پنہاں تھا اور ان کا یہ خوف کچھ غلط بھی نہیں کیونکہ آنے والے واقعات نے ان کے اندیشوں کی تصدیق کر دی۔

میری والدہ اس وقت باتھ روم میں تھیں جب وہ شیطان چیخا چھڑا کر فرار ہو رہا تھا۔ تقریباً آدھے گھنٹے بعد وہ باتھ روم سے برآمد ہوئیں تو ان کا جسم پسینہ میں شرابور تھا اور چہرے سے سخت خوف کا اظہار ہو رہا تھا۔

گھر کے تمام افراد اپنی اپنی بولیاں بول رہے تھے کسی نے بھی ان کے دیر سے آنے اور خوفزدگی کی کیفیت کا نوٹس نہیں لیا۔ وہ کمرے میں آ کر نیم دراز ہو گئیں اور میری سب سے چھوٹی بہن سے دوران ذکر کا پڑھا ہوا پانی مانگا۔ بہن دوسرے کمرے میں گئیں یہ کمرہ آستانے کے طور پر بھی استعمال ہوتا ہے۔ وہاں سے بوتل میں رکھا ہوا پانی لے آئی اور والدہ کو دینے لگی وہ نہایت پھرتی سے اٹھیں اور شدید غصے کی حالت میں گلاس پر ہاتھ مارتے ہوئے غصے سے چلا کر بولیں۔ ''بدبخت! مجھے زہر پلا رہی ہے۔ ٹھہر میں تجھے بتاتی ہوں۔'' اپنی بات مکمل کر کے وہ نہایت سرعت سے اٹھیں اور چھوٹی بہن کو مارنے کے لیے لپکیں مگر حیدر ان کے قریب ہی تھا اس نے ان کا راستہ روکا اور ہاتھ پکڑ کر ایک طرف دیا۔

ان کی اچانک بدلتی ہوئی کیفیت سے سب ہی سہم گئے۔ شاہین والا واقعہ سب کے ذہنوں میں تازہ تھا اور امی کی حالت بھی غیر ہو رہی تھی۔ جو کہ کچھ دیر قبل شاہین کی تھی ان کی آواز میں بھی غیر فطری پن جھلک رہا تھا۔

چھوٹے بھائی حیدر نے فوراً آیت الکرسی پڑھ کر ان پر پھونکا کئی بار اس عمل کو دہرانے سے ان کی طبیعت قدرے معمول پر آئی۔

مگر اب سب کی بولتی بند ہو چکی تھی اور تمام اہل خانہ خصوصاً بچے سراسیمگی کا شکار تھے۔ اس کی وجہ یہ بھی تھی کہ جب شاہین کی طبیعت خراب ہوئی تھی وہ نانی کی گود میں چھپ گئے تھے۔ اب نانی خود اس شیطان کے زیر اثر تھیں وہ کہاں پناہ حاصل کریں۔

اب کی بار چھوٹی باجی بھی واضح طور پر پریشان نظر آ رہی تھیں۔ مگر ان حالات میں چھوٹے بھائی حیدر اور میرے بہنوئی خلیل بھائی نے ہمت سے کام لیا اور وہ قرآنی آیات پڑھ کر امی پر پھونکتے رہے۔ چند منٹ کی محنت کے بعد والدہ ماجدہ معمول کے مطابق گفتگو کرنے لگیں۔ یوں محسوس ہو رہا تھا گویا انہیں کچھ دیر قبل کی کیفیت کے متعلق کچھ علم ہی نہ ہو۔ لیکن اب صورت حال مختلف ہو چکی تھی۔ بچے والدہ کے نزدیک جاتے ہوئے ڈر رہے تھے جب کہ وہ اپنی عادت کے مطابق بچوں کو پکڑ پکڑ کر قریب بٹھاتیں اور بچے بدک کر دور بھاگتے۔ گو کہ یہ صورت حال خاصی سنجیدہ اور تکلیف دہ تھی مگر چویشن کچھ ایسی بنی کہ اس میں فراق کا پہلو نکل آیا اور سب ایک دوسرے کا مذاق اڑانے لگے۔

رات کو جب سونے کا وقت ہوا تو صورت حال مزید دلچسپ ہو گئی۔ والدہ جہاں بھی سونے کے لیے لیٹتیں بچے

فوراً بھڑک کر انہیں وہاں سے اٹھا دیتے اور کہتے۔ ''نہیں نانی آپ اس طرف سو جائیں میرے پاس نہیں سوئیں۔''

اچانک والدہ نے گھورتی آنکھوں سے چھوٹی باجی کی طرف دیکھا اور نہایت غصے سے بولیں۔ ''تجھے تو میں چھوڑوں گی نہیں، تیری وہ حالت کروں گی کہ تو یاد کرے گی تو نے مجھے بہت تنگ کیا ہے۔''

''میں نے تمہیں کیا کہا ہے؟ امی! میں تو تم سے اتنی دور بیٹھی ہوں۔'' ریحانہ باجی معصومیت سے بولیں اور اس سے قبل کہ امی ان پر جھپٹتیں وہ دوڑ کر کچن میں گھس گئیں۔ خلیل بھائی نے بڑی مشکل سے انہیں قابو کیا اور کچھ پڑھ کر دم کیا جس سے ان کی حالت قدرے معمول پر آئی۔ مگر اب بچے اور زیادہ نانی سے خوف زدہ تھے۔

خدا خدا کر کے رات کٹی یہ شب گھر کے تقریباً تمام ہی افراد نے آنکھوں میں کاٹی خوف کے باعث کسی کو نیند نہیں آرہی تھی حد تو یہ کہ آپس میں گفتگو کرتے ہوئے بھی ڈر لگ رہا تھا۔

صبح ہی فجر کی نماز کے بعد چھوٹی باجی اپنا سامان وغیرہ پیک کر کے بچوں کے ہمراہ جانے کے لیے تیار ہو گئیں۔ انہیں تیار دیکھ کر بڑی باجی حیرانی سے بولیں۔ ''کیا تم جا رہی ہو؟''

''ہاں باجی میں جا رہی ہوں۔'' بڑی باجی کی حیرت دور نہیں ہوئی۔ لیکن چھوٹی باجی خاموش رہیں۔ ذرا توقف کے بعد بڑی باجی نے کہا۔ ''اچھا ذرا ٹھہرو میں امی کو جگا دوں۔ ان سے مل کر جانا۔'' اپنی بات مکمل کر کے وہ بستر کی جانب بڑھیں مگر چھوٹی باجی نے لپک کر ان کا بازو پکڑ لیا اور بولیں۔

''نہیں...... نہیں...... امی کو مت مگانا ان کی نیند خراب ہوگی۔'' ان کے لہجے سے صاف عیاں تھا کہ وہ خوف زدہ ہیں۔ ان دونوں کی گفتگو بچے بھی سن رہے تھے ان کی اندرونی کیفیت محسوس کر کے بے ساختہ ہنس پڑے۔ بچوں کے قہقہے اور شور وغل کے باعث امی بھی جاگ گئیں اور جب انہوں نے چھوٹی باجی کو جانے کے لیے تیار دیکھا تو بڑے پیار سے بولیں۔

''ارے بیٹا! تو کیوں جا رہی ہے۔ جب تک میری زندگی ہے تم لوگوں کو کوئی بھی اس گھر میں رہنے سے نہیں روک سکتا۔'' امی نہایت پیار سے انہیں سمجھانے لگیں۔ اس موقع پر خلیل بھائی صاحب کی حس مزاح پھڑکی اور وہ زیر لب بولے۔

''تمہاری وجہ سے تو یہ جا رہی ہیں۔'' ان کی بات سن کر کمرہ ایک بار پھر قہقہوں سے گونج اٹھا۔

ان سب کے جانے کے بعد گھر میں صرف میری سب سے چھوٹی بہن اور امی رہ گئیں۔ ان حالات میں والد محترم نے عملیات کا ورد جاری رکھا اور وہ شیطان کوئی بڑی حرکت کرنے میں کامیاب نہیں ہو سکا۔ بس کبھی کبھار ہی امی کو بلا ضرورت غصہ آجاتا اور وہ اول فول بکنے لگتیں اس صورت میں انہیں ورد کیا ہوا پانی پلا دیا جاتا۔ جس سے ان کی طبیعت اعتدال پر آجاتی۔

اس واقعے کے تقریباً دو ماہ بعد میں پیر صاحب کو لے کر حیدر آباد پہنچا۔ آتے ہوئے میں نے چھوٹی باجی سے ازراہ مذاق حیدر آباد چلنے کو کہا تو انہیں نے فوراً کانوں پر ہاتھ رکھ دیئے اور میں مسکرا کر رہ گیا۔ پیر صاحب نے سب سے پہلے پورے گھر کا مکمل جائزہ لیا اور باقاعدہ عملیات کا آغاز کیا۔ پیر صاحب نے اپنے عمل سے اس شیطان کو حاضر ہونے پر مجبور کیا اور اسی کی زبانی سے اس کی ہسٹری معلوم کرتے رہے۔ اپنے عمل سے فارغ ہو کر پیر صاحب نے بتایا کہ اس شیطان سے مکمل طور پر چھٹکارا حاصل کرنے کے لیے تین روز کا وظیفہ کرنا پڑے گا اور اس کے لیے ایک سیاہ مرغی اور تین دیسی انڈوں کی ضرورت ہے۔

ان کی مطلوبہ اشیاء انہیں فراہم کر دی گئیں اور انہوں نے اپنے لیے مخصوص کردہ کمرے میں مکمل سکونت اختیار کر لی۔

دن بھر تو مرد وخواتین و مریدین ان سے ملنے آتے رہے اور اپنے مسائل سے آگاہ کرتے رہے۔ رات کو عشاء کی نماز کے بعد پیر صاحب نے مصلح سنبھالا اور وظیفہ میں مشغول ہو گئے۔

سیاہ مرغی کمرے میں موجود تھی اور ایک انڈہ پیر صاحب کے سامنے رکھا تھا۔ کمرہ لوبان کی دھونی کے سبب پر اسرار خوشبو میں بسا ہوا تھا۔ پیر صاحب نے وظیفہ شروع کرنے سے قبل کمرے کی ٹیوب لائٹس بند کروا کر صرف زیرو کا بلب روشن کروایا تھا۔ اندھیرے کے باعث کمرے

کی فضا سحر انگیز اور پراسرار ہوگئی۔

پیر صاحب تسبیح کے دانوں پر کچھ پڑھتے رہے اور جب تسبیح مکمل ہو جاتی تو اپنے سامنے رکھے انڈے اور مرغی پر پھونک مارتے پھر تسبیح پڑھنے میں مشغول ہو جاتے۔ ان کا یہ عمل تقریباً دو گھنٹے جاری رہا۔ میں حیران تھا کہ اتنی ضعیفی کے باوجود پیر صاحب ایک ہی نشست میں بیٹھ کر کس طرح پڑھائی کر لیتے ہیں۔ فجر کی نماز کے بعد انہوں نے انڈہ مجھے دیا اور کسی چوراہے پر رکھ کر آنے کی ہدایت کی میں ان کی ہدایت پر عمل کرتے ہوئے پنجرہ پول چوک پر انڈے کو رکھ دیا۔

دوسرے دن بھی حسب معمول عمل کیا گیا اور صبح میں انڈا چوراہے پر رکھ کر آیا۔ آج تیسرا دن تھا اور رات کو اس سلسلے کے آخری وظیفے کی ادائیگی کرنا تھی۔ پیر صاحب کی طبیعت صبح ہی سے بگڑنے لگی۔ فوری طور پر ڈاکٹر کو بلوایا گیا جس نے چند دوائیں تجویز کیں اور آرام کرنے کی ہدایت دے کر رخصت ہو گیا۔ پیر صاحب نے دوائیں تو کھالیں مگر اب مخصوص تسبیح کا ورد بھی جاری رکھا۔ جس سے حیرت انگیز طور پر ان کی طبیعت نہ صرف بالکل ٹھیک ہوگئی بلکہ وہ پہلے سے زیادہ ہشاش بشاش اور حسین نظر آنے لگے۔

پیر صاحب نے مجھے بتایا کہ آج کی رات کا عمل ذرا طویل ہوگا۔ وہ آج بعد نماز عشاء عمل شروع کریں گے اور رات تقریباً ایک بجے تک جاری رکھیں گے۔ اس دوران مجھے بھی اپنا بھرپور کردار ادا کرنا تھا۔ وہ عمل شروع کرنے کے بعد گیارہ تسبیح مکمل ہونے پر مرغی مجھے دیں گے اور میں نے مرغی کو ٹنڈے یوسف کے قبرستان کے وسط میں چھوڑ کر آنا ہے۔ مجھے اس طرح سے وہاں پہنچنا تھا کہ قبرستان کے وسط میں پہنچتے پہنچتے لگ بھگ بارہ بجے کا عمل ہو۔ ساتھ ہی انہوں نے سختی سے ہدایت کی کہ مرغی کو قبرستان میں چھوڑنے کے بعد پیچھے مڑ کر ہرگز نہیں دیکھنا۔ کیونکہ ان کے بقول وہ اپنے عمل کی قوت سے اس شیطان کے غیر مرئی جسم کو اس مرغی کے جسم میں قید کر دیں گے۔ وہ شیطان قید سے بچنے کے لیے مزاحمت کے طور پر مختلف حیلوں بہانوں سے مجھے پیچھے مڑ کر دیکھنے پر مجبور کریگا اور اگر میں نے پیچھے دیکھ لیا تو نتیجے کے طور پر نہ صرف پیا صاحب کا تین روزہ عمل ضائع ہو جائے گا۔ بلکہ خود مجھے بھی ناقابل تلافی نقصان پہنچ سکتا ہے۔

یہ تمام ہدایت وظیفہ شروع کرنے سے قبل ہی پیر صاحب نے مجھے ذہن نشین کرا دی تھیں اور میں ذہنی طور پر ہر قسم کی صورت حال سے نمٹنے کے لیے تیار تھا۔ ان کے وظیفے کے نتیجے میں، میں اب تک دو انڈے چوراہے پر رکھ آیا تھا۔ بعد میں اپنے تجسس کے باعث میں نے چوک پر جا کر دیکھا بھی تھا مگر وہ انڈے وہاں موجود نہیں تھے۔

مرغی قبرستان میں چھوڑ کر جب میں گھر واپس آیا تو پیر صاحب اپنے عمل میں مشغول تھے۔ میری واپسی کے چند منٹ بعد انہوں نے اپنا عمل ختم کر دیا اور مجھے قریب بٹھا کر مجھ پر کچھ پڑھ کر پھونکا۔

درحقیقت میرے لیے یہ واقعہ بڑا سنسنی خیز اور خوفناک تھا اگر کوئی کمزور دل شخص ہوتا تو یقیناً اسے ہارٹ اٹیک ہو جاتا یہ میری مضبوط قوت ارادی اور خدا پر کامل یقین کی طاقت تھی کہ میں اس مشکل مرحلے سے صحیح و سلامت واپس لوٹ آیا۔

میں نے پیر صاحب کی ہدایت پر دو رکعت نماز شکرانہ ادا کی اور ان کے بتائے ہوئے طریقے سے جائے نماز پر ہی نشست لگا کر بیٹھ گیا۔

تسبیح میرے ہاتھ میں تھی اور میں اس کے ہر دانے پر تین تین بار آیت الکرسی کا ورد کرتا رہا۔ مجھے خبر ہی نہیں ہوسکی نہ جانے کتنا وقت گزر گیا مجھے ہوش اس وقت آیا جب تسبیح مکمل ہو چکی تھی۔ تسبیح ختم ہونے کے بعد میں نے گیارہ مرتبہ درود شریف پڑھے اور مختصر سی دعا کے بعد مصلیٰ اٹھا دیا۔

پیر صاحب نے بتایا کہ اب ہمیشہ ہمیشہ کے لیے تمہارا اس شیطان سے پیچھا چھوٹ چکا ہے اور اسے روحوں کے ایسے مسکن میں قید کیا گیا ہے جہاں سے وہ اب کبھی بھی انسانوں کو تنگ کرنے کے لیے نہیں آسکے گا۔



باعصمت

پرویز احمد دولو

جب محافظ عزتوں کے لٹیرے بن جائیں اور دوسروں کے آشیانے
نذر آتش کرکے تماشا دیکھنے والوں پر جب بنتی ہے تو کیا ہوتا ہے۔
جاگیردارانہ معاشرے کے پس منظر میں ایک خوب صورت تحریر۔

بہتے آنسو کرب کو ظاہر کرتے ہیں پرنم آنکھیں ہی دکھ کے زخموں کو زبان دیتی ہیں آنسو من کے اندر دہکتے دکھوں کے الاؤ کے اظہار کا ذریعہ ہیں۔ کرب کے جوار بھاٹے کو ان ندیوں کے کناروں سے باہر آ کر ساون بھادوں کی بارشوں کی طرح من کے صحرا کو جھل تھل کرنا چاہیے۔ ہر گرنے والا آنسو اپنے اندر دکھوں کی المناک داستان سمیٹے ہو پھر اس بہتی گنگا کو روکنے والا کوئی نہ ہو، اگر یہ آنسو بہنا رک جائیں تو ہر انسان کو اندر سے گھائل کر کے زندہ درگور کردیتے ہیں۔

بے شک مرد نہیں روتے مگر دکھ کا الاؤ تو سب کو جلا کر راکھ کردیتا ہے بے زبان جذبوں کو زبان دیتا ہے۔ مرد و زن کی تمیز ختم ہوجاتی ہے۔ غم کی شدت اسے رونے پر مجبور کردیتی ہے۔

مگر وہ عجیب انسان تھے اس کے اندر غم وغصہ رنج وغم اور درد کے قافلے ماتم کناں تھے مگر اس کی آنکھیں یتیم کی زندگی اور بیوہ کے جیون کی طرح اجڑی اجڑی پیاسی پیاسی تھی یا تو آنسو خشک ہوگئے تھے یا وہ رونا ہی نہیں چاہتا تھا۔

مگر ایسا تو ممکن ہی نہ تھا کہ وہ دکھ کی آگ میں نہ جل رہا ہو، اس کی غیرت کا جنازہ نکل گیا تھا اس کی پھولوں کی طرح نرم و نازک گڑیا جیسی ناز و نعم میں پلی بیٹی کی کروڑوں سے مہنگی عزت پر ڈاکہ ڈالا گیا تھا اس کے جگر کے ٹکڑے کی غیرت اور عزت کے خزانے کو دن دیہاڑے لوٹنے کی کوشش کی گئی تھی۔

وڈیرے کی عزت پر ڈاکہ ڈالنے والا کوئی اور نہ تھا اس کے گاؤں کا کمی اس کے ٹکڑوں پر پلنے والا، اس کی دہلیز پر بیٹھ کر دم ہلانے والا اس کے گھر میں برتن دھونے اور جھاڑو مارنے والا۔

حویلی کے چمکتے سورج کو گرہن لگ گیا تھا اب وڈیرے سائیں کو گاؤں کے کمیوں نے بھی آنکھیں دکھانا شروع کردی تھیں ان کی غیرت بھی جاگ اٹھی تھی لوگوں کے بولیاں بولنے اور طعنے دینے پر غیرت ان کے اندر بھی پھڑ پھڑانے لگی تھی۔ ان کی آنکھوں میں بھی غیرت کے دیے جلنے شروع ہوگئے تھے اب وہ بھی محترم ہوگئے تھے۔

یہ ایک تلخ حقیقت ہے کہ غریب لوگ تو ہوتے ہی بے نام ہیں ذات، نام، پہچان کچھ نہیں ہوتا ان کے پاس بڑے لوگوں کی خوشنودی کے لیے اپنی جان سے گزر جانا ان کے ذمہ ہوتا ہے غلامی ان کی گھٹی میں رچی بسی ہوتی ہے عزت، غیرت، انا، خودداری کے معنی تک نہیں جانتے بے نام پیدا ہوتے ہیں اور بے نام ہی اس جہاں سے گزر جاتے ہیں ان کے ذمہ جی حضوری کے علاوہ کچھ نہیں ہوتا۔

اگر ان کے اندر بھی غیرت کے جراثیم پیدا ہونا شروع ہوجائیں یہ بھی انا کا علم بلند کرنا شروع کردیں، عزت کی حرمت کے لیے جان پر کھیل جائیں غیرت کے لیے مرنے مارنے پر تل جائیں تو پھر ان وڈیروں کی بگڑی اولادوں کو دن میں تارے نظر آجائیں۔ ان کو بھی پاؤں پھونک پھونک کر رکھنا پڑیں ان کی وہسکی اور دولت کا نشہ سیکنڈوں میں ہرن ہوجائے۔ ان کو دن کی روشنی اور رات کی تاریک میں ماں بہن کا فرق نظر آجائے۔

اگر وڈیروں کی سرزمین پر غیرت کے سپوت کھمبیوں کی طرح زمین سے سر نکالنا شروع کردیں اپنی بہو، بیٹیوں، بہنوں کی عصمت کی حرمت، وڈیرے کی جوان دوشیزہ کی عزت کی طرح کرنی شروع کردیں تو وڈیرے سائیں کا اندھا قانون اپنی موت آپ مرجائے گا جنگل کے بادشاہ شیر کی طرح خواہشات کے جنگل میں من مانی

کرنے کا جذبہ خود بخود ختم ہو جائے گا پھر ہر سفر دلّی کے گھوڑے پر بیٹھ کر طے کرے گا۔

کتنے ہی سائیں جنسی خواہشات کی تسکین کے لیے حویلی میں کام کرنے والی غربت کی گود میں پروان چڑھنے والی دوشیزاؤں کی عزت کو گاجر مولی کی طرح کاٹ کر ہڑپ کر جاتے ہیں۔ ان کی چیخیں حویلی کی بلند و بالا دیواروں سے باہر نہیں جاتیں۔

غربت کا صحرا اور وہ بھی ننگے پاؤں عبور کرنا جان جوکھوں کا کام ہے بھوکے پیاسے اس سفر کو جاری و ساری رکھنا کربناک منازل کو عبور کرنا بہت مشکل مرحلہ ہوتا ہے لیکن چونکہ چلتے رہنا شرط جو ٹھہرا اس لیے ہر حال میں چلنا پڑتا ہے۔"

پاپی پیٹ کو بھرنے کے لیے عزتوں تک کے سودے کرنے پڑتے ہیں جاگتی آنکھوں سے دیکھتے ہوئے زندہ مکھی نگلنا پڑتی ہے لیکن ایک دن کامیابی و کامرانی کا سورج طلوع ہو جاتا ہے۔ ظلم و ستم کے اندھیرے چھٹ جاتے ہیں غربت و افلاس دہشت گردی کی طرح موت کے ڈر سے بھاگ جاتی ہے جیسے سدا اندھیرا نہیں رہتا تنگدستی میں نہیں رہتیں اس طرح سدا غریب بھی سوئے نہیں رہتے۔ ایک نہ ایک دن ان کو بھی جاگ آ ہی جاتی ہے۔

بے شک غربت بہت بڑی سزا ہے لیکن اس کی آنکھوں میں ڈال کر جینا ہی زندگی ہے۔ خودی کا پتا تو اس وقت چلتا ہے جب آدمی مصائب کے صحرا میں بھوکا پیاسا ننگے پاؤں سرابوں کے پیچھے بھاگ رہا ہو اور پھر اتنی پریشانیوں کے باوجود انا کا سودا نہ کرے، غیرت پہ آنچ نہ آنے دے، مگر اس دورا ہے پر چلنا اتنا بھی آسان نہیں کچھ لوگ تو بہت جلد حوصلہ ہار کر اس کے آگے سرنگوں ہو جاتے ہیں پیچھے کچھ بھی بچا کر نہیں رکھتے۔ بے دام غلاموں کی طرح اس کے اشاروں پر ناچنے لگتے ہیں۔ سب کچھ داؤ پر لگا کر صرف زندہ رہنے کو ہی زندگی سمجھتے ہیں مگر کچھ لوگ غیرت کا دریا بن جاتے ہیں اور جب اس دریا میں سیلاب آتا ہے تو صحرا گلستان سرسبز و شاداب کھیتیاں، مہکتے پھولوں کے چمن سب کو نیست و نابود کرتا

چلا جاتا ہے۔

......☆☆☆......

میاں فخر وڈیرے کا چھوٹا بھائی تھا نخوت، تکبر، غرور کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا تھا سونے کا چمچ منہ میں لے کر پیدا ہوا تھا، بچپن سے جوانی کا سفر بے فکری، بے پروائی اور عیاشی کے گھوڑے پر سوار ہو کر کیا۔ دکھ، پریشانی اور غم کے نام سے بھی آگاہ نہیں تھا، دولت کی دیوی کی مدد سے خوشیوں کے کئی میلے لوٹ چکا تھا۔ آسائشیں ادنیٰ غلام کی طرح در کی دربان تھیں جوانی کے چمن میں جنگل کا بادشاہ شیر کی طرح دھاڑ رہا تھا۔ دولت اور طاقت کے نشے میں مخمور کئی نازک کومل کلیوں کو اپنے بستر کی زینت بنا کر مسل چکا تھا۔ کتنے ہی نازک اندام پھول اس کے ہاتھوں پتی پتی ہو کر بکھر چکے تھے۔

مگر ان بکھری پتیوں کی شکایت آج تک کسی نے وڈیرے سائیں سے نہیں کی تھی ویسے بھی کس میں جرات تھی جو میاں فخر کی شکایت کرتا یا اس کے حکم کی تعمیل نہ کرتا وہ ان کا ان داتا تھا زندگی کی سانسوں کی روانی کا موجب تھا کتنے ہی غریب لوگ ان کے دست نگر تھے اور پھر ان کی نفرت کے بھڑکتے شعلوں میں اپنے آپ کو جلانا عقل مندی نہیں تھی۔

ان سے دادرسی کی امید رکھنا بحث تھا وہ دولت کے نشے میں چور اس نگری کے بے تاج بادشاہ تھے اور وہ بھی فرمان جاری کرتے یا جو بھی کام کرنے کا حکم دیتے اس کی بجا آوری میں ہی لوگوں کی عافیت تھی ورنہ ان کے غضب کو برداشت کرنا اتنا بھی آسان نہ تھا۔

......☆☆☆......

بشیراں لڑکی کیا تھی کیچڑ میں کھلا کنول تھا حسن کا منہ بولتا ثبوت، نشیلی آنکھیں، گلابی چہرہ، صراحی دار گردن گھٹا ٹوپ رات کی طرح سیاہ زلفیں، لب گلاب کی پتیوں کی طرح نرم و نازک گلابی جو بھی دیکھتا اس کو سانسوں کا شمار کرنا مشکل ہو جاتا۔ عقل و شعور بے قابو ہو جاتے۔ لڑکی کم آسمان سے اتری حور زیادہ لگتی۔ اس حسین چہرے کو دیکھنے والا قدرت کے نظارے کی محویت میں کھو جاتا۔

ایسے خوب صورت اور معطر پھول تو قسمت والوں کے گلشن میں کھلتے ہیں جو اپنی خوشبو سے کتنے ہی ذہنوں کو مہکائے رکھتے ہیں یہ کب سوچ نگر سے دور جاتے ہیں یہ تو یادوں کے سرے محل آباد رکھتے ہیں۔

ان کی نفاست کو مدنظر رکھتے ہوئے بعض اوقات دیکھنے میں بھی احتیاط سے کام لینا پڑتا ہے۔ ہوسکتا ہے نگاہوں کے چھونے سے کملا جائیں۔

جب ایسے خوب صورت پھول کسی غریب کے آنگن میں کھلیں تو غریب کو کچھ حاصل ہو نہ ہو کتنے ہی من چلوں کو اپنے دل کا آنگن آباد آباد لگتا ہے۔ وہ آس کے پیڑ کے نیچے منتظر آنکھوں سے اس کے کھلنے کا انتظار کرتے ہیں اور شباب آنے پر کتنی ہی گلیوں کے نکڑ آباد ہونے لگتے ہیں۔

دیدار کی پیاسی نگاہیں ایک جھلک دیکھنے کے لیے کتنی ہی دیر منتظر رہتی ہیں۔

کیچڑ میں کھلا پھول کس کی ملکیت ہوتا ہے شاید کسی کی بھی نہیں یا پھر اس کی جو پہلے پہنچ کر توڑ لے۔

غریب کا آنگن بھی تو کیچڑ کی مانند ہی ہوتا ہے لیکن شاید اس سے بھی کمتر کیونکہ وہاں تو کپڑوں اور پاؤں کے گندے ہونے کا خطرہ ہوتا ہے لیکن غریب کا در اس سے تو قدرے ستھرا ہوتا ہے اور پھر اس آنگن کا در ہوتا ہی کہاں ہے یہاں تو کوئی بھی آوارہ جانور کی طرح آسکتا ہے اور چرنے سے بھی دریغ نہیں کرتا۔

غریب بے چارہ جو بے نام ہوتا ہے اس میں کب اتنی طاقت ہوتی ہے کہ گھر آنے والے وحشی درندوں کو دھتکار سکے ان درندوں کی خوراک تو ایسے ہی گھروں میں ہوتی ہے۔

غریب کی کٹیا میں اس کی غیرت کی کیاری میں اگا پھول کب اس شریفوں کے معاشرے کے جنگل میں آزاد حیوانوں کو اچھا لگتا ہے اور ویسے بھی ایسے خوب صورت، پرکشش پھول کسی حسینہ کے گجرے کی زینت بنیں کسی من موجی نوجوان کے قمیص کے کالر میں سے ہوں یا پھر کسی پہنچی ہوئی سرکار کی مرقد کو مہکا رہے ہوں۔

دوسروں کی لمحاتی خوشی کے لیے پتی پتی بکھر کر خاک میں رل جائیں اپنی ذات کو فنا کر کے ان کے لیے خوشی کا موجب بنیں۔

......☆☆☆......

دور پار کے گاؤں سے بشیراں اور نصیر اپنے غریب والدین کے ساتھ اس حویلی میں جھاڑو برتن کے عوض زندگی کی سانسیں خریدنے آئے تھے۔

''انسانوں کی اہمیت، ذات پات کی تمیز امیر غریب کا فرق، تمام انسان برابر، ہر کسی کو زندگی کی رعنائیوں سے لطف اندوز ہونے کا حق، زندگی گزارنے میں ہر ذی روح آزاد ہے۔

لیکن یہ سب کتابی باتیں ہیں کتابوں میں تحریر خوب صورت لگتی ہیں عملی طور پر کہیں بھی یہ آپ کو نظر نہیں آئیں گی۔

آج بھی امیر اور غریب کے درمیان دولت کی دیوار چین سے بھی زیادہ بلند ہے۔ آج بھی غریب وڈیروں کے بچے کھچے ٹکڑے کھا کر رب کا شکر ادا کرتا ہے۔

بشیراں کا باپ ڈیرے پر جھاڑو دیتا، پانی چھڑکتا مہمانوں کی خدمت کرتا، رات کو وڈیرے کے پاؤں دباتا جبکہ بشیراں نصیر اور ماں سارا دن حویلی میں صفائی ستھرائی کرتے برتن صاف کرتے کپڑے دھوتے پھولوں کی کیاریوں کو پانی دیتے جوتے پالش کرتے اور کھانے کے وقت مالکوں کو حسرت بھری نگاہوں سے مرغن کھانا کھاتے دیکھتے ان کو پکوانوں کو کھانے کا موقع اس وقت ملتا جب یہ بچے کھچے ٹکڑوں کی صورت میں ان کو میلی کچیلی کھجور کے پتوں سے بنی چنگیر میں ماں' مالکن کی نظر بچا کر دیتی۔

سارا دن کام کاج سے تھکے ماندے یہ بہن بھائی ان ٹکڑوں پر چیل کی طرح جھپٹ پڑتے پیٹ کا دوزخ بھر کر خدا کا شکر بجالاتے اور پھر کام کاج میں جت جاتے۔

......☆☆☆......

حویلی کے غذائیت سے بھرپور ٹکڑوں پر پلنے والی بشیراں نیم کے درخت کی طرح دنوں میں جوان ہوگئی، خوب قد کاٹھ نکالا، نین نقش نشیلے تھے اگر کوئی تھوڑی بہت کسر رہ گئی تھی تو وہ چاند کی چاندنی نے چہرے پر قوس قزح کے رنگ بکھیر کر پوری کردی، جوانی اس پر ساون کی بارش کی طرح ٹوٹ کر برسی تھی۔

حویلی کی دیواروں کے سائے تلے رنگت بھی گندمی سے گوری ہوچکی تھی۔

پاپی پیٹ بھرنے کے لیے کام کرنا اس کی مجبوری تھی۔ کام کاج کے دوران تو نوکرانی لگتی مگر جب بھی کام کاج سے تھک کر مالکن کی آنکھ بچا کر چوری چھپے میاں فخر کے ایئر کنڈیشن کمرے میں پرانی بوری کی گیلی تپڑی سے فرش صاف کرتے کرتے لیٹ جاتی تو اس دوران ٹھنڈی ہوا اس کی ناگن زلفوں سے آنکھ مچولی کھیلنے لگتی، وہ تھکاوٹ سے چور نیند کی وادی میں گم ہو جاتی تو بے فکری سے سوتے ہوئے نوکرانی کم اور مالکن زیادہ لگتی۔

''حسن اللہ تعالیٰ کی دین ہے اور نیند کب پوچھ کر آتی ہے یہ تو کانٹوں کی سیج سے لے کر لب دار تک آ جاتی ہے اور پھر ایسے ذی روح جن کی عمر تپتے سورج کے نیچے سخت کام کرتے گزری ہو ان کے لیے ایئر کنڈیشن کی ٹھنڈی ہوا عظیم نعمت سے کم نہیں ہوتی۔

حویلی کی دہلیز پر بیٹھے بیٹھے بشیراں جوانی کے شریر جذبات سے ہم کلام ہونے لگی، کھانے پینے کو بچا کچا بہت کچھ مل جاتا تھا بے فکری کا دور، صحت پر خوشگوار اثر پڑا تھا حسن کا منہ بولتا شاہکار لگتی اب تو گلی کے نکڑ پر ایک جھلک دیکھنے کے لیے کتنی ہی آنکھیں منتظر ہوتیں۔

حویلی کی ملازمہ ہونے کے ناتے کسی میں جرات نہ تھی جو سوائے دیدار کے دلوں کے سودے کرنے کی جسارت کرے اب تو ہم جولیاں بھی اس کی تعریف کرتے نہ تھکتی تھیں۔

مگر غریب کو ایک ہی فکر ہوتی ہے کہیں اس کی زندگی کے اثاثے کو ناگہانی مصیبت برباد ہی نہ کر دے اس لیے سکھیاں بشیراں کو بھی عزت کے معاملے میں محتاط رہنے کی نصیحت کرتیں۔

غریب کے پاس سوائے عزت کے اثاثے کے اور ہوتا ہی کیا ہے لیکن معاشرے کے شرفا تمام دنیاوی، سکھ چین، آسائشوں کے باوجود انتہائی حریص نگاہوں سے غریبوں کے اس اثاثے کو لوٹنے کے بہانے تلاش کرتے ہیں۔

یہ چاند سا چہرہ حویلی کے اندر غلامی کے آسمان پر چمک رہا تھا اور پھر یہ کیسے ممکن ہے کہ چاند کی دھیمی، مٹھاس سے بھرپور روشنی لوگوں کی نگاہوں سے اوجھل رہے اس چاند کی روشنی ایک دن چھوٹے سائیں کی آنکھوں کو چندھیانے لگی غریب کے کواڑوں کے اندر چمکنے والا چاند ایک دن سائیں نے اپنے من کے آسمان پر چمکانے کا فیصلہ کیا۔

......☆☆☆......

بڑے لوگوں کی خواہشات بھی ان کی وسیع و عریض جائیداد کی طرح حدود کی قیود سے آزاد ہوتی ہیں۔ جیسے ان کی نگری میں سورج کبھی غروب نہیں ہوتا ایسے ہی ان کی خواہشات کی بھی شام نہیں ہوتی، ان کی چاہتیں سانپ کی آنت کی طرح طویل ہوتی جاتی ہے ہر نئی نظر آنے والی چیز پر ان کا دل بھرتا ہے۔ آنکھوں کے کٹورے ہلکورے لینے لگتے ہیں۔ جذبات کے بادل گرجنے لگتے ہیں۔ حصول کے لیے دولت کا خونی پنجہ ناخن تیز کرنے لگتا ہے غرور کی تلوار سب کچھ تہہ تیغ کرنے کے لیے نیام سے نکل آتی ہے اختیارات کا قفس سب کچھ اپنے اندر مقید کر لیتا ہے۔

خواہشات کے جنگل میں شکار کے دوران اتنا نیا شکار آ جاتا ہے کہ پہلے کی یاد ہی نہیں رہتی۔

پھر ان خواہشات کی تسکین کے لیے انہیں کون سا تپتی ریت پر سفر کرنا ہوتا ہے صرف حکم جاری کرنا ہوتا ہے غلاموں کی فوج ظفر موج سب کچھ کر گزرنے کے لیے تیار ہوتی ہے سرپرستوں کی آشیرباد سے یہ پالتو گداگر کتنے ہی انسانوں سے زندگی کی سانسیں چھین لیتے ہیں۔ شریف لوگوں کے لیے سوہان روح بن جاتے ہیں۔

لوگ بہت کچھ قربان کر کے ان کے شر سے اپنے آپ کو بچاتے ہیں یہ لوگ انسانیت کے نام پر دھبہ ہوتے ہیں جو صرف مالک کی خوشنودی کے لیے لوگوں کے خون، غیرت، مال، عزت و آبرو اور خون کی ہولی کھیلتے ہیں۔ مجبوروں کا جینا دوبھر کر دیتے ہیں۔ بعض اوقات تو سانس بھی ان سے پوچھ کر لینی پڑتی ہے۔

مالک کے مقاصد خواہشات اور جذبات کو آج تک ان لوگوں نے پرکھنے کی کوشش نہیں شاید اسی کو بے دام غلامی کا نام دیا گیا ہے، مالک کی خوشنودی کے لیے جان سے گزر جاؤ، جاں نثاری ثابت کرنے کے لیے بعض اوقات یہ لوگ اپنے گھروں کو بھی ظلمت کے بھڑکتے شعلوں کے حوالے کر دیتے ہیں جب سب کچھ برباد

ہو جاتا ہے تو کف افسوس ملتے ہیں۔

......☆☆☆......

چھوٹے سائیں کی سوچوں نے بشیراں کو اپنے حصار میں گھیر رکھا تھا اس کے حسن نے سوچنے سمجھنے صلاحیتوں کو تسخیر کر رکھا تھا سائیں تو بہت کچھ اس کے آگے ہار چکا تھا حسین چہرہ ہر وقت آنکھوں کے آگے محو رقص رہتا، اب تو راتوں کو نیند کے دوران بھی یادیں شرارت سے باز نہ آتیں۔

لیکن ابھی تک کھل کر اس نے اپنی چاہت کا اظہار نہیں کیا تھا لیکن کب تک خاموش رہتا اور پھر محبت کا دریا جب کناروں سے باہر آتا ہے تو کب دیکھتا ہے کہ اس سے نفع، نقصان کتنا ہوتا ہے اور کون سے لوگ مفاد حاصل کر رہے ہیں، کتنے لوگوں کی جمع پونجی ضائع ہو رہی ہے۔

پھر ایک دن سائیں نے جذبات کو زمانے کی رسموں کے قفس سے آزاد کرنے کا فیصلہ کرلیا بشیراں کو اپنے کمرے میں بلایا اور تمام جذبات کو باری باری اس کے آگے کھول کر رکھ دیا۔

بلند و بالا دیواروں کے حصار میں گھری حویلی کی مالکہ بننے کا عندیہ دیا، جھاڑ پونچھ سے نجات دلانے کا وعدہ کیا اس نگری کی ملکہ بنانے کا پیغام دیا، اس کے تمام دکھ، تکالیف کو دولت کی گہری کھائی میں دفن کرنے کا اقرار کیا۔ کتنے ہی سکھ، ارام اور خوشیوں کی دلدل میں اس کو پھنسایا کتنے ہی خوابوں کو تعبیر دینے کے تمام اختیارات اس کو سونپے۔

......☆☆☆......

میاں فخر کی بیٹی نادیہ بشیراں کی ہم عمر تھی حسن کا منہ بولتا ثبوت، جو بھی دیکھتا آنکھیں جھپکنا بھول جاتا زمین کا چاند، اگر تھوڑی بہت کسر رہ گئی تھی تو امارت کی دبیز تہوں کے نیچے دب کر ختم ہوگئی تھی۔ روپے پیسے کی ریل پیل، ناز نخرہ، وڈیرے پن کا غرور، تمام اوصاف کے بل بوتے پر اس کا حسن کچھ اور نکھر گیا تھا۔

شہر کے مہنگے کالج میں پڑھ رہی تھی حسن و ذہانت نے کتنے ہی لوگوں کو اسیر کر رکھا تھا مگر اس نے آج تک کسی کو ایک خاص حد سے آگے بڑھنے کا حوصلہ نہ دیا، بے شک آزاد خیال تھی، مگر حویلی اور گاؤں کے اصولوں کی

پاسدار، غیرت کی منہ بولتی تصویر، خودداری اور انا کی علم بردار تھی تعلیم حاصل کرنے کے مشن پر سختی سے کاربند ہر سال اول پوزیشن حاصل کرتی، پیار، محبت کے نام سے ناواقف امیر زادوں کی سوچوں کے آگے عصمت کی چٹان بن گئی، جو بھی اس سے ٹکراتا پاش پاش ہو جاتا سب عزیز ہستیوں کو اس کے کردار کی عظمت پر فخر تھا۔

پندرہ دن بعد چھٹی آتی والدین اور چاہنے والے رشتوں کو تسکین ملتی، چھوٹے بڑے سب کی آنکھوں کا تارا، حویلی کی رونقوں کو دوبالا کرنے کا کھلونا تھی۔ اس کے آتے ہی کئی چہرے کھل اٹھتے، خوب اودھم مچتا، مالک نوکر سب کو برابر سمجھنے والی کسی کی دل آزاری کا باعث نہ بنتی بشیراں اور نصیر بھی خوب کھل کر کھیلتے۔

بشیراں کو زمانے کی تلخیوں سے آگاہ کرتی، تپتی نگاہوں سے بچنے کی تلقین کرتی، عصمت کے زیور کو محفوظ رکھنے کی نصیحت کرتی پاک دامنی کی اہمیت سے آگاہ کرتی، زمانے کی نگاہوں سے داغدار ہونے سے بچنے کے لیے حرمت کی چادر میں چھپنے کی نصیحت کرتی۔

من ہی من میں بشیراں کے بارے میں بہت فکر مند ہو جاتی مگر یہ بات اس کو حوصلہ دیتی کہ حویلی کی ملازمہ ہے کس میں دم ہے کہ اس کی طرف میلی آنکھ سے دیکھے۔

کبھی تو وہ بہت پریشان ہو جاتی، آخر کو بشیراں غریب کے آنگن کا پھول تھی غریب کے چاند کو گرہن لگتے دیر نہیں لگتی۔

وہ اس چاند کو ہمیشہ چمکتا، مسکراتا دیکھنا چاہتی تھی اور حویلی ایک ڈھال کا کام دے رہی تھی۔

......☆☆☆......

چھوٹے لوگوں کو اپنی عزت کے ساتھ ساتھ زمانے کی بڑی فکر ہوتی ہے۔

ہم آپ کے شایان شان نہیں، لوگ کیا کہیں گے، پہلے ایسا کب ہوا ہے، جھونپڑی میں رہنے والے محل کے خواب نہیں دیکھتے، ہم کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہیں رہیں گے۔ پانی دودھ میں ملانے سے اپنی شناخت کھو بیٹھتا ہے نمک چینی میں ملانے سے میٹھا نہیں ہو جاتا، دولت کی دیوار میں سونے کے قفس میں قید نہیں ہونا چاہتے۔ ایسی کتنی ہی بھولی بسری مثالیں یاد آ جاتی ہیں۔

بشیراں اپنی غربت کا رونا رونے لگی، آج تک کسی نے مخمل میں ٹاٹ کا پیوند نہیں لگایا، کہاں وسیع و عریض جائیداد کا مالک اور کہاں جوتے صاف کرنے والی نوکرانی ہمارا جوڑ کسی طور ممکن نہیں، ویسے بھی میری اور آپ کی عمر میں بہت فرق ہے۔

آپ جوان بیٹی کے باپ ہیں اس کی تعلیم و تربیت پر توجہ دیں، اس کی شادی کے بارے فکر مند ہوں، اس عمر میں ویسے بھی آپ کو شادی زیب نہیں دیتی اور وہ بھی بیٹی کی ہم عمر ملازمہ سے۔"

اتنا سننا تھا کہ سائیں آپے سے باہر ہو گیا، غصے سے تھر تھر کانپنے لگا۔ آنکھوں میں خون اتر آیا ایک دو ٹکے کی ملازمہ کی یہ جرات کہ مجھے نصیحت کرے میری حکم عدولی کی گستاخی اور وہ بھی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دو پٹے سے حویلی کی دیواروں کو صاف کرنے والی مجھے پند و نصائح کرے، میاں فخر نے بشیراں کے انکار کو انا کا مسئلہ بنا لیا اور موقع کی تلاش میں رہنے لگا کہ کب مناسب وقت آئے کہ وہ بشیراں سے انکار کا انتقام لے سکے۔

پھر ایک دن وقت نے یہ موقع فراہم کر دیا، ضروری اشیا کی خریداری کے لیے شہر جانے کا پروگرام بنا۔ میاں صاحب نے ناسازی طبیعت کا بہانہ کر کے جانے سے معذرت کر لی۔ ڈرائیور کے ساتھ فیملی شہر چلی گئی۔

کام کے بہانے میاں صاحب نے کافی دیر بشیراں کو روکے رکھا جبکہ اس کی والدہ اور بھائی کو جلدی چھٹی دے کر گھر بھیج دیا۔

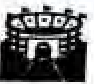
کمرے کی صفائی کے لیے اسے اندر بلایا، اندر داخل ہونے پر کنڈی لگا لی اور پھر اس کی عزت کی دھجیاں اڑا دیں۔

چیخ و پکار اندر ہی گھٹ کر رہ گئی، عزت کا خزانہ رکھوالوں نے لوٹ لیا تھا، احتجاج کرتی تو کس سے کرتی۔

پھٹے کپڑوں اور عزت کے بچے کھچے ٹکڑوں کو اکٹھا کر کے گھر کیسے پہنچی، اپنے اوپر ٹوٹنے والی قیامت کا احوال گھر والوں کو کیسے بتاتی۔

بتاتی بھی تو کیا بتاتی، عتاب کے ڈر سے شاید خاموش رہی ہوگی یا پھر اجڑی حالت دیکھنے والوں نے خود ہی حقیقت حال کا پتا چلا لیا ہوگا۔ اگلے دن پتا چلا بشیراں کا

خاندان علی الصبح منہ اندھیرے ہی یہ گاؤں چھوڑ کر کسی اور نگر چلا گیا تھا۔
جوان بیٹے باپ کے بڑھاپے کا سہارا اپنی جیون ساتھی کی آنکھوں کا تارا اور بہنوں کا مان ہوتے ہیں۔
نصیر غیرت کی آگ میں سوکھی لکڑی کی طرح چٹخنے لگا کون سا لمحہ ہو کہ وہ وڈیرے سے اپنی معصوم بہن کی عصمت کا بدلہ لے سکے۔ بدلے کی چنگاری دہکتے انگارے میں بدل گئی۔
ایک دوست کے ہمراہ وہ شہر سے آنے والے راستے پر چھوٹی مالکن نادیہ کا روزانہ انتظار کرنے لگا۔
ایک دن اس کا انتظار اس وقت ختم ہو گیا جب دور سے دھول اڑاتی گاڑی اس کو نظر آئی، جب گاڑی نزدیک پہنچی تو اس نے زور زور سے ہاتھ ہلانا شروع کر دیا قریب پہنچنے پر نادیہ نے نصیر کو پہچان لیا اور گاڑی رکوائی۔
نصیر نادیہ کے پاس آیا اور کہا میں اور میرا دوست بھی حویلی جا رہے ہیں ہمیں بھی لیتے چلو نادیہ پچھلی سیٹ پر بیٹھی ہوئی تھی۔
نادیہ بی بی کو کہا آپ ڈرائیور کے ساتھ والی فرنٹ سیٹ پر بیٹھ جائیں ہم دونوں دوست پیچھے بیٹھ جاتے ہیں۔
جونہی نادیہ نیچے اتری نصیر نے اس کا بازو پکڑا اور فصلوں کی طرف گھسیٹنے لگا۔ نادیہ یہ صورت حال دیکھ کر بوکھلا گئی، اس کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ حویلی کا ملازم اس کا بازو پکڑنے کی جسارت کرے گا۔ اپنا بازو چھڑانے کے لیے زور لگانے لگی، چیخ و پکار کیا ڈرائیور کو آواز دی۔
نصیر سخت غصے میں زور لگا رہا تھا۔ اس کا دوپٹا اتار کر دور پھینکا، بالوں کی لٹ ہاتھ میں پکڑی اور دوسرے ہاتھ سے اس کا منہ اپنے منہ کی طرف کر کے کہا۔
میں آج اپنی بہن کی لٹی عزت کا بدلہ لے کر رہوں گا، تمہارے باپ نے میری معصوم بہن کی عزت پر ڈاکا ڈالا ہے ہماری غیرت کا جنازہ نکال دیا ہے ہمیں جیتے جی مار دیا ہے پتا نہیں وہ پہلے کتنی لڑکیوں کی عزت سے کھیل چکا ہے آج جب تیری عزت کے لٹنے کی خبر اس تک پہنچے گی تو مجھے سکون ملے گا میری بہن سکھ کا سانس لے گی، تیرے باپ کو پتا چلے گا کہ بیٹی کی عزت کتنی قیمتی ہوتی ہے۔ سخت کوشش، جدوجہد اور ڈرائیور کی بروقت مداخلت سے وہ عزت کا زیور کو بچانے میں کامیاب ہوگئی، مگر دوپٹہ سر پر نہ رہا، قمیص پھٹ گئی چوڑیاں ٹوٹ گئیں بال بکھر گئے نیم برہنہ ننگے پاؤں حویلی پہنچ گئی۔
گھر والوں نے جب ناز و نعم میں پلی عام نگاہوں سے بھی دور رہنے والی اپنی معصوم بچی کی یہ حالت دیکھی تو گویا حویلی میں بھونچال آ گیا، ہر شخص غصے سے بے قابو ہو رہا تھا میاں فخر کی آنکھیں انگارے برسانے لگیں خون جسم کو پھاڑ کر باہر آنے لگا۔
لیکن نادیہ گم صم اپنے کمرے میں چلی گئی، صرف باپ کو اندر بلایا اور جب بشیراں کے بارے اس سے بات کی تو میاں فخر کو یوں لگا، جیسے وہ پاتال میں اتر گیا ہو، پسینہ اس کے ماتھے سے بہنے لگا۔ زبان گنگ ہو گئی نگاہوں کو جھکا کر فرش کو دیکھنے لگا، زبان پر چپ کا تالہ لگ گیا۔ نادیہ کے کسی بھی سوال کا اس کے پاس جواب نہ تھا۔
مجھے میرے سوالوں کا جواب چاہیے۔ اس حویلی میں بشیراں کی عزت کو تار تار کس نے کیا۔
میں تو سمجھی تھی یہاں اس کو امان ملے گی، تحفظ کی چادر میں محفوظ ہو گی کوئی اس کی طرف میلی آنکھ سے نہیں دیکھے گا، مگر محافظوں نے ہی اس کی عصمت کے پھول کو نوچ ڈالا۔ نادیہ دہاڑنے لگی آواز کمرے میں گونجنے لگی۔
اب میں آپ کے کرتوتوں کے بدلے چکاتی رہوں گی، ہرگز میں اپنی جان تو دے سکتی ہوں مگر عزت پر حرف نہیں آنے دوں گی۔'' اور پھر الماری سے پستول نکال کر نال اپنی کنپٹی پر رکھ کر ٹرائیگر دبا دیا۔



اوجھل

حسن عادل

آج کے دور میں ہر شخص شارٹ کٹ کے چکر میں رہتا ہے اور اس کے لیے ہر ناجائز طریقے کو جائز قرار دیتا ہے۔
ایک مجرم ذہن کی روداد' اس نے دولت کی خاطر اپنے دوست کو بلی چڑھا دیا تھا۔

ڈاکٹر ناصر کو گئے ہوئے دس منٹ ہو گئے تھے' لیکن اب تک اس کا کوئی اتا پتہ نہ تھا۔ حالانکہ وہ صرف دو منٹ کا کہہ کر گیا تھا۔

گلریز بے تابی سے پہلو بدل رہا تھا۔

اس نے اپنی رسٹ واچ پر نگاہ ڈالی اور مضطربانہ انداز میں صوفے سے کھڑا ہو گیا۔

''کہاں چلا گیا یہ؟'' اس نے خود کلامی کی۔

''میں تمہارے پاس کھڑا ہوں۔'' یک لخت اسے ڈاکٹر ناصر کی آواز سنائی دی۔

گلریز ایک دم پلٹا' مگر حیران رہ گیا۔ پیچھے کوئی نہ تھا۔ وہ صوفے کی طرف بڑھا اور اس کے عقب میں جھانک کر دیکھا۔ لیکن وہاں بھی کوئی نہ تھا۔

''ناصر ......'' اس نے آواز لگائی۔ ''کہاں چھپے ہوئے ہو تم ...... یہ کیا بچگانہ پن ہے؟''

''میں چھپا نہیں ہوں۔ سامنے ہوں تمہارے۔''

ڈاکٹر ناصر کی ہنستی ہوئی آواز آئی۔

پھر ایک دم ڈاکٹر ناصر کسی جن کی طرح اس کے سامنے نمودار ہو گیا۔ گلریز حیرت سے منہ کھولے اسے دیکھتا رہ گیا۔ اس کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئی تھیں۔

''یہ ...... یہ کیا ...... تم غائب کیسے ہو گئے تھے؟ گلریز پر حیرتوں کے بم پھٹ پڑے تھے۔

ڈاکٹر ناصر ہنستے ہوئے صوفے پر بیٹھ گیا اور اسے بھی بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ ''بیٹھ جاؤ...... میں نے کہا تھا نا کہ میں تمہیں ایک انوکھی چیز دکھانا چاہتا ہوں۔''

''ہاں ...... مگر ...... مگر ...... تم غائب ...... میری سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا ہے۔'' گلریز واقعی بہت حیران و پریشان تھا۔

''وہی بتا رہا ہوں ......'' ڈاکٹر ناصر اس کی کیفیت سے لطف اندوز ہوتے ہوئے بولا۔ ''بیٹھ جاؤ۔''

سحر زدہ گلریز میکانکی انداز میں صوفے پر بیٹھ گیا۔ ''یہ یہ کیا میری نظر کا دھوکا تھا۔ یا تم نے نظر بندی کا مظاہرہ کیا تھا؟''

''نہ یہ دھوکا تھا اور نہ نظر بندی۔'' ڈاکٹر ناصر ہنسنے لگا اور پھر اپنا بایاں ہاتھ آگے کیا۔ ''یہ سب اس کا کمال ہے۔'' گلریز نے حیرت سے اس کے ہاتھ کی جانب دیکھا۔ اس کے ہاتھ میں ایک بڑی سی رسٹ واچ تھی۔

''یہ تو گھڑی ہے۔'' گلریز اب تک محو حیرت تھا۔

''یہ گھڑی میری ایجاد ہے۔ میں نے یہی دکھانے کے لیے تمہیں بلایا ہے۔'' یہ کہہ کر ڈاکٹر ناصر نے گھڑی کے ایک بٹن پر ہاتھ رکھا اور گلریز سے کہا۔ ''غور سے میری طرف دیکھو۔''

گلریز اسے دیکھنے لگا۔ ڈاکٹر ناصر نے بٹن دبا دیا۔ اگلے ہی لمحے ڈاکٹر ناصر کا جیتا جاگتا ٹھوس وجود نگاہوں سے اوجھل ہو گیا' جیسے کوئی جادوگر منتر پڑھ کر غائب ہو جاتا ہے۔

گلریز خوف زدہ ہو کر کھڑا ہو گیا۔ ''نن ...... نا ...... صر تم ...... کہاں ہو؟''

''میں ادھر ہی بیٹھا ہوں۔'' ڈاکٹر ناصر کی شوخ آواز آئی اور وہ دوبارہ نمودار ہو گیا۔

''یہ سب اس گھڑی کا کمال ہے میرے دوست۔ گھبراؤ نہیں ...... اسے سائنس کی جادوگری کہہ سکتے

ہو۔''

''بہت عرصے سے میں اس تجربے پر کام کر رہا تھا کہ کیا انسان غائب ہو سکتا ہے اور اب میں اپنے مقصد میں کامیاب ہو گیا ہوں۔ یہ دیکھو۔۔۔۔۔ یہ بٹن۔۔۔۔۔ پانچ بار دبانے سے انسان غائب ہو جاتا ہے اور یہ دوسرا والا بٹن اس پانچ بار دبانے سے ظاہر ہو جاتا ہے۔''

''کمال کر دیا تم نے۔'' گھریز واقعی حیران رہ گیا۔

''مگر اس میں بہت بڑی رقم خرچ ہو چکی ہے۔ اب میں اس سے کمانا چاہتا ہوں۔ ہم اربوں کھربوں روپے کما سکتے ہیں۔ وہ اس طرح کہ ایسی گھڑیاں بنا کر ہم کروڑوں روپوں میں فروخت کریں گے۔ بس تمہیں اس لیے بلایا ہے کہ تم اس کاروبار کے لیے پیسے لگاؤ گے۔''

''وہ تو ٹھیک ہے۔۔۔۔۔ مگر'' گھریز ہچکچانے لگا۔

''مگر کیا؟''

''میرا کاروبار تباہ ہو گیا ہے ناصر۔۔۔۔۔ میں قلاش ہو چکا ہوں۔'' گھریز نے حقیقت بیان کر دی۔

''اوہ۔۔۔۔۔ تو پھر مجھے کوئی دوسرا انویسٹر تلاش کرنا پڑے گا۔'' ڈاکٹر ناصر مایوس ہو گیا۔

گھریز اسے عجیب سی نظروں سے دیکھنے لگا۔ اچانک ہی اس کے دماغ پر شیطان قابض ہو گیا۔ لمحہ بعد میں اس نے ایک فیصلہ کر لیا تھا۔

❁ — ❁ — ❁ — ❁

گھریز نے ایک جھٹکے سے گاڑی روک دی۔ وہ اس وقت ایک سنسان سڑک پر تھا۔ اس نے ڈیش بورڈ کھولا اور وہ جادوئی گھڑی باہر نکالی۔ کچھ دیر تک وہ اسے مسکراتے ہوئے دیکھتا رہا پھر اس کے منہ سے ایک فاتحانہ قہقہہ نکلا ''الوداع میرے پیارے دوست۔'' ''تم نے تو میری تمام مشکلات دور کرنے کا بندوبست ہی کر دیا۔ بہت شکریہ۔۔۔۔۔ اور ساتھ ہی بہت معذرت۔۔۔۔۔ میں کیا کرتا۔۔۔۔۔ تمہیں مارنے کے علاوہ میرے پاس اور کوئی راستہ بھی تو نہیں تھا۔ جب تک تمہاری لاش دریافت ہو گی میں اس ملک سے پیسہ سمیٹ کر بہت دور جا چکا ہوں گا۔''

اس نے گھڑی اپنی کلائی پر باندھ لی اور کار دوڑا دی۔ ایک گھنٹے بعد وہ شہر کی مصروف کمرشل شاہراہ پر موجود تھا۔ یہاں بڑے بڑے دفاتر اور تمام بینک موجود تھے۔ اس نے اپنی کار ایک ذیلی سڑک پر کھڑی کی تھی۔ اب اسے کسی کی پروا نہ تھی کہ کوئی اسے اس وقت دیکھ رہا ہے یا نہیں۔ اس کے ہاتھ میں تو جادو آ گیا تھا۔ کار سے اتر کر اس نے قرب و جوار میں ایک طائرانہ نگاہ ڈالی۔ وہاں آس پاس میں کوئی نہ تھا۔ کچھ کاریں اور موٹر سائیکلیں کھڑی تھیں۔ کافی دور دو سیکورٹی گارڈز کھڑے باتیں کر رہے تھے تب گھریز نے گھڑی کا غائب ہونے والا بٹن پانچ بار دبایا اور اگلے ہی لمحے وہ غائب ہو گیا۔ اس نے اپنی کار کی کھڑکی کے شیشے میں خود کو دیکھنا چاہا مگر اپنا عکس نظر نہیں آیا۔

گھریز نے خوشی سے چٹکی بجائی اور مین روڈ کی جانب بڑھنے لگا۔ وہاں کئی ریسٹورنٹس بھی تھے۔ ایک ریسٹورنٹ کے سامنے سے گزرتے ہوئے اسے بھوک

لگنے لگی۔ وہ اندر داخل ہوگیا۔ اندر ڈائننگ ہال میں بہت سے لوگ کھانے پینے میں مشغول تھے۔

گلریز نے ایک آدمی کی ٹیبل پر رکھا ہوا زنگر دیکھا تو آگے بڑھ کر اسے اٹھالیا۔ زنگر اسکے ہاتھ میں آتے ہی غائب ہوگیا تھا۔ وہ آدمی دوسری جانب دیکھ رہا تھا۔ گلریز مزے سے زنگر کھانے لگا۔

آدمی نے پلٹ کر دیکھا تو زنگر نہیں تھا۔ ''ہیں...... یہ زنگر کون لے گیا...... یا پتا نہیں ......ویٹر لایا بھی تھا کہ نہیں۔''

اس نے ویٹر کو آواز دی۔

گلریز وہاں سے نکل آیا۔ اسے کوئی دلچسپی نہ تھی کہ وہ ویٹر سے کیا کہے گا۔ وہ فٹ پاتھ پر زنگر کھاتا ہوا چلا جارہا تھا۔ پیٹ بھرا تو اس کا دماغ کام کرنے لگا۔ اب اس کے پاس زیادہ ٹائم نہیں تھا۔ کسی وقت بھی اس کے پیارے دوست ڈاکٹر ناصر کی لاش دریافت ہوسکتی تھی۔ جسے وہ گلا گھونٹ کر مار چکا تھا۔ جسمانی اعتبار سے وہ ناصر سے زیادہ طاقت ور تھا۔ لہٰذا اسے خاص دشواری نہیں ہوئی تھی۔ ناصر تو حیرت اور دکھ سے ہی مرگیا تھا۔

''گلریز کی نظر ایک نجی بینک پر پڑی۔ یہ کمرشل ایریا تھا اور یہاں بڑے بڑے اداروں کے آفسز تھے۔ لازمی سی بات تھی کہ یہاں کے بینکوں میں بڑی بڑی رقوم موجود ہوں گی۔ تب گلریز کے قدم اس بینک کی جانب اٹھنے لگے۔ بینک کے مین گیٹ پر ایک سیکیورٹی گارڈ الرٹ کھڑا تھا۔ اس کے ہاتھ میں میٹل ڈی ٹیکٹر تھا۔ گلریز اس کے نزدیک جاکر کھڑا ہوا اور انتظار کرنے لگا کہ کوئی اور آدمی آئے تو اس کے ساتھ وہ بھی اندر چلا جائے۔ ایسے ہی جانے کی صورت میں جب وہ دروازہ کھولے گا تو اندر اور باہر والوں کو دروازہ خود بخود کھلتا دکھائی دے گا۔ اتنے میں ایک کار سے ایک آدمی اتر کر بینک کی جانب بڑھا۔ گلریز ہوشیار ہوگیا۔ گارڈ نے اس شخص کو چیک کیا اور جانے کا اشارہ کیا۔ وہ آدمی دروازہ دھکیل کر اندر چلا گیا۔ عین اس کے عقب میں گلریز تھا۔ اندر آتے ہی وہ شخص اچانک ہی رک گیا۔ اور اپنی جیب سے کچھ نکالنے لگا۔ گلریز اپنی ہی جھونک میں اسے سے ٹکرا گیا۔ وہ شخص چونک کر پیچھے دیکھنے لگا، مگر اسے کوئی دکھائی نہ دیا۔ وہ حیران سا ہو کر اردگرد دیکھنے لگا گلریز کا دل اچھل کر حلق میں آگیا تھا۔ پھر اس آدمی نے کندھے اچکا کر جیب سے ایک چیک نکالا اور کیش کاؤنٹر کی طرف بڑھ گیا۔

گلریز نے ایک طائرانہ نظر اندر کے ماحول پر ڈالی۔ بینک کا عملہ اپنے روٹین کے کاموں کی انجام دہی میں مصروف تھا۔ بہت سے لوگ بھی وہاں اپنے کاموں کے لیے آئے ہوئے تھے۔ خاص طور پر کیش کاؤنٹر پر کافی رش ہورہا تھا۔ گلریز نے اپنی جگہ کھڑے کھڑے وہاں کا پورا جائزہ لے لیا۔ لوگوں کی چہل پہل متواتر جاری تھی اور گمان غالب تھا کہ کوئی اس سے ٹکرا جائے۔ اس لیے گلریز نے کھڑے ہونے کے لیے ایسی جگہ کا انتخاب کیا تھا جہاں کسی کے ٹکرانے کے امکانات نہایت ہی کم تھے۔ اس کے باوجود وہ محتاط تھا۔

کاؤنٹر کی طرف جانے کے لیے ایک الگ دروازہ تھا۔ جس کا کھلنے اور بند ہونے کا میکنزم اندر سے تھا۔ کوئی بھی اندر جاتا یا باہر آتا تو وہ فوراً بند ہوجاتا تھا۔ گلریز کو اندر ہی جانا تھا کیونکہ رقم تو اندر جاکر ہی حاصل کی جاسکتی تھی۔ پھر گلریز نے موقع دیکھ کر اپنی جگہ چھوڑی اور تیزی سے کاؤنٹرز والے دروازے کی جانب لپکا۔ وہ دروازے کے پاس آکر اس کے برابر میں چپک کر کھڑا ہوگیا اور انتظار کرنے لگا کہ کوئی باہر آئے یا اندر جائے۔ خوش قسمتی سے اسے زیادہ انتظار نہیں کرنا پڑا۔ عملے کا ایک موٹا سا شخص دروازے کی جانب بڑھا۔ اندر بیٹھے شخص نے اسے دیکھ کر بٹن دبایا اور دروازہ کھل گیا۔ گلریز موٹے آدمی کے ساتھ ہی اندر آگیا۔

یہ سب اسے عجیب اور مسحور کن لگ رہا تھا۔ عجیب اور جادوئی۔ کوئی اسے دیکھ نہیں سکتا تھا جب کہ وہ ان کے سامنے موجود تھا۔ گلریز نے ایک کاؤنٹر کے پاس کچھ خالی تھیلے دیکھے۔ جن میں کیش لایا جاتا تھا۔

''کام بن گیا'' گلریز نے دل میں کہا اور بڑھ کر ایک تھیلا اٹھالیا۔ تھیلا اس کے ہاتھ میں آتے ہی غائب ہوگیا۔ اس جگہ بیٹھے ہوئے افراد لوگوں کو ڈیل کررہے

نظمیہ نعت

روز ازل کچھ بھی نہ تھا
بس میرے رب کی ذات تھی
ہر سمت نور نور تھا
اور نور کی برسات تھی
اس نور سے اللہ نے
پیدا کیا اپنا نبی
ذاتِ نبی، ہی وجہ تخلیق کائنات تھی
تھا چرخ بھی رواں رواں
اور فرش تھا دھواں دھواں
ہر سمت آب آب تھا
ٹھنڈی ہوائیں تھیں رواں
اور حکم تھا یہ برق کو
اور عرش کو اور فرش کو
ہوں سب کے سب قطار میں
یہ روئے شاہِ دو جہاں
حمد و ثنا میں کم فقط
میرے نبی کی ذات تھی
ذاتِ نبی، ہی وجہ تخلیق کائنات تھی
پھر حکم رب تعالیٰ ہوا
کلمہ ملائک سے پڑھا
سبحان ربی الاعلیٰ
سبحان ربی الاعلیٰ
روز ازل کی ابتدا
میرے نبی کی ذات تھی

ذاتِ نبی، ہی وجہ تخلیق کائنات تھی
تخلیق آدم ہوگئی
دنیا بھی ساری سج گئی
پھل پھول گل بوٹے لگے
رحمت کی بارش ہوگئی
پھر نسل آدم کے لیے
خوشیوں کی اک بارات تھی
ذاتِ نبی، ہی وجہ تخلیق کائنات تھی
اس بزم کائنات میں
پیغام حق بھیجا گیا
اور پھر رسولوں کو یہاں
تعلیم کو بھیجا گیا
سارے رسولوں کے لیے
منبع نبی کی ذات تھی
ذاتِ نبی، ہی وجہ تخلیق کائنات تھی
وہ روزِ حشر آئیں گے
اور عرش کو سجائیں گے
ان کی ادائے خاص پر
افلاک جھوم جائیں گے
یہ وعدہ رسول ہے
امت کو بخشوائیں گے
روز ازل خالق سے یہ
میرے نبی کی بات تھی
ذاتِ نبی، ہی وجہ تخلیق کائنات تھی

زرین قمر

تھے لہٰذا کسی کی توجہ تھیلے کی جانب نہیں تھی۔ کئی کاؤنٹر کے پاس بڑی بڑی درازیں کھلی ہوئی تھی اور ان میں بڑے نوٹوں کی نئی نئی گڈیاں کھائی دے رہی تھی۔ اب گلریز نے دھیرے دھیرے کام دکھانا شروع کر دیا۔ وہ ایک ایک کر کے بڑے نوٹوں کی گڈیاں تھیلے میں منتقل کر رہا تھا۔ وہ کوئی جلد بازی نہیں کرنا چاہتا تھا۔ اگر وہ ہر دروازہ کو خالی کر دیتا تو بینک کا آدمی خالی دراز دیکھ کر کھٹک جاتا۔ اس نے کئی دراز میں سے نوٹوں کی گڈیاں نکالیں مگر وہ تمام گڈیاں دراز کے اندرونی حصوں سے نکالی تھیں اور جو گڈیاں سامنے کی جانب تھیں انہیں چھوا تک نہیں تھا اس طرح کاؤنٹر پر بیٹھے شخص کی نظر دراز پر پڑتی بھی تو اسے سامنے کی تمام گڈیاں جوں کی توں پڑی دکھائی دیتیں اور کوئی جگہ خالی نہیں ملتی۔ چند ہی منٹوں میں گلریز کا تھیلا نوٹوں کی گڈیوں سے لبالب بھر گیا' اس

کا دل بلیوں اچھل رہا تھا۔ آج وہ کچھ ہو گیا تھا جس کے بارے میں اس نے تصور بھی نہیں کیا تھا۔ وہ ایک دم ہی کروڑ پتی ہو گیا تھا۔

پھر اس نے ایک ہی بینک سے زیادہ مال نکالنا مناسب نہیں سمجھا۔ ابھی اس علاقے میں کئی بینک موجود تھے۔ گلریز اسی احتیاط کے ساتھ اس بینک سے نکل گیا۔ مگر اب اس کے پاس ایک خطیر رقم تھی۔ جس کا وہ بلاشرکت غیرے مالک تھا۔

اب اس کا رخ برابر والے بینک کی جانب تھا۔ اس نے اپنی کار خاصے فاصلے پر پارک کی تھی۔ چلتے چلتے وہ رکا اور پھر کچھ سوچ کر کار کی طرف بڑھنے لگا۔ اس نے وہ تمام رقم کار کی نشستوں کے نیچے منتقل کی اس جگہ لوگوں کی آمد ورفت کم تھی۔ اس لیے اس کارروائی میں اسے کوئی دقت پیش نہیں آئی۔

اب تھیلا پھر خالی ہو گیا تھا۔ بھرنے کے لیے۔ گلریز اس بار لمبے لمبے قدم بھرتا ہوا اگلے بینک کی جانب بڑھ رہا تھا۔ یہاں سیکورٹی کے انتظامات مزید سخت تھے۔ گلریز کو اندر داخل ہونے میں بہت زیادہ احتیاط کرنی پڑی۔ پھر وہ بیگ لے کر کیش کاؤنٹرز کے اندرونی حصے میں پہنچ گیا۔ جہاں بینک کا عملہ بیکار ہوتا ہے گلریز وقت ضائع کیے بغیر اپنے کام میں جت گیا۔ یہاں زیادہ تر پانچ ہزار والے نوٹوں کی گڈیاں تھیں۔ گلریز نے پورا تھیلا منہ تک بھر لیا۔ پھر وہ اسی انداز میں کاؤنٹر کے عقب سے باہر آیا۔ ابھی اس نے قدم بڑھائے ہی تھے کہ اچانک زور دار دھماکے کی آواز گونجی۔

گلریز بری طرح چونک گیا۔

دھماکے کے ساتھ ہی اس نے ایک چیخ سنی۔ اس کے فوراً بعد کسی آدمی کی خوف ناک آواز وہاں ابھرنے لگی۔

''خبردار۔ جو جس جگہ ہے وہیں جم جائے۔ جس نے بھی چالاکی کی تو گولی ماردی جائے گی۔''

گلریز نے وہاں کئی ڈاکوؤں کو دیکھا۔ ان سب کے ہاتھوں میں اسلحہ تھا۔ ڈاکو پورے بینک میں پھیل گئے تھے لگتا تھا کہ وہ مکمل ریکی کرنے کے بعد باقاعدہ پلاننگ سے وہاں آئے تھے۔ گلریز کی پیشانی عرق آلود ہو گئی۔ پورے بینک میں سراسیمگی پھیل گئی تھی۔ سب اپنی اپنی جگہوں پر ساکت وجامد رہ گئے۔ چار پانچ ڈاکوؤں نے رقم لوٹنا شروع کر دی تھی۔ سیکورٹی گارڈز کو بھی قابو کر لیا تھا۔ ایک سیکورٹی گارڈ فرش پر ڈھیر تھا اور اس کے پیٹ سے تیزی سے خون کا اخراج ہو رہا تھا۔ وہ جانکنی کے عالم میں سر پٹخ رہا تھا۔ کوئی بھی اس کی مدد نہیں کر سکتا تھا۔ اگر کوئی ہلتا تو جان سے جاتا۔ لوگ اس کے مرنے کا تماشا دیکھتے رہے۔

''جلدی کرو۔ جلدی کرو۔'' ڈاکوؤں کا سرغنہ اپنے ساتھیوں سے کہہ رہا تھا۔

گلریز کے پیروں میں سے جان ہی نکل گئی تھی۔ ہاتھ پیر سن ہو کر رہ گئے تھے۔ تب اسے خیال آیا کہ وہ تو نادیدہ ہو چکا ہے۔ اسے بھلا ان ڈاکوؤں سے کیا خطرہ اور پھر وہ خود بھی تو ڈکیتی کرنے جا رہا تھا۔

یہ خیال آتے ہی گلریز نے باہر کی جانب پیش قدمی شروع کر دی۔ ابھی وہ صرف پانچ چھ قدم ہی چلا ہوگا کہ یکا یک زوردار آوازوں کے ساتھ کئی فائر ہوئے۔ شیشے ٹوٹنے کے چھناکے ہوئے۔ لوگوں کی دلدوز چیخیں کئی ڈاکو دھڑام سے چیختے ہوئے گر گئے تھے۔ باقی ڈاکوؤں نے صوفوں اور ستونوں کے عقب میں پوزیشن سنبھال لیں۔ بینک میں جگہ جگہ کیمرے لگے ہوئے تھے جن کی مانیٹرنگ بھی ہر لمحے کی جاتی ہے وہاں بھی تین سیکورٹی گارڈز بیٹھے ہوتے ہیں انہوں نے ڈاکوؤں کو دیکھ لیا تھا اور موقع پا کر کئی ڈاکوؤں کو نشانہ بنا لیا۔ بینک میں آنے والے افراد اور عملے کے لوگ فرش پر لیٹ گئے تھے۔ جن سیکورٹی گارڈز کو ڈاکوؤں نے پہلے سے بے بس کر رکھا تھا انہوں نے بھی ڈاکوؤں کی بوکھلاہٹ سے فائدہ اٹھا کر مورچے سنبھال لیے۔ اب ڈاکو اچانک ہی بازی پلٹ جانے پر مصیبت کا شکار ہو گئے تھے اور گارڈز کے نرغے میں آگئے تھے۔ گلریز بھی ایک ستون کی آڑ میں کھڑا تھا۔ اگرچہ وہ نادیدہ حالت میں تھا مگر کوئی بھی اندھی گولی بھٹک کر اسے چاٹ سکتی تھی۔ فی الحال گلریز ابھی مرنے کے موڈ میں نہیں تھا۔ ابھی یہاں مقابلہ جاری تھا کہ ڈاکوؤں کے سرغنہ نے چلا کر اپنے ساتھیوں

میاں بیوی اور فساد

میاں بیوی کا رشتہ ایک عظیم رشتہ ہے جو جوڑا تو مشکل سے جاتا ہے لیکن توڑا آسانی سے جاسکتا ہے۔ ہر گھر میں فساد جھگڑے ہوتے ہیں کبھی کبھار جھگڑا حد سے بڑھ جاتا ہے لیکن یہ پتا نہیں چل پاتا کہ زیادہ جھگڑالو کون ہے میاں یا بیوی؟

اکثر بیویاں بہت باتونی ہوتی ہیں جو بات بات پر آپے سے باہر ہوجاتی ہیں اور جھگڑا کرنے میں پہل کرتی ہیں کہتے ہیں جس گھر میں برتن ہوں وہ آپس میں کھڑکتے ضرور ہیں۔ اس لحاظ سے چند لمحے اپنی بے عزتی اور بیوی کے نازیبا جملے سننے کے بعد بزدل میاں آکر میانوالی کا ہیرو بن ہی جاتا ہے۔ جو بیوی میاں والی ہوتی ہے وہ اپنے شوہر کو نیک دیکھنا چاہتی ہے اور گھر میں میلے جیسا ماحول پسند کرتی ہے اسی لیے چالاک اور ہوشیار لوگ کہتے ہیں کمپیوٹر کی ونڈو، موٹر سائیکل کی ٹیوننگ اور بیوی کے دماغ کو ایک ماہ کے بعد برین واش کرنا ضروری ہے۔ ہمارے ہاں بیویوں اور ان کے فساد کی تین قسمیں زیادہ مشہور ہیں۔

ماڈرن میاں بیوی کا فساد

ماڈرن میاں بیوی کا فساد بڑھتا ہے کم نہیں ہوتا ایسی بیویاں جنہیں پارلر سے محبت اور کچن سے خدا واسطے کا بیر ہو، محلے اور گلی کی خواتین سے فوراً گھل مل جاتی ہوں اور کئی خواتین کے گلے میں باآسانی پڑجاتی ہوں اس کے علاوہ وہ گھر کے کام کاج سے جان چھڑا کر دور بھاگتی ہوں یہ اتنی ماڈرن ہوتی ہیں کہ ان کی آیا ان کے بچے سنبھالتی ہیں جبکہ وہ خود کو سوشل ورک میں مصروف رکھتی ہیں یہ بیویاں محلے میں بھی ڈراؤنا فساد کرا کر انجوائے کرتی ہیں ان کی طرف سے کرائے گئے فساد "ماڈرن فساد" کہلاتے ہیں۔

سادگی پسند میں بیوی کا فساد

سادگی پسند میاں بیوی کا فساد سادہ ہی ہوتا ہے اور ایسی بیویوں کی یہ قسم نصیب والوں کو ہی ملتی ہے۔ جی ہاں خراب نصیب والوں کی یہ بیویاں اتنی سادہ ہوتی ہیں کہ سادگی، سادگی میں فساد برپا کردیتی ہیں اگر گھر میں اکیلی ہوں تو اپنے آپ سے ناراض ہوکر بیٹھ جاتی ہیں۔ جب ان کے دماغ کی گرمی ٹھنڈی ہوجاتی ہے تو انہیں یاد آتا ہے کہ میاں صاحب تو ابھی آئے ہی نہیں۔ پھر خود ہی دل میں سوچتی ہیں کہ شوہر کو جب گڑ کھلا کر مارا جاسکتا ہے تو پھر زہر ضائع کرنے کی کیا ضرورت ہے؟ یہ اتنی سادہ ہوتی ہیں کہ کسی بھی تقریب میں جانے کے لیے میک اپ نہیں کرتیں بلکہ تقریب سے واپس آکر میک اپ کرتی ہیں جس دن فساد شروع ہوجاتا ہے تو یہ اپنی شادی کی تصویر دیکھ کر رونا شروع کردیتی ہیں اور کہتی ہیں کہ کاش میری شادی اس سے نہیں بلکہ اس کی شادی مجھ سے ہوئی ہوتی۔ سادگی پسند میاں بیوی کا یہ فساد "سادہ فساد" کہلاتا ہے۔

سازشی میاں بیوی کا فساد

سازشی میاں بیوی کا فساد شروع ہوتے ہی نت نئے منصوبے بننا شروع ہوجاتا ہیں ان بیویوں کے حوالے سے یہ کہنا ہی کافی ہے کہ ایسی بیوی کے ملنے کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ اس شخص کو قدرت اس کی خطاؤں کی سزا اسی دنیا میں ہی دینا چاہتی ہے ایسی بیویوں کی نیت میں ہی سازش ہوتی ہے۔ انہوں نے ہر لمحہ فساد کو دماغ پر سوار کیا ہوتا ہے ان میں سازش کوٹ کوٹ کر بھری ہوتی ہے۔ جیسے سازش کو آرائش کررہی ہوں۔ یہ پہلے لڑائی کا منصوبہ سوچتی ہیں اور پھر فساد کرتی ہیں۔ کبھی کبھار اگر ان کی سازشی منصوبہ ناکام ہوجائے تو یہ جعلی خودسوزی کا منصوبہ بنالیتی ہیں۔

کہ ان میں سے کتنے مر گئے اور کتنے بے ہوش پڑے ہیں۔ گلریز ستون کی آڑ سے ہوکر دیوار کے ساتھ لگ کر دروازے کی طرف بڑھنے لگا۔ اب اسے بینک کے اندر مزید رکھنا خطرے سے خالی نہیں لگ رہا تھا۔

ڈاکواب دروازہ کھول کر باہر نکل رہے تھے شیشے کا ایک دروازہ ٹوٹ چکا تھا اور کرچیاں بکھری ہوئی تھیں۔ ڈاکو انہیں پھلانگ کر باہر بھاگے۔ مگر ٹھٹک گئے۔

باہر پولیس کی کئی موبائلیں کھڑی تھی۔

ڈاکوؤں نے بلا تاخیر اور بوکھلا کر پولیس والوں پر فائر کردیئے۔ نتیجتاً پولیس کی طرف سے گولیوں کی بوچھاڑ آئی اور آگے والے کئی ڈاکوؤں کو آخرت کے سفر پر روانہ کردیا۔ گلریز دروازے کے ساتھ کھڑا تھا۔ اچانک اس نے ایک سیکورٹی گارڈ کے چیخنے کی آواز سنی۔ اس کے ساتھ ہی گلریز کے سینے میں ایک انگارہ پیوست ہوگیا۔ گلریز کی سمجھ میں نہیں آیا کہ آخر یہ ہوا کیا ہے۔ اس نے اپنے سینے کی جانب دیکھا اور اس کا دماغ بھک سے اڑ گیا۔

سینے سے خون تیزی سے بہہ رہا تھا۔

ابھی گلریز حیرت پاش نظروں سے خون دیکھ رہا تھا کہ یکلخت اسے شدید ترین درد کا احساس ہوا۔ وہ چکرا کر فرش پر گر گیا۔ اس کے ہاتھ سے نوٹوں سے بھرا تھیلا گر چکا تھا۔ اتنے میں ایک اور گولی نے اس کا بھیجہ اڑا دیا۔ گلریز کو تڑپنے کا موقع بھی نہیں مل سکا تھا۔

سامنے لگے شیشے میں گلریز کی لاش کا عکس دکھائی دے رہا تھا۔

❁ ...... ❁ ...... ❁

چار دن بعد کا ذکر ہے۔ پولیس آفیسر نعیم الرحمان پریس کانفرنس کر رہے تھے۔ گلریز کے کیس پر تفتیش مکمل کرلی گئی تھی۔ تین دن تک میڈیا پر اس کیس کے بارے میں مختلف قیاس آرائیاں کی جاتی رہی تھیں۔ آخر کیس کی گتھیاں سلجھالی گئی تھیں۔

''قتل کی وارداتوں کے کیس اکثر میڈیا پر آتے رہتے ہیں۔ ان کی نوعیت مختلف ہوتی ہے۔ کچھ کے پیچھے مجرمانہ ارادے ہوتے ہیں بعض رقابت اور بعض ذاتی دشمنی کا شاخسانہ ہوتے ہیں۔ مگر یہ کیس قدرے مختلف ہے۔ اس میں ایک دوست نے دوسرے دوست کو لالچ کی وجہ سے قتل کیا۔ ڈاکٹر ناصر جانے مانے سائنس دان ہیں انہوں نے ایک ایسی گھڑی بنائی تھی جسے پہن کر غائب ہوا جاسکتا تھا۔ گلریز کو انہوں نے وہ گھڑی دکھائی اور اس کے بارے میں بتایا تو گلریز کے سر پر شیطان سوار ہوگیا اور اس نے ڈاکٹر ناصر کو قتل کردیا۔ گلریز اس گھڑی کی مدد سے غائب ہوکر دولت حاصل کرنا چاہتا تھا۔ وہ کافی عرصے سے مالی بحران کا شکار تھا اور اسے دولت کی شدید ضرورت تھی۔ گلریز نے بلا تاخیر ایک بینک سے دولت لوٹی اور دوسرے بینک کا رخ کیا۔ اتفاق سے وہاں ڈاکوؤں نے دھاوا بول دیا۔ ساتھ ہی پولیس نے اطلاع پر کارروائی کرتے ہوئے بینک کو گھیرے میں لے لیا۔ پولیس مقابلہ ہونے لگا۔ گولیوں کے تبادلے میں کئی پولیس اہل کار زخمی ہوئے اور کئی ڈاکو مارے بھی گئے۔ اس وقت گلریز بینک سے رقم لوٹ کر باہر آرہا تھا۔ وہ غائب حالت میں تھا۔ پھر اس نے باہر نکلنے کے لیے قدم بڑھائے تو اچانک وہ ظاہری حالت میں آگیا۔ لیکن گلریز کو اس کی خبر نہ ہوئی۔ ایک سیکورٹی گارڈ نے اسے ڈاکو سمجھ کر گولیاں برسادیں اور گلریز مارا گیا۔ اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ گلریز اچانک ہی ظاہری حالت میں کیسے آگیا۔'' پولیس آفیسر نے اس مقام پر رک کر میڈیا کے لوگوں پر ایک نظر ڈالی اور دوبارہ گویا ہوئے۔ ''گھڑی کی بیٹری ختم ہوگئی تھی۔ اس میں سیل کے بجائے ری چارج ایبل بیٹری لگی ہوئی تھی۔ وہ زیادہ سے زیادہ چار سے پانچ گھنٹے چلتی تھی اس کے بعد اسے چارج کرنا پڑتا تھا۔ اس کمی کو دور کرنے کے لیے ڈاکٹر ناصر کو بڑی رقم کی ضرورت تھی۔ اس لیے انہوں نے گلریز کو پارٹنر بنانے کا فیصلہ کیا تھا۔ گلریز کی بدنصیبی...... کہ اسے معلوم نہیں تھا کہ وہ زیادہ سے زیادہ پانچ گھنٹے تک غائب رہ سکے گا۔ بینک سے باہر نکلتے وقت بیٹری ختم ہوگئی اور اس کے ساتھ گلریز کی زندگی بھی۔''

یہاں تک کہہ کر پولیس آفیسر خاموش ہوگئے۔



فن پارے

دیس بدیس نئے اور پرانے لکھاریوں کی
رنگارنگ تحریریں جو آپ کے دل کو چھو لیں گی

بے چین شہر کی پرسکون لڑکی	ایمن صدر الدین بھایانی
رگِ جاناں	طاہرہ جبیں تارا
پسِ آئینہ	زینب اصغر مغل
یادوں کی پرچھائیاں	عمران احمد راجپوت
قربانی	محمد خالد جاوید

بے چین شہر کی پُرسکون لڑکی

صدر امین الدین بھایانی

انسان درد کو اپنا سب سے بڑا دشمن سمجھتا ہے اور ہلکے سے سر درد پر بھی تڑپ اٹھتا ہے مگر اس کا جسم درد محسوس کرنے کی حس سے پیدائشی طور پر محروم تھا۔
دوسروں کے درد پر تڑپ اٹھنے والی معصوم روح کا فسانہ۔

آج پھر وہ غیر حاضر تھی!

پہلے روز تو میں نے سوچا کہ شاید کوئی ضروری کام آن پڑا ہوگا جس کے سبب دفتر نہ آسکی ہوگی۔ مگر جب تین روز گزر گئے تو مجھے تشویش ہوئی۔ اُس کے ساتھ کام کرنے والے دوسرے لوگوں سے دریافت کیا تو معلوم ہوا کہ انہیں بھی کچھ علم نہیں۔ سب سے زیادہ حیرت تو اِس بات پر ہوئی کہ کسی کے پاس اُس کا فون نمبر تک نہ تھا۔ ابھی میں سوچ ہی رہا تھا کہ ایچ آر ڈیپارٹمنٹ سے معلوم کروں کہ میرے کیبن کا دروازہ کھلا اور آفس بوائے اندر داخل ہوا۔ میری میز کے قریب یوں کھڑا ہو گیا جیسے کچھ کہنا تو چاہتا ہو مگر کہہ نہ پا رہا ہو۔ اُس کی نگاہیں اپنے جوتوں پر گڑھی ہوئی تھیں۔ ایک ہاتھ سے بالوں کو کھجاتا ہوا بولا۔ ”حسن صاحب! وہ صدف میڈم کی کوئی خبر آئی؟“ میں اُس کی بات کا جواب نفی میں سر ہلا کر دینے ہی والا تھا کہ مجھے کچھ خیال آیا۔ ”تم کیوں پوچھ رہے ہو؟“

”جی...... صاحب...... بس...... ویسے ہی ایسی کوئی خاص بات تو نہیں ہے۔“ اُس کے لہجے کی گھبراہٹ نے مجھے چونکا دیا۔ میں نے اُسے گھورتے ہوئے قدرے با آواز بلند کہا۔ ”میری طرف دیکھ کر بات کرو اور ٹھیک سے بتاؤ بات کیا ہے؟“

”جی صاحب...... وہ...... بات...... کوئی بات نہیں...... میں تو بس...... وہ میڈم کچھ دنوں سے نہیں آرہی ہیں نا...... سوچا آپ کو کچھ علم ہوگا۔ بس یونہی پوچھنے چلا آیا۔“ وہ مجھ سے آنکھیں چُراتے ہوئے بولا۔ اُس کی اِس حرکت نے میرے شک کو یقین میں بدل دیا کہ ضرور کچھ دال میں کالا ہے۔ اب کی بار میں نے سخت لہجے میں دریافت کیا۔ ”دیکھو، سچ سچ بتاؤ کہ کیا بات ہے ورنہ میں بہت بُری طرح پیش آؤں گا۔“ میرے کڑے تیور دیکھ کر وہ بیچارہ گھبرا گیا۔ ”جی حسن صاحب...... وہ...... وہ...... وہ میڈم نے ہی کہا تھا کہ اِس بات کا کسی کو بھی پتہ نہ چلے......!“

”کس بات کا پتہ نہ چلے؟“ میں نے گرجتے ہوئے کہا۔ ”صاحب! میں غریب آدمی ہوں اور میڈم کو پتہ چل گیا کہ میں نے آپ کو بتا دیا ہے تو وہ بہت ناراض ہوں گی اور مجھ غریب کا ناحق نقصان ہو جائے گا۔“ وہ روہانسا ہوتا ہوا بولا۔

”تم فکر نہ کرو۔ میں ہوں نا! میں تمھارا نقصان ہرگز نہیں ہونے دوں گا۔ البتہ تم نے مجھے سب کچھ سچ سچ نہ بتایا تو سچ مچ تمھارا نقصان ہو جائے گا۔“ میں نے اپنے لہجے کو دھمکی آمیز بناتے ہوئے کہا۔ ”ارے نہیں صاحب!“ وہ گھگیاتے ہوئے بولا۔ ”میں بہت ہی غریب آدمی ہوں۔ میرے دو چھوٹے چھوٹے بچے ہیں۔“ اُس کی آنکھیں بھر آئیں اور لہجہ تو اِس قدر گلوگیر ہو چکا تھا جیسے مانو ابھی رو ہی تو پڑے گا۔ میں نے اُسے دلاسا دیتے ہوئے کہا۔ ”میں نے کہا نا کہ تمھارا نقصان نہیں ہونے دوں گا۔ بس تم مجھے فوراً بتاؤ کہ بات کیا ہے؟“ پھر جو کچھ اُس نے بتایا میں تو بس ہکا بکا سا ہو کر رہ گیا اور اُسے تسلی دے کر بھیج دیا۔

صدف مرزا!! ایک ڈیڑھ برس سے اُس برآمداتی کمپنی جہاں میں منیجر متعین تھا، بطور پروڈکشن کوآرڈینیٹر کام کر رہی تھی۔

اُس کے فرائض میں آرڈر کی بروقت ترسیل کے لیے فیکٹری میں پروڈکشن سپروائیزر کے ساتھ جاری کام کی رفتار پر نظر رکھنا اور تمام زیرِ تکمیل آرڈر کی موجودہ صورت حال کی روزانہ کی بنیاد پر رپورٹس تیار کرکے متعلقہ اسٹاف تک پہنچانا تھا۔

وہ کچھ عجیب سی لڑکی تھی۔

دفتر کے تمام مرد و خواتین اسٹاف میں گھلنے ملنے سے اجتناب برتیں اور سارا وقت اپنے کام میں مصروف رہتی۔ اُسے اپنی نشست سے بہت کم اُٹھتے ہوئے دیکھا۔ اپنی تیار کردہ رپورٹوں کو متعلقہ شعبے یا اسٹاف تک پہنچانا ہوتو وہ اُنہیں آفس بوائے کے لیے رکھی گئی مخصوص ٹوکری میں ڈال دیا کرتی جسے وہ آتے جاتے اُٹھا کر اُس پر لکھے نام والی میز یا کمرے میں پہنچادیا کرتا۔

دفتر میں اسٹاف کے لیے ایک وسیع لنچ روم تھا جہاں سب ایک سے دو کے درمیان کھانا کھاتے اور فارغ ہوکر آرام دہ صوفوں پر براجمان ہوکر کافی اور چائے سے لطف اُٹھاتے۔ مگر وہ اپنا لنچ جو کہ عموماً سینڈوچ یا سلاد پر مشتمل ہوتا، آفس بوائے سے منگوائی گئی چائے کے ساتھ اپنی میز پر ہی بڑے اطمینان کے ساتھ دھیرے دھیرے ختم کرتی۔ اُس وقت تک اُس کی چائے مکمل طور پر ٹھنڈی ہوچکی ہوتی جسے وہ بڑے بڑے گھونٹ بھر کر پیتی اور پھر دفتر کے دوسرے لوگوں کے برعکس لنچ کا وقفہ ختم ہونے کا انتظار کیے بنا ہی فوری طور پر اپنے دفتری کاموں میں مشغول ہوجاتی۔

چار بجے شام کی چائے پیش کی جاتی۔ جیسے ہی آفس بوائے اُس کی میز پر گرما گرم بھاپ اُڑاتی چائے کی پیالی رکھتا، وہ اپنی دراز میں سے بسکٹ کا پیکٹ نکال کر سکون و اطمینان کے ساتھ چند بسکٹ نوش کرتی۔ اُتنی دیر میں چائے کی گرمی بھی ختم ہوچکی ہوتی اور وہ بڑے بڑے گھونٹ بھر کر چائے ختم کرلیتی۔

دفتر ایک مخصوص رکشے سے آتی اور شام کو وہی رکشہ اُسے لینے بھی آتا۔ دفتر کے کئی خوش شکل و خوش پوش نوجوان اُس کے اِردگرد توجہ حاصل کرنے کے لیے منڈلاتے رہتے۔ مگر وہ اپنے کام میں سر جھکائے یوں مگن رہتی جیسے اُسے کسی کے ہونے کا احساس ہی نہ ہو۔ وہ سارے اسٹاف میں مغرور حسینہ کے نام سے مشہور تھی۔ حالانکہ میں نے اُسے ہمیشہ بہت ہی بااخلاق اور مہذب پایا۔ اُس کا لہجہ مدھم و دھیما، پُرخلوص اور چہرے پر ہمیشہ ایک ہلکی سی دوستانہ مسکراہٹ نمایاں رہتی۔ مگر کسی سے از خود بات کرتے کبھی نہ دیکھا۔ نہ ہی کبھی اسٹاف پکنک یا پارٹی وغیرہ ہی میں شریک ہوتی۔

ویسے تو میں ایک خوش و خرم شادی شدہ، بال بچوں والا شخص اور عمر میں بھی اُس سے کوئی بارہ پندرہ برس بڑا ہی تھا تو ظاہر ہے کہ میری اُس میں دلچسپی کی وجوہات ہرگز وہ نہ ہوسکتی تھیں جو کہ اسٹاف میں موجود نوجوانوں کی تھیں۔ مگر یہ بھی قدرت کا ایک اٹل اُصول ہے کہ خوبصورتی ہر انسان کو اپنی طرف ضرور متوجہ کرتی ہے اور پھر اُس کا یہ عجیب و غریب رویہ مجھے اکثر و بیشتر اُس کے بارے میں سوچنے پر مجبور کیے رکھتا۔

میری دلچسپی کی وجہ محض اُس کا ملکوتی حسن اور معصومیت بھرا چہرہ ہی نہ تھا۔ ایک اور بات بھی اُس میں ایسی ضرور تھی جو اُسے دوسروں سے منفرد بناتی تھی۔ اسٹاف کا کم و بیش ہر رکن دفتری کام سے زیادہ دفتری سیاست، افسرانِ بالا کے حوالے سے چہ مگوئیاں، حالاتِ حاضرہ تو کبھی اپنے گھریلو مسائل کو لے کر اور اگر کچھ نہ میسر آئے تو ایک دوسرے کے آپسی معاملات کے حوالے سے کھچڑی پکاتا رہتا۔ اِس کے برعکس میں نے اُسے کبھی بھی اِس قسم کی باتوں میں شریک ہوتے نہیں دیکھا۔ بلکہ اکثر ایسا محسوس ہوتا کہ جیسے اِس مصروف دفتر میں دنیا بھر کے معاملات کو لے کر بے چین رہنے والے نفوس میں وہ فردِ واحد ہے جو پُرسکون ہے۔ میرے کیبن کی ایک طرف منظر دکھاتی بڑی سی کھڑکی کے شیشے سے مرکزی ہال جہاں دفتر کے بیشتر اسٹاف کی میزیں تھیں کے ایک کونے میں لگی میز پر وہ اپنے میک اپ سے عاری معصوم سے کتابی چہرے، گہری جھیل جیسی پُرسکون بڑی بڑی آنکھوں، گورے رنگ پر ستواں ناک اور گلاب کی پنکھڑیوں جیسے تراشیدہ لب اور ایک گہرے سکون کی کیفیت کے ساتھ دوسروں کے معمولات سے قطعاً بے نیاز و بے پروا ہمہ وقت کام میں مہنمک نظر آتی۔

ایک دن بڑی عجیب بات ہوئی۔
اُس روز میرے سر میں شدید درد تھا۔ عموماً مجھے سر درد کی شکایت ہوتی نہیں۔ مگر جب کبھی سر میں درد اُٹھتا ہے تو پھر اگلی پچھلی ساری کسر نکال کر ہی جاتا ہے۔ شام چار بجے کے قریب اچانک سر میں درد اُٹھا اور پھر دھیرے دھیرے اِس قدر شدت اختیار کر گیا کہ ہر آتی جاتی سانس کے ساتھ شدید دردناک ٹیسیں اُٹھتیں۔ چھٹی ہونے میں ابھی کوئی گھنٹہ بھر رہتا تھا۔ درد رفع گولی بھی لے چکا تھا مگر درد ویسے کا ویسا ہی تھا۔ کام اِس قدر تھا کہ چاہتے ہوئے بھی میں جلدی گھر نہیں جاسکتا تھا۔ ایک غیر ملکی فرم کا بہت بڑا آرڈر انتہائی سرعت کے ساتھ تکمیل پذیر تھا جو اگر ایک خاص تاریخ تک فراہم نہ کر دیا جاتا تو کمپنی کو بہت بھاری نقصان کا سامنا کرنا پڑسکتا تھا۔ میں نے انٹرکام پر صدف کو مذکورہ آرڈر کی تازہ ترین رپورٹ لے کر اپنے کمرے میں آنے کو کہا اور آنکھیں بند کر کے انگلیوں سے درد کی ٹیسوں سے پھٹتی پیشانی کو زور زور سے رگڑنا شروع کر دیا۔ مجھے معلوم ہی نہ ہوسکا کہ کب وہ میرے کمرے میں آکر میز کے سامنے کھڑی ہوئی۔ وہ تو جب میں نے کچھ دیر بعد آنکھیں کھولی تو اُسے وہاں کھڑے بڑی عجیب سی نظروں سے گھورتے ہوئے پایا۔ جن نظروں سے مجھے دیکھ رہی تھی، پہلے تو ایسا محسوس ہوا کہ جیسے اُن میں ایک وارفتگی سی ہو۔ میں نے اِسے کرسی پر بیٹھنے کا اشارہ کرتے ہوئے پروڈکشن کی تازہ ترین صورت حال دریافت کی۔ اُس نے بتایا کہ جس رفتار سے کام جاری ہے، پروڈکشن اور پیکنگ وغیرہ کے بعد وقت سے پہلے ہی شپمنٹ کر دی جائے گی۔ اِس دوران میں نے محسوس کیا کہ اُس کی نظروں میں وارفتگی نہیں بلکہ رشک کی سی ایک کیفیت ہے۔ سُننے میں تو یہ بات بڑی عجیب سی لگتی ہے مگر شاید تھا کچھ ایسا ہی۔ کیونکہ جب میں پیشانی رگڑتا، مجھے اُس کی آنکھوں میں اُس چھوٹے سے بچے کی سی چمک نظر آتی جو کسی دوسرے بچے کے ہاتھوں میں اپنا من پسند کھلونا دیکھ کر رشک و تحسین بھری نظروں سے دیکھ رہا ہو۔ خیر میں نے اِسے اپنا واہمہ جانا۔
چند روز بعد کمپنی کے کلرک ریاض الدین کی کمر میں زمین پر گرا قلم جھک کر اُٹھاتے ہوئے چک پڑ گئی اور وہ شدت درد سے پہلے تو زور سے چلایا اور پھر اپنی نشست پر ڈھیر ہو کر ہائے ہائے کرنے لگا۔ تمام اسٹاف کی نگاہوں میں اُس کے لیے ہمدردی تھی مگر صدف کی آنکھوں میں بالکل وہی تاثرات نظر آئے۔
پھر باقی رہا سہا شک اُس روز یقین میں بدل گیا جب ایک حادثے کے سبب کمپیوٹر آپریٹر مختار احمد کئی روز تک مسلسل دفتر نہ آسکا۔ اسٹاف کے چند لوگ اُس کے گھر عیادت کو گئے اور اگلے روز واپس آکر انہوں نے اُس کی ٹوٹی ٹانگ کی ہڈی کے درد کا نقشہ کچھ یوں کھینچا کہ سُننے والوں کو خود اپنی ہڈیوں میں درد کی لہریں اُٹھتی محسوس ہوئی۔ مگر اُس کے چہرے اور آنکھوں میں وہی پہلے والے تاثرات تھے۔ نہ چاہتے ہوئے بھی میں یہ سوچنے پر مجبور ہو گیا کہ یہ کوئی بے حد کٹھنی لڑکی ہے جو چہرے پر خاموشی اور معصومیت کا نقاب اوڑھے دوسروں کی تکالیف سے لطف اندوز ہوتی ہے۔ مگر یہ سوچ کر زیادہ توجہ نہ دی کہ ہر انسان کا اپنا مزاج اور شخصیت ہوتی ہے۔ اگر ایسا ہے بھی تو مجھے اِس سے کیا؟
پھر ایک روز ایک اور عجیب بات ہوئی۔
میں نے انٹرکام پر صدف کو آفس بوائے کے ہاتھوں ایک اہم ترین آرڈر کی رپورٹ جس پر وہ کام کر رہی تھی، فوری بھجوانے کو کہا۔ کچھ ہی دیر میں آفس بوائے ایک فولڈر میری میز پر دھر گیا۔ میں نے فولڈر کھول کر کاغذات پلٹنا شروع کیے۔ ابھی دو چار صفحات ہی پلٹے ہوں گے تو مجھے ایک چھوٹا سا کاغذ کا ٹکڑا نظر آیا۔ میں صدف کی لکھائی اچھی طرح سے پہچانتا تھا۔ کاغذ کے ٹکڑے پر ایک شعر اور کچھ چھوٹے چھوٹے سے پھول یوں بنے ہوئے تھے جیسے کسی نے سوچوں کے دھارے میں بہتے ہوئے سامنے موجود کاغذ کے ٹکڑے پر کوئی لفظ یا شعر لکھ کر پھول پتیاں بنا دی ہوں۔ شعر پڑھ کر تو میں حیران سا رہ گیا۔

درد سے میرا دامن بھر دے یا اللہ
پھر چاہے دیوانہ کر دے یا اللہ

میرے وہم و گمان میں نہ تھا کہ اُسے شعر و ادب سے شغف ہوگا اور اِس قدر گہرے اشعار کا ذوق بھی رکھتی ہوگی۔ موقعہ پاکر میں نے اُس سے شعر کے بارے میں دریافت کیا۔ اُس کے چہرے پر ایک عجب سا تاثر نظر آیا۔ ہونٹوں کو ہلکے سے بھینچ کر اپنی نگاہیں کہیں دور خلاؤں میں مرکوز کرتے ہوئے ایک گہری سانس لی۔ پھر ایک ہلکا سا تبسم اُس کے ہونٹوں پر اُبھرا۔ ''حسن صاحب، یہ میرے پسندیدہ شاعر قتیل شفائی کا شعر ہے اور مجھے بے حد پسند ہے۔'' ابھی میں اُس سے کچھ اور پوچھنے کی جستجو کر ہی رہا تھا کہ وہ میری میز کے سامنے لگی کرسی سے اُٹھی اور کیبن کا دروازہ کھول کر مجھے حیران و پریشان چھوڑ گئی۔ کچھ عرصہ تو میں اُن تمام باتوں کے متعلق سوچتا رہا پھر دفتری اور گھریلو مصروفیات میں کچھ یوں الجھا کہ وہ ساری باتیں میرے ذہن سے محو ہوتی چلی گئیں۔

ایچ آر ڈیپارٹمنٹ سے رابطہ کیا تو معلوم ہوا کہ اُس نے غیر حاضری کی درخواست دی ہے اور نہ ہی کوئی اطلاع فراہم کی ہے۔ میں نے فون پر اُس کی خیریت معلوم کر کے مجھے خبر کرنے کی ہدایت دی۔ کچھ ہی دیر بعد بتایا گیا کہ اُس کی پرسنل فائل میں موجود سیل فون اور گھر کے نمبروں سے کوئی جواب نہیں آ رہا۔ کافی سوچ و بچار کے بعد اُس کے گھر کا پتہ اس ارادے سے حاصل کیا کہ شام کو دفتری اوقات ختم ہو جانے کے بعد میں اس کے گھر کا چکر لگاؤں گا تا کہ معلوم تو ہو کہ آخر ماجرا کیا ہے؟

گھر کا پتہ دیکھ کر مجھ پر ایک اور بجلی گری۔ یہ شہر کے سب سے متمول رہائشی علاقے کا پتہ تھا۔ جہاں شہر کے کھاتے پیتے لوگوں کی کوٹھیاں اور بنگلے تھے۔ دفتر سے نکل کر میں نے گاڑی کا رخ اُس کے گھر کی طرف پھیر دیا۔ سارے راستے میں بس اِسی سوچ میں غلطاں و پیچاں رہا کہ یہ صدف آخر ہے کون؟ میں جتنا اُس کے بارے میں سوچتا، اُس کی شخصیت اُتنی ہی پُر اسرار محسوس ہوتی۔ تھوڑی دیر کے بعد میں اُس کے گھر کے سامنے کھڑا تھا۔ اِرد گرد ایستادہ بڑی بڑی کوٹھیوں سے ذرا ہٹ کر یہ ایک واحد چھوٹا مگر انتہائی خوب صورت سا بنگلا تھا جس کے عین سامنے والی بڑی سڑک کے اُس پار ساحلِ سمندر کا دلفریب نظارہ آنکھوں اور دل کو لبھا رہا تھا۔

بنگلے کے دروازے پر بیٹھے چوکیدار نے میرے دریافت کرنے پر بتایا کہ یہ اُس کا ہی گھر ہے۔ جب میں نے اُس سے کہا کہ جا کر بتاؤ کہ اُن کے دفتر سے کوئی ملنے آیا ہے تو وہ بڑے ہی افسردہ اور گلوگیر لہجے میں بولا کہ بی بی صیب تو گذشتہ تین دنوں سے اسپتال میں داخل ہیں۔ کھانا پکاتے ہوئے کپڑوں نے آگ پکڑلی اور زخمی حالت میں اسپتال لے جایا گیا۔ اِتنا کہہ کر اُس نے اپنے دونوں ہاتھ بلند کیئے اور آسمان کی طرف دیکھتے ہوئے اُس کی صحت یابی کے لیے دعا کرنے لگا۔ میں نے گھر میں موجود کسی اور فرد کو بلانے کے لیے کہا۔ اُس نے بتایا کہ بی بی صیب کے علاوہ گھر میں صیب اور بیگم صیب ہوتے ہیں اور وہ بھی اسپتال میں ہی ہیں۔ اسپتال کا نام معلوم کیا اور گاڑی اسپتال کی طرف موڑ دی۔

شام کے اوقات کے سبب تمام سڑکیں ٹریفک سے بھری پڑی تھیں۔ ہر سو ایک نفسا نفسی کا سا سماں تھا۔ لوگ پیدل، سائیکلوں، اسکوٹروں، کاروں، ویگنوں اور بسوں میں بھرے یوں بیتابی اور نفسا نفسی سے بھاگے چلے جا رہے تھے کہ جیسے اُن سب کی زندگی کا واحد مقصد صرف بھاگنا ہی تو ہو۔ نہ جانے کیوں بے اختیار صدف کا پُر سکون چہرہ میری نگاہوں کے سامنے پھرنے لگا اور ذہن کے کسی نہاں خانے سے یہ سوال اُبھرا کیا سچ مچ وہ اندر سے بھی اتنی ہی پُر سکون ہے یا محض پُر سکون نظر آنے کی اداکاری کرتی ہے؟

کچھ دیر بعد میں اسپتال کے برنس وارڈ کے پرائیوٹ روم کے باہر کھڑا تھا۔ نرس مجھے باہر رکنے کا کہہ کر کمرے میں داخل ہو گئی۔ تھوڑی ہی دیر میں کمرے کا دروازہ کھلا اور اندر سے ایک مہربان صورت معمر صاحب برآمد ہوئے۔ آہستگی کے ساتھ دروازہ بند کرنے کے بعد مجھ سے ہاتھ ملایا اور بولے۔ ''فرمائیں، میں آپ کی کیا خدمت کر سکتا ہوں؟'' میں نے اپنا تعارف کروایا۔ جس پر اُن کے چہرے پر شناسائی کے سائے لہرائے۔

''اوہ اچھا تو تم ہو حسن میاں۔ صدف بٹیا اکثر تمہارا ذکر کیا کرتی ہے۔ مجھے شفقت مرزا کہتے ہیں، میں صدف کا

والد ہوں۔ آؤ سامنے بیٹھ کر آرام سے باتیں کرتے ہیں۔'' انہوں نے برآمدے میں نصب بینچ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ''جی مجھے آپ کے چوکیدار کی زبانی پتہ چلا۔ بہت افسوس ہوا'' میں نے بینچ پر بیٹھتے ہی کہا۔ ''اب کیسی حالت ہے؟'' میری بات کے جواب میں انہوں نے کچھ کہا تو نہیں بس دور خلاؤں میں گھورتے رہے۔ مجھے ایسا محسوس ہوا کہ شاید صدف کی حالت کچھ اچھی نہیں۔ جبھی تو وہ کچھ بتا نہیں رہے۔ پھر اچانک یونہی خلاؤں میں گھورتے ہوئے بولے۔

''بس اللہ کا کرم ہو گیا۔ ڈاکٹر کا کہنا ہے صرف دس فیصد جسم جھلسا ہے۔ دو تین ہفتوں میں ٹھیک ہو جائے گی۔''

میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا بات کروں۔ بات جاری رکھنے کی نیت سے بولا۔ ''آپ کا گھر دیکھ کر مجھے یہ بخوبی اندازہ ہو رہا ہے کہ صدف کو ملازمت کی چنداں ضرورت نہیں۔'' اُن کے چہرے پر ایک ہلکی سی مسکراہٹ آ گئی۔

''ملازمت تو اپنے شوق اور خود کو مصروف رکھنے کے لیے کرتی ہے۔ ورنہ جو تنخواہ اُسے ملتی ہے وہ تو ضرورت مندوں کی مدد کرنے میں ہی خرچ کر دیتی ہے۔ میں ریٹائرڈ سول سرونٹ ہوں۔ کوئی تیس سال قبل گھر والا پلاٹ کوڑیوں کے مول خرید کر اُنہی اچھے وقتوں میں بنک سے قرضہ لے کر گھر بنوا لیا تھا۔ پینشن آ جاتی اور فکس ڈیپازٹ اکاؤنٹ سے کچھ منافع بھی مل جاتا ہے۔ سو اللہ تعالیٰ کا کرم ہے اچھی بھلی گزر بسر ہو ہی جاتی ہے۔ بس میں تو یہی چاہتا ہوں کہ صدف خوش رہے۔ وہ لوگوں کی زندگیوں میں اپنی ذات کی نفی کر کے شامل ہونا چاہتی ہے۔ گھر میں گاڑی اور ڈرائیور کے ہوتے ہوئے بھی روز دفتر بھی رکشہ پر آیا جایا کرتی ہے۔ اُسے دولت، حیثیت، علم اور مرتبے کا استعمال کر کے دوسروں کو مرعوب کرنے والے لوگ بالکل پسند نہیں۔ میری بیٹی ایک عجب آزاد اور پرسکون روح ہے۔ اُسے زندگی، اپنی بیماری، مقدر حتیٰ کہ خدا سے بھی کوئی شکایت نہیں۔''

''بیماری......؟ مگر جل جانا تو کوئی بیماری نہیں۔'' میں نے حیران ہوتے ہوئے پوچھا۔

صدف نہیں چاہتی کہ کسی کو یہ بات بتائی جائے۔'' وہ میری آنکھوں میں دیکھتے ہوئے بولے۔ ''مگر تم سے کیا چھپانا، وہ 'سیپا' کی مریضہ ہے۔''

''جی کیا فرمایا آپ نے 'کس کی مریضہ ہے؟'' میں نے حیران ہوتے ہوئے پوچھا۔

''سی، آئی، پی، اے، سیپا۔'' انہوں نے ایک ایک حرف انگریزی میں بول کر بتایا۔

''یہ کون سی بیماری ہے؟ میں نے تو اس طرح کی کسی بیماری کا نام آج تک نہیں سُنا؟''

''یہ ایک بہت ہی کمیاب بیماری ہے جو کروڑوں لوگوں میں بمشکل کسی ایک انسان میں پائی جاتی ہے اور جنیٹک ڈس آرڈر کے باعث ہوتی ہے۔ وہ اکثر ضد کر کے ہمارے لیے کھانا بناتی ہے۔ اُس روز کھانا پکاتے ہوئے نجانے کیسے اُس کے کرتے نے چولہے سے آگ پکڑ لی۔ وہ تو بھلا ہو کہ اُس کی نظر جلتے ہوئے کرتے پر پڑی تو اُس نے آواز لگائی۔ ساتھ والے کمرے میں موجود ملازمہ نے اُس کی بروقت مدد کرتے ہوئے چادر لپیٹ کر آگ بجھائی۔ جب صدف کوئی چند ماہ کی تھی تب فیملی ڈاکٹر کے توسط سے اِس بیماری کا پتہ چلا۔''

''مرزا صاحب......! آگ......! بیماری......! بخدا میں کچھ بھی سمجھنے سے قاصر ہوں۔''

''آؤ میں تمھیں سمجھاتا ہوں......'' اتنا کہہ کر اُٹھے اور مجھے اپنے ساتھ آنے کا اشارہ کیا۔ دو قدم چل کر رُک گئے جیسے کچھ یاد آ گیا ہو اور بولے۔ ''ارے ہاں بھئی، وہ صدف کے کہنے پر دفتر کے آفس بوائے کے دونوں بچوں کے اسکول کی فیس آج صبح ہی کسی کو بھیج کر جمع کروا دی تھی۔ اُسے بتا دیجیے گا۔''

ہم دونوں صدف کے کمرے میں داخل ہوئے۔ وہ سکون آور ادویات کے زیرِ اثر گہری نیند سو رہی تھی۔ اُس کے جسم کا زیریں حصہ ایک نیم دائرہ بناتی سفید جالی سے ڈھکا ہوا تھا۔ نیند پری اُس کے ملکوتی چہرے کو اور معصوم بنا رہی تھی۔ مرزا صاحب صدف کی طرف دیکھتے ہوئے آہستگی سے بولے۔ ''ہم انسان درد کو اپنا سب سے بڑا دشمن سمجھتے ہیں......! نہیں جانتے کہ درد ہی تو ہمارا سب سے بڑا دوست ہے۔''

اتنا کہہ وہ کچھ دیر سانس لینے کو رکے۔ مجھے اُن کا خاموش ہونا بے حد کھلا۔ چند گہری گہری سانسیں لے کر بولے۔
''لوگوں کی نظروں میں یہ بیمار ہے۔ مگر بیمار تو وہ ہیں جو دردِ دل سے محروم ہیں......! یہ تو ہر کسی کا درد اپنے دل پر محسوس کرتی ہے......! ہاں البتہ اُس کا جسم درد محسوس کرنے کی حس سے پیدائشی طور پر محروم ہے۔''

......☆☆☆......

رگ جاناں

طاہرہ جبیں تارا

طاہرہ جبیں تارا کا تعلق بنیادی طور پر صحافت سے ہے آپ کے مضامین اور کالم پنجاب کے کئی اخبارات کی زینت بنتے رہتے ہیں' اس کے علاوہ آپ تدریس کے شعبہ سے بھی وابستہ ہیں. بحیثیت استاد اور صحافی کے ان کی نظریں معاشرے کے ایسے مسائل تک پہنچ جاتی ہیں جنھیں عام آدمی نظر انداز کر دیتا ہے یا ہنگامہ آلام کی وجہ سے اس کی نگاہ نہیں جاتی.

زیر نظر افسانہ انسانی رویوں کے اس پہلو کو نمایاں کرتا ہے جس کے بارے میں ہم تبصرہ تو برملا کرتے ہیں لیکن اس پر سوچنا پسند نہیں کرتے.

اس کی نگاہیں ایک ہی نکتے پر مرکوز تھیں' اچانک اس نے اپنی نظروں کا زاویہ بدلا اور مٹھی کھول کر اپنے ہاتھوں کی لکیروں کو دیکھنے لگی اس کے کانوں میں آوازوں کی۔ بازگشت گونجی۔
''تمہارا ہاتھ بہت لکی ہے ایسا ہاتھ میں نے بہت کم لوگوں کا دیکھا ہے، کسی کو نہ دکھانا۔''
''کیوں کیا خاص بات ہے بابا جی ہمیں بھی تو بتائیں۔'' ضویا نے ہنستے ہوئے پوچھا تھا۔
''محبت ہی محبت ہے محبت بانٹتی ہے اور جواب میں بے انتہا محبت ملتی ہے دولت کی کمی نہیں اور دل کی لکیر پر چاند اور تاروں کا جھرمٹ اس کی خوش بختی کو ظاہر کرتا ہے۔ دکھ، بیماری اور تکلیف زندگی کے نزدیک نہیں آئے گی جو منہ سے نکالے گی وہ پورا ہوگا گھر پر ایک شہزادی کی طرح راج کرے گی ہر ایک کے دل کی ملکہ بنے گی۔''
''بابا جی کوئی شہزادہ بھی ملے گا یا ہماری شہزادی......!'' حنا نے پوچھا۔
''شہزادے کو شہزادی پتہ نہیں کیوں خود ٹھکرا دے گی اور یہ اس کی زندگی کی بہت بڑی غلطی ہوگی۔''
''سن لو مہارانی صاحبہ ایسی غلطی مت کرنا۔''

......☆☆☆......

وہ سب یونیورسٹی سے نکلیں تو نجومی کو دیکھ کر بے اختیار مستقبل جاننے کی جستجو میں اس کے پاس چلی آئیں سب نے ہاتھ دکھایا مگر اس کا ہاتھ دیکھتے ہی نجومی نے کہا تھا۔
''ایسا ہاتھ میں نے بہت کم لوگوں کا دیکھا ہے۔'' اور اس نے نجومی بابا کی سب باتیں سن کر کہا تھا۔ ''ٹھیک ہی تو کہہ رہے ہیں بابا جی میں گھر بھر کی لاڈلی ہوں بڑی بیٹی جس کے پیدا ہوتے ہی بابا کی پروموشن ہوئی اماں کا دس لاکھ کا پرائز بانڈ نکلا جو اپنے بعد بابا کا وارث لے کر آئی دیکھو بابا جی سچ کہہ رہے ہیں کہ میں اپنے گھر کی شہزادی ہوں جس کے منہ سے نکلی بات پوری کرنا سب اپنا فرض سمجھتے ہیں اتنی ڈھیر ساری محبتیں مجھے میسر ہیں۔'' اس نے اتراتے ہوئے کہا تھا۔

آج اس نے ایک بار پھر اپنی ہتھیلیوں کو غور سے دیکھا خوشیوں کے سب جگنو اڑ چکے تھے اب تو بس دونوں ہاتھ خالی تھے بے بسی سی بے بسی تھی زندگی اذیت دے رہی تھی لفظ نشتر کی طرح دل و روح کو چھلنی کر رہے تھے وہ پیارے رشتے جو کبھی اس کی محبت کا دم بھرتے تھے وہ صبح کہتی تو وہ صبح مانتے آج اس سے یوں بے زار ہوں گے اس نے سوچا بھی نہ تھا سب قربانیاں، محبتیں اور وفائیں فنا ہو چکی تھیں صرف خود غرضی بچی تھی لیکن وہ تو خود غرض نہ تھی اس نے تو سب کی خاطر اپنا تن من دھن تج دیا تھا۔

پھر......

آنسو ایک تواتر سے اس کی آنکھوں سے بہہ رہے تھے خوبصورت گھنی اور لمبی پلکیں آنسوؤں سے بھیگی ہوئی تھیں۔

......☆☆☆......

''سنو تمہاری پلکیں بہت خوب صورت ہیں انہیں آنسوؤں سے بھیگنے مت دینا اگر کبھی رونے کو دل چاہے تو مجھے بلا لینا تمہاری پلکوں کے سارے تارے میں اپنے ہاتھوں سے چن لوں گا۔'' سرگوشی سنائی دی۔ ''تم ہنستی اچھی لگتی ہو تم روتی بالکل بھی اچھی نہیں لگتی ہو۔''

......☆☆☆......

''میری جان کو اماں نے ڈانٹا ہے، بیگم میری بیٹی کی آنکھوں میں آنسو......!''

''میری اتنی جرأت کہ آپ کی لاڈلی کو کچھ کہوں آپ کی لاڈلی نے کڑوا پیاز کاٹا ہے جس سے آنکھوں میں پانی آگیا ہے۔''

''بابا جانی آپ واقعی مجھے روتے نہیں دیکھ سکتے۔''

''ہاں بابا کی جان جس نے آپ کو رلایا میں اسے جان سے مار دوں گا آپ مجھے اتنی ہی پیاری ہو میں آپ کی آنکھ میں آنسو نہیں دیکھ سکتا ہر لمحہ میں یہی دعا کرتا ہوں میرے اللہ میرے بچوں کو سدا خوش رکھنا ان کی تکلیف بھی مجھے دے دینا۔''

''نہ بابا جانی یہ فاؤل ہے آپ کی تکلیف ہماری تکلیف ہوگی آپ یہ دعا مانگیں کہ اللہ ہم سب کو ہر دکھ اور ہر تکلیف سے بچائے۔'' اور وہ کھلکھلا کر ہنس پڑی۔

......☆☆☆......

آنسو اور تیزی سے بہنے لگے آج ان آنسوؤں کو صاف کرنے والا کوئی نہ تھا آوازیں گڈمڈ ہو رہی تھیں۔

''آپ بہت لکی ہیں تم مجھے بہت پیاری ہو میں تمہاری آنکھوں میں آنسو نہیں دیکھ سکتا تم ہنستی اچھی لگتی ہو۔ بجیا آپ تو میری جان ہو آنی کیا ہوا؟ اف کب ان سے جان چھوٹے گی؟

آہ وہ سہانے دن مٹھی میں ریت کی مانند پھسل گئے اب تو وہ لق دق صحرا میں تنِ تنہا کھڑی تھی سب کچھ بدل چکا تھا اب اس کا نازک وجود سب پر بوجھ بن گیا تھا۔

سنو جب تمہیں لگے کہ اب زندگی اکیلے بتانی مشکل ہے تو مجھے آواز دینا میں منتظر ملوں گا۔

کیا مجھے برسوں پہلے بڑھے ہوئے ہاتھ کو تھام لینا چاہیے جسے میں نے خود ان رشتوں پر قربان کر دیا مگر لوگ کیا کہیں گے؟ وہ شش و پنج میں تھی اور ماضی کی پرتیں تہہ در تہہ اس کے سامنے کھل رہی تھیں۔

......☆☆☆......

اس کے بابا ایک کمپنی میں منیجر تھے اس نے ایک خوشحال گھرانے میں آنکھ کھولی تھی اس کی دادو کہتیں وہ بڑی منتوں مرادوں کے بعد پیدا ہوئی دس سال بابا اور اماں پیروں فقیروں کے در کی خاک چھانتے رہے کیونکہ ڈاکٹرز کہتے آپ دونوں ٹھیک ہو بس اللہ کی طرف سے دیر ہے اور دس سال بعد جب وہ پیدا ہوئی تو بابا جنرل منیجر بن گئے اور اماں نے جو برسوں پہلے دس ہزار کا پرائز بانڈ لیا تھا اس پر دس لاکھ کا فرسٹ پرائز نکلا یوں وہ پورے خاندان میں خوش بخت کے نام سے مشہور ہوگئی گھر بھر کی لاڈلی۔

دو سال بعد حارث کا آنا بھی اس کی خوش بختی کا حوالہ بنا پھر ارومہ اور سعد بھی اس کی اہمیت کم نہ کر سکے وہ اول روز سے اہم تھی اہم رہی لیکن اس اہمیت نے نہ اس میں تکبر پیدا کیا نہ وہ اپنے سیدھے راستے سے بھٹکی عام طور اتنا پیار اتنا لاڈ اور اہمیت لڑکیوں اور لڑکوں میں تکبر پیدا کر دیتا ہے وہ ضدی اور اپنی خواہشات کے غلام بن جاتے ہیں دوسرے لوگ چاہے وہ بہن بھائی ہی کیوں نہ ہوں انہیں حقیر سمجھنے لگتے ہیں خود غرضی اور خود پسندی کا شکار ہو جاتے ہیں لیکن وہ ان تمام بدعادات سے دور تھی۔

بابا، اماں اور دادو کی تربیت نے اسے انمول ہیرا بنا دیا تھا احساس اور محبت سے گندھا اس کا وجود ہر ایک کے لیے خوشی کا باعث بن جاتا وہ نہ صرف خاندان میں اپنی اچھی عادات کی وجہ سے ہر دل عزیز تھی بلکہ اسکول کالج اور یونیورسٹی میں بھی اپنے اساتذہ اور اپنے کلاس فیلو کے لیے پسندیدہ ہستی تھی۔

دکھ کی پہلی بارش سے وہ اس وقت آشنا ہوئی جب دادو کو اچانک ہارٹ اٹیک ہوا دادا کے وجود سے تو وہ نا آشنا تھی دادا اس کی پیدائش سے پہلے ہی وفات پا چکے تھے۔

مگر دادو نے تو اسے گودوں کھلایا تھا وہ تو حارث کی پیدائش کے بعد دادو کے پاس ہی رہتی تھی ہوش سنبھالنے کے بعد بھی اس نے اپنا ٹھکانہ نہیں چھوڑا تھا سب کے اپنے اپنے کمرے تھے مگر وہ دادو کے ساتھ ہی رہتی سب نے کہا مگر اس نے سب کو کہہ دیا۔

''لو اگر میں الگ کمرے میں سوؤں گی تو مجھے نیند ہی نہیں آئے گی مجھے دادو کے ساتھ کی اتنی عادت ہو چکی ہے کہ اب ان سے جدائی مجھے ایک پل بھی گوارہ نہیں۔''

حارث اور رومی اسے چھیڑتے۔ ''خوشی جی آپ ہماری دادو کو جہیز میں لے کر جائیں گی ناں ہم ایسے نہیں ہونے دیں گے اور سعدی کہتا دادو تو میری ہیں ان کی وجہ سے گھر میں رونق ہے میں ان سے کہانی سنتا ہوں میں دادو کو نہیں جانے دوں گا۔

اور وہ خوشی سے کھلکھلا کر کہتی ''جناب دادو میری ہیں میں ہمیشہ ان کے ساتھ رہوں گی۔''

اور دادو اسے محبت سے اپنے ساتھ لگا کر کہتیں۔ ''نہ نہ خوشی ایسا نہ کہہ تجھے تو میں نے شہزادے کے ساتھ رخصت کرنا ہے بھلا لڑکیاں بھی کبھی ساری عمر ماں باپ کے گھر رہتی ہیں میری خوشی دلہن بنے گی۔'' اور پھر اماں کو مخاطب کر کے کہتیں ''بس بہت پڑھ لیا اس نے بی اے کر لیا اب رشتہ دیکھو اور اسے اپنے گھر کا کرو تم نے بھی میٹرک کیا تھا تو میں تجھے دلہن بنا کر لے آئی تھی اب تو انوکھا زمانہ آ گیا ہے لڑکیاں لڑکے لوتھا کے لوتھا ہو جاتے ہیں اور اماں باوا کو کوئی فکر ہی نہیں ہوتی۔'' اور وہ سب ہنس پڑتے۔

''اماں دادو سچ کہتی ہیں آپ خوشی کو رخصت کریں تا کہ میری باری آئے۔''

''اوئے خبردار میرا نام لیا میں نے ابھی پڑھنا ہے ایم اے کرنا ہے اور خود کو دیکھو ابھی ایف ایس سی کیا ہے اور سہرا سجانے کی پڑ گئی۔'' یوں ہی وہ سب مل کر نوک جھونک کرتے ہنستے کھلکھلاتے رہتے تھے۔ جب دادو کو اٹیک ہوا تو وہ اسپتال میں بلک بلک کر روئی۔

''خوشی اپنے آپ کو سنبھالو اماں کو کچھ نہیں ہوگا دیکھنا ہم شام کو گھر بھی چلے جائیں گے اماں کو لے کر۔''

''بابا میرا دل کیوں بے چین ہے یوں جیسے کچھ انہونی ہونے والی ہے بابا میں دادو کے بنا نہیں رہ سکتی۔'' وہ شدت سے رونے لگی۔

''بابا کی جان چپ کر جاؤ آپ کو پتہ ہے نا میں آپ کی آنکھوں میں آنسو نہیں دیکھ سکتا پھر آپ مجھے کیوں ستا رہی ہو۔'' اس نے اپنے آنسو اپنے آنچل میں چھپا لیے مگر جو اس دنیا میں آیا ہے اسے اپنا وعدہ بھی نبھانا ہے وہ وعدہ جو اس روح نے اپنے لوٹنے کا کیا تھا بے شک دنیا میں آ کر انسان اس عارضی دنیا میں مست ہو جاتا ہے اس کا واپس لوٹنے کو

دل نہیں چاہتا مگر اس کی روح کو لوٹنا پڑتا ہے یوں دادو بھی اس ابدی دنیا میں لوٹ گئی مگر ان سب کی آنکھوں کو برسات دے گئیں۔ آہستہ آہستہ سب دنیا کے کاموں میں مصروف ہو گئے مگر وہ سب کے سامنے تو نہیں رات کی تنہائیوں میں دادو کو یاد کر کے بلکتی رہتی ابھی وہ فائنل ایئر میں تھی کہ بابا اور اماں نے اس کی منگنی کر دی۔

اریز اس کے بابا کے دوست کا بیٹا تھا بہت اچھا محبت کرنے والا منگنی سے پہلے وہ سب ایک دوسرے کے گھر میں آتے جاتے تھے لیکن منگنی کے بعد احساسات بدل گئے تھے وہ جو پہلے بلا جھجک اریز بھائی کہہ کر اسے تنگ بھی کرتی تھی اور اپنی باتیں شیئر بھی کرتی تھی اب اس سے بات کرنے میں جھجک محسوس کرتی تو وہ کہتا۔

''خوشی یہ فاؤل ہے یار اب تو ہمارا ہمیشہ کا تعلق بن گیا ہے اب تو ہم مرتے دم تک ایک ساتھ رہیں گے مگر تم اجنبی بن رہی ہو مجھے پہلے والی خوشی چاہیے۔''

''اریز بھا......!''

''نہ......نہ اب بھائی نہیں اب صرف اریز کہو۔''

''یہی تو مشکل ہے میں اریز بھائی سے اپنی ہر بات شیئر کرتی تھی۔ اریز سے نہیں۔'' اور کھلکھلا کر ہنس دیتی۔

......☆☆☆......

''خوشی تم میری خوشی ہو اور تم ہنستی اچھی لگتی ہو کبھی ان پلکوں کو بھیگنے مت دینا۔''

دن یوں ہی خوشیوں کے جھولوں میں بسر ہو رہے تھے اس نے ایم اے کر لیا حارث ایم ایس سی اور رومہ بی اے میں تھی سعد ہشتم میں اماں اور بابا نے اسے وداع کرنے کا سوچا اور اس کی شادی کی تیاری شروع کر دی۔

''نہ اماں یہ انصاف نہیں میں نے ابھی ایم فل کرنا ہے اور آپ مجھے گھر سے نکالنے پر تل گئے ہیں میں ابھی شادی وادی نہیں کروں گی میں نے بابا کی کمپنی میں جاب کرنی ہے۔ بس آپ بابا کو کہہ دیں۔''

''اماں نکالیں خوشی کو یہ ہمارے حصے کی محبتیں بھی بٹور لیتی ہے ہم ما بدولت سارے گھر میں عیش کریں گے۔'' حارث کے ساتھ ارومہ جھٹ کہتی دادو کا کمرہ تو میں لوں گی۔

''اچھا تو تم دونوں میری چیزوں پر میرے کمرے پر قبضہ کرنے کا سوچ رہے ہو تو بیٹا جی بھول جاؤ میں اس گھر سے جانے والی نہیں ہوں اریز سے کہوں گی رخصت ہو کر اس گھر میں آ جائے۔'' وہ انگوٹھا دکھاتی۔

''نہ خوشی ایسا نہ کہو کوئی وقت قبولیت کا بھی ہوتا ہے بیٹیاں اپنے گھر میں ہی اچھی لگتی ہیں بس تجھے رخصت ہو کر اپنے گھر جانا ہے۔ بس بہت پڑھائی کر لی کوئی ایم فل شل نہیں کرنا تمہاری دادو سچ کہتی تھیں ہماری تو چھوٹی عمر میں شادی ہو گئی تھی اب یہ موئے لڑکوں اور لڑکیوں کو پڑھائی سے فرصت نہیں ملتی اور جب پڑھ لیتی ہیں تو ہم نے جاب کرنی ہے کی رٹ لگا لیتی ہیں اور لڑکے جب ہم بہت سا پیسہ کما لیں گے تب شادی کریں گے پتہ ہے جب میری شادی ہوئی تو تمہارے بابا کی تنخواہ تین ہزار تھی۔''

''سچ اماں کیسے گزارہ ہوتا ہوگا ہر چیز کے لیے ترستی رہی ہوں گی آپ۔'' رومہ نے تعجب سے کہا۔

''نہیں رومی اللہ کا شکر ہے کہ میں کسی چیز کے لیے نہیں ترسی تیرے بابا نے ہمیشہ ہر ایک کی خواہش کو مقدم سمجھا اپنے بابا اور ماں کے ساتھ میرا بھی بہت خیال رکھا پھر مہنگائی بھی اتنی نہ تھی اور خواہشات بھی محدود آج تو بس انسان خواہشات میں جکڑا ہوا ہے ہوس پرست ہو گیا ہے ہر چیز پانے کی تمنا ہے چاہے وہ اس کے لیے فائدہ مند ہو یا نقصان دہ بس دوسروں کے پاس دیکھ کر جائز نا جائز طریقے سے حاصل کرنے کی تگ و دو میں لگا ہوا ہے اچھا چھوڑو رات اریز کے والدین ڈیٹ فکس کرنے آ رہے ہیں تم دونوں مل کر کھانا تیار کرو ہر چیز نو بجے تک تیار ہو جانی چاہیے تمہارے انکل اور آنٹی نو بجے تک کھانا کھا لیتے ہیں۔''

''ہاں خوشی تم سب کچھ تیار کرنا تا کہ ابھی سے ٹائم پر کھانا بنانے کی پریکٹس ہو ان کے گھر جا کر مشکل پیش نہ آئے

میں تو موووی دیکھوں گی۔'' ارومہ نے کہا۔
''رومی بہن کا ہاتھ بٹاؤ۔'' اماں نے اسے تنبیہ کی۔
''اماں صرف ہاتھ نہ بٹائے بلکہ سارا کام کرے میں تو اب کچھ دنوں کی مہمان ہوں اب اگلے گھر جا کر سارا کام کروں گی تو اپنی پیاری سی بہن رومی کو یاد کیا کروں گی یہ حارث کو بھی اپنے ساتھ لگا لو اپنی بیوی کے کام تو بھاگ بھاگ کر کرے گا۔'' خوشی نے افسردہ سی شکل بنا کر کہا۔
''ارے جانے دو جس کا کام اسی کو ساجھے تم دونوں کام کرو میں تو دوست کی طرف جا رہا ہوں۔''
''اچھا بس بحث ختم' دونوں کچن کی راہ لو اور ہر چیز پرفیکٹ ہونی چاہیے تابندہ کو ساتھ لگا لو۔''
رات کو جب اپنے کمرے میں آئی تو دادو بے طرح یاد آئیں اس نے دادو کی تصویر پکڑی اور بے اختیار اس پر سر رکھ کر رونے لگی دادو آپ بھی چلی گئیں اب میں بھی چلی جاؤں گی۔ دادو میں اس گھر سے اماں بابا سے جدا نہیں ہونا چاہتی کیسے سب کے بنا رہوں گی مجھے تو اپنے بستر اپنے کمرے کے بنا نیند نہیں آتی کیسے اجنبی گھر کمرہ......!'' سیل کی ٹون نے اسے اپنی طرف متوجہ کیا۔
''اریز......!''
''ہاں جی کیا ہو رہا ہے اب کچھ دنوں کی جدائی ہے تم خوش ہو نا خوشی ارے تم بول نہیں رہی ہو......!''
''میں...... میں کیسے رہوں گی سب کے بنا اریز یہی سوچ کر مجھے وحشت ہو رہی ہے کاش کہ ایسا ہوتا کہ لڑکے رخصت ہو کر لڑکی کے گھر آتے۔''
''ہاہاہا ویسے تمہیں بتاؤں لڑکے کے والدین یہی سمجھتے کہ بہو ہمارے بیٹے کو لے اڑے گی یار تم فکر نہ کرو ہر روز تمہیں آنٹی اور انکل سے ملانے لے جایا کروں گا اور پھر تم کسی اور ملک تو نہیں جا رہی ہو ایک ہی شہر ہے صرف آدھا گھنٹہ کی مسافت دلوں میں دوری نہیں ہونی چاہیے یہ فاصلے کچھ اہمیت نہیں رکھتے تم اب میرے دل کی خوشی اور میرے آنگن کی خوشی ہو ویسے آج تم کیسی لگ رہی تھیں۔''
''جیسے پہلے لگتی ہوں کوئی تبدیلی نہیں آئی مجھ میں۔''
......☆☆☆......
محبت بدل دیتی ہے تمہیں میری محبت نے بدلا نہیں رومی تو کہہ رہی تھی تم پنک کپڑوں میں بہت خوبصورت لگ رہی تھیں اور تمہاری آنکھوں میں ایک انوکھی سی چمک تھی میری محبت کی چمک کیا ایسا نہیں تھا۔''
''اریز یہ رومی کی بچی اچھا بس مجھے نیند آ رہی ہے۔'' اس نے شرمیلے لہجے میں کہا۔
''تم ہنستی اچھی لگتی ہو بس ایک دفعہ ہنس دو۔''
''تم بھی نا......!'' بے اختیار اس نے ہنستے ہوئے فون بند کر دیا۔
رات پتہ نہیں کیا کچھ سوچتے سوچتے سو گئی مگر صبح نماز کے لیے فوراً اٹھ گئی جب وہ چہل قدمی کے لیے اپنے خوب صورت باغیچے میں آئی تو بابا پہلے سے موجود تھے اداس اداس سے۔
''بابا جانی کیا ہو رہا ہے آج آپ مجھ سے پہلے کیسے آ گئے۔''
''بس آج جلدی آنکھ کھل گئی تھی نماز کے بعد سویا نہیں سوچا اپنی خوشی کے گارڈن میں بیٹھ کر انجوائے کروں دیکھو تمہارے بعد پتہ نہیں کوئی اس کی دیکھ بھال کرے گا کہ نہیں رومی کو تو بس کمپیوٹر سے دلچسپی ہے ہر وقت کمرے میں گھسی رہتی ہے۔''
''ارے بابا جانی فکر نہ کریں میں ہر روز آ کر خود اس کی دیکھ بھال کر لیا کروں گی میں اس کی شادابی ختم نہیں ہونے دوں گی یہ خوبصورت پھول اور مزے مزے کے پھل میری اور آپ کی محنت کا نتیجہ ہے یہ سدا ہرا بھرا رہے گا۔''

اور پھر ہر روز شاپنگ کبھی رومی اور حارث اس کے ساتھ ہوتے کبھی اماں سارا دن بازاروں میں گزر جاتا رات کو تھکے ہارے ہوتے پھر بھی محفل جمتی اور اسے تنگ کیا جاتا۔

قہقہے، ہنسی مذاق اور اداسیاں سب کی فیلنگ جدا جدا بچھڑنے کا دکھ بھی تو فرض سے عہدہ برآ ہونے کی خوشی بھی رنگ محفل رات گئے تک جاری رہتی لیکن جب وہ اپنے کمرے میں آتی تو جدائی کا دکھ ملن کی گھڑیوں پر بھاری ہو جاتا اور نشیلی آنکھیں پانیوں سے بھر جاتیں وہ اپنے کمرے کی دیواروں کو حسرت سے دیکھتی جو عنقریب اس کے لیے اجنبی ہونے والی تھیں اس نے کہیں پڑھا تھا کہ لڑکی کے لیے وہ گھر جس میں اس کا بچپن گزرتا ہے جوانی کی بہار آتی ہے گڑیوں سے کھیلنے سے لے کر آنکھوں میں سپنے سجانے تک وہ گھر اس کا گھر رہتا ہے لیکن جیسے ہی نکاح کے بول اسے کسی سے باندھ دیتے ہیں تو وہ گھر جس میں اس کی تمام یادیں بکھری ہوتی ہیں لمحوں میں اجنبی بن جاتا ہے۔

وہ جب ملنے بھی آئے تو گھر اپنا نہیں اجنبی سا لگتا ہے وہی چیزیں جنہیں وہ بے دھڑک استعمال کرتی تھی اب استعمال کرتے ہوئے خود بخود ایک جھجک سی محسوس ہوتی ہے۔

انسانی فطرت ہے جو وقت اور حالات کے مطابق تبدیل ہوتی رہتی ہے۔ کبھی اپنائیت کی ساری منزلیں لمحوں میں طے کر لیتا ہے اور کبھی ایک دم سے اجنبیت اور بیگانگی کی ساری حدیں پھلانگ لیتا ہے وہ سوچتی کیسے یہ سب در و دیوار میرے لیے اجنبی بن جائیں گے پھر خود ہی کہتی نہیں میں کسی کو اپنے لیے اجنبی نہیں بننے دوں گی۔

موسم بہت خوشگوار تھا آج سب نے فرنیچر اور زیور پسند کرنے جانا تھا۔

''خوشی جلدی سے تیار ہو جاؤ اختر بھائی اور صابرہ بہن آ رہے ہیں۔ تمہارے بابا بھی جا رہے ہیں تم بھی چلو اپنی پسند سے فرنیچر اور زیور پسند کر لینا۔''

''اماں مجھے آپ اور بابا کی پسند پر کوئی اعتراض نہیں بس آپ اور بابا انکل اور آنٹی کے ساتھ چلے جائیں۔''

''او کے بیٹا کھانا ہم گھر آ کر ہی کھائیں گے رومہ کے ساتھ مل کر اچھا سا ڈنر تیار کر لینا۔''

''ڈونٹ وری اماں، ہم دونوں مل کر تیار کر لیں گی۔''

اس نے اور رومہ نے ہنستے باتیں کرتے ہوئے کھانا تیار کر لیا کہ حارث نے آ کر کہا۔ ٹی وی آن کرو ایم ایم عالم روڈ مین مارکیٹ میں بم دھماکا ہوا ہے۔ بہت جانی اور مالی نقصان ہوا ہے۔ ٹی وی پر میڈیا ایک ایک لمحے کی تصویر دکھا رہا تھا کٹی پٹی لاشیں روتے بلکتے لوگ دھواں دھواں فضا قیامت کا منظر پلیز بند کر دو میں مزید نہیں دیکھ سکتی۔

''اف لوگ کہتے ہیں قیامت کب آئے گی یہ قیامت ہی تو ہے اپنوں کی کٹی ہوئی لاشیں بچھڑنے کا دکھ یہ سب دیکھنا۔ پتہ نہیں کتنے ظالم لوگ ہیں جو گھروں کو تباہ کر دیتے ہیں۔''

''خوشی سچ کہتی ہو پتہ نہیں کتنی عورتیں بیوہ ہوئی ہوں گی کتنے بچے یتیم ہوئے ہوں گے کتنے کمانے والے ہاتھ کٹے ہیں یہ کوئی مسلمان نہیں ہو سکتا ہے یہ یقیناً یہودی یا را کے ایجنٹ ہوں گے کوئی مسلمان اتنا ظلم نہیں کر سکتا۔''

''دس بج چکے ہیں ابھی تک اماں بابا نہیں آئے نہ انکل آنٹی فون کرو۔'' اتنے میں حارث کا موبائل بج اٹھا۔

''بابا کا فون ہوگا۔''

......☆☆☆......

''اریز بھائی کیا ہوا آپ اتنے گھبرائے ہوئے کیوں ہیں۔''

''کیا ہوا انکل آنٹی کو وہ کہاں گئے تھے؟''

''اماں بابا کے ساتھ ایم ایم عالم روڈ پر جیولری شاپ پر گئے تھے۔''

''کیا کیا؟ ہاں حارث میں تمہاری طرف آ رہا ہوں کیونکہ بم بلاسٹ ہونے سے آدھا گھنٹہ پہلے میری ان سے بات ہوئی تھی وہ ایم ایم عالم روڈ جیولری شاپ میں تھے اب ان کا فون نہیں مل رہا میں نے انکل آنٹی کے سیل پر بھی ٹرائی

کیا ہے اللہ خیر کرے ابھی تم رومی خوشی اور سعد کو کچھ نہ بتانا بس میں تھوڑی دیر میں آتا ہوں۔'' اسپتال سے ہو کر آتا ہوں اللہ خیر کرے۔''

''حارث کیا ہوا کس کا فون تھا۔ اماں بابا کہاں ہیں وہ فون کیوں پک نہیں کر رہے ہیں۔''

''خوشی بس اللہ سے دعا کرو اماں بابا انکل آنٹی خیریت سے ہوں ابھی میں کچھ نہیں کہہ سکتا اریز بھائی آ رہے ہیں۔''

''اریز کیا ہوا ہے؟''

''میں اسپتال سے آ رہا ہوں۔ ہم...... ہم...... کچھ...... بھی باقی نہیں رہا۔ امی ابو انکل آنٹی ہمیں چھوڑ کر چلے گئے ہیں۔'' آنسو سیل رواں کی طرح بہہ رہے تھے۔

''خوشی تم تم بڑی ہونا پلیز اپنے آپ کو سنبھالو...... تم نے ان سب کو حوصلہ دینا ہے۔''

''حوصلہ...... کہاں سے حوصلہ لاؤں۔'' وہ چیخ پڑی۔

''رومہ، حارث، سعد ظالموں نے ہمارا گھر لوٹ لیا ہم ہم یتیم ہو گئے آسمان اور زمین دونوں ہم سے چھن گئے ہم بے آسرا ہو گئے ہیں۔'' وہ سب تڑپ رہے تھے۔ خوشیوں بھرا گھر لمحوں میں ماتم کدہ بن گیا۔ قیامت سی قیامت تھی قیامت اسی کا نام ہے جب بہت اپنے بچھڑ جائیں جب آنکھوں میں برسات بج جائے نہ کوئی ماموں نہ چچا بس دور کے رشتے دار اور دوست آئے کب اماں بابا انکل آنٹی کو دفنایا گیا کچھ پتا نہ چلا نہ مکمل اعضا ملے نہ کفن بس بکھرے اعضاء کا ڈی این اے ٹیسٹ ہوا اور اریز کسی سوغات کی طرح لے آئے اور ان اعضا کو کفن اوڑھا کر منوں مٹی تلے دفن کر دیا آج اسے بہت سے رشتوں کے نہ ہونے کا احساس ہوا۔ اماں، بابا نے انہیں اتنی محبتیں دی تھیں کہ کبھی کسی رشتے کی کمی محسوس نہ ہوئی۔ کبھی وہ کہتے کہ اف اماں آپ کیوں اکیلی پیدا ہوئیں نہ ہماری کوئی خالہ نہ کوئی ماموں، نانا، نانی تو وہ ہماری پیدائش سے پہلے ہی اللہ میاں کے پاس چلے گئے بہت جلدی تھی انہیں اللہ کے پاس جانے کی۔ بابا تو وہ اکلوتے تھے۔ پھوپو نہ چچا، دادا بھی چلے گئے اور دادو بھی بیچ منجدھار میں چھوڑ گئیں۔

......☆☆☆......

''ارے ہم دونوں ہیں نا کیا ہماری محبت کافی نہیں۔''

''خوشی تیری تو نہ کوئی خالہ ساس نہ ماموں سسر نہ پھوپو ساس نہ چچا سسر اور اریز بھائی بھی اکیلے اماں سن لیں میری جہاں شادی کرنی ہے وہاں یہ سارے رشتے ہونے چاہئیں۔ میری یہی شرط ہے۔''

اور آج کوئی اپنا نہ تھا جو ان کے سر پر ہاتھ رکھتا جن کے سینے سے لگ کر وہ درد کم کر سکتیں جن کے کندھے پر سر رکھ کر آنسو بہا سکتے سب دو چار دن رہ کر رخصت ہو گئے۔

اب وہ تھے اور زندگی کے مسائل حارث رومہ اور سعد کی تو ابھی ایجوکیشن مکمل نہ ہوئی تھی۔

''خوشی میں بابا کے آفس گیا تھا۔ اریز بھائی کے ساتھ، بقایاجات ملنے میں کچھ وقت لگے گا میں نے سوچا ہے کہ تعلیم کو خیر آباد کہہ دوں اور بابا کے آفس میں جاب کر لوں بابا اماں کا چہلم ہو جائے تو پھر سادگی سے آپ کا نکاح کر کے رخصت کر دوں۔''

''حارث میں تم سے بڑی ہوں اب اس گھر کو میں نے چلانا ہے۔ میں نے انکل سے بات کی ہے مجھے بابا کی جگہ جاب مل جائے گی۔ ایک ہفتے تک میں جوائن کروں گی تم اپنی اسٹڈی مکمل کرو گے بابا کی خواہش تھی کہ تم سی ایس ایس کرو تمہیں بابا کا یہ خواب پورا کرنا ہے۔''

''مگر خوشی تمہاری شادی۔''

''جب تم کسی مقام پر پہنچ جاؤ گے رومہ کی شادی کر دوں گی تو پھر میں بھی شادی کر لوں گی مگر ابھی نہیں ابھی اس گھر کو میری ضرورت ہے تم سب کو میری ضرورت ہے۔''

"خوشی ہم دونوں مل کر بھی تو اس گھر کو چلا سکتے ہیں میرا کون ہے کوئی بھی نہیں سوائے تم لوگوں کے۔ پھر تم نے یہ کیسا فیصلہ کیا ہے میں تمہیں جاب سے نہیں روکوں گا مگر......!"

"اریز میں اس رشتے کو ہمیشہ قائم رکھوں گی یہ رشتہ میرے بابا اور اماں نے جوڑا تھا مگر ابھی شادی نہیں کر سکتی میں اپنے بہن بھائیوں کو چھوڑ کر اپنا گھر بسا لوں ایسا میں سوچ بھی نہیں سکتی میں خود غرض نہیں ہوں شادی کے بعد بہت سی ذمہ داریاں ہوتی ہیں میں دونوں گھروں کو ایک ساتھ مینج نہیں کر سکتی میرے بہن بھائیوں کی وجہ سے تمہارے ساتھ زیادتی ہو میں تمہیں ٹائم نہ دے پاؤں یہ بھی مجھے گوارہ نہیں میں اپنی ذمہ داریاں پوری کرنے کے بعد تم سے شادی کروں گی لیکن میں اپنی وجہ سے تمہیں بھی پابند نہیں کرنا چاہتی اگر تم کہیں بھی شادی کرنا چاہتے ہو تو کر لینا بے شک میرا انتظار نہ کرنا کیونکہ انکل اور آنٹی کی ڈیتھ کے بعد اکیلے زندگی گزارنا تمہارے لیے بھی مشکل ہے۔"

"خوشی تمہاری خوشی میری خوشی ہے میں زندگی کی آخری سانس تک تمہارا انتظار کروں گا۔"

اور وہ مشین بن گئی دفتر اور گھر کی ذمہ داریوں میں اسے صرف رات کے تنہا لمحوں میں بابا اور اماں کی یاد آتی اور وہ پھوٹ پھوٹ کر روتی۔

"بابا اماں آپ نے بہت جلدی کی جانے میں۔"

اور دن کے وقت وہ اس گھر کی چھپر چھاؤں بن جاتی اریز کی محبت اس کا حوصلہ بڑھاتی وقت گزرتا گیا یادوں کے زخم مندمل کرتے چہروں پر دھول جماتے حارث نے سی ایس ایس کر لیا اور انکم ٹیکس میں فرسٹ کلاس آفیسر لگ گیا۔

"حارث آج بابا کا خواب پورا ہو گیا آج میں بہت خوش ہوں۔"

"ہاں خوشی میں بھی آج بہت خوش ہوں اور اس خوشی میں آپ سے کچھ کہنا چاہتا ہوں آپ میری خواہش پوری کریں گی کیونکہ بابا اماں کے بعد آپ ہی اس گھر کی سربراہ ہیں۔"

"ہاں بولو۔"

"خوشی میں اپنی کلاس فیلو سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔ نائمہ بہت اچھی ہے آپ اس سے مل لیں کیونکہ اب اس کے پیرنٹس مزید انتظار نہیں کر سکتے مجھے بھی جاب مل گئی ہے۔"

"بہت خوشی کی بات ہے تم مجھے ان کے گھر لے جانا آج شام کو ہی چلتے ہیں۔"

"میں نائمہ کو بتا دیتا ہوں۔"

"اگلے مہینے شادی حارث یہ بہت جلدی نہیں ہے کیسے تیاری ہوگی۔"

"ارے خوشی لڑکی کی شادی میں تیاری مسئلہ ہوتا ہے لڑکے کی شادی زیور چند جوڑے کپڑے اور ولیمہ بس......"

"اچھا جی اور جو ہم نے شادی پر تیاری کرنی ہے اس کا کیا ہوگا؟" رومی نے کہا۔

"اللہ کا نام لو سب ٹھیک ہو جائے گا۔"

"خوشی میں یہ کیا سن رہا ہوں حارث کی شادی ہاں آج ہی وہ اپنی کسی کلاس فیلو کی طرف لے کر گیا تھا شاید پہلے سب کچھ طے تھا اس لیے فارملٹی پوری کی ہے ڈیٹ فکس کر دی ہے اگلے ماہ کی ۱۵ کو شادی ہے اریز تم کل سے آ جانا حارث اور رومہ کے ساتھ شاپنگ کے لیے چلے جانا مجھے شاید وقت نہیں مل سکے گا کیونکہ آفس میں آج کل کام زیادہ ہے۔"

"خوشی حارث کو تمہاری شادی کی بات کرنی چاہیے تھی تم بڑی ہو میں اس سے بات کرتا ہوں۔"

"نہیں اریز تم بات نہیں کرو گے یہ اسے سوچنا چاہیے تھا جب اس نے نہیں سوچا میرے اور رومہ کے بارے میں تو چھوڑ دو۔"

"یہ خود غرضی ہے ابھی ایک ماہ ہوا ہے جاب پر لگے اور اسے اپنی شادی کی پڑ گئی تمہارے اور رومی کے بارے میں سوچنا چاہیے اب تم دونوں اس کی ذمہ داری بنتی ہو لڑکی گھر کی سربراہ نہیں ہوتی ٹھیک ہے جب تک وہ پڑھ رہا تھا تم نے

اپنی ذمہ داری پوری کی مگر اب تم اس کی ذمہ داری ہو یہ تو اپنی ذمہ داریوں سے پہلو تہی کرنے کی بات ہوئی نا۔"
"اس کی بیوی اس کی ذمہ داری ہو گی ہم نہیں اور اریز ابھی مجھے رومی اور سعد کو کسی مقام تک پہنچانا ہے پھر ہی میں اپنے بارے میں سوچ سکوں گی اگر تم انتظار نہیں کر سکتے تو پلیز تم کسی بھی اچھی لڑکی سے شادی کر لو میں اپنی وجہ سے تمہیں کیوں سزا دوں۔"
"25 سال کی تھیں جب تم نے گھر سنبھالا اب 28 کی ہو صرف تین سال گزرے ہیں میں تو زندگی کی آخری سانس تک تمہارا انتظار کر سکتا ہوں میں نے تم سے محبت کی ہے یاد رکھنا محبت خود غرض نہیں ہوتی کوئی بھی رشتہ خود غرض نہیں ہوتا۔ بہن بھائی ماموں چچا' پھوپو' خالہ' بھتیجا' بھانجا بے شک میں نے ان رشتوں کو نہیں دیکھا لیکن یہ رشتے خالص ہوتے ہیں بناوٹ سے پاک۔"
"ہاں یہ رشتے اس وقت تک خالص رہتے ہیں جب تک ان میں خود غرضی نہیں آتی جب اپنی ذات کے بارے میں انسان سوچتا ہے قربانی اور ایثار کو بھلا دیتا ہے تو پھر یہ رشتے بھی بدل جاتے ہیں برا مت ماننا حارث کی مثال تمہارے سامنے ہے اس نے تمہارے بارے میں نہیں سوچا تمہاری قربانی کو یاد نہیں رکھا کہ کس طرح تم نے اپنی محبت کو بھلا کر اپنے بہن بھائیوں کے لیے خود کو وقف کیا تعلیم کا خرچہ اٹھایا گھر کی دیکھ بھال کی اور آج موقع ملتے ہی اس نے اپنی زندگی سنوارنے کا سوچا تمہاری کسی قربانی کا خیال نہیں کیا اگر تم خود غرضی دکھاتی اور شادی کر لیتی تو حارث آج اس مقام پر ہوتا خوشی اپنے بارے میں ضرور سوچنا ایسا نہ ہو تم خود اپنے ہی اس آشیانے میں اجنبی بن کر رہ جاؤ۔"
"اریز پلیز ایسا مت کہو سعد اور رومہ ایسا نہیں کریں گے۔"
"خدا کرے تمہاری کوئی توقع نہ ٹوٹے لیکن کبھی ایسا ہوا تو خوشی مجھے ضرور آواز دینا دن رات کی تفریق کیے بنا میں اسی وقت تمہارے پاس آجاؤں گا کیونکہ میری محبت خالص ہے۔"
"اریز تمہاری محبت کے سہارے ہی تو میں نے بابا اماں کے بنا ان ذمہ داریوں کو پورا کیا ہے تمہاری محبت نے قدم قدم پر میرا ساتھ دیا بس آئندہ بھی ایسے ہی ساتھ دینا۔"
"خوشی تم ہمیشہ اپنے ساتھ مجھے پاؤ گی۔"
وہ اپنے کمرے کی طرف جا رہی تھی جب نائمہ کی آواز نے اس کے قدموں میں زنجیریں ڈال دیں۔
"حارث کیا یہ گھر صرف خوشی آپی کا ہے میرا کوئی حق نہیں کہ میں اس کو سنوار سکوں اپنی مرضی سے فرنیچر سیٹ کر سکوں۔"
"کس نے کہہ دیا یہ گھر میرا ہے اور میرے حوالے سے تم اس گھر کی مالکن ہو میں اور سعد اس گھر کے وارث ہیں خوشی اور رومہ نہیں تم جیسے چاہو اسے بناؤ سنوارو کسی کو اعتراض کرنے کا حق نہیں۔"
"حارث اب ہمارا اسٹیٹس چینج ہو چکا ہے تم گزیٹڈ آفیسر ہو اس حوالے سے میرا اور تمہارا ملنا جلنا ہے اب یہ تھرڈ کلاس فرنیچر سوٹ نہیں کرتا کل میں نے فرنیچر بیچنے کی بات کی تو خوشی آپی کہنے لگیں کہ "گھر جس طرح سیٹ ہے اسی طرح رہنے دو نہ ہی فرنیچر بیچنا ہے۔"
"خوشی کے کمرے کو چھوڑ کر تم جو چیز رکھنا چاہتی ہو رکھو باقی کباڑیا کو بیچ دو اور گھر کو اپنے مطابق سیٹ کر لو یہ اے ٹی ایم رکھ لو جس طرح کا فرنیچر لینا چاہتی ہو لے آؤ سعد کو ساتھ لے جانا رومہ سے پوچھ لینا اگر جانا چاہے تو لے جانا۔"
"او تھینکس حارث تم نے اپنائیت کا احساس دلا دیا ورنہ میں سمجھ رہی تھی یہ صرف خوشی آپی کا گھر ہے ہمارا نہیں۔"
اور وہ اپنے کمرے میں لوٹ آئی آنسو تھے کہ بہے چلے رہے تھے میں نے کب اس گھر پر اپنا حق جتایا میں تو صرف اماں اور بابا کا فرنیچر نہیں بیچنا چاہتی تھی لیکن کل بابا اور اماں کا لایا فرنیچر بک جائے گا ان کے ہاتھوں کی یادگار کوئی چیز اس گھر میں نہیں رہے گی۔ "بابا یہ حارث کو کیا ہو گیا کیوں اتنا بدل گیا مجھے لوگوں کے رویے بدلنے سے خوف آتا تھا کیونکہ جب رویے بدلتے ہیں تو رشتے بھی بدل جاتے ہیں اور اب میں سب کے رویے بدلتے ہوئے محسوس کر رہی ہوں یہی

رشتے تو ہیں میرے پاس اگر یہ بھی بدل گئے تو میرے پاس کیا رہ جائے گا۔"

سیل کی بیپ نے اسے اپنی طرف متوجہ کرلیا اریز کا فون تھا۔

"ہاں جی کیا حال ہے آج تم نے بات نہیں کی تو میں نے سوچا میں ہی رابطہ کرلوں...... ارے میں بول رہا ہوں تم کچھ بول نہیں رہی ہو خیریت ہے نا۔"

"ہاں سب خیریت ہے بس نیند آرہی تھی۔ اس لیے فون نہیں کیا۔"

وہ نبض آشنا کیسے نہ پہچانتا "تم رو رہی ہو۔"

"نہیں تو وہ فلو ہو رہا ہے نا اس لیے آواز بھاری ہو رہی ہے۔"

"خوشی تم مجھ سے جھوٹ نہیں بول سکتیں سچ بتاؤ کیا ہوا ہے۔"

"وہ کل بابا اور اماں کا فرنیچر بک جائے گا کتنی یادیں وابستہ ہیں نا میری بس اس لیے دل بھر آیا۔"

"ارے اتنی سی بات میں وہ سارا فرنیچر خرید لوں گا اب خوشی تم جب میرے گھر آؤ گی نا بابا اور اماں کی سب یادیں میرے آنگن میں تمہارا انتظار کریں گی۔"

"اریز تم...... تم بہت اچھے ہو اتنے کہ میں کن الفاظ میں بیان کروں۔"

"بس تم خوش ہونا میرے لیے یہی کافی ہے اب تم سکون سے سو جاؤ۔"

"اریز تم تو میرے ماں جائے سے بھی بڑھ کر ثابت ہوئے۔"

گھر سیٹ ہو گیا ہر پرانی چیز اریز نے خرید لی۔ اس نے پھر بھی دخل نہ دیا کیا ہو رہا ہے بس وہ سعد اور رومہ کی فیس دیتی رہی حارث نے بھی نہ کہا کہ اب تم جاب چھوڑ دو۔

اب اس کی ضرورت نہیں میری پے بہت اچھی ہے، بہت اچھا گزارہ ہو گا کسی نے اس کے بارے میں نہ سوچا سعد اپنے حال میں مست اور رومہ اپنی سرگرمیوں میں گم۔

وقت دھیمی چال چلتے ہوئے بھی گزرتا گیا۔ اس کے بالوں میں چاندی اتر آئی سعد اعلیٰ تعلیم کے لیے یورپ گیا اور پھر وہاں ہی سیٹ ہو گیا شادی بھی کرلی رومہ نے ایم فل کیا اور پھر حارث سے کہا میرے کلاس فیلو کے والدین میرے لیے آنا چاہتے ہیں آپ خوشی سے بات کرلیں۔

"تم خود خوشی سے بات کرو۔"

"نہیں حارث تم میرے لیے بات کرو وہ کیا سوچیں گی۔"

"رومی اب اس عمر میں وہ لال جوڑا پہن کر دلہن بنیں گی، بوڑھی گھوڑی لال لگام تمہاری تو پھر عمر ہے ویسے تو تم نے بھی دیر کردی شادی کی آئیڈیل عمر پچیس سال ہے تم بھی اب بتیس کی ہو رہی ہو وہ تو اڑتیس کی ہیں اس عمر میں شادی مذاق ہی بنے گی شکر ہے میری اور حارث کی وقت پر شادی ہوئی۔" نائمہ نے کہا تم فکر نہ کرو میں ان سے بات کروں گی۔

"بھابی میں تو رضا کا انتظار کر رہی تھی اس کے پیرنٹس کہتے تھے پہلے اس کی دونوں بڑی بہنوں کی شادی ہو گی پھر اس کی کریں گے اب وہ اپنے فرائض سے فارغ ہو گیا ہے۔ اس لیے اس نے مجھے کہا ہے۔"

"چلو ٹھیک ہے میں کل خوشی آپی سے بات کرلوں گی۔"

اس نے سب کی باتیں سنیں اور اپنے کمرے میں چلی آئی اب وہ روتی نہیں تھی غموں اور سب کے بدلتے رویوں نے اسے باور کرا دیا تھا کہ اب اس کی ضرورت ختم ہو گئی ہے۔

اسے تنہا جینا ہے نوکیلے لفظ اسے چھلنی تو کرتے مگر ان کی دھار وہ سہہ جاتی ہاں بھابی نے اس پر یہ مہربانی کی تھی کہ بھتیجا اس کی گود میں ڈال دیا وہ آفس سے آکر اس کے ساتھ لگ جاتی اس کے ساتھ کھیلتی۔ اس طرح اس کا دل بہلتا جب فارس اپنی پیاری سی آواز میں اسے آنی کہتا تو وہ بے پناہ خوش ہوتی مگر اب وہ بھی بڑا ہو گیا۔ دہم کا طالبعلم اب وہ

اسکول سے آکر کرکٹ کھیلنے چلا جاتا شام کو اکیڈمی۔ جب وہ اس سے کہتی فاری تم میرے پاس آتے ہی نہیں ہو تو وہ کہتا۔ ''آنی ٹائم ہی نہیں ملتا۔'' بچپن میں وہ اسے اپنے آفس میں بھی لے جاتی فنکشن ہوتا وہاں لے جاتی بھابھی فارس کو منع کرتی کہ تم نہ جاؤ اور وہ کہتا۔

''ماما میں آنی کے بغیر نہیں رہ سکتا میں ان کے ساتھ جاؤں گا۔'' اور وہ خوشی سے سرشار ہو جاتی کہ کوئی تو ہے جو بے غرض اسے چاہتا ہے مگر اسی فاری کے پاس اب اس کے لیے وقت نہیں تھا۔ وہ مزید تنہا ہو گئی تھی۔ نائمہ نے اسے رضا کے رشتے کا بتایا۔

''ٹھیک ہے حارث سے کہو تحقیق کر لے میں اریز کو بھی کہہ دوں گی انہیں سنڈے کو بلا لیں۔''

''خوشی آپی میں نے ساری تحقیق کر لی ہے ویسے بھی وہ رومی کا کلاس فیلو ہے دونوں ایک دوسرے کو اچھی طرح جانتے ہیں بس اب آتے ہیں تو ڈیٹ فکس کر دیتے ہیں۔ خوشی آپی اب رومی ۳۲ سال کی ہو گئی ہے شکر ہے کہ پڑھا لکھا رشتہ ہے ورنہ تو بیچاری پڑھی لکھی لڑکیاں پڑھے لکھے لڑکوں کے انتظار میں بوڑھی ہو رہی ہیں والدین پر بوجھ بن گئی ہیں۔ والدین الگ پریشان ہیں اور ایسی لڑکیوں کے خواب وقت کی دھول میں اَٹ جاتے ہیں۔ بے چاری اپنے گھر کے انتظار میں سرخ جوڑے کے بجائے سفید کفن اوڑھ لیتی ہیں ہمیں بھی اب رومی کے سلسلے میں مزید دیر نہیں کرنی چاہیے۔''

''تم ٹھیک کہہ رہی ہو نائمہ، بس اب ڈیٹ فکس کر کے شادی کی تیاری شروع کر دیتے ہیں۔ ہاں آپی کھانے کا ارینج تو حارث کر لیں گے باقی جہیز کا ارینج آپ کر لیں گھر کے اتنے اخراجات ہیں کہ بچت ہی نہیں ہوتی۔''

''نائمہ تم فکر نہ کرو میں کھانے کا ارینج بھی کر لوں گی۔''

''خوشی اب سب ذمہ داریاں پوری ہو گئی ہیں تم میرے آنگن میں کب خوشی کی کرن بن کر آ رہی ہو؟'' رومی کی شادی کے تیسرے دن اریز نے اسے کہا۔

''نہ دل میں کوئی امنگ نہ جینے کی کوئی آرزو بڑھاپے میں اب کیا شادی کرنی لوگ کیا کہیں گے بوڑھی گھوڑی لال لگام چھوڑو کچھ زندگی گزر گئی کچھ گزر جائے گی۔ اریز میں تمہاری گناہ گار ہوں۔ تم نے ہمیشہ میرا ساتھ دیا مگر میں تمہاری کوئی خواہش پوری نہیں کر سکی مجھے معاف کر دینا۔ اب شادی کرنا یوں لگتا ہے جیسے مردے کو کفن کے بجائے سرخ لباس پہنا دیا جائے۔'' اس نے بہت سفاکی سے کہا۔

''اب تو میرا بھتیجا شادی کے قابل ہو گیا ہے۔ اریز مرد کے لیے عمر کی کوئی قید نہیں وہ اسی سال کی عمر میں بھی شادی کر لے تو دنیا باتیں نہیں کرتی لیکن اگر لڑکی تیس سال سے اوپر ہو جائے تو دنیا طعنے دینا شروع کر دیتی ہے۔ منحوس، کالی قسمت بدنصیب، بیچاری اور نہ جانے کیا کیا۔ تم شادی کر لو کسی بھی اچھی لڑکی سے اگر کہتے ہو تو میں دیکھتی ہوں تمہاری لیے لڑکی۔''

''خوشی یہ تمہارا آخری فیصلہ ہے۔''

''ہاں پلیز اریز میں...... میں بہت مجبور ہو کر کہہ رہی ہوں میں اس عمر میں شادی کر کے لوگوں کی اور اپنوں کی باتیں نہیں سن سکتی میرا حوصلہ اب جواب دینے لگا ہے۔''

''تم نے ہمیشہ اپنوں کے بارے میں سوچا جب تمہاری شادی کی عمر تھی تو وہ عمر تم نے اپنوں پر وار دی ان کی اسٹڈی کے لیے اپنی ذات تج دی اب سب اپنے اپنے مقام پر ہیں کسی کو تمہارا احساس نہیں کہ تمہارا بھی ایک گھر ہونا چاہیے انکل اور آنٹی نے میرے ساتھ تمہاری انگیجمنٹ کی تھی رشتہ تمہارے لیے مسئلہ نہیں کہ ڈھونڈنا پڑے گا پھر تمہارے بہن بھائیوں کا اگنور کرنا سمجھ نہیں آتا میں بات کروں حارث سے۔''

''نہیں اریز کسی سے کوئی بات کرنے کی ضرورت نہیں میں خود اس عمر میں تماشا نہیں بننا چاہتی۔ آج سے میں تمہیں آزاد کرتی ہوں۔ بس تم کسی اچھی لڑکی سے شادی کر لینا۔''

''شادی مسئلہ نہیں ہے میرے دل کی خوشی تم ہو اگر تم نہیں تو کوئی بھی نہیں لیکن ایک وعدہ کرو جب تم تھکنے لگو اور بہت تنہا ہو جاؤ کوئی اپنا نہ رہے تم اپنوں پر بوجھ بن جاؤ تو پلیز مجھے آواز دینا میں ایک پل بھی نہیں لگاؤں گا پھر میرا جو فیصلہ ہوگا وہ تمہیں قبول کرنا ہوگا، وعدہ کرو پلیز۔''

''جب میرا کوئی اپنا نہ رہا اور میرا وجود زمین پر بوجھ بن گیا تو میں تمہیں ضرور آواز دوں گی لیکن اریز ایسا ہوگا نہیں میرے اپنے مجھے کبھی تنہا نہیں چھوڑیں گے اتنا مجھے یقین ہے۔''

وقت تیزی سے گزرتا گیا۔ فارس نے ایم بی اے کرلیا اس کی زندگی کے مزید پانچ سال وقت کی دھول کی نذر ہوگئے اب کسی کو اس کی پرواہ ہی نہ رہی نہ اس کی ضرورت رہی۔

زندگی نے عجب کھیل کھیلا جب سب کو اس کی ضرورت تھی تو وہ سب کی جان تھی بڑی تھی مگر اب وہ بے جان چیز کی مانند اپنے کمرے میں پڑی رہتی کوئی اسے کھانے کے لیے بھی بلانے نہ آتا سب اپنی دلچسپیوں میں مست تھے۔ فارس، حادیہ اور ماریہ جو بچپن میں اس کے کمرے سے نکلتے نہیں تھے اب اس کے کمرے میں جھانکتے بھی نہ تھے۔

ایک ہی گھر میں رہتے ہوئے وہ سب کے لیے اجنبی بن گئی۔ اس کی زندگی اپنوں کے لیے بوجھ ہوگئی۔

آج کتنے دنوں کے بعد وہ لان میں چلی آئی بہت سی یادیں بہت سے منظر پلکوں کی باڑ سے جھانکنے لگے اس کے لگائے گئے پودے قد آور درخت بن چکے تھے اسے ٹی وی لاؤنج سے فارس کی اونچی آواز سنائی دی۔

''پپا پلیز اب اس گھر کو بیچ دیں آج تو سامعہ کے گھر والوں نے ہمیں انوائٹ کیا ہے کل ہم اسے اس پرانے گھر میں انوائٹ کریں گے اب یہ گھر ہمارے اسٹیٹس کے مطابق نہیں ہے ہمیں کسی سوسائٹی میں گھر لینا چاہیے۔ میں نے چاچو سے بات کی تھی وہ کہہ رہے ہیں کہ بیچ دو انہیں تو پیسہ بھی نہیں چاہیے کہہ رہے تھے جب کبھی پاکستان آؤں گا کسی بھی اچھی سوسائٹی میں گھر لے لوں گا تم لوگ گھر بیچ کر کسی سوسائٹی میں لے لو۔''

''تمہارے پپا کیا کریں پھپو نہیں بیچنے دیں گی یہ تو مجبور ہیں انہیں گھر سے تو نہیں نکال سکتے۔''

''ہاں بیٹا تمہاری مما درست کہہ رہی ہیں میں کیسے خوشی سے کہوں کہ ہم نے گھر بیچنا ہے وہ نہیں بیچنے دیں گی۔''

''پپا ان سے کہیں وہ خود خرید لیں ہمیں پیسہ دے دیں تا کہ ہم اس کھٹیچر سے گھر سے نکلیں۔''

''وہ اکیلی کیسے رہیں گی اور پھر ان کے پاس اتنا پیسہ کہاں ہوگا۔''

''مجھے نہیں پتہ پپا میں ملٹی نیشنل کمپنی میں منیجر ہوں ایسے ہی لوگوں سے ملنا جلنا ہے اس گھر میں لاتے ہوئے شرم آتی ہے پلیز آپ آنی سے بات کریں۔''

''ڈنر ہے سامعہ کے گھر آپ سب 6 بجے تک تیار ہو جانا حادیہ، ماریہ تم بہت دیر کرتی ہو ٹائم پر تیار ہو جانا اوکے۔''

''فارس پھپو کو بتایا ہے تا کہ وہ بھی تیار ہو جائیں۔''

''آنی کو..... تو مما وہ ہماری فیملی کا حصہ تو نہیں ہماری فیملی پپا مما میں حادیہ اور ماریہ پر مشتمل ہے۔''

''بیٹا وہ ہمارے ساتھ رہتی ہیں تو ہماری فیملی کا حصہ ہوئیں نا حارث نے اسے سمجھانے کی کوشش کی۔''

''پلیز پپا آنٹی نے تو صرف ہمیں انوائٹ کیا ہے انہیں بتا دیں گے جب دوبارہ جائیں گے تو پھر آنی کو بھی لے جائیں گے آج تو صرف ہم لوگ ہی جائیں گے میں نے سامعہ کو بتا دیا تھا اب اسے دوبارہ فون کر کے آنی کا بتاؤں تو اچھا نہیں لگے گا۔''

''اوکے بیٹا۔''

''پپا آپ مکان کے سلسلے میں آنی سے بات کریں گے نا پلیز۔''

''کل بات کروں گا آج تو میرا بیٹا بہت خوش ہے نا سامعہ کی طرف جانا ہے تمہیں پسند ہے تو ہمیں بھی پسند ہے۔ بس ڈن کر دیں گے۔''

''تھینک یو پپا سوئیٹ۔''
''پپا کھلے عام رشوت۔'' ہادیہ اور ماریہ کا قہقہہ گونجا۔
مگر اس کے اردگرد سائیں سائیں ہو رہی تھی آوازوں کی بازگشت اس کے کانوں کے پردے پھاڑ رہی تھی وہ تیزی سے اپنے کمرے میں آئی اور اپنے بیڈ پر گر گئی۔
کیا میں بوجھ ہوں کسی کی فیملی میں نہیں ہوں پھر میں کون ہوں میری فیملی کہاں ہے؟ میری ضرورت ختم ہوگئی ہے مجھے مر جانا چاہیے یہ گھر یہ رشتے سب میرا کچھ نہیں پھر میں زندہ کیوں ہوں کچھ عرصہ پہلے اس نے خود ایک نظم لکھی تھی اس کے الفاظ اس کے لبوں پر آگئے۔

ضرورتوں کے رشتے ہیں
ضرورتیں جو باقی ہیں تو رشتے بھی باقی ہیں
ضرورت جو ختم ہوئی
ایک چھت کے نیچے پھر سب اجنبی سے ہیں
زندگی سے جڑے رشتے جب بوجھ بن جاتے ہیں
نفرتوں کے سانچے میں رشتے ڈھل جاتے ہیں
احساس باقی رہتا ہے نہ وفا کے پھول کھلتے ہیں
سب رشتے وقت کی دھول میں اٹ جاتے ہیں
سب رشتے پھر مٹی میں رل جاتے ہیں

آہ رگِ جاں ٹوٹ رہی ہے درد اتنا ہے کہ دل وحشی ہر رگ جاں سے الجھ رہا ہے۔ آہ...... دل رکا ہوا سا محسوس ہوتا ہے اے دل کچھ لمحے ٹھہر جاؤ کسی اپنے کو آواز دینے دو مگر کون اپنا ماں جایا ماں جائی فارس باپ کا وارث سب رشتے وقت کی دھول میں اٹ جاتے ہیں ضرورتوں کے رشتے۔ سب اجنبی سے ہو جاتے ہیں۔ بے ربط الفاظ
اس کی آنکھیں آنسوؤں سے لبالب بھری تھیں۔
''سنو جب بہت اکیلی ہو جاؤ کوئی اپنا نہ رہے تو مجھے آواز دینا میں منتظر ملوں گا۔'' اریز بے اختیار اس کے ہاتھ موبائل کی طرف بڑھے۔
''ارے رات کے اس سمے میری یاد آئی خوشی۔''
''اریز...... اریز......!''
''خوشی...... خوشی...... کیا ہوا۔'' موبائل ہاتھ سے گر گیا۔
وہ آندھی طوفان کی طرح آیا بابا سب گھر والے کہاں ہیں۔ کوئی نظر نہیں آ رہا اس کا دل سوکھے پتے کی طرح کانپ رہا تھا۔
''خوشی...... خوشی کہاں ہے؟''
''وہ سب تو فارس بیٹے کا رشتہ دیکھنے گئے ہیں خوشی بیٹی اپنے کمرے میں ہوگی۔'' وہ تیزی سے خوشی کے کمرے کی طرف آیا۔
خوشی اپنے بیڈ پر بکھری پڑی تھی ہوش و خرد سے بیگانہ اس کا دل کانپ اٹھا اس نے بابا کو آواز دی۔
''بابا......!''
''کیا ہوا خوشی بٹیا کو کیا ہوا اریز بیٹا۔''
''یہ یہ بے ہوش ہیں انہیں اسپتال لے جانا ہوگا۔''

جب اسے ہوش آیا تو وہ وفا کا پتلا اس کے پاس بیٹھا تھا۔
"شکر ہے تمہیں ہوش آگیا میں نے حارث کو فون کر دیا ہے وہ آتے ہی ہوں گے۔"
"لیکن اب میں تمہاری کوئی بات نہیں سنوں گا۔ تم بہت اکیلی تھیں اس لیے مجھے آواز دی نا اب میں تمہیں اکیلا رہنے ہی نہیں دوں گا۔"
اس نے آنکھیں موند لیں وہ جان چکی تھی اب اس کے اپنوں کے پاس اس کے لیے وقت نہیں رہا تھا۔ وہ سب اپنے اپنے مقام پر پہنچ چکے تھے اب وہ محض بوجھ تھی۔ بوجھ کا اتر جانا ہی بہتر ہوتا ہے۔

......☆☆☆......

پس آئینہ

زینب اصغر مغل

وہ ہجر کی رات کا ستارہ، وہ ہم سخن وہ ہم نفس ہمارا
سدا رہے نام اس کا پیارا سنا ہے کل رات مر گیا وہ

دو سہیلیوں کا فسانہ' وہ ایک جان دو قالب تھیں' ایک دوسرے کا سایہ تھیں۔

"شہاب تم کہاں چلے گئے...... یہ کیا ہو گیا؟" اس نے دل میں کہا اس کا دل اس وقت قطرہ قطرہ لہو کی بوندوں کی طرح پگھل رہا تھا اور روم روم شہاب ثاقب کو پکار رہا تھا وہ اپنے کمرے کے دروازے سے لگ کر بیٹھی پھوٹ پھوٹ کر رو دی۔ اس کی موت کی خبر سن کے دل سے طوفان اٹھ رہے تھے اور ظلم کی انتہا تو دیکھو بے بسی کی حد ہی تو تھی کہ وہ شہاب ثاقب کی اس ناگہانی موت پر کسی کے سامنے آنسو بھی نہیں بہا سکتی تھی۔ اس کا دل و دماغ کسی بھی طرح یہ ماننے کو تیار نہ تھا کہ وہ ہنستا کھیلتا وجود مٹی کا ڈھیر ہو چکا ہے نجانے کس درندے نے اسے پسٹل کے چار فائر کر کے موت کی وادی میں دھکیل دیا تھا۔ بہر حال حقیقت اپنی جگہ تندی سے ایستادہ تھی جس کا ثبوت ثمینہ چوہدری تھی جو ڈرائنگ روم میں صدمے سے نڈھال پڑی ہوئی تھی۔

ثمینہ چوہدری اور مہرین مرزا بچپن کی سہیلیاں تھیں نرسری سے لے کر اسکول و کالج اور پھر یونیورسٹی تک ساتھ رہیں لوگ انہیں یک جان دو قالب کہتے تھے وہ ہر وقت اور جگہ ساتھ ہی پائی جاتی تھیں کلاس، کھیل کا میدان لائبریری یا تفریح کا کوئی مقام جہاں ثمینہ چوہدری ہو وہاں مہرین مرزا کی موجودگی لازم و ملزوم تھی اس دوران ان کے درمیان بھی لڑائی نہ ہوئی صرف ایک مرتبہ تھوڑا اختلاف ہوا۔ ایک لڑکا تھا جو یونیورسٹی میں ساتھ پڑھتا تھا ہوا یوں کہ ان دونوں کے آئیڈیل پر پورا اترتا تھا سوئے اتفاق اس لڑکے نے ثمینہ چوہدری کو نظر انداز کر کے مہرین مرزا کی طرف پیش قدمی کی تو ثمینہ چوہدری کو بہت برا لگا اس نے مہرین پر الزام لگایا کہ اس نے اسے ثمینہ کی طرف سے بدظن کر کے اپنی طرف مائل کیا ہے جبکہ اس الزام میں کوئی سچائی نہیں تھی۔ اب اگر کوئی شخص خود ہی کسی کی طرف بڑھتا ہے تو اسے کیا اعتراض ہو سکتا ہے۔ بہر حال وہ وقتی بات تھی سو آئی گئی ہو گئی اس نے قیوم سے معذرت کر لی سو قیوم نے بھی اپنے قدم واپس موڑ لیے۔ ایک انجان شخص کی خاطر وہ ثمینہ جیسی دوست کو نہیں کھونا چاہتی ہے۔
وہ دونوں اس قدر ہم مزاج تھیں کہ ان کی پسند ناپسند اور عادات بھی ایک تھی ان کی پسند اور ہم مزاجی یوں تو کوئی ایسا

مسئلہ نہیں تھا لیکن جب بات پسندیدہ ہم سفر کی آئی تو اختلافات لازمی بات تھی بہرحال مہرین مرزا نے اپنے طور پر اس معاملے میں احتیاط برتنا شروع کردی کیونکہ ثمینہ اس کے لیے دوستی کے نام پر ہیرا تھا جس سے وہ کسی صورت ہاتھ دھونا نہیں چاہتی تھی۔

پھر جب ان دونوں نے پریکٹیکل لائف میں قدم رکھا تو بھی ایک ہی میدان میں اتری مہرین مرزا چونکہ دوران تعلیم بھی کمرشلز کرتی رہی تھی سو تعلیم مکمل کرنے کے بعد باقاعدہ اداکاری کے شعبہ میں آ گئی اور ثمینہ چوہدری نیوز کے شعبہ سے منسلک ہوگئی مہرین مرزا کی اداکاری پر لوگ عش عش کرتے تو ثمینہ کی آواز انداز گفتگو اور شخصیت لوگوں کے دلوں میں جادو جگاتی بہرحال اپنے اپنے کام میں وہ دونوں نا صرف نام کما رہی تھیں بلکہ دن دگنی رات چوگنی ترقی بھی کر رہی تھیں۔

ثمینہ چوہدری کا تعلق راولپنڈی سے تھا جبکہ مہرین لاہور سے آئی تھی اور راولپنڈی میں اپنی خالہ کے گھر رہتی تھی۔ ایک روز جب مہرین ہفتہ بھر کے لیے لاہور گئی ہوئی تھی تب اچانک ثمینہ چوہدری کی شادی ہوگئی جس پر مہرین انگشت بدنداں رہ گئی مگر اس نے شکوہ کرنے سے ہر ممکن گریز کیا، چونکہ اس افتاں وخیزاں شادی کی نہ تو اسے خبر ہوسکی اور نہ ہی وہ اس شادی میں شرکت کرسکی اس لیے ثمینہ چوہدری جو کہ اب مسز شہاب ثاقب بن چکی تھی شادی کے بعد مہرین کے گھر دعوت پر میاں سمیت تشریف لے کے گئی تو مہرین مرزا شہاب ثاقب کو دیکھ کر مبہوت رہ گئی وہ اس قدر شاندار شخصیت کا مالک تھا کہ پہلی نظر میں ہی مہرین مرزا کے دل میں اتر گیا بات پھر وہی ہوگئی کہ جو ثمینہ چوہدری کی پسند تھی وہی مہرین مرزا کی......جس شخص کو ثمینہ نے ہم سفر چنا تھا وہ بھلا مہرین کو کیوں نہ بھاتا۔

مگر وہ ثمینہ کا سرتاج تھا مہرین کے لیے ادب واحترام کے قابل تھا اس نے اپنے دل کو سرزنش کیا اور اپنی سوچ پر چار حروف بھیجے اور شہاب ثاقب کو ''دلہا بھائی'' کہنے لگی۔ وہ دونوں بہت اچھی سہیلیاں تھیں ان کی محبت بہنوں جیسی تھی شہاب ثاقب بھی ان کی دوستی پر فخر کرتا اور اکثر کہا کرتا۔ ''میں نے ایسی دوستی کبھی نہیں دیکھی۔'' شہاب کی بات ان کے لیے کسی اعزاز سے کم نہ تھی۔ ثمینہ اور شہاب کا کپل گویا چاند سورج کی جوڑی کہلانے کے لائق تھا۔ ان کی شادی کے بعد بھی ثمینہ اور مہرین کی دوستی میں کوئی فرق نہ آیا۔ بلکہ وہ بھی ان کی فیملی کا حصہ بن گئی تھی اور وہ تینوں ہر جگہ ساتھ پائے جاتے البتہ گھر الگ تھے۔

مہرین مرزا اپنی بیوہ ماں کے ساتھ راولپنڈی میں اپنی خالہ کے گھر رہتی تھی اس کا ددھیال تو لاہور میں تھا مگر اس کے والد کی وفات کے بعد خالہ اس کو اور اس کی ماں کو مستقل طور پر اپنے گھر لے آئی تھیں۔

تعلیم مکمل ہوجانے کے بعد اس کی ماں اس کی شادی کے لیے کوشاں تھی وہ ہر روز نت نئے لوگوں کو گھر بلا کے ان کے سامنے پیش ہونے کا حکم صادر کرتیں لیکن وہ شادی سے مسلسل انکاری تھیں شہاب ثاقب جیسا کوئی ملتا تو شادی کرتی نا...... یہ بھی حقیقت تھی کہ وہ دل ہی دل میں شہاب ثاقب کو چاہنے لگی تھی کبھی کبھی سوچتی ثمینہ نے اس کے ساتھ ظلم کیا ہے۔

وقت کا کام گزرنا ہے اور خدا کے فضل وکرم سے اچھا ہی گزر رہا تھا کہ یکدم وقت نے ایسی کروٹ لی کہ سب کچھ اپنے ساتھ بہا لے گیا جب ایک روز رات دس بجے وہ شوٹنگ سے واپس آئی کھانا کھا کے سونے کی تیاری میں تھی جب دروازے پر دستک ہوئی اسے سخت کوفت ہوئی وہ اس وقت بہت تھکی ہوئی اور آرام کرنا چاہتی تھی اماں اور خالہ بھی گھر پر نہیں تھیں۔ اس نے بادل ناخواستہ دروازہ کھولا تو روتی دھوتی ثمینہ چوہدری آ کر اس سے لپٹ گئی۔

ہمیشہ نک سک سے تیار رہنے والی ثمینہ آج ملگجے سے حلیے میں عجیب طرح سے اجڑی لگ رہی تھی بکھرے ہوئے بال آنکھوں کے گرد سیاہ حلقے، سرخ انگاروں کی طرح دہکتی متورم آنکھیں۔

وہ اسے اس برے حال میں دیکھ کر بری طرح گھبرا گئی اور کندھوں سے تھام کے لاؤنج میں لے آئی پانی پلایا اور پوچھا۔ ''ہاں......اب بولو کیا ہوا ہے؟'' اپنے دل میں آنے والے خدشات کو جھٹکتے ہوئے پوچھا وہ ایک بار پھر مہرین کے

گلے لگ کر سسکنے لگی۔

''مہرین...... شہاب مر گیا۔'' اس نے ہچکیوں کے درمیان بتایا۔

اس کے سر پر گویا چھت آن گری تھی اس نے جھٹکے سے ثمینہ کو خود سے الگ کیا اسے اپنے دل کی دھڑکن رکتی ہوئی محسوس ہوئی اور آنکھوں کو سیاہ تاریکی نے اپنی لپیٹ میں لے لیا اس نے بمشکل خود کو سنبھالا۔

''ثمینہ تم کہنا کیا چاہتی ہو، مجھے کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا اور تم اس وقت کہاں سے آ رہی ہو، شہاب ثاقب کہاں ہے، کیا تم نے اسے مرا ہوا دیکھا ہے؟''

اس نے ڈوبتے دل کے ساتھ کئی سوال داغے۔

''میں اسٹوڈیو سے گھر آئی تو دیکھا وہ خون میں لت پت پڑا تھا کسی نے اسے گولیاں مار کر ہلاک کر دیا۔'' وہ ایک بار پھر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ شہاب ایک فوٹو گرافر تھا بظاہر اس کا کوئی دشمن نہیں تھا۔

''اچھا یہ بتاؤ کہ تم نے تھانے میں رپورٹ درج کرائی۔'' اچانک خیال آنے پر اس نے پوچھا۔

''ہاں، پولیس نے شہاب کی لاش کو پوسٹ مارٹم کے لیے اسپتال بھیج دیا ہے۔'' وہ بدستور روتے ہوئے بولی۔

''مگر شہاب ثاقب سے بھلا کس کو دشمنی ہو سکتی ہے، وہ تو بہت ملنسار اور انسان دوست تھا۔'' مہرین نے تعجب سے کہا۔

''وہ قتل ہوا ہے اور قتل غارت دشمنی میں ہی کیا جاتا ہے دوستی میں کون ایسا کرتا ہے۔'' وہ تیزی سے بولی۔

''اچھا...... پولیس نے تفتیش کی...... وہ کیا کہتی ہے۔''

''ہاں پولیس چھان بین کر رہی ہے جب وہ کسی نتیجے پر پہنچے گی تو بتا دے گی۔'' اس نے آنسو پونچھتے ہوئے کہا اور سر ہاتھوں میں گرا لیا۔

''اوکے، ثمینہ تم اج رات یہیں رہو، خود کو سنبھالو، آرام کرو صبح ہم دونوں پولیس اسٹیشن چلیں گے۔'' اس نے سعادت مندی سے سر ہلا دیا۔

''مجھے پتا تھا اس کڑے وقت میں تم ہی میری غم گسار ہو گی۔'' اس نے کہا اور مہرین کے گلے لگ کر رو پڑی۔

مہرین نے اس بار اسے رونے سے نہیں روکا تا کہ وہ اچھی طرح سے آنسو بہا کے ہلکی پھلکی ہو جائے تقریباً بیس منٹ تک رونے کے بعد وہ قدرے سنبھلی مہرین نے اسے اپنا جوڑا نکال کر دیا کہ وہ فریش ہو جائے۔

سلیپنگ پلز اور گرم دودھ کا گلاس دے کر اسے بے فکر ہو کر سو جانے کی تلقین کی اس نے نہایت فرمانبرداری سے مہرین کی ہدایت پر عمل کیا اور کچھ ہی دیر بعد وہ ڈرائنگ روم میں صوفہ کم بیڈ پر لیٹی نیند کی وادیوں میں گم ہو چکی تھی۔ کمرہ اس کی سانسوں کے زیر و بم سے گونج رہا تھا مہرین مرزا نے اسے کمبل اوڑھایا، لائٹ آف کی دروازہ بند کر کے اپنے کمرے میں چلی آئی۔ کچھ دیر پہلے والی نیند کی خواہش اور آرام کی طلب روٹھ کر نجانے کس دیس سدھار گئی تھیں۔

......☆☆☆......

کہانی یوں تھی کہ مہرین کچھ عرصہ سے خود بھی محسوس کر رہی تھی کہ ثمینہ اور شہاب کے درمیان ضرور کوئی ان بن چل رہی ہے اور ان کا تعلق اب پہلے جیسا نہیں رہا دوسروں کے سامنے وہ محبت کا اچھا ڈرامہ کر لیتے تھے لیکن حقیقت اب بدل چکی تھی ان کے درمیان غیر محسوس فاصلے در آ چکے تھے مگر کیوں......؟ اس کیوں کا جواب بہر حال اس کے پاس نہیں تھا اس نے کئی بار سوچا کہ وہ ثمینہ سے پوچھے مگر اس خیال سے رک جاتی کہ کہیں وہ اپنے انتہائی پرسنل معاملے میں مداخلت سمجھ کر ناراض نہ ہو جائے اور یہ بھی کہ وہ خود ہی اپنا مسئلہ شیئر کرنا چاہے تو کرے۔

ایک روز وہ جب اپنے کام سے فارغ ہوئی تو ثمینہ کے گھر چلی گئی اور جاتے ہوئے ثمینہ کی فیورٹ آئس کریم اور کیک بھی لے گئی مگر جب وہ وہاں پہنچی تو پتا چلا کہ وہ اپنے چینل کی طرف سے ملک سے باہر گئی ہوئی ہے۔

''ارے دلہا بھائی...... وہ ملک سے باہر چلی گئی اور مجھے بتایا تک نہیں۔'' اس نے حیرت سے پوچھا کیونکہ ایسا پہلی

بار تو نہ ہوا تھا مگر پھر بھی...... وہ پھیکا سا مسکرا دیا اس کی بے رنگ مسکراہٹ کو دیکھ کر مہرین کا دل چاہا کہ وہ اس کے سارے درد بانٹ لے مگر...... اس نے شہاب کو کبھی اس حال میں نہیں دیکھا تھا۔

وہ بہت زندہ دل اور ہنس مکھ تھا اب اس کی آنکھوں سے رت جگے نمایاں تھے۔

بڑھی ہوئی شیو بے ترتیب بال اور شکن زدہ لباس......

''آپ کی طبیعت تو ٹھیک ہے نا۔'' اس نے فکر مندی سے پوچھا۔

''بس کیا بتاؤں...... زندگی عجیب موڑ پر لے آئی ہے۔'' اس نے دلگرفتگی سے کہا۔

''کیوں...... کیا ہوا؟'' مہرین نے بوکھلا کر پوچھا۔

''ثمینہ کبھی ماں نہیں بن سکتی۔'' اس نے بلا تمہید کہا اور رپورٹ نکال کر اس کے سامنے رکھ دی۔ ''اسے ڈر ہے کہ کہیں میں اسے چھوڑ کر دوسری شادی نہ کرلوں اسی بات کو بنیاد بنا کر مجھ پر شک کرتی ہے کہتی ہے چند سال بعد بھی تو چھوڑ دو گے بہتر ہے ابھی طلاق دے دو، حالانکہ میں ہر طرح کی قسم کھانے کو تیار ہوں کہ میں اسے نہیں چھوڑ سکتا۔ میں اس سے بے تحاشا محبت کرتا ہوں مگر وہ اپنی ضد پہ اڑی ہوئی ہے۔''

اس پل اسے ثمینہ پر بے تحاشا طیش آیا جسے شہاب جیسے شخص کی قدر نہیں تھی اور وہ اس سے اس طرح بدگمان تھی۔

''اگر شہاب میرا جیون ساتھی ہوتا تو میں اس کے پاؤں دھودھو کر پیتی اور خود کو دنیا کی خوش قسمت ترین لڑکی سمجھتی۔''

اس نے دل میں کہا اور ساتھ ہی ایک عجیب سے خیال نے دل میں سر اٹھایا۔

''اگر واقعی ثمینہ شہاب ثاقب سے طلاق لے لیتی ہے تو شہاب ثاقب آخر کسی نہ کسی سے تو شادی کرے گا تو وہ میں ہی کیوں نہیں؟''

کیونکہ وہ دل ہی دل میں اسے چاہنے لگی تھی، وہ تھا بھی چاہے جانے کے لائق انہی خیالوں میں گم وہ وہاں سے اٹھ آئی اور وہیں سے ان کی دوستی کا آغاز ہوا تھا جوں جوں دن ہفتے اور مہینے گزرتے گئے ان کی دوستی پختہ ہوتی چلی گئی جب بھی ثمینہ چوہدری شہر یا ملک سے باہر جاتی وہ سارا وقت وہ دونوں ساتھ گزارتے کھانا پینا، اٹھنا، بیٹھنا سب ایک ساتھ ہوگا گویا وہ دونوں ایک دوسرے کے لئے لازم و ملزوم ہو چکے تھے لیکن اس کے باوجود وہ ثمینہ کو چھوڑنے کا تصور بھی نہیں کرسکتا تھا اور وہ دونوں ثانیہ کی موجودگی میں محتاط ہی رہتے۔

......☆☆☆......

وہ ساری رات شہاب ثاقب کو یاد کر کے روتی رہی اور ثمینہ چوہدری آرام سے مہمان خانے میں محو استراحت تھی۔

صبح اس نے ثمینہ کو جگایا اور اس کے لیے پرتکلف ناشتہ تیار کیا وہ نہا دھو کر فریش ہو کر آئی بظاہر وہ تازہ دم ہوگئی تھی مگر اس کی سرخ متورم آنکھیں اس کے غم کی عکاسی کررہی تھیں۔

''تم کم از کم شہاب کی موت کا غم تو منا سکتی ہو ایک میں ہوں کہ اپنے محبوب اور عزیز از جان دوست کے بچھڑنے پر آنسو بھی نہیں بہا سکتی۔''

بے دلی سے ناشتہ کرتے ہوئے اس نے سوچا ناشتے کے دوران اچانک ثمینہ نے کہا۔

''تمہیں پتا ہے مہرین...... شہاب کی کوئی معشوقہ بھی تھی۔''

''کک...... کیا......؟'' اسے حیرت سے اس کی طرف دیکھا۔

''میں سچ کہہ رہی ہوں مہرین مرزا۔'' ثمینہ نے وثوق سے کہا۔

''بکومت...... وہ مر چکا ہے اور مرے ہوئے انسان پر بہتان لگانا ٹھیک ہے کیا؟'' مہرین نے ملامت بھرے انداز میں اسے لتاڑا۔

''وہ صرف تم سے محبت کرتا تھا سمجھی۔''

"ہاں مجھے پتا ہے وہ مجھ سے محبت کرتا تھا مگر اس کی ایک معشوقہ بھی تھی۔"
"تمہارے پاس کیا ثبوت ہے؟" مہرین نے پوچھا۔
اس سے پہلے کہ وہ کوئی جواب دیتی دفعتاً گیٹ پر بیل ہوئی اس نے دروازہ کھولا تو ایک انسپکٹر اور ایک لیڈی کانسٹیبل کو پایا۔
"تمہارا نام مہرین مرزا ہے۔" انسپکٹر نے سرتاپیر اسے کھوجتی ہوئی نظر سے دیکھ کر پوچھا تو مہرین نے سر ہلا دیا۔
"میں انسپکٹر جاوید ملک ہوں۔" اس نے گویا اپنا تعارف کرایا۔
"آپ یہاں کس خوشی میں؟" مہرین نے جل کر پوچھا۔
"بتاتا ہوں بتاتا ہوں پہلے تو تم مجھے یہ بتاؤ......!" انسپکٹر کہتے ہوئے لاؤنج کی طرف بڑھ آیا۔
"آپ یہاں کیسے مسز شہاب ثاقب؟" اس نے بات ادھوری چھوڑ کر ثمینہ سے دریافت کیا۔
"میں تو سمجھا تھا کہ آپ اپنے میکے یا سسرال چلی گئی ہوں گی۔"
"ملک صاحب میرے شوہر کے قاتل کے بارے میں کچھ پتا چلا کہ نہیں۔" ثمینہ نے انسپکٹر کے سوالات کو نظر انداز کر کے پوچھا۔
"مجھے تمہارے غم کا اندازہ ہے سب پتا چل جائے گا تفتیش ہو رہی ہے مگر قاتل کو ڈھونڈ نکالنا کوئی بچوں کا کھیل نہیں ہے اس میں محنت بھی ہوتی ہے اور وقت بھی لگتا ہے۔" جاوید ملک نے دیدے گھماتے ہوئے کہا۔
"مگر تمہاری یہاں موجودگی میری تو سمجھ سے بالاتر ہے۔"
"وہ کیوں ملک صاحب؟" مہرین نے ترشی سے کہا۔
"بتاؤ تم یہاں کیا کر رہی ہو؟" انسپکٹر نے اس کے سوال کو نظر انداز کر کے ثمینہ سے پوچھا۔
"یہ میری بیسٹ فرینڈ ہے۔" ثمینہ نے کہا۔
"تم جانتی ہو تمہارے میاں کو کس نے موت کے گھاٹ اتارا ہے؟" جاوید ملک نے مونچھوں کو تاؤ دیتے ہوئے گویا سسپنس پھیلایا تو ثمینہ اچھل کر کھڑی ہوگئی۔
"سچ ملک صاحب......کون ہے وہ آپ نے اسے اریسٹ کیا نہیں ابھی تک۔" ثمینہ نے بے تابی سے پوچھا۔
"وہی کرنے تو یہاں آیا ہوں۔" جاوید ملک نے کہتے ہوئے لیڈی پولیس کو اشارہ کیا اس سے پہلے کہ وہ کچھ سمجھ پاتی اس نے مہرین کے ہاتھوں میں بیڑیاں ڈال دیں۔ "تم لوگ پاگل تو نہیں ہوگئے۔" وہ چلائی۔ "میں نے شہاب کو قتل نہیں کیا، میرا اس معاملے سے کوئی واسطہ نہیں چھوڑ دو مجھے۔"
"دھیرج......دھیرج......!" ملک جاوید نے زہر خند لہجے میں کہا۔
"زیادہ اداکاری کرنے کی ضرورت نہیں ہے تمہاری یہ اداکاری یہاں کام آنے والی نہیں ہے۔ تم دونوں ایک دوسرے کی آواز تو خوب پہچانتی ہوں گی۔" پھر اس نے ثمینہ چوہدری کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "کیونکہ تم دونوں کا تعلق ٹی وی سے ہے۔"
"ہاں لیکن۔" ثمینہ نے کہا وہ حیرت سے کبھی مہرین مرزا کو تو کبھی جاوید ملک کو دیکھ رہی تھی۔
"ملک صاحب آپ کو ضرور کوئی بڑی غلط فہمی ہوئی ہے، یہ میری بہنوں جیسی دوست ہے یہ بھلا ایسا کیوں کرے گی۔" وہ متعجب ہوئی۔
"او میری بہن زمانہ بڑا خراب ہے آج کل کے مجرموں کے چہرے اتنے معصوم ہوتے ہیں کہ کوئی تصور بھی نہیں کرسکتا کہ انہوں نے کوئی جرم کیا ہوگا۔" پھر جاوید ملک نے لیڈی پولیس سے کہا۔
"وہ کیمرہ لاؤ ذرا......ابھی دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی ہوجائے گا مسز ثمینہ شہاب......کل تو میرا شک تم پر ہی تھا

کہ تم نے خود ہی اپنے شوہر کو قتل کیا ہے لیکن جب تفتیش کی گئی تو حقیقت یوں سامنے آئی کہ تم اپنے مرحوم شوہر سے بہت محبت کرتی ہو لہٰذا تم اپنے شوہر کو قتل نہیں کر سکتی اس بے چارے کو تو کسی ایسے شخص نے قتل کیا ہے۔ جس کا تم لوگوں کے ساتھ کوئی قریبی تعلق تھا اور تمہارے ہاں آنا جانا بھی تھا۔"

"شہاب چونکہ فوٹو گرافر تھا اور اپنا ذاتی کیمرہ ہر وقت آن رکھتا تھا کچھ زندہ دلی اس میں اس طرح کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی کہ وہ زندگی کے ہر لمحے سے بھر پور خوشی کشید کرتا اور ہر خوب لمحے کو اپنے کیمرے میں کیپچر کر لیتا بہر حال قاتلہ کی آواز اس میں ریکارڈ ہے تم لوگ خود سن لو۔" یہ کہہ کر اس نے کیمرہ آن کیا تو مہرین کی ویڈیو چلنے لگی۔

"تمہاری طرح میں بھی تمہیں بہت چاہتی ہوں بس اب تم جلد از جلد اپنی بیوی کو طلاق دے دو تا کہ ہم دونوں ایک ہو جائیں اگر تم مجھے نہیں مل سکے تو دیکھ لینا میں تمہیں بھی مار دوں گی اور خود کو بھی......بس اب مجھ سے یہ جدائی نہیں سہی جاتی۔"

"ہاں مس مہرین اب آپ کیا کہتی ہیں۔" انسپکٹر نے معنی خیز انداز میں اسے دیکھتے ہوئے کہا۔ "آپ قتل کے الزام میں پھنس چکی ہیں۔"

"دھوکا ہے یہ سب فراڈ ہے میرے خلاف سازش ہے۔" وہ ہزیانی انداز میں چلائی اور خود کو چھڑانے کی ناکام سی کوشش کرنے لگی۔

مگر وہ بلاوجہ نہیں چلا رہی تھی بلکہ شہاب کو واقعی اس نے قتل نہیں کیا تھا اور وہ ویڈیو بھی جھوٹی تھی بلکہ وہ تو تین سال پہلے چلنے والے اس کے ڈرامے کے ڈائیلاگ اور سین تھے جسے مہارت سے شہاب کے کیمرے میں کاپی کیا گیا تھا کہ شک کی کوئی گنجائش ہی نہیں تھی ورنہ بھلا وہ شہاب کو کیوں قتل کرتی وہ تو اسے دل و جان سے چاہتی تھی۔

جب اس نے ثمینہ کی طرف دیکھا تو اس کے چہرے پر بڑی معنی خیزی کھیل رہی تھی جیسے کہہ رہی ہو۔

"اسے کہتے ہیں ایک تیر سے دو شکار۔ میں نے بے وفا شوہر کو قتل کر کے اسے بے وفائی کا مزہ چکھا دیا اور دشمنی کرنے والی دوست کو اس کے عاشق کے قتل کے الزام میں پھنسوا کر اس کی بے وقوفی کی سزا بھی دے ڈالی۔

......☆☆☆......

یادوں کی پرچھائیاں

عمران احمد راجپوت

ذہنی اختلاف یا سوچوں کا تصادم جب حد سے تجاوز کر جائے یا انسان اسے اپنے ذہن پر سوار کر لے تو سمجھوتے کی گاڑی کا انجن راستے ہی میں فیل ہو جاتا ہے اور پچھتاوے زندگی بھر کا آزار بن جاتے ہیں۔

گھر کے کاموں سے نڈھال کچھ دیر فراغت کے لمحات گزارنے بیڈ پر بیٹھتے ہوئے ٹی وی آن کیا ہی تھا کہ اچانک ٹی وی اسکرین پر علی احمد کا نام پڑھتے ہی دل کی خاموش لہروں نے یکدم وجود کے اندر ایک تلاطم برپا کر دیا۔ وہ واقعی شہرت کی بلندیوں کو چھو رہا تھا وہ اپنی بات کا پکا تھا جو ایک بار ٹھان لیتا اُسے پورا کر کے ہی رہتا اُس کی زندگی بلیک اینڈ وائٹ کی طرح تھی جو یس اینڈ نو کے گرد گھومتی صحیح اور غلط کے بنیادی اصولوں پر ٹھہری ہوئی تھی۔ شاید یہی اس کے اور میرے درمیان تنازعے کا باعث تھا بلکہ میرے درمیان کیا اُس سے جڑے ہر رشتے کے درمیان یہی تنازعہ حائل تھا اُس کے بنائے خود کار اُصولوں سے مجھ سمیت کسی کو اتفاق نہ تھا۔ وہ زندگی کے ہر لمحے کو اُصولوں کے ترازو میں تول کر

گزارنے کا عادی تھا۔ اِس میں کوئی شک نہیں کہ اُس کے بنائے اُصول حق وصداقت پر مبنی تھے لیکن شاید وہ یہ بھول گیا تھا کہ آج کے معاشرے میں سچائی کی بڑی بھاری قیمت چکانی پڑتی ہے ہمارا معاشرہ اس کا عادی نہیں وہ تو بس بے ہنگم شور وغل میں بے مقصد زندگی گزارنے کا عادی ہے وہ بھول چکا تھا کہ معاشرتی اختلاف انسان کو ایسی ویرانیوں میں دھکیل سکتا ہے جس سے باہر نکلنا ناممکنات میں سے ہے۔۔۔اور پھر اُس کے ساتھ ایسا ہی ہوا ماضی میں اُصولوں کے پابند اور مضبوط ارادوں کے حامل اِس انسان کو میں نے ٹوٹتے ہوئے بھی دیکھا سخت موقف پر ڈٹنے والے علی احمد کو میں نے جھکتے ہوئے بھی دیکھا جن آنکھوں نے کبھی نمی کو محسوس نہ کیا ہو اُن آنکھوں میں اُشکوں کا سمندر بھی دیکھا مسلسل جیتے ہوئے انسان کو ہارتے ہوئے بھی دیکھا جب اُسے یہ احساس ہوا کہ کچھ رشتے اُصولوں سے زیادہ قیمتی ہوتے ہیں جن سے کنارہ کرنا کسی انسان کے اختیار میں نہیں ہوتا۔

اولاد نامی انمول رشتے کی سچائی کو نو ماہ اپنے وجود میں رکھ کر اِس حقیقت سے آشنا نہ ہو پائی تھی کہ جس سے شناسائی علی احمد کے ہاتھوں ہوئی اپنے زعم میں مبتلا غرور وتکبر سے لبریز چٹان سے زیادہ مضبوط اصولوں پر کھڑا انسان اولاد کے لیے لحہ بھر میں ریتیلی عمارت کی صورت اختیار کیے اِس طرح زمیں بوس ہو جائے گا خواب وخیالوں میں بھی نہ سوچا تھا اولاد کی جدائی کے خوف سے بقول اُس کے مجھ جیسی احمق لڑکی کے ساتھ دوبارہ زندگی گزارنے کو تیار تھا لیکن جانے یہ میری بدنصیبی تھی یا اُس کی تقدیر میں اولاد کا بچھڑنا لکھا تھا کہ اُسے رشتوں کا احساس ہونے تک کافی دیر ہو چکی تھی۔وہ طلاق جیسے شبدوں کو میرے گلے کا طوق بنا چکا تھا۔ بقول اُس کے وہ مجھے نصیحت دینا چاہتا تھا لیکن اپنے خود ساختہ اصولوں پر کھڑی عمارت کے زعم میں مبتلا وہ یہ بھول گیا تھا کہ یہ معاشرہ اُس کی اختیار کی گئی آزاد و ملحدانہ سوچ کی پیروی نہیں کرتا بلکہ طبقات میں بٹا مسلکوں میں تقسیم معاشرہ ایسے موقعوں کی تلاش میں رہتا ہے اور وہ یہ بھی بھول گیا تھا کہ میرے اور اُس کے درمیان رشتے کی بنیاد اب صرف نکاح کے تین بولوں سے نہیں دانیال کے وجود سے جڑی ہے لیکن باوجود اِن سب کے وہ میری ذات پر طلاق کی مہر ثبت کر چکا تھا......

کیا قصور تھا میرا......میں آوارہ تھی، بدچلن تھی، ان پڑھ تھی جاہل تھی گنوار تھی کیا تھی میں......؟

کیا ذہنوں کا اختلاف اِس قدر سنگین صورت حال اختیار کر جاتا ہے کہ ساتھ ایک لحہ گزارنا مشکل ہو جاتا ہے۔

میرے اور اُس کے درمیان اختلاف صرف اتنا ہی تو تھا کہ وہ زندگی کو جینا چاہتا تھا اور میں زندگی گزارتا۔

کہنے کو یہ معمولی بات تھی لیکن بات جب الفاظ میں چھپی حقیقت کو چاک کرنے کی آتی ہے تو اندر اختلافات کا کبھی نہ رکنے والا سیلاب اُمڈتا دکھائی دیتا ہے جو ذہنوں کو غارت کرنے میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھتا۔

میرا تعلق ایسے گھرانے سے تھا جہاں عورت کو سہاگن بننے سے پہلے باپ بھائی کی نظریاتی سوچوں کا غلام بننا پڑتا ہے اور سہاگن ہونے کے بعد شوہر کے اصولوں کا پابند کر دیا جاتا ہے۔ بہر صورت عورت کو ایک کٹھ پتلی کا کردار ہی ادا کرنا ہوتا ہے لہذا ایسی عورت کا شعور سے کیا تعلق، اُس کا زندگی کے دلفریب رنگوں سے کیا واسطہ، اُسے فکرِ نو سے کیوں رغبت ہو، ایسی باتیں اُس کے لئے شجرِ ممنوع کی حیثیت رکھتی ہیں لہذا جس نے اِس کا ارتکاب کیا وہ سنگین جرم کا مرتکب ٹھہرا۔ مجھے نہیں معلوم کہ یہ میری خوش قسمتی تھی یا بدنصیبی کہ علی احمد جیسا شخص میرے وجود کا حقدار قرار پایا وہ ایک انتہائی آزاد اور لبرل سوچ کا مالک تھا جو زندگی کو زندہ دلی کے ساتھ جینا چاہتا تھا اُس کی نظر میں فرسودہ معاشرتی اقدار کی کوئی اہمیت و وقعت نہیں تھی وہ ہر شے کو انسانیت کے حقیقی اصولوں پر پرکھنے کا عادی تھا وہ ہر طرح کی تاریخ سازی کو مسترد کر چکا تھا اُس کی نظر میں پرانی روایات کی کوئی اہمیت تھی نہ بزرگوں کے قول کا کوئی پاس تھا وہ اپنے آپ پر کسی وجود کا ٹھپا نہیں چاہتا تھا وہ انتہا کا غیر جانبدار تھا وہ ہر رشتے کی اہمیت عمل سے جانچنے کا عادی تھا وہ مکمل ایک پریکٹیکل انسان تھا۔ ایسے انسان کا اِس مطلب پرست معاشرے میں کیا کام......نتیجہ یہ نکلا نہ معاشرے نے اُس کو تسلیم کیا اور نہ وہ فرسودہ معاشرتی اقداروں میں خود کو ضم کر پایا، وہ ہمارے لئے ایک عجوبہ تھا جو اپنے وجود میں تنہا حالات سے مقابلہ کرتا

اپنے اصولوں پر کھڑا تھا۔
چونکہ میری پرورش جھوٹی شان پر کھڑے عدم استحکام کے حامل اِسی معاشرے میں ہوئی تھی لہٰذا ہر ممکن کوشش کے باوجود اِس کے سحر سے باہر نہ نکل سکی میں تو بس زندگی کو ہانڈی چولہے تک محدود کرنے کی اہل تھی لہٰذا علی احمد کے آزاد نہ خیالات سے چڑ ہونے لگی، بجائے اِس کے ہم خیال بنتی اُس کے تصورات کی تضحیک کرنے لگی...... اُسے اِسی بے مہر معاشرے کا حصہ بنانے میں جتی رہی لیکن وہ کب جھکنے والا تھا...... سوٹوٹا اُس کا مقدر بنا گردشِ حالات نے سب کچھ بہا کر آسمان سے زمیں پر پہنچا دیا تھا۔
لیکن شاید اب وہ حالات سے نبرد آزما ہونے کا فن جان چکا تھا آج ٹی وی اسکرین پر ڈائریکٹر، رائٹر، اور ایکٹر کے چلتے ٹریکر پر علی احمد کا نام اِس بات کی عکاسی کررہا تھا کہ زندگی کسی سہارے کی نہیں بلکہ ارادوں کی محتاج ہوا کرتی ہے اور یہ اُس نے ثابت کر کے بھی دکھایا۔ مجھے اب یہ احساس شدت سے ہونے لگا تھا آج مجھے اُس کی ہر بات میں سچائی کی جھلک نظر آرہی تھی شاید میں نے خود کو ایک بند گلی میں دھکیل دیا تھا لیکن کیا اِس نتیجے کی ذمہ دار میں تنہا تھی یا علی احمد بھی میرے ساتھ شریک جرم تھا۔ یا پھر وہ بھائی جو دنیا کے لئے آخرت کو خراب نہ کرنے کا درس دیتا اچانک اسی سماج کی خاطر اپنے دونوں ہاتھوں کو میرے پیروں کی زنجیر بنا چکا تھا...... جس کی چابی حلالہ جیسی معاشرتی روایتوں کے سرہانے پڑی تھی...... جو علی احمد کو کسی طور قبول نہ تھا وہ تو تجدیدِ نکاح کی گنجائش جیسے صاف ستھرے راستے کا قائل تھا......
پتا نہیں آج علی احمد کو ٹھکرا کر فردوس کو پانے کا سودا بھلا رہا یا برا۔ لیکن میں اتنا ضرور جان چکی ہوں کہ آج سب اپنی اپنی جنتوں میں خوش ہیں جہاں تک علی احمد کی بات ہے تو وہ جنت دوزخ کے تصور سے آزاد اپنی جنت آپ پیدا کرنے کے اصول پر کاربند نظر آتا ہے۔ جہاں تک بھائی کی بات ہے وہ میرے چہرے پر اُمڈتے سوالوں سے نظریں چرائے بیوی بچوں کے ساتھ اپنی جنت نمائی میں مگن ہے جبکہ میں مایوسیوں کے گھپ اندھیروں میں پتھرائی آنکھوں کے ساتھ آسمانوں سے نبرد آزماں کبھی اپنی جنت کو تلاشتی ہوں تو کبھی نظریں جھکائے خاموش بیٹھی اپنے اصل دشمن کو کھوجتی رہتی ہوں...... شاید یہی میرا مقدر ہے جس کے سہارے مجھے اب زندہ رہنا ہے۔ آج اگر علی احمد سے تعلق جوڑنے کا کہوں بھی تو وہ مجھے کبھی نہیں اپنائے گا کیونکہ اُس کے اصولوں کی پٹاری میں ہر غلطی کی معافی ہے لیکن بے وفائی کی نہیں......!

......☆☆☆......

قربانی

محمّد خالد جاوید

وہ محبوبہ تھی' دوست تھی' محبوبہ تھی' محافظ یا قاتل

رحیم دفتر آکر بیٹھا ہی تھا کہ چپڑاسی نے بتایا۔ ''سر انور بیلدار آپ سے ملنا چاہتا ہے' اگر آپ اجازت دیں تو؟''
''ہاں، ہاں بھیجو''
چند لمحے بعد ایک آدمی جس کی عمر چالیس کے لگ بھگ رہی ہوگی، پسینے سے شرابور، گندی سی قمیض جس کے سارے بٹن غائب تھے اور دھاگے سے ایک جگہ بٹن کا کام لیا گیا تھا، پھٹی ہوئی آستین، میلا کچیلا تہبند، سر پر پرانی سی پگڑی رکھے، دروازے سے اندر آکر یتیم سی صورت بنائے، ہاتھ باندھ کر کھڑا ہو گیا۔
''آؤ انور بیٹھو۔''
رحیم نے سامنے ایک کرسی کی طرف اشارہ کیا۔

انور کے چہرے پر حیرانی اور خوشی کے ملے جلے عجیب سے تاثرات تھے۔
''نہیں صاب میں بھلا آپ کے سامنے کیسے کرسی پر بیٹھ سکتا ہوں؟''
''کیوں ......کیوں نہیں بیٹھ سکتے ؟''انسان ،انسان کے سامنے بیٹھ سکتا ہے، ہاں البتہ بھیڑیئے کے سامنے نہیں بیٹھ سکتا۔''
اور میں تمہیں کیا لگتا ہوں؟''
''آپ تو صاب جی دیوتا ہیں جی دیوتا۔''
''خدا نہ کرے میں دیوتا نہیں جو ہمارا دیوتا ہے وہی دیوتا ہے، میں اگر انسانیت کے درجے پر بھی رہ جاؤں تو سمجھوں گا۔''
زندگی کا مقصد پالیا۔
''بہر حال تم بیٹھ جاو۔'' وہ بیٹھ تو گیا مگر یوں سکڑ کر جیسے بہت سردی لگ رہی ہو۔
اس کو پانی پلوانے کے بعد، رحیم بولا۔
''ہاں اب بتاؤ کیا بات ہے؟''
''وہ صاب جی چھیدا ہے نا چھیدا اس نے نہر کو جگہ جگہ سے کاٹ کر سارا پانی اپنی زمینوں کو لگالیا ہے اور ایک قطرہ پانی اگلے زمینداروں کو نہیں دے رہا۔''
''چھیدا؟ یہ کون ہے؟''
''صاب جی آپ کو چھیدے کا نہیں پتہ؟''
''اس پورے علاقے کا بے تاج بادشاہ ہے جی، نارنگ منڈی کے علاقے کا بہت بڑا اشتہاری ہے۔''علاقے کے سارے بدمعاش اس سے ڈرتے ہیں جی، پولس بھی اس کے ڈیرے سے کترا کے نکل جاتی ہے اب تک ......قتل کر چکا ہے جی۔''
''پر ایک بات ہے جی، دل کا بہت اچھا ہے۔''
انور کی اس بات پر رحیم کی ہنسی نکل گئی۔
''وہ قتل کر چکا ہے، بہت بڑا اشتہاری ہے، بڑے بڑے بدمعاش اس سے ڈرتے ہیں اور دل کا اچھا......''
''کیا اچھائی کا معیار ہے! قربان جاؤں۔''
''اچھا خیر یہ بتاؤ کہ انتظامیہ نے اب تک کچھ نہیں کیا؟''نہیں صاب سب بے بس ہیں۔''اور وہ صرف دو ہستیوں کی بہت قدر کرتا ہے جی ایک اس کی ماں اور ایک پنو۔
''پنو...... یہ کون ہے؟'' یہ اس کی معشوقہ ہے جی۔''انور کے منہ سے یہ لفظ سن کر وہ حیران ہوا۔
''انور یہ معشوقہ کیا ہوتی ہے؟'' پتہ نہیں صاب جی سب لوگ ایسے ہی کہتے ہیں، وہ بڑی جنی ہے جی چھیدا جتنا اعتبار اس کا کرتا ہے کسی کا نہیں کرتا وہ خود بندوق پکڑ کر ساری رات پہرا دیتی ہے اور چھیدے کے بعد وہی ڈیرہ سنبھالتی ہے جی۔''
''اچھا یہ بتاؤ جب ساری انتظامیہ بے بس ہے تو میں اکیلا کیا کر سکتا ہوں؟''
''آپ اس سے ملیے صاب!''
یہ بات سن کر رحیم کا منہ کھلے کا کھلا رہ گیا۔''کیا......؟''میں ملوں؟''خود ہی کہتے ہو کسی سے وہ ملتا نہیں۔''
''اور ویسے انور تم نے ابھی کہا کہ میں اچھا آدمی ہوں اور تم نہیں چاہتے کہ ایک اچھا آدمی اس دنیا میں رہے۔''رحیم

نے ہنستے ہوئے کہا۔
''نہیں صاحب اللہ آپ کو لمبی حیاتی دے، وہ جٹ برادری کا ہے اور جٹ برادری کے افسر کی بہت قدر کرتا ہے۔''
''اچھا انور اگر تم نہیں چاہتے کہ میں اس دنیا میں رہوں تو اس تک میرا پیغام پہنچا دو کہ میں اسے ملنا چاہتا ہوں''۔ رحیم نے ہنس کر کہا۔
انور جب جانے کے لیے اٹھا تو اس کی آنکھوں میں خوشی کے آنسو تھے۔
''صاب آپ نے مجھ مسکین کو عزت دی اللہ آپ کو عرشوں کے رنگ لگائے۔'' انور رحیم کو دعائیں دیتا ہوا چلا گیا۔
رحیم کو ساری رات نوافل ادا کر کے بھی وہ سکون نہیں کبھی ملا تھا، جتنا اس کو انور کے چہرے پر پھیلی اس مسکراہٹ اور خوشی سے میسر آیا۔
رحیم کافی دن کشمکش و پیچ میں رہا اندیشے اور وسوسے اس کے دماغ میں کسی فلم کی طرح چل رہے تھے، لوگوں تک نہر کا پانی پہنچانا بھی اس کی ذمہ داری تھی مگر کیسے؟
کہ ایک دن انور چھیدے کا پیغام لے کر آیا۔ ''وہ صاب جی چھیدے نے آپ کو جمعہ والے دن دوپہر کے کھانے پر بلایا ہے۔''
رحیم کو یقین نہ آیا کہ اتنا خطرناک مجرم جو قانون کو مطلوب ہے مجھ سے ملنے کو کیوں راضی ہو گیا؟
دل ڈانواں ڈول ہو رہا تھا جاؤں کہ نہ جاؤں، پھر یہ سوچ کر کہ موت کا وقت اور جگہ مقرر ہے، پھر ڈر کیسا؟ اگر میرے جانے سے ہزاروں لوگوں کا فائدہ ہو سکتا ہے تو مجھے جانا چاہیے۔ اس نے انور کو ہاں کر دی۔
وہ جمعہ کا دن تھا جب رحیم اس خطرناک درندے کی کچھار میں جانے کے لیے موٹر سائیکل پر سوار اپر چناب کینال کے دائیں کنارے پر گھنے درختوں کی چھاؤں میں اڑا جا رہا تھا۔
کئی کلومیٹر کا سفر کر کے وہ نہر کے کنارے ایک گاؤں ڈھلی پہنچا جہاں سے ایک چھوٹی نہر چندر کے مائنر نکلتی تھی جس پر چھیدے کا ڈیرہ تھا نہر کے ہیڈ پر انور انتظار کر رہا تھا۔
''انور میرے پیچھے بیٹھ جاؤ۔'' رحیم نے کہا۔
''نہیں صاحب جی میں آپ کے آگے سائیکل پر چلوں گا اور آپ میرے پیچھے ہوں گے۔''
''کیوں؟''
''صاب اگر کچھ بھی ہوا تو میں پہلے آپ پر اپنی جان وار دوں گا۔''
یا خدا یہ تیرے غریب بندے جن سے اگر تھوڑی سی عزت سے پیش آئیں تو یہ اپنی جان بھی وارنے سے دریغ نہیں کرتے تو ہمیں کتنی عزت دیتا ہے، بیشمار نعمتیں دیتا ہے مگر ہمارے پاس تمہیں یاد کرنے کا وقت بھی نہیں!
رحیم کی آنکھوں میں آنسو آ گئے، اس نے اپنا منہ دوسری طرف پھیر لیا، کہ کہیں انور یہ نہ سمجھے کہ شائد صاب چھیدے کے خوف سے رو رہے ہیں۔
بڑی نہر سے اتر کر وہ چھوٹی نہر کے کنارے پر ہو لیے، نہر کو جگہ جگہ سے کاٹا گیا تھا اور نہر کا سارا پانی چھیدے کی زمینوں میں جا رہا تھا جن پر اس نے زبردستی قبضہ کیا ہوا تھا، زمینوں کے قریب ٹریکٹر جو ارد گرد کے دیہات سے زبردستی منگوائے گئے تھے کام کر رہے تھے یعنی پانی میں ہل چلا رہے تھے۔ چلتے چلتے نہر کے کنارے بنے ہوئے ایک کچے اور خستہ سے مکان سے اچانک...... کلاشنکوف بردار آدمی نکل آئے اور رکنے کا اشارہ کیا مگر جب انور کو دیکھا تو گنیں نیچے کر لیں۔
''چیمہ صاب ہیں ہمارے نئے افسر۔''

"ہاں ہاں ہمیں اطلاع ہے، مگر یہ سائیکل اور موٹر سائیکل یہیں چھوڑ دیں اب آگے آپ کو پیدل ہی جانا پڑے گا۔"
نہر سے اتر کر وہ دونوں مکئی اور باجرے کی گھنی اور اونچی فصلوں کے درمیان بنی پتلی سی پگڈنڈی پر ہو لئے، انور یہاں بھی آگے آگے چل رہا تھا، کئی جگہ فصلوں میں عجیب سی سرسراہٹ محسوس ہوئی رحیم نے انور کی طرف دیکھا۔
"صاب یہ چھیدے کے آدمی ہیں جو آس پاس فصلوں میں گھات لگائے چھپے رہتے ہیں۔"
کئی کلومیٹر چلنے کے بعد ایک مصنوعی سا جنگل جس میں کائی، سرکنڈہ اور جنگلی کیکر کے بیشمار درخت تھے شروع ہو گیا پیدل چلنے کی عادت نہ ہونے کے سبب رحیم کا برا حال تھا مگر چلنا مجبوری تھی، اس کا دل دھک دھک کر رہا تھا' جان کو انتہائی خطرے میں ڈال چکا تھا۔ آیایت لکرسی کی تلاوت جو صرف ایسے موقعوں پر ہی یاد آتی ہے شروع کر دی۔
تڑ تاڑ تڑ تڑا چانک فضا بے شمار گولیوں کی آواز سے گونج اٹھی، ارد گرد کے درختوں پر بیٹھے ہوئے بیشمار پرندوں نے اڑ کر شور مچانا شروع کر دیا جس سے ماحول اور بھی گھمبیر ہو گیا، رحیم اور انور بے اختیار زمین پر بیٹھ گئے کہ اچانک کئی آدمی جو اسلحے کا ڈبولنگ رہے تھے دونوں کندھوں پر جدید قسم کی رائفلیں لٹکائے، پیٹ پر تین تین کارتوسوں کی پیٹیاں باندھے فصلوں سے نکل کر سامنے آ گئے۔
"انور ہے؟" ان ہی میں سے ایک بولا۔ "جی میں انور ہوں اور یہ صاب ہیں۔" "آو جی آو ست بسم اللہ...... یہ آپ کا استقبالیہ تھا۔" ان میں سے ایک نے آگے بڑھ کر مصافہ کیا۔
رحیم نے سوچا کہ یہ چھیدا ہے، مگر جب اس نے کہا کہ...... پائے۔ "جی آپ کا انتظار کر رہے ہیں۔" رحیم کا منہ کھلے کا کھلا رہ گیا یہ اسلحے کے ڈپو ہیں تو وہ تو اسلحے کا کارخانہ ہی ہو گا رحیم نے سوچا۔
مزید ایک فرلانگ کا فاصلہ طے کرنے کے بعد جب سامنے نظر پڑی تو گھنے جنگل میں دو بڑے سے کمرے جو پختہ اینٹوں کے بنے ہوئے تھے اور ان کے اوپر ایک اور کمرہ بنایا گیا تھا جس میں سے جگہ جگہ سے اینٹیں نکال کر چھوٹے چھوٹے سوراخ بنائے گئے تھے تاکہ بوقت ضرورت خود کو محفوظ رکھتے ہوئے باہر فائرنگ کی جا سکے، ان سوراخوں سے باہر نکلی ہوئی بندوق کی نالیاں صاف دکھائی دے رہی تھیں کافی تعداد میں مسلح آدمی ارد گرد گھوم رہے تھے ایک چھوٹے سے جنگلی قلعے کا سماں تھا۔
رحیم نے سوچا کہ چھیدا کوئی لحیم شحیم سا اونچے قد کاٹھ کا فلم شعلے کے گبر سنگھ کی طرح ہو گا۔
مگر اس کی حیرت کی انتہا نہ رہی جب سامنے سے ایک جواں سال انتہائی سمارٹ سے لڑکے کو جو سادہ سی شلوار قمیص میں ملبوس ہوائی چپل پہنے آتے ہوئے دیکھا، اس کے ساتھ ایک انتہائی خوبصورت لڑکی جس کے کندھوں پر سرخ بال بکھرے ہوئے تھے، بڑی بڑی خوبصورت آنکھیں، سرخ وسفید رنگت، مختصر سا لباس پہنے جس میں سے اس کے جسم کے تمام اعضاء کے نشیب و فراز دعوت نظارہ دے رہے تھے بڑے ہی سیکسی انداز میں اسموکنگ کرتی ہوئی آ رہی تھی اس نے اپنے کندھے پر ایک جدید قسم کی رائفل لٹکا رکھی تھی، ننگے خوبصورت پیٹ پر ایک پیٹی کارتوس بھری باندھ رکھی تھی وہ قتالہ عالم چھیدے کے ساتھ سائے کی طرح چلتی ہوئی چند قدم دور کھڑی ہو گئی' اس کے منہ سے شراب کی بو دور سے ہی آنا شروع ہو گئی۔
انور نے تعارف کروایا۔ "یہ ہمارے صاب ہیں جی......اور یہ رشید صاحب۔"
واہ چھیدا...... چھیدا...... چھیدا اور سامنے آتے ہی.. رشید صاحب واہ رے دنیا!
چھیدے سے ملنے سے پہلے اس قتالہ عالم نے ہماری تلاشی لی کیونکہ چھیدے کو اور کسی پر اعتبار نہیں تھا۔
چھیدے نے آگے بڑھ کر مصافہ کیا اور رحیم کو ساتھ لے کر ایک کمرے کی طرف چل پڑا۔
لڑکی سائے کی طرح ساتھ تھی کمرے میں ایک پھولدار کپڑا فرش پر بچھایا گیا تھا، شاید یہ رحیم کے اعزاز میں بچھایا

گیا تھا، سامنے دیوار پر انتہائی جدید قسم کا اسلحہ جگہ جگہ لٹک رہا تھا ایک کونے میں بہت بڑا بیشمار گولیوں کا ڈھیر لگا تھا، دوسرے کونے میں فرش پر ہی کپڑا بچھا کر انواع واقسام کے کھانے اور غیر ملکی شراب کی بوتلیں رکھی گئی تھیں۔

رحیم نے جب تجسس سے لڑکی کی طرف دیکھا تو چھیدا بولا۔" یہ میری پنو ہے اس کے ماں باپ مر گئے، چچا کے بیٹے نے ایک رات زبردستی عزت لوٹ لی۔ انصاف کے لیے ہر دروازے پر گئی مگر کوئی شنوائی نہ ہوئی۔

خودکشی کا سوچا مگر اس کو میرا ایک آدمی مل گیا جو میرے پاس لے آیا۔ میرے بعد یہ گینگ کو سنبھالتی ہے۔

" مجھے اپنے پاس کوئی ہتھیار نہیں رکھنے دیتی کہ جب تک پنو زندہ ہے کوئی مجھے چھو بھی نہیں سکتا۔" یہ کہہ کر چھیدے نے پنو کو ایک بھرپور کس کر دی اور پنو نے بھی اسی گرمجوشی سے جواب دیا، رحیم جھینپ کر رہ گیا۔

" اچھا میں جس کام سے آیا ہوں آپ کو معلوم ہے اس کے بارے میں کچھ بتایئے۔" رحیم نے کہا۔

" دیکھو چیمہ صاحب میرے باپ کو ان لوگوں نے پانی کی باری کے تنازعہ پر قتل کر دیا اور پھر اس کی لاش پر بھنگڑے ڈالے گئے اور میں سوائے اپنے باپ کی چارپائی سے لپٹ کر رونے کے اور کچھ نہ کر سکا، میں نے ایم بی اے کیا ہوا ہے میرے بھی بہت سے خواب تھے جو انہوں نے خاک میں ملا دیئے میں نے پھر گن گن کر بدلے لیے۔

" میں آپ کے آنے اور جٹ بھرا کے افسر لگنے کی وجہ سے عزت کرتا ہوں کہ آپ جب تک یہاں ہو پانی آگے ٹیل تک جائے گا۔"

" مگر جس دن آپ ٹرانسفر ہو گئے میں پھر بند کر دوں گا۔"

" آؤ کھانا کھائیں۔" مگر اس سے پہلے کہ کھانا شروع کرتے رحیم کو شراب کی بدبو کی وجہ سے شدید قسم کی ابکائیاں آنے لگیں، چھیدے نے ہنستے ہوئے کہا۔" واہ اتنے بڑے افسر کی رگ رگ میں شراب بھری ہوتی ہے، افسروں کے دو ہی تو شوق ہوتے ہیں۔ شراب اور شباب۔۔ ابھی تو آپ کے لیے شباب کا بھی انتظام کر رکھا ہے۔"

" نہیں...... نہیں رشید بھائی آپ کو انور نے بتایا ہوگا کہ میں نے یہ شوق نہیں پالے...... آپ کا اتنا ہی بڑا احسان ہے جو میری عزت رکھ لی۔"

" مجھے اجازت دیں اگر میں کچھ دیر اور رکا تو باقاعدہ قے کرنے لگوں گا۔" بہت مشکل سے چھیدے سے اجازت لے کر واپس آ گئے آج بھی سیالکوٹ نہری دفتر میں یہ بات ریکارڈ پر ہے کہ میری تعیناتی سے لے کر ٹرانسفر تک چندرکے مائنر کا پانی ٹیل تک گیا لوگ تو جو خوش ہوئے ایک الگ داستان ہے مگر محکمے کی طرف سے رحیم کو پروموشن اور اعزازی شیلڈ بھی ملی جو وہ سمجھتا ہے کہ صرف ایک غریب آدمی کی عزت کرنے کی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے اس کو اتنی بڑی عزت سے نواز دیا۔

ایک دن انور نے بتایا کہ" صاب جی کل چھیدا نے اپنے ڈیرے پر اپنے ساتھیوں کو جو کے اشتہاری تھے دعوت پر بلایا۔ پولیس نے ریڈ کیا' چھیدا اپنے اشتہاری ساتھیوں سمیت مرا گیا ہے مگر ایک بڑی عجیب بات ہے جی۔"

" وہ کیا؟" اس دن سے پنو غائب ہے جی اس کی لاش بھی نہیں ملی۔"

اس واقعے کے دو ماہ بعد ایک دن اخبار میں ایک تصویر دیکھ کر رحیم سکتے میں آ گیا۔

تصویر کے نیچے لکھا تھا۔

الف۔ آئی۔ اے کی لیڈی انسپکٹر پروین اسلم ہوسٹل میں اپنے کمرے میں مردہ پائی گئی۔

......☆☆☆......

گورکھ دھندا

آغاز الدین

یہ حقیقت ہے کہ وقت ایک جیسا نہیں رہتا کبھی کے دن بڑے اور کبھی راتیں' جو لوگ اس پر یقین رکھتے ہیں وہ کبھی پریشان نہیں ہوتے۔

ایک پرائیوٹ ڈیلر کا فسانہ' اس کی محبوبہ نے اسے قاتل بننے سے روک دیا تھا۔

ہر شخص کی زندگی میں کبھی نہ کبھی ایسا وقت ضرور آتا ہے جب وہ اپنے آپ کو اتنا بے بس پاتا ہے کہ اپنی مرضی سے سوچ بھی نہیں سکتا یا پھر جو کچھ سوچتا ہے اس پر عمل نہیں کرسکتا میرا دل چاہتا تھا کہ میں اس سے محبت کروں لیکن ٹھنڈے دماغ سے سوچتا تھا تو مجھے اس سے نفرت ہونے لگتی تھی جبکہ اصولاً مجھے یا تو اسے قتل کردینا چاہیے تھا یا خودکشی کرلینی چاہئے تھی۔ وہ نہ محبت کے قابل تھی نہ نفرت کے۔ چنانچہ میں بے بس تھا۔

ویسے میری قوت فیصلہ مضبوط ہے۔ صبح سے شام تک میں بہت سے فیصلے کرتا ہوں۔ بروقت اور بلا تامل۔ اور ان پر عمل بھی اتنی ہی قوت ارادی کے ساتھ کرتا ہوں۔ چھوٹے چھوٹے فیصلے۔ مثلاً یہ کہ مجھے کون سا لباس پہننا ہے۔ موسم' وقت اور موقعہ کے علاوہ اپنی عمر کے لحاظ سے۔ اور بڑے فیصلے مثلاً یہ کہ مجھے اپنی بیوی کو طلاق دینی چاہیے یا اس کے آشنا کو قتل کردینا چاہیے یا کرادینا چاہئے۔ بات چونکہ پرانی ہے اس لیے یہ بتادینے میں کوئی حرج نہیں کہ اتنا بڑا فیصلہ کرتے ہوئے مجھے صرف دو منٹ ستاون سیکنڈ لگے تھے۔ شاید اتنا ہی وقت اس پر عمل کرنے میں لگا ہوگا۔ یعنی اس کا دم نکلنے میں صحیح اس لیے نہیں بتاسکتا کہ جب میں گھر سے چلا تھا تو قلم' پرس' کف لنک یعنی وہ چیزیں جو عموماً بلا ارادہ رہ جاتی ہیں یا گرجاتی ہیں۔ میں نے گھر پر ہی چھوڑ دی تھی اور سوائے ...... دستانوں کے میری جیب میں کچھ نہ تھا۔ نہ سگریٹ۔ نہ ماچس۔ نہ کوئی سکہ۔ نہ رومال۔ جیسے ہی مجھے علم ہوا کہ میری بیوی کو مجھ پر شک ہے۔ یہ تیسرے دن کی بات ہے جب ہم مرحوم کی آخری رسومات سے فارغ ہوکر لوٹے تھے تو طلاق دینے کا فیصلہ بھی میں نے سات منٹ سولہ سیکنڈ...... آپ سمجھ ہی گئے ہوں گے کہ میں کس قماش کا آدمی ہوں۔ اس کے باوجود مجھے اس عورت نے اپنے دام میں اس طرح اسیر کرلیا تھا جیسے مکڑی اپنے جالے میں کیڑے مکوڑوں کو قید کرلیتی ہے اور ان کی ناکام جدوجہد کا اور بے بسی کا تماشہ دیکھتی ہے۔

میرا پیشہ شریفانہ ہے۔ میں مہذب اور خوش اخلاق ہوں اور لوگ اپنی مرضی سے اپنے اپنے مسائل لے کر میرے پاس آتے ہیں۔ میں ان کا مناسب حل تلاش کردیتا ہوں اور ان کا کام کرنے سے پہلے ایک مقررہ شرح پر اپنا معاوضہ طے کرلیتا ہوں۔ نہ ایک پیسہ زیادہ نہ ایک پیسہ کم۔ لوگ میری صاف گوئی اور اصول پرستی سے متاثر ہوتے ہیں اور یہی اس پیشے میں میری کامیابی کا راز ہے۔

تین ماہ پہلے مادام۔ معاف کیجئے گا۔ شہزادی کیرولین نے جب میرے دفتر میں قدم رکھا تھا تو میں موجود نہ تھا۔ میں کسی کام سے نیپلز گیا ہوا تھا۔ اس نے پہلے فون کیا اور ایک گھنٹے بعد خود آگئی۔ سیکریٹری نے اسے بتایا کہ میں اگلے دن شام سے پہلے نہیں آؤں گا تو وہ پیغام چھوڑ گئی کہ میں آتے ہی اس سے ملوں۔ کاغذ کے ٹکڑے پر چند ٹیڑھے میڑھے حروف اور پتا

ایک نگاہ میں پہچانی جانے والی زنانہ تحریر۔

چند سیکنڈ تک میں اس پیغام پر نظریں جمائے بیٹھا رہا اور میری سکرٹری احکامات کی منتظر کھڑی رہی۔ میں کیرولین کے نام سے واقف تھا میں کیا سارا شہر واقف تھا۔ ایک تو وہ شہزادی تھی۔ سچ مچ کی شہزادی نہیں کیونکہ اس کے باپ کی کوئی ریاست نہ تھی لیکن اس کا دادا شاید پر دادا ضرور بادشاہ وغیرہ رہا ہوگا جس کی وجہ سے وہ اپنے نام کے ساتھ شہزادی کا لفظ لگاتی تھی۔ دوسری بات جو زیادہ اہم تھی وہ یہ تھی کہ وہ سچ مچ کی دس شہزادیوں سے زیادہ دولت مند تھی اور سو گنا حسین۔ بالکل دو دھاری تلوار جس نے ان گنت دولت مندوں کے ٹکڑے کر دیئے تھے اور انہیں مفلس قلاش بنا کر روم کی سڑکوں پر کھلے آسمان کے نیچے بھیک مانگنے کے لیے زندہ چھوڑ دیا تھا۔ دو سال قبل اس نے ایک ایسے بوڑھے پھوس سے شادی کر لی تھی جو لب گور تھا اور اس کے بعد شہزادی کی لوگوں کو کنگال بنانے کی فیکٹری بند ہوگئی تھی کیونکہ بڈھے نے بڑی مشکل سے اس دنیا کو چھوڑا۔ اس کی روح جیسے اس کی دولت سے چمٹ گئی تھی اور شہزادی کیرولین کو خطرہ لاحق ہوگیا تھا کہ کہیں اس دولت پر قبضہ کرنے کے لیے اسے سو پچاس سال انتظار نہ کرنا پڑے اور وہ اس سے پہلے خود رخصت ہوجائے۔ بڈھے کا مخنی جسم دو ماہ تک بے حس و حرکت پڑا اس دنیا پر الوداعی نظریں ڈالتا رہا اور شہزادی کیرولین کے اعصاب اس انتظار سے متاثر ہونے لگے۔ بالآخر اس کی دعاؤں اور کوششوں کے طفیل بڈھے نے اپنی آنکھیں بند کیں اور شہزادی نے اطمینان کا سانس لیا کہ وہ قتل کے الزام سے بچ گئی اور بڈھے نے جو دولت پائی پائی کر کے ساٹھ برس میں جمع کی تھی وہ دو برس سے بھی کم عرصے میں اسکے پاس آ گئی ذہنی طور پر وہ کسی حد تک پریشان ضرور رہی لیکن جسمانی طور پر اسے کوئی گزند نہ پہنچا۔ وہ بدستور حسین۔ لالچی اور بے رحم رہی۔

ایسی عورت کا پیغام میرے لیے اور میری محنت کی کمائی کے لیے خطرے کی گھنٹی تھا۔ آخر وہ مجھ سے کیا چاہتی ہے۔ شادی کرنا اور میری جیب سے آخری سکہ نکال کر مجھے مجبور کرنا کہ میں بے عزت زندگی یا باعزت تدفین میں سے کسی ایک کو قبول کروں۔؟ کیا وہ مجھے اتنا احمق سمجھتی ہے۔ کیا اس شہر میں میرے جیسے شخص کے مقابلے میں اسے کوئی دولت مند نظر نہیں آیا؟

سترہ منٹ چوالیس سیکنڈ کے بعد میں اس نتیجے پر پہنچا کہ اس سے مل لینے میں کوئی حرج نہیں۔ وہ ایک عورت ہے کوئی ساحرہ نہیں کہ مجھے طوطا بنا کر پنجرے میں قید کردے اور میں بہر حال ایک مرد ہوں اور عورت کے ہر حربے کا مقابلہ کرسکتا ہوں۔ مسکراہٹ سے لے کر آنسوؤں تک۔ مگر یہ فیصلہ جو میں نے بے حد غور و خوض کے بعد کیا تھا۔ جس میں میرا سب سے زیادہ وقت صرف ہوا تھا۔ غلط ثابت ہوا اور اس نے میرے سارے دعوے باطل کردیئے۔ میرا خیال یہ ہے کہ شہزادی کی شخصیت کے گرد پراسرار داستانوں کا جو ہالہ تھا اس نے میرے شوق تجسس کو ہوا دی۔ لوگ اسے طرح طرح سے بدنام کرتے تھے۔ بدنام کیا اس کے بارے میں ایسی باتیں کرتے تھے جو بدنامی کا سبب بن جاتی تھیں۔ مثلاً یہ کہ اس نے میری دولت کی ہوس میں اپنے سابقہ دونوں شوہروں کو قتل کیا لیکن میرے نزدیک یہ بات بے بنیاد تھی۔ وہ دونوں زندگی کی آخری سانسیں گن رہے تھے اور انہیں بہر صورت مرجانا تھا۔ یہ اس کی دانشمندی یا عیاری تھی کہ اس نے مردوں کی ایک نفسیاتی کمزوری سے فائدہ اٹھایا کہ دنیا کا بدصورت ترین اور غریب ترین مرد بھی ایک حسین عورت کی ملکیت چاہتا ہے خواہ اس کے لیے اسے اپنا سب کچھ قربان کرنا پڑے۔ اس کا پہلا شوہر تپ دق کا آخری مرحلہ طے کر رہا تھا جب شہزادی نے اپنی ”رحم لی“ کا مظاہرہ کرتے ہوئے اس سے شادی کرلی اور یوں اس کی زندگی کے آخری لمحوں کو اپنی ”محبت“ سے خوشگوار بنادیا۔ وہ سینی ٹوریم میں بے کسی کی موت مرنے کے بجائے شہزادی کی معطر گود میں دنیا

سے رخصت ہوا۔ رہ گئی اس کی دولت تو وہ حکومت کی تحویل میں نہ گئی شہزادی کے اثاثوں میں شامل گئی۔ بات ایک ہی ہے۔ مرنے والا اسے اپنے ساتھ نہیں لے جاسکتا تھا۔ بعد میں اس کا ایک بہت دور کا رشتہ دار نکل آیا تھا مگر بیوی کے ہوتے ہوئے وہ قانونی طور پر ایک پھوٹی کوڑی نہیں لے سکتا تھا۔ وہ غریب تھا اور اس نے زندگی میں کبھی مرحوم کی صورت بھی دیکھنا گوارہ نہ کیا تھا چنانچہ شہزادی نے اس کی رحم کی اپیل بھی مسترد کردی اور وہ گمنامی کے جس گوشے سے نکل کر آیا تھا وہیں چلا گیا۔ دوسرے شوہر کا انتخاب بھی اس پس منظر میں بالکل ٹھیک تھا۔

وہ خسیس نہیں تھی اس کا رہن سہن شاہانہ تھا لیکن اپنی دولت میں اضافہ اس کی زندگی کا اولین اور آخری مقصد تھا۔ مگر میں اس کو بھی عیب نہیں سمجھتا۔ دنیا میں ہر شخص اسی جدوجہد میں مصروف ہے۔ البتہ یہ سوال ضرور کیا جاسکتا ہے کہ بے اولاد ہونے کی وجہ سے اسے اتنی بدنامی کے عوض یہ دولت جمع کرنے کی کیا ضرورت تھی۔ بیویاں اپنے شوہروں کے منہ سے اس کا نام سن کر ڈراؤنے خواب دیکھنے لگتی تھیں اور اس کے بارے میں گفتگو کرتے ہوئے جو الفاظ استعمال کرتی تھیں وہ میں فی الحال نہیں لکھ سکتا لیکن اگر آپ شادی شدہ ہیں تو اشارہ کافی ہے۔

قصہ مختصر۔ اگلے دن شام کے وقت میں نے اس کے محل میں قدم رکھا۔ دروازے پر ایک مستعد دربان بھری ہوئی بندوق لیے کھڑا تھا اور اس کے تیور بتاتے تھے کہ وہ بندوق کا استعمال جانتا ہے اور ان دربانوں کی طرح نہیں ہے جو بندوق کو سہارے کے لیے استعمال کرتے ہیں اور جب اس کو گولی چلانے کے لیے اٹھاتے ہیں تو پتا چلتا ہے کہ بندوق سے صرف ڈنڈے کا کام لیا جاسکتا ہے۔ خاصی ردوکد کے بعد اس نے مجھے دروازے سے اندر داخل ہونے کی اجازت دی۔ صدر دروازے پر جو شخص ملا وہ دربان کی نسبت زیادہ شائستہ اطوار کا مالک تھا۔ اس نے میری بات پر بحث کے بغیر یقین کرلیا کہ میں شہزادی کو لوٹنے نہیں آیا بلکہ اس کے احکامات کی تعمیل میں حاضر ہوا ہوں۔ وہ شہزادی کو مطلع کرنے کا وعدہ کرکے رخصت ہوا اور صرف پچیس منٹ بعد لوٹ آیا۔ اس سے بہت پہلے میں شہزادی سے ملے بغیر لوٹ جانے کا ارادہ کرچکا تھا لیکن دروازے پر دربان ایستادہ تھا اور مجھے یقین تھا کہ وہ میرے داخلے پر تو رضا مند ہوگیا تھا لیکن ملاقات کے بغیر جانے کی اجازت ہرگز نہ دے گا۔ میری بات کو جھوٹ سمجھے گا اور نہ جانے کیا کر بیٹھے۔ گولی چلانے کے علاوہ۔

محل کی وسعت اور آرائش واقعی قابل تعریف تھی۔ میرا اندازہ تھا کہ دائیں بائیں گردشوں اور برآمدوں سے گزر کر نہ جانے کتنی دیر میں مجھے شہزادی تک رسائی نصیب ہوگی لیکن خلاف توقع دروازے سے داخل ہوتے ہی قیمتی فرنیچر سے آراستہ ہال میں شہزادی نے میرا استقبال کیا۔ تھوڑے سے تکلف اور حجاب آمیز اجنبیت کے احساس کے ساتھ وہ ابھی ماتمی لباس میں تھی کیونکہ اس کے شوہر کے انتقال کو زیادہ عرصہ نہیں گزرا تھا۔ سرتاپا سیاہ جس میں اس کے ہاتھوں اور چہرے کی سفیدی اس حد تک نمایاں تھی کہ یہ تضاد نگاہوں کو خیرہ کرتا تھا۔ اس نے اپنے ملائم مخملی سرد ہاتھ میرے ہاتھ پر رکھ دیا۔ ویسے بھی یہ گرم جوشی کے اظہار کا موقع نہ تھا۔ اس کے اشارے پر میں بیٹھ گیا۔ چھ فٹ دور دوسرے صوفے پر وہ خود بیٹھ گئی۔ بلکہ ٹک گئی۔

''آپ نے مجھے یاد کیا تھا۔'' چند لمحوں کے سکوت کے بعد میں نے کہا۔ اس عظیم الشان ہال کے فانوسوں کی مدھم روشنی میں خاموشی کے چند لمحوں میں میں نے یوں محسوس کیا جیسے یہ خاموشی ایک طلسم کی طرح مجھ پر غالب آتی جارہی ہے۔ اس کا حسن دیکھ کر مجھے یقین آگیا کہ جو لوگ اس کے ہاتھوں رسوا ہوئے اس میں ان کا کوئی قصور نہ تھا۔

''انتونیو۔'' اس نے مدھم ملائم آواز میں کہا۔ ''میں

نے تمہیں ایک کام کے لیے بلایا ہے۔'' انتونیو اور تم......مگر یہ اپنائیت کا اظہار نہیں تھا۔ ایک شہزادی کا ایک عام آدمی کے لیے تخاطب کا انداز تھا۔

''فرمائیے۔'' میں نے اجازت اور معذرت کے بغیر سگریٹ سلگاتے ہوئے کہا اور جلتی ہوئی تیلی کو بدتمیزی سے قالین پر پیر کے نیچے دبا دیا۔ اس کے چہرے کے ناگوار تاثرات کی پرواہ کیے بغیر۔ حالانکہ میرے دائیں ہاتھ پر سنگ مرمر کی وینس ایش ٹرے اٹھائے کھڑی تھی۔ چند لمحے اور گزر گئے۔

''انتونیو۔ تم جانتے ہو میرے شوہر کا حال ہی میں انتقال ہوا ہے۔''

''جی ہاں۔ آپ کے دوسرے شوہر کا۔ مجھے افسوس ہے۔'' اصولاً اور اخلاقاً مجھے خاتون کو اپنے آنسو خشک کرنے کے لیے اپنا رومال پیش کرنا چاہیے تھا۔ مگر میں نے طنزیہ الفاظ استعمال کیے کام بہرحال ہو گیا۔

''ان کی بے وقت موت کے بعد اتنے بڑے محل میں تنہا رہ گئی ہوں۔ موت بالکل بروقت تھی۔ میں نے دل میں کہا۔ اور آپ تنہا نہیں ہیں۔ مرحوم کی ساری دولت آپ کی رفیق ہے اور غمگسار۔

''میں یہ چاہتی ہوں کہ محل کا مغربی حصہ فروخت کر دوں۔'' اس نے کہا۔ میں حیران رہ گیا بلکہ مجھے سخت صدمہ ہوا۔ میری تمام دفاعی تیاری دھری رہ گئی۔ میرا یہ خدشہ غلط ثابت ہوا کہ اس نے تیسری بار مجھے۔ خیر۔ مجھے ایسا سوچنا بھی نہیں چاہیے تھا۔ میں کیا اور میری اوقات کیا۔ اور میں کہاں کا رومیو ہوں۔ اب میں نے پیشہ ورانہ اخلاق کے ساتھ مہذب اور محتاط ہو کر بات کی ابتداء کی۔ ''یور ہائی نس۔ میں آپ کی رائے سے اتفاق نہیں کرتا۔''

''میں نے تمہیں رائے دینے کے لیے نہیں بلایا ہے۔ کیونکہ میں فیصلہ کر چکی ہوں تم صرف اتنا بتاؤ کہ تم یہ کام کر سکتے ہو یا مجھے کسی اور کو بلانا ہو گا۔'' اس نے خشک سرد لہجہ میں کہا۔ ایک بار پھر میں نے اپنا رویہ درست کیا۔ میرے لیے بھی یہ لاکھوں کا سودا تھا۔

''آئی ایم سوری پرنس۔ کیا مجھے آپ وہ حصہ دکھانا پسند کریں گی جسے آپ بیچنے کا ارادہ کر چکی ہیں۔

''ہاں۔'' اس نے اٹھتے ہوئے کہا۔ نہ جانے اس کے قرب کا احساس تھا یا ایک ہلکی سی مہک جو مجھے اس کے پیچھے چلتے ہوئے محسوس ہوئی کہ میں نے نہ دیکھا نہ سنا۔ میں اسے شاہانہ وقار کے ساتھ پر تمکنت انداز میں ایک ایک قدم اٹھاتے دیکھتا رہا۔ دبیز قالینوں پر رقص کے انداز میں اٹھتے قدم۔ جن کی ہر حرکت کے ساتھ کمر میں ہلکا سا بل پڑتا تھا۔ کمرے ہال بڑے بڑے گول کمرے۔ برجیاں اور محراب دار کھڑکیاں۔ رنگین شیشے والے بھاری دروازے اور نقش و نگار والی اونچی چھتیں۔ لمبے لمبے ستون۔ نہ جانے کیا کیا گزر گیا۔ اب بتاؤ اس کی زیادہ سے زیادہ قیمت کیا ہو سکتی ہے تم نے ہر چیز دیکھ لی ہے۔'' اس نے واپس پہنچ کر بیٹھتے ہوئے کہا۔

''جی ہاں۔'' میں نے جھوٹ بولتے ہوئے کہا۔ کیونکہ میں نے دیکھا تھا اس کی قیمت لگانا ناممکن تھا۔ ''میں نے سب دیکھ لیا ہے لیکن یور ہائی نس مجھے مکانوں کی فروخت کا تجربہ ہے۔ محلات کا نہیں۔''

''اوہ۔'' اس نے مایوسی سے کہا۔ ''تم ایک مدت سے یہ کام کر رہے ہو اور میں نے تمہاری شہرت کا تذکرہ بھی سنا ہے دوسرے لوگ تو بالکل اناڑی ہوں گے؟''

''بالکل قیمت کا اندازہ کرنے میں آپ کی کوئی مدد نہیں کر سکتا۔ آپ فرمائیے آپ کیا چاہتی ہیں۔'' اس نے کوئی جواب نہیں دیا۔ اس کا ذہن کشمکش میں مبتلا تھا اور زیادہ سے زیادہ رقم بھی اسے کم سے کم لگتی ہو گی۔ پتہ نہیں یہ عورت کیا چاہتی ہے۔ اشرفیوں میں دفن ہونا۔ اگر یہ فراعنہ مصر کے دور میں ہوتی تو اہرام بنوا کر ہر سکہ اپنے ساتھ لے کر بند ہو جاتی۔ میں نے سوچا۔ اس کا بس چلے تو شاید یہ سونا کھائے۔

''میں۔ میرا اندازہ ہے انتونیو کہ دس لاکھ تو ہونے ہی چاہئیں۔'' اس نے تذبذب کے ساتھ کہا۔ ''میں

کوشش کروں گا یور ہائی نس۔ روم میں بہت زیادہ لکھ پتی تو نہیں ہیں لیکن اس عمارت کے حسن اور ماحول کے پیش نظر۔''

''ہاں۔ حسن اور ماحول۔ تم گیارہ بارہ لاکھ سے شروع کرنا تو دس لاکھ پر سودا ہو سکے۔ ویسے میرا خیال ہے کہ میں نے بہت کم قیمت لگا دی ہے۔ خیر۔ مجھے زیادہ دولت کی ضرورت نہیں ہے۔ لوگ اچھے ہونے چاہئیں۔ بہتر ہے خاندانی رئیس ہوں۔ جو لوگ نئے نئے دولت مند بنتے ہیں وہ پائی پائی کے لیے جان دیتے ہیں۔'' ظاہر ہے جو کچھ میں سوچ رہا تھا وہ اس کے بالکل برعکس تھا اور دوسروں کے بارے میں جو کچھ وہ کہہ رہی تھی وہ سب سے زیادہ اس کے اپنے لیے درست تھا۔ دس لاکھ کی قیمت مناسب تھی۔ ''اچھا انتونیو۔'' اس نے بیٹھے بیٹھے ہاتھ بڑھا کر کہا۔ میں نے ذرا جرات سے کام لیتے ہوئے اس کے سامنے خم ہو کر ہاتھ تھاما اور چوم لیا۔ بظاہر تعظیم کے لیے مگر۔ اس کے مخملی لمس کی نرمی کی یاد اب بھی میرے ہونٹوں پر تازہ ہے۔ مجھے یاد ہے وہ اس حرکت پر حیران ضرور تھی۔

اس عورت کا حسن ایٹم بم سے زیادہ تباہ کن ہے۔ باہر نکل کر میں نے سوچا۔ اور یہ محل ایک طلسماتی قلعہ ہے جہاں ایک بار قید ہو جانے کے بعد صرف روح باہر نکل سکتی ہے۔ اپنے دماغی توازن اور جسم کو درست حالت میں باہر لے آنے پر مجھے بڑی خوشی ہوئی۔ باہر کی دنیا بالکل مختلف تھی۔ حقیقی دنیا۔



پہلا خریدار ایک خاندانی رئیس ضرور تھا مگر ورثہ میں اسے بہادری کے سوا سب کچھ ملا تھا۔ میں نے اشتہار میں صرف اپنا پتہ دیا تھا۔ کرولین کا نام سنتے ہی اس کا رنگ اڑ گیا۔ کچھ کہے بغیر اس نے ہیٹ سر پر رکھا چھڑی اٹھائی اور تیز تیز قدموں سے باہر نکل گیا۔ کھڑکی کے شیشے سے میں نے اسے کار میں بیٹھ کر ڈرائیور کو چلنے کا اشارہ کرتے دیکھا۔ اس کی بدحواسی اور گھبراہٹ پر ہنستے ہنستے میرا برا حال ہو گیا۔ غالباً تصور میں اس نے بھی اپنی بے عزت زندگی یا باعزت تدفین کا منظر دیکھا ہوگا۔ عمر رسیدہ آدمی تھا۔ اپنے سائے کو بھی موت کا فرشتہ سمجھتا ہوگا۔ شام کو میں نے یہ داستان سنانے کے لیے ہر ہائی نس کے محل کا رخ کیا۔ وہ میری بات خاموشی سے سنتی رہی۔ اس مرتبہ وہ ماتمی لباس میں نہیں تھی مگر خلاف توقع وہ مسکرائی تک نہیں۔ ''انتونیو۔ اس میں مزاح کا کیا پہلو ہے اور میرا خیال ہے کہ تمہیں ایسی بے مقصد باتیں مجھے بتانے کے لیے اتنی زحمت اٹھانے کی بھی کوئی خاص ضرورت نہیں۔'' اس کا مطلب یہ تھا کہ یہ فول۔ گٹ آؤٹ۔ چنانچہ میں ہاتھ ملائے بغیر اپنے آپ پر لعنت بھیجتا باہر نکل آیا۔ مجھے وہاں جانے کی ضرورت ہی کیا تھی۔ پھر مجھے اس پر غصہ آنے لگا۔ شہزادی کی اولاد۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ اس کا دماغ درست کر دیا جائے۔ خود فریبی پر مبنی یہ جھوٹا احساس تفاخر اس بیسویں صدی میں اور پھر میرے سامنے۔ میں کیا اس کا شوہر ہوں۔ یا غلام جو اسے برداشت کروں۔ ایک کاروباری مصلحت کے پیش نظر میں یور ہائی نس اور پرنس جیسے الفاظ استعمال کرتا تھا۔ ستائیس سیکنڈ بعد میں نے فیصلہ کیا کہ نفع گیا جہنم میں۔ آئندہ میں اسے صرف مادام کیرولین کہوں گا۔ یا کیرولین۔

لیکن دوسری بار میں ایک خریدار کے ہمراہ گیا جو دس لاکھ دے سکتا تھا مگر دیکھے بغیر نہیں چونکہ دس لاکھ میں میرا کمیشن بھی تھا اور خریدار کو شہزادی کے حقیقی شہزادی ہونے کا یقین دلائے بغیر سودے کے پکے ہونے کا امکان کم تھا اس لیے میں نے پھر ستائیس سیکنڈ میں فیصلہ کیا کہ میں اسے یور ہائی نس اور پرنس کہوں۔ مشکل یہ تھی کہ خریدار خاندانی رئیس نہیں تھا صنعت کار تھا۔ وہ حسن سے کم اور قیمت سے زیادہ متاثر ہوتا تھا اور روایتی صنعت کار کے انداز میں۔ کسی شہزادی کو خاطر میں نہ لاتا تھا۔ اس نے دیواروں کو

ٹھوک بجا کر دیکھا اور مایوسی سے سر ہلایا جیسے وہ اندر سے کھوکھلی ہیں۔ چھتوں کے نقش ونگار پر اعتراض کیا۔ رنگین شیشوں کا مذاق اڑایا۔ لیکن بالآخر دس لاکھ دینے پر تیار ہوگیا۔ ''مجھے اسے رہنے کے قابل بنانے کے لیے مزید دس لاکھ خرچ کرنے ہوں گے مس۔''

''پرنسس کیرولین۔'' میں نے تصحیح کی۔

''اوکے۔ پرنسس کیرولین۔'' وہ بیزاری سے بولا۔ لیکن پرنسس نے مجھے آنکھ سے اشارہ کیا۔

''انتونیو۔'' اس نے مجھے ایک طرف لے جا کر کہا۔ یہ خاندانی رئیس نہیں ہے اور اس کے پاس دولت کی فراوانی ہے۔ اگر وہ دس لاکھ مزید خرچ کرسکتا ہے تو قیمت بھی زیادہ یعنی بارہ لاکھ دے سکتا ہے۔ بارہ لاکھ۔'' وہ سرگوشی میں بولی۔

''مگر پرنسس۔'' میں نے حیرت سے کہا۔ ''آپ نے خود ہی دس لاکھ کہا تھا۔''

''وہ کم سے کم تھا۔ زیادہ سے زیادہ نہیں۔'' اس نے رکھائی سے کہا۔ میں مجبور ہوگیا۔ لیکن وہ بارہ لاکھ سنتے ہی بھڑک اٹھا۔ ''کیا بارہ لاکھ...... اس ...... میوزیم کے۔ راتوں رات اس کی قیمت دو لاکھ بڑھ گئی...... نو تھینک یو۔'' وہ سلام دعا کیے بغیر روانہ ہوگیا۔

''خاصا کم ظرف آدمی تھا۔'' شہزادی نے اس کے جانے کے بعد کہا۔ ''حسن کے احساس سے عاری۔ اس نے وہ ڈبہ نما عمارتیں دیکھی ہیں جو...... خیر جانے دو...... وہ اگر بارہ لاکھ بھی دیتا تو میں اسے محل میں نہ گھسنے دیتی۔ وہ محل کا ستیاناس کردیتا۔ اب تم بارہ لاکھ کی بات کرنا۔ مجھے اندازہ ہوگیا ہے کہ میں نے شروع میں قیمت کم لگائی تھی۔''

ایک ہفتہ اور گزر گیا۔ کوئی فون تک نہیں آیا۔ دوسرے ہفتے کے آغاز میں ایک رولز رائس میرے دفتر کے سامنے رکی۔ مضحکہ خیز وردی میں ملبوس خادم نے دروازہ کھولا اور ایک شخص برآمد ہوا۔ جو سو فیصد خاندانی رئیس تھا۔ اس کی گفتگو کا انداز نشست و برخاست سب اس کے خاندانی جدی پشتی رئیس ہونے کی گواہی دیتے تھے۔ میں نے اسے بارہ لاکھ بتائے جسے سن کر وہ تھوڑی دیر تک میز پر انگلیوں سے طبلہ بجاتا رہا۔ پھر سر کے اشارے سے اس نے رضامندی اور روانگی کا اشارہ کیا۔ دروازے پر وہی دربان تھا جس نے روز اول میرے ساتھ مفرور مجرم کا سا سلوک کیا تھا لیکن میری باقاعدہ آمدورفت کے بعد اس کا رویہ زیادہ خراب نہیں رہتا تھا۔ رولس رائس سے وہ خاصا متاثر ہوا اور ہم سیدھے اندر گئے۔

رسمی گفتگو کے بعد جو شائستگی کی انتہائی حدود کو چھوتی تھی محل کے مغربی حصے کا معائنہ شروع ہوا۔ خاندانی رئیس نے ابتدا ہی غلط کی۔ وہ چلتے چلتے اچانک رک گیا۔ ''یور ہائی نس۔'' اس نے کہا۔ ''کیا یہ ممکن نہیں کہ آپ مشرقی حصے کی فروخت کے امکانات پر توجہ فرمائیں۔

''آپ کا مطلب ہے جس میں۔ میں خود رہتی ہوں۔'' کیرولین نے حیرت سے کہا۔

''جی ہاں۔ دراصل طلوع آفتاب کا منظر۔'' اس نے ہاتھ ملتے ہوئے ندامت سے کہا۔

''وہ آپ مغربی حصے کے برج سے بھی دیکھ سکتے ہیں اور غروب آفتاب بھی تقریباً ویسا ہی ہوتا ہے۔'' کیرولین نے کہا ویسے میں نے کافی دن سے طلوع آفتاب نہیں دیکھا۔ پہلے ایسا ہی ہوتا تھا۔''

''اچھا؟'' اس نے یوں کہا۔ جیسے یہ انکشاف اس پر پہلی مرتبہ ہوا ہے لیکن اس کا مطلب یہ نہ تھا۔ میں مودب خادم کے ساتھ چل رہا تھا اور وہ دونوں بے حد رسمی تکلفات کے ساتھ گفتگو کرتے ہوئے آگے رواں تھے۔ خادم خود کو میرا ہم مرتبہ سمجھ کر خوش تھا۔ بالآخر خاندانی رئیس نے بارہ لاکھ کی رقم کو بڑے انکسار کے ساتھ قبول کیا۔

''یور ہائی نس۔ قیمت کوئی چیز نہیں۔ اس رقم سے میں بہت بڑی کوٹھی بنوا سکتا ہوں۔'' کن ویو سے بھی بڑی جس میں آج کل میں رہتا ہوں شاید آپ نے

دیکھی ہوگی۔ اس نے جائے وقوع بتائے بغیر کہا۔
''خوب خوب۔ تو آپ وہاں رہتے ہیں۔ بڑی حسین کوٹھی ہے۔'' کیرولین نے کہا۔
''یور ہائی نس۔ کوٹھی اور محل میں بڑا فرق ہے۔ محل کا شمار نوادرات میں کیا جاسکتا ہے۔ محل کا ایک ماضی ہوتا ہے اس میں ایک وقار ہے۔ تمکنت ہے۔ گو دولت کے اعتبار سے دونوں ایک بھی ہوسکتی ہیں لیکن ایک شہزادی اور ایک فلم اسٹار میں جو فرق ہے وہی ایک محل اور۔''
''آپ قدر دان معلوم ہوتے ہیں۔ خاندانی رئیس پہچانے جاتے ہیں۔'' کیرولین نے عیاری سے کہا۔ بظاہر دونوں ایک دوسرے کی تعریف کر کے خوش تھے مگر اسی وقت ہر ہائی نس نے معذرت چاہی اور اٹھ کر دوسرے کمرے میں چلی گئی لیکن پردے کی اوٹ سے اس نے مجھے اشارہ کیا۔ اسی وقت میں نے رئیس کو خادم سے سرگوشی کرتے دیکھا۔
''انتونیو۔ یہ خوشامد پسند رئیس خاصا بیوقوف ہے۔ چودہ بلکہ پندرہ لاکھ کی بات کرو۔''
''مادام کیرولین۔ یہ میرے کاروباری اصولوں کے خلاف ہے۔'' میں نے بے رخی سے کہا۔ اس نے میرے ''مادام'' کہنے کو نظر انداز کر دیا۔ ''انتونیو۔'' اس میں تمہارا بھی فائدہ ہے۔
''میں اس قسم کے فائدے کا قائل نہیں۔''
''پلیز؟'' مجھے اپنے کانوں پر دھوکا ہوا۔ میری ساری مزاحمت ختم ہوگئی۔ میں پگھل گیا۔ خاندانی رئیس نے تین لاکھ کا صدمہ خاصے صبر و تحمل سے برداشت کیا۔ اس کے ماتھے پر ایک شکن یا ناگواری کا سایہ تک نہ تھا۔ ''یور ہائی نس۔'' اس نے سرخم کرتے ہوئے کہا۔ ''میں عرض کر ہی چکا ہوں کہ قیمت کوئی چیز نہیں۔'' اس نے محل کی شان میں مزید قصیدہ خوانی کرتے ہوئے اجازت چاہی۔ ''میں بے حد شرمندہ ہوں۔ سردست بارہ لاکھ لے کر حاضر ہوا تھا۔ آپ کو پھر زحمت دوں گا۔'' میں انہیں جاتے ہوئے دیکھتا رہا۔

''مجھے معلوم تھا کہ وہ سراسر بکواس کر رہا ہے۔ مودب خادم اور وہ دونوں فراڈ لگتے تھے۔ انتونیو۔ مایوس ہونے کی ضرورت نہیں۔ وہ پندرہ لاکھ لے کر آئے گا۔'' پرنس نے کہا۔
''میرا خیال ہے کہ وہ محض ایک کامیاب اداکار ہے۔ تمہاری طرح۔''
''شٹ اپ۔ تم کبھی کبھی حد سے بڑھ جاتے ہو۔'' پرنس نے خفگی سے کہا۔
''تم نے اس کی وہ کوٹھی دیکھی ہے، جس کا وہ نام لے رہا تھا۔'' میں نے کہا۔
''نہیں۔ مگر وہ کہہ رہا تھا تو ضرور ہوگی۔''
''روم میں اس نام کی کوئی کوٹھی نہیں۔'' میں نے اٹھتے ہوئے کہا۔
''نہ ہو۔ مگر اس جیسے احمق اور بھی ہوں گے۔ تم اشتہار میں ترمیم کر دو۔''
دس دن تک برائے فروخت کے کالم میں پندرہ لاکھ کی رقم کے محل کا اشتہار آتا رہا۔ ڈھائی ہزار اور خرچ ہوگئے۔ میری اپنی جیب سے۔ میں نے اس عرصے میں کم سے کم دس مکان فروخت کر دیئے اور محل کا خیال بھی میرے ذہن سے اتر گیا۔ پھر مجھے ڈاک سے ایک خط ملا۔ مشرق وسطیٰ کی ایک ریاست کا ولی عہد محل خریدنا چاہتا تھا اور ہوائی جہاز سے روم پہنچ رہا تھا۔ خلاف امید وہ تعلیم یافتہ اور خاصا مہذب ثابت ہوا۔ اس نے محل دیکھنے پر بھی اصرار نہیں کیا۔ ''مجھے اس کا نقشہ سمجھا دو۔''
''یور ہائی نس۔ جا کر دیکھنے میں کم وقت لگے گا۔''
''اچھا۔'' وہ اٹھ کھڑا ہوا۔ ''چلو۔''
کیرولین سے جب میں نے تعارف کرایا تو وہ ذرا سا چونکا۔ ''پرنس؟ کیا آپ کے والد بادشاہ تھے۔ میرا مطلب ہے...... ہیں۔''
''جی......؟ جی نہیں۔'' کیرولین نے ذرا بے چینی سے کہا۔

"تو آپ کے دادا۔اوہ۔آپ جلاوطنی کی زندگی گزار رہی ہیں۔ میں سمجھ گیا۔ مجھے آپ کی مدد کر کے خوشی ہوگی۔" اس نے سر ہلاتے ہوئے رضامندی کا اظہار کیا۔ یہ ہمدردی اسے مہنگی پڑی۔

"یور ہائی نس۔آپ نقد پندرہ لاکھ لیں گی۔ یا چیک کی صورت میں۔اگر آپ چاہیں تو میں پونڈ یا ڈالر بھی دے سکتا ہوں۔سوئس اکاؤنٹ میں۔"

"دراصل۔" کیرولین نے مجھ سے نظریں ملائے بغیر کہا۔"اشتہار کا مضمون چھپنے کے بعد مجھے اٹھارہ لاکھ کی پیشکش موصول ہوچکی ہے۔ چنانچہ آپ بیس لاکھ دے سکتے ہوں تو۔"

"نو پلیز۔ میں اصول پرست آدمی ہوں۔آپ اٹھارہ لاکھ کی پیشکش قبول کر لیں۔ پیسے کی بات نہیں۔ جو پہلے آیا اس کا حق پہلے ہے۔کیوں مسٹر انتونیو۔" میں احمقوں کی طرح نہ سر کو دائیں بائیں ہلا سکتا تھا نہ اوپر نیچے۔زبان ہلانے کا تو سوال ہی نہ تھا۔"یور ہائی نس۔آپ سے مل کر خوشی ہوئی۔" اس نے مصافحے کے لیے ہاتھ بڑھاتے ہوئے کہا۔"میں ہلٹن میں ٹھہرا ہوں سوئیٹ نمبر چوبیس۔اور شاید ایک ہفتہ ٹھہروں گا۔"

میرا دل چاہتا تھا کہ میں اپنے کپڑے پھاڑ لوں اور دیوار میں سر دے ماروں۔

"کیرولین۔تمہارا دماغ خراب ہے۔اس سے زیادہ تمہیں کوئی الو کا پٹھا نہیں دے سکتا۔ وہ شریف آدمی تھا۔ اس نے غریب سمجھ کر تم پر ترس کھایا۔ زرمبادلہ۔میرے خدا۔"

"انتونیو۔ یہ محل میرا ہے تمہارا نہیں۔ میں اسے جس قیمت پر چاہوں فروخت کروں۔" اس نے برہم ہوتے ہوئے کہا۔

"بالکل، یہ محل بھی تمہارا ہے اور اس کا سودا کرنا بھی تمہارا کام ہے۔ میں اس چکر میں نہیں پڑتا۔اس سے میری کاروباری ساکھ کو نقصان پہنچتا ہے۔ مجھے ساڑھے چار ہزار ادا کر دو جو میں نے اشتہار پر خرچ کیے ہیں۔خدمات گئیں جہنم میں۔" میں نے مشتعل ہوتے ہوئے کہا۔

"انتونیو ڈیئر۔" اس نے مسکرا کر کہا۔"تم بلاوجہ اپنا خون جلا رہے ہو وہ آئے گا۔" وہ مجھے آنکھ مار کر مسکرائی۔ میں ہکا بکا رہ گیا۔میرا سارا غصہ جھاگ کی طرح بیٹھ گیا۔وہ اٹھ کر میرے قریب آبیٹھی۔"تم کاروبار کیسے کرتے ہو۔آدمی کو غصے پر قابو رکھنا چاہیے۔" اس نے تھوڑی پکڑ کر میرا چہرہ اپنی طرف کرتے ہوئے کہا۔ادھر دیکھو۔ میری طرف۔تم ناراض ہو مجھ سے۔"

ناراض ہونے کا سوال ہی نہ تھا۔حیرانی کی بات یہ ہے کہ میں شرمندہ تھا اور مسکرا رہا تھا۔خفت سے۔"آئی ایم سوری۔پرنس۔" میں نے کہا۔

"کیرولین۔ جیسے تم نے ابھی کہا تھا۔صرف کیرولین۔کم آن۔"

"سوری کیرولین۔" میں نے بڑی مشکل سے کہا اور اس کے چنگل سے نکلنے کے لیے ہاتھ پاؤں مارنے لگا۔ میرے ہوش وحواس ابھی باقی تھے اور مجھے یاد تھا کہ اس عورت نے دوسرے لوگوں کا کیا حشر کیا ہے۔



لیکن اس سے بھی زیادہ حیرت مجھے اس وقت ہوئی جب مشرق وسطیٰ کے اس شہزادے نے مجھے فون کیا۔

"انتونیو۔کیا محل بک گیا۔"

"نہیں ابھی نہیں۔ وہ آپ سے جھوٹ بول رہی تھی۔اٹھارہ لاکھ کا کوئی گاہک نہیں۔"

"کوئی بات نہیں۔ بڑا خوبصورت جھوٹ تھا۔ ایک حسین عورت کا جھوٹ۔" وہ ہنسا۔"میں شام کو آرہا ہوں۔"

شام کو میں پھر اس کے محل میں تھا۔میں نے اسے مطلع کر دیا تھا۔"یور ہائی نس۔اگر آپ کا خریدار۔میرا مطلب ہے کہ آپ کے محل کا خریدار آیا نہیں ہے تو مجھے

آپ کی قیمت منظور ہے۔'' اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔ بالکل سنجیدہ رہی لیکن اس شام کا حسن قیامت تھا۔ اس نے تیاری میں خاصا اہتمام کیا تھا۔ شہزادے اور شہزادی دونوں کا موڈ رومانی تھا۔ میں نے محسوس کیا کہ میں کباب میں ہڈی بن گیا ہوں۔ وہ دونوں مجھے نظر انداز کیے ایک دوسرے کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے بیٹھے تھے۔

''یور ہائی نس۔ اگر آپ لوگوں کا اتفاق رائے ہو گیا ہے تو مجھے اجازت دیجیے۔''

''لیکن انتونیو۔ وہ دوسرا شخص بھی آنے والا ہے جس نے بائیس لاکھ لگائے تھے۔ میں اس سے کیسے بات کروں گی۔'' اس نے معصومیت سے کہا۔ پرنس مسکرایا۔ ''میں کرلوں گا۔''

''یور ہائی نس۔۔۔ دراصل میں بالکل اناڑی ہوں۔ میں نے پائیں باغ کو تو شامل ہی نہیں کیا تھا۔'' اس نے میری توجہ اس طرف دلائی۔ اس نے پوچھا کہ کیا قیمت میں باغ بھی ہے تو مجھے یاد آیا۔'' میں اس کی جھوٹ بولنے کی مہارت پر حیران رہ گیا۔

شہزادی راضی تھی ولی عہد راضی تھا تو قاضی کیا کرسکتا تھا۔ ''پچیس لاکھ کے بارے میں کیا خیال ہے۔'' اس نے بے تکلف ہوتے ہوئے کہا۔ لیکن کیرولین اپنے ناخونوں کی پالش دیکھتی رہی۔ ''اس نے باغ کے دو لاکھ لگائے تھے اور آپ تین لاکھ لگا رہے ہیں۔'' ''فرق کیا ہوا۔'' میں نے ولی عہد کی طرف دیکھا اور اسے آنکھ کے اشارے سے منع کیا۔ غضب خدا کا۔ وہ اسے لوٹ رہی تھی کنگال کررہی تھی اور میری آنکھوں کے سامنے مجھے بے وقوف بنا کر ایک تیر سے دو شکار۔ ولی عہد نے جواب میں مجھے آنکھ مار کر خاموش رہنے کا اشارہ کیا۔ ''یور ہائی نس۔ بزنس کے معاملے میں میرا تجربہ بھی نہ ہونے کے برابر ہے۔'' اس نے قہقہہ لگایا۔ ''کیوں نہ ہم باغ کو دیکھ کر طے کرلیں۔''

''یہی مناسب معلوم ہوتا ہے۔'' کیرولین نے کھڑے ہوتے ہوئے کہا۔ مجھے اس ولی عہد کے انجام پر ترس آیا۔ باغ اور چاندنی رات اور کیرولین اگر وہ اپنی ریاست بھی ہار جائے تو کوئی تعجب کی بات نہیں۔ وہ دونوں چلے گئے۔ شہزادہ آکسفورڈ کا تعلیم یافتہ تھا۔ اس نے روایتی شاہانہ انداز میں شہزادی کا ہاتھ تھام لیا۔ قاضی وہیں بیٹھا رہ گیا۔

آہستہ آہستہ ترس کا جذبہ رقابت میں تبدیل ہونے لگا۔ تبدیلی کا یہ عمل کیسے ہوا۔ میں نہیں بتا سکتا۔ غالباً یہی وہ لمحہ ہوتا ہے جب آدمی عقل گھاس چرنے جاتی ہے اور وہ بے بس رہ جاتا ہے۔ میرے سارے وجود میں رقابت کی آگ جلنے لگی۔ بیشک میں ولی عہد کی طرح دولت مند نہیں تھا۔ کیرولین سے محبت۔ محبت؟ مجھے یوں محسوس ہوا جیسے میں محل کے صوفے پر نہیں روم کی کسی سڑک کی فٹ پاتھ پر بیٹھا ہوں۔ محبت اس سے۔ سب کچھ جانتے ہوئے بھی؟ میرے دو ٹکڑے ہوگئے۔ ایک وہ جو مجھے کہتا تھا کہ میں عقل سے کام لوں۔ شہزادی ایک طوائف ہے اور شہزادہ اسے خریدے گا۔ ہر قیمت پر۔ دوسرا وہ جو کہتا تھا نہیں۔ وہ ولی عہد کو بے وقوف بنا رہی ہے۔ صرف اس کی دولت کے زیادہ ہے محبت کے لیے ہم دونوں برابر ہیں۔ بے شک وہ خوبرو ہے صحت مند ہے۔ ذہنی جسمانی طور پر۔ مگر میرے دل اور دماغ میں کشمکش جاری تھی۔ ہاں۔ نہیں۔ ہاں۔ نہیں۔ بالآخر دل نے دماغ کو شکست دی اور میں اٹھ کر کھڑکی سے پائیں باغ میں دیکھنے لگا۔ میرے سامنے کسی فلم کا رومانی سین آگیا۔ شہزادی سنگ مرمر کی بنچ پر بیٹھی تھی۔ بنچ کے قریب' اور شہزادہ ایک پیر بنچ پر رکھے اس پر جھکا ہوا تھا پھر اس نے شہزادی کو ہاتھ پکڑ کر اٹھایا اور اس کی کمر میں ہاتھ ڈال دیا۔ میری طبیعت گرم ہوگئیں۔ میرے کانوں میں سیٹیاں سی بجنے لگیں۔ جذبات نے مجھے اندھا کردیا۔ اگر کہیں میری جیب میں پستول ہوتا تو ولی عہد کوئی اور دنیا میں پہنچ جاتا۔ کہتے ہیں جس کو

عشق۔ خلل ہے دماغ کا۔ پھر وہ دونوں آہستہ آہستہ بڑھنے لگے۔ مجھے ان کی گفتگو کا ایک لفظ بھی نہیں سنائی دے رہا تھا میں اندازہ کرسکتا تھا کہ وہ ایک دوسرے سے کیا کہہ رہے ہوں گے۔

''اگر آپ لوگ باغ کا ملاحظہ کر چکے ہوں تو ہم بزنس کی بات کریں میں نے اچانک ان کے پیچھے پہنچ کر کہا۔ شہزادہ چونک کر پلٹا۔ کیرولین بے نیازی سے کھڑی رہی۔

''بزنس؟'' ولی عہد نے سنبھلتے ہوئے کہا۔ ''کیسا بزنس۔''

''محل کی خریداری کا۔ شاید آپ کو یاد ہو آپ محل خریدنے آئے تھے۔'' میں نے طنز سے کہا۔

''اوہ......'' وہ ہنسا۔ ''وہ تو ہو چکا۔ کیوں کیرولین۔'' کیرولین نے مجھ سے نظریں چراتے ہوئے آہستہ سے اقرار میں سر ہلایا۔ ''کتنے میں......'' میں نے حیرت سے پوچھا۔

''پچاس لاکھ میں۔'' ولی عہد نے اطمینان سے کہا۔

''کیا......؟'' میں نے چلا کر کہا۔ ''پچاس لاکھ؟''

''ہاں ......تمہارا کمیشن کتنا ہوا۔ دو فیصد؟'' ولی عہد نے کہا۔

''پانچ فیصد۔ یہ سودا مجھے بہت مہنگا پڑا ہے۔'' ''ڈھائی لاکھ۔''

''آل رائٹ آل رائٹ۔'' ولی عہد نے جیب سے چیک بک نکالی اور گھٹنے پر رکھ کر رقم لکھی۔ ''صبح میرے سکرٹری سے مل لینا۔ وہ تمہیں اپنے ہمراہ لے جائے گا۔''

''مجھے نقد چاہئے۔'' میں نے چیک کو پھاڑ کر پرزے پرزے کرتے ہوئے کہا۔ ولی عہد کچھ دیر میری صورت دیکھتا رہا اور میں نے بے خوفی سے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے کھڑا رہا۔ ہم دونوں دشمنوں کی طرح آمنے سامنے یوں کھڑے تھے جیسے ہم ڈوئل لڑنے پر آمادہ ہیں۔ پھر ولی عہد مسکرایا۔

''او کے۔ صبح تمہیں نقد مل جائے گا۔ انکم ٹیکس کا چکر ہوگا؟'' ''خیر اب تم جا سکتے ہو۔'' ''میں اس وقت کیا چاہتا تھا۔ یہ بالکل واضح ہے میں اسے قتل کرنا چاہتا تھا مگر میں واپس پلٹا۔'' ''ڈرائیور تمہیں چھوڑ آئے گا۔ تھینک یو۔'' ولی عہد نے کہا۔

''میں پیدل جانا بہتر سمجھتا ہوں۔'' میں نے جارحانہ انداز میں کہا۔ مگر وہ دونوں آگے روانہ ہو چکے تھے۔ دربان نے مجھے بے حد مشتبہ نظروں سے دیکھا۔ میں اس وقت لڑنا چاہتا تھا۔ ''کیا دیکھ رہے ہو۔'' میں نے چیخ کر کہا۔ ''یو فول۔ تمہاری اس شہزادی نے۔ اس طوائف نے مجھے نکالا نہیں ہے۔ میں اپنی مرضی سے جا رہا ہوں۔ اور میری جیب میں نہ سونے کا چمچہ ہے اور نہ ایش ٹرے...... سمجھے؟''

خلاف توقع اس نے بھی گولی نہیں چلائی۔ ساری دنیا نے جیسے نہ لڑنے کی قسم کھالی تھی اپنے گھر تک پہنچتے پہنچتے میری حالت غیر ہوگئی۔ تصور میں میرے سامنے جو منظر تھا وہ کسی فلم کے سنسر شدہ ٹکڑے کی طرح تھا۔ دو گھنٹے تک شراب کی مدد سے میں نے اعصاب سے جنگ جاری رکھی اور بالآخر ان پر قابو پانے میں کامیاب ہوگیا۔ اب میں صورت حال کا صحیح تجزیہ کرسکتا تھا۔ حقیقت یہ تھی کہ میں کیرولین کے ذاتی معاملات میں کہیں نہ آتا تھا۔ اس کے مقابلے میں فقیر تھا اور ولی عہد کو مغربی حصے کے مالک کی حیثیت حاصل ہو چکی تھی۔ رڈیارڈ کپلنگ لاکھ کہے مشرق مشرق ہے۔ اور مغرب مغرب مگر مشرق اور مغرب ملنا چاہتے تھے۔ اور انہیں کوئی روک سکتا تھا۔ صبح مجھے ڈھائی لاکھ مل جائیں گے۔ مجھے خدا کا شکر ادا کرنا چاہئے کہ اس نے کنگال کرنے کے لیے ولی عہد کا انتخاب کیا۔ اس کے بعد میں اطمینان سے سوگیا۔ مجھے الٹے سیدھے خوابوں نے ضرور پریشان کیا۔ کبھی میں دیکھتا تھا کہ شہزادے کا سر ہرن اور شیروں کے سروں کے درمیان محل کے ہال میں لگا ہوا ہے۔ کبھی یہ نظر آتا تھا کہ مجھے پھانسی دی جا رہی ہے اور میں خود ہی جلاد ہوں۔

ڈھائی لاکھ ملنے سے پہلے صبح مجھے کیرولین کا فون ملا۔ جیسے کسی نے بارود میں چنگاری ڈال دی۔ معلوم نہیں میں نے اسے کیا کہا۔ وہ سنتی رہی دس منٹ میں میرے دل کا سارا ابخار نکل گیا۔ ''کہہ چکے؟'' اس نے ہنستے ہوئے کہا۔ ''رات کو نیند آئی یا نہیں؟'' میری حالت اس غبارے کی سی تھی جس کی ہوا نکل گئی ہو۔ ''تمہاری رات کیسی گزری۔''

''بہت اچھی۔'' کیرولین نے کہا۔

''اور شہزادے کی......؟''

''مجھے نہیں معلوم۔ وہ تمہارے جانے کے بیس منٹ بعد چلا گیا تھا۔''

''وہ تمہارے ساتھ......''

''تمہارا دماغ چل گیا ہے۔ جو تم ایسی باتیں سوچتے ہو۔ میں......صرف تمہیں پسند کرتی ہوں۔'' زوم۔ جیسے کسی نے مجھے راکٹ پر بٹھا کر فائر کر دیا۔ میں بادلوں سے بھی اوپر نکل گیا۔

''انتونیو۔'' اس نے ملائم شیریں آواز میں مزید مٹھاس پیدا کرتے ہوئے کہا۔ ''تم شام کو آ رہے ہو؟'' یہ سوال نہیں تھا۔ حکم ملا تھا کیونکہ اس کے ساتھ ہی فون بند ہو گیا۔

شام کو جب میں محل کے دروازے پر پہنچا تو دربان مجھے دیکھ کر حیران ہوا کہ میں پاگل خانے سے کیسے بھاگ آیا۔ مگر وہ بڑی خوبصورت بڑی قاتل شام تھی جس نے میری تباہی کو میرا مقدر بنا دیا۔ کھانا ختم ہونے کے بعد پائیں باغ میں سیر کرتے ہوئے وہ اسی بنچ پر بیٹھ گئی جو فوارے کے قریب تھی۔ میں بنچ پر پاؤں رکھ کر اس پر جھک گیا اور اس کے وجود کی مہک کو جذب کرنے لگا۔ منظر گزشتہ شب کا تھا مگر ولن کی جگہ ہیرو نے لے لی تھی۔

''انتونیو ڈارلنگ۔ مشرق وسطیٰ کا وہ ولی عہد۔ تم نے دیکھا ہوگا۔ وہ محل کی بجائے مجھے خریدنے کے در پے ہے۔''

''ونکٹ......'' جیسے ہدایت کار نے کہا۔ رومانی سین کا خاتمہ ہو گیا۔ ولن کا ذکر کہاں سے آ گیا۔ ''کل اس نے میرا ہاتھ چومنے اور چند منٹ کمر میں ہاتھ ڈال کر باغ کی سیر کرنے کے پچیس لاکھ ادا کر دیئے۔ دراصل یہ مشرق وسطیٰ کے سارے شیوخ اور ریاستوں کے مالک اور ولی عہد۔ پچاس لاکھ کیا پچاس کروڑ بھی ادا کر سکتے ہیں۔ انہیں کون سی محنت کرنی پڑتی ہے۔ تیل دوسرے نکالتے ہیں۔ یہ کمیشن کھاتے ہیں۔''

''تمہارا مطلب ہے میں اسے جا کر کہوں کہ وہ پچاس کروڑ ادا کرے۔'' میں نے دماغ کو ٹھنڈا رکھتے ہوئے کہا۔

''پچاس نہیں۔ صرف ایک کروڑ۔ اتنے تو اس کی ایک جیب میں پڑے رہتے ہوں گے۔''

''اور اس نے ایک کروڑ ادا کر دیئے پھر۔ دو کروڑ یا دس کروڑ؟''

''نہیں پھر بات ختم۔ ایک کروڑ پر محل اس کا۔ میرا تمہارا شریفانہ عہد۔'' اس نے ہاتھ بڑھاتے ہوئے کہا۔ کسی ارادے کے بغیر میں نے وہ ہاتھ تھام لیا مگر اس کو چومنے کی خواہش مر چکی تھی۔

''اچھا......'' میں نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا۔

''لیکن تمہیں ذرا ہشیاری سے کام لینا ہوگا۔ وہ مجھ سے شادی کرنا چاہتا ہے۔ شادی کیا' اپنے حرم میں داخل کرنا چاہتا ہے۔ تم میری طرف سے ایک پیغام لے جاؤ۔ کہو پرنس شادی کے لیے تیار ہے۔'' میں نے سوالیہ نگاہوں سے دیکھا۔

''بشرطیکہ ہاں' یہی بات تمہیں کہنی ہے' بشرطیکہ وہ ایک کروڑ ادا کر دے۔ اسے کہنا کہ وہ شہزادی ہے کوئی عام عورت نہیں۔ وہ تحفظ چاہتی ہے۔''

''پرنس۔ تم نے اپنی قیمت بہت کم لگائی ہے۔ صرف پچاس لاکھ محل کے مغربی حصے کے برابر۔'' اس کا چہرہ زرد پڑ گیا۔ ''انتونیو۔ سمجھنے کی کوشش کرو۔''

''میں سمجھ چکا ہوں۔ تم ایک طوائف ہو۔ بلکہ طوائف سے بھی بدتر۔ کیونکہ وہ اپنے جسم کا سودا کرتی

ہے اس پر قائم رہتی ہے۔ لیکن تمہاری ہوس کی کوئی انتہا نہیں ہے۔ اگر وہ ایک کروڑ دے گا تو تم دو مانگو گی۔ وہ دو دے گا تو دس کا مطالبہ کرو گی۔ اور تم چاہتی ہو میں دلال کا کام کروں۔ ایک طوائف کے دلال کا۔'' غصے سے میرے ہاتھ کانپنے لگے۔

''انتونیو...... انتونیو۔'' وہ روتے ہوئے بولی۔ ''ایسی باتیں مت کرو۔ یہ ٹھیک ہے کہ میں دولت پر بھی مرتی ہوں۔'' اس نے میرے گلے میں اپنے بازو حمائل کر دیئے اور میرے سینے پر اپنا سر رکھ کر سسکیاں لینے لگی۔ میرا وجود برف کی طرح پگھل کر بہہ گیا۔ اس کے جسم کی مدہوش کن حرارت سے۔

''کیرولین۔'' میں نے اس کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے اسے چومتے ہوئے کہا۔ ''میں جاؤں گا تمہارے لیے۔ ایک نہیں دو کروڑ لے آؤں گا۔'' ستارے توڑ لاؤں گا۔ پہاڑ کاٹ دوں گا۔ وغیرہ میں نے اس کے آنسو صاف کیے اور ہم اندر آگئے۔ وہ کچھ خجل تھی اور میں گیس کے غبارے کی طرح پھر ہوا میں اڑ رہا تھا۔ ''انتونیو۔ اسے کہنا نقد لائے۔''

اگلے صبح میں ہلٹن ہوٹل کے سوئیٹ نمبر چوبیس میں پہنچا تو پرنس ناشتا کر رہا تھا۔ وہ اتنی صبح مجھے دیکھ کر حیران رہ گیا۔ اسے میں کیا بتاتا کہ میں نے ساری رات کانٹوں پر بسر کی ہے۔ ''انتونیو۔ کیا پیغام لائے ہو۔'' اس نے بے تابی سے کہا۔ مجھے جھٹکا سا لگا۔ کیا وہ کسی پیغام کے انتظار میں تھا۔

''وہ تیار ہے۔ آپ شام کو دو کروڑ نقد لے کر آجائیں۔'' اس نے اچھل کر مجھے گلے لگا لیا۔ ''دو کروڑ۔ میں دس کروڑ لے آؤں گا۔ یقین کرو میں نے اس جیسی حسین عورت آج تک نہیں دیکھی۔ اس کا حسن قیامت کا اس کا جسم۔ سرسبز وادیاں۔ گنگناتے چشمے۔ آتش فشاں پہاڑ۔'' اس نے ہاتھوں کی حرکت سے لہریں پیدا کرتے ہوئے کہا۔ ''وہ ذہین ہے۔ شائستہ ہے۔ دولت مند ہے اور شہزادی ہے۔ اوہ انتونیو۔ کیا اتنی صفات تم نے کسی عورت میں یکجا دیکھی ہیں۔ نہیں کہیں نہیں۔ میں دنیا گھوم چکا ہوں۔'' ظاہر ہے وہ پاگل ہو چکا تھا اور اس کا مرض ناقابل علاج تھا۔ مگر مجھے اس پر ترس آیا۔ وہ اتنی بلندی پر اڑ رہا تھا اور اسے سر کے بل زمین پر گرنا تھا۔ جیسے جہاز گرتے ہیں اور پاش پاش ہو جاتے ہیں۔

شام کو وہ دو کروڑ لے آیا۔ نقد۔ شہزادی نے رقم تجوری میں رکھ دی۔ جو پہلے ہی سے اوپر تک بھری ہوئی تھی۔ چابی کو اس نے اپنے بلاؤز میں چھپا لیا۔ رات کے کھانے کے بعد ہم رخصت ہوئے۔ پرنس بڑی ترنگ میں تھا۔ راستے میں اس نے اپنی کار روک دی۔ ''انتونیو۔ میں تمہیں زیادہ دیر بے خبر نہیں رکھ سکتا۔ مجھے کسی نہ کسی کو یہ خبر ضرور سنانی ہے۔ ورنہ میرا دل پھٹ جائے گا۔ کل ہم شادی کر رہے ہیں۔'' میں خاموش رہا۔ بے چارہ کاٹھ کا الو! الو کا پٹھا۔

''پرنس!'' میں نے کہا۔ ''وہ تم سے شادی نہیں کرے گی۔'' وہ بے اختیار ہنسا۔ ''اور کیا تم سے کرے گی؟'' اس جملے سے میری انا کو ٹھیس پہنچی۔ ''ہاں۔ وہ صرف تمہاری دولت چاہتی تھی۔ وہ اسے مل چکی ہے۔ اس نے مجھے خود بتایا ہے۔''

اوہ مائی گاڈ'' ہنستے ہنستے اس کا برا حال ہو گیا۔'' اور جانتے ہو اس نے تمہارے بارے میں مجھے کیا بتایا۔ انتونیو۔ وہ تمہیں الو بنا رہی ہے۔ اس نے مجھ سے کہا ہے کہ یہ غریب کمیشن ایجنٹ خود فریبی میں مبتلا ہے۔ اس نے مجھ سے ابھی کہا ہے کہ میں تمہیں گھر چھوڑ کر واپس آجاؤں۔'' میرا جہاز جو بادلوں سے اوپر اڑ رہا تھا زمین سے ٹکرایا اور پاش پاش ہو گیا۔

پرنس نے مجھے میرے گھر پر اتار دیا۔ سیٹی بجا کر لوفروں کے انداز میں آنکھ ماری اور گاڑی فراٹے بھرتی سڑک کا موڑ کاٹ کر غائب ہو گئی۔

گھر میں داخل ہو کر میں نے وہسکی کے دو جام پیئے اور سگریٹ سلگا کر کرسی پر بیٹھ گیا۔ میں وہی پرانا

انتونیو تھا۔ میری عقل قوت فیصلہ اور قوت عمل۔ میرے پرانے رفیق۔ سب واپس آگئے۔ بس۔ اور کوئی راستہ نہیں۔ کوئی سزا نہیں۔ سوائے اس کے کہ میں ان دونوں کو بستر میں ہی گولی ماردوں۔ میز کی دراز سے میں نے پستول نکال کر چھ گولیاں بھریں سائیلینسر لگایا اور جیب میں رکھ لیا۔ میرا پلان مکمل تھا۔ وہ پہلے سے بدنام تھی۔ جو لوگ اس کے عشق میں تباہ ہوچکے تھے اپنی تباہی کا انتقام لینے کے درپے تھے۔ ایک غریب کمیشن ایجنٹ پر کون شبہ کرسکتا تھا۔ حفظ ماتقدم کے طور پر میں نے اپنی سکرٹری کو فون کیا۔ وہ نہ جانے کب سے میرے عشق میں مبتلا تھی اور میرے پیغام کی منتظر۔ ایک غریب مگر حسین لڑکی۔ سادہ لوح۔ گھریلو قسم کی لڑکی۔

''ایلینا...... کیا تم اس وقت آسکتی ہو۔''

''اس وقت ......؟ کیوں نہیں۔'' اس نے پر مسرت لہجے میں کہا۔ اس نے مجھ سے کچھ بھی نہیں پوچھا اور فون بند کردیا۔ بیس منٹ بعد اس کی ٹیکسی میرے دروازے پرآ کر رکی۔ وہ گزشتہ تین سال سے میرے ساتھ تھی اور اسے مجھ پر اعتماد تھا۔

''ایلینا۔ میں نے ایک ایسی بات کہنے کے لیے تمہیں بلایا ہے جو مجھے اب سے تین سال پہلے کہہ دینی چاہیے تھی۔ اس کا رنگ گلنار ہوگیا۔ پلکیں جھک گئیں۔ چند لمحوں تک میں اس کا یہ روپ دیکھتا رہا۔ ایک عورت کا روپ جب وہ انتظار کی سرحد پر پہنچتی ہے اور جانتی ہے کہ انتظار ختم ہوگیا۔ ''ایلینا۔ میں تم سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔'' میں نے جیب سے انگوٹھی نکالی۔ دوسری جیب میں پستول تھا۔ ''میں جانتا ہوں تم انکار نہیں کرسکتیں۔'' میں انگوٹھی پہناتے ہوئے اس پر جھکا اور اس کی پیشانی کو چوم لیا۔ بلاشبہ وہ کیرولین سے کہیں زیادہ حسین تھی۔ شفق کا یہ رنگ اس کے عارض پر کہاں تھا۔ وہاں تو سونے کی چمک تھی۔ یہ خواہش کہاں تھی جو گھر کی بنیاد رکھتی ہے۔ وہاں تو صرف ہوس تھی۔

''اتنی رات گئے تم نے مجھے یہی کہنے کے لیے بلایا تھا۔'' اس نے بدستور نگاہیں فرش پر رکھتے ہوئے کہا۔

''ہاں۔ اس کا ایک اور بھی مقصد ہے میں تھوڑی دیر کے لیے باہر جا رہا ہوں۔ قریباً ایک گھنٹے کے لیے۔ تم یہاں ٹھہرو۔''

''انتونیو۔'' اس نے پہلی بار میرا نام لیا۔ ''تم کہاں جا رہے ہو؟''

''ایک کام ہے لیکن کل تم سے کوئی میرے بارے میں پوچھے تو تم صرف یہ کہو گی کہ میں تمہارے ساتھ تھا۔ میں کہیں نہیں گیا۔''

''کیا کام ہے۔'' اس نے میرا ہاتھ تھام لیا۔ ''کون پوچھے گا مجھ سے۔''

''پولیس۔'' میں نے سپاٹ لہجے میں کہا۔ اس کا رنگ اڑ گیا۔ ''کیوں انتونیو۔ کیا چکر ہے۔ میں تمہاری بیوی بننے والی ہوں۔ مجھ سے نہ چھپاؤ۔''

''او کے بے بی سنو۔ میں ایک قتل کرنے جا رہا ہوں۔ ایک نہیں دو۔'' میں نے محسوس کیا کہ وہ بے ہوش ہونے والی ہے۔ میں نے اسے پانی پلایا۔ ''انتونیو۔'' اس نے کانپتے ہوئے کہا۔ ''کیا تم ہوش میں ہو تمہیں قتل کرنے کی کیا ضرورت ہے؟''

ایلینا تم میری بیوی ہو۔ میں تم سے کچھ چھپاؤں گا نہیں، میں ایک عورت کو قتل کرنے جا رہا ہوں۔''

''لیکن تم نے دو کا ذکر کیا ہے۔''

''ہاں دوسرا ایک مرد ہے۔ عورت کو تم جانتی ہو۔ پرنس کیرولین۔ مرد کو تم نہیں جانتیں۔''

''انتونیو۔ ایسا مت کرو۔ بھول جاؤ ساری باتیں۔ ہم شادی کر کے ایک نئی زندگی کی ابتدا کریں گے۔'' وہ میری منت کرتے ہوئے بولی۔ میں اس وقت دستانے پہن رہا تھا۔ میں نے اس کا ہاتھ جھٹک دیا۔ ''ایلی ہماری شادی اسی صورت میں ہو سکتی ہے کہ میں ان دونوں کو ٹھکانے لگا دوں۔ مزید کوئی سوال کرنے کی ضرورت نہیں۔'' میں دروازے کی طرف بڑھا۔

''نہیں ...... نہیں ...... انتونیو۔'' وہ میرے پیچھے بھاگی۔ مگر میں نے دروازہ باہر سے لاک کر دیا۔ میرے سر پر خون سوار تھا۔ وہ دروازے پر مکے مارتی رہی۔ ''انتونیو۔ انتونیو۔''

چالیس منٹ بعد میں محل کی پچھلی طرف سے دیوار پھاند کر اندر داخل ہوا۔ اب تک میں سارے راستوں سے واقف ہو گیا تھا۔ باورچی خانے کی کھڑکی کا شیشہ توڑ کر میں اندر گھس گیا۔ راہداری سے گزر کر میں زینے کے راستے اوپر پہنچا۔ سارے فانوس بجھے ہوئے تھے۔ زینوں پر مدھم روشنی والے نیلے بلب جل رہے تھے کہیں کوئی آواز نہ تھی۔ میں دبے پاؤں چلتا ہوا شہزادی کی خواب گاہ کے دروازے تک پہنچا اور تالے کے سوراخ سے اندر دیکھا۔ اندر بھی خاموشی تھی۔ غالباً وہ سو رہے ہیں۔ میں نے آہستہ سے ہینڈل گھمایا ہلکا سا کھٹکا ہوا۔ میں رک گیا۔ نہیں کچھ نہیں۔ دروازہ آہستہ سے دھکیل کر میں نے قدم رکھا۔ وہ بستر پر سوئی پڑی تھی۔ پرنس اس کے پہلو میں تھا میں آہستہ آہستہ اس کے قریب پہنچا۔ پل بھر کے لیے اس کے حسن نے میرے ارادے کو متزلزل کر دیا۔ اس کے بکھرے ہوئے بال باریک نائٹ گون سے روشنی کی طرح پھوٹتا ہوا بدن کا رنگ۔ مگر میں نے پستول پر اپنی گرفت کو مضبوط کر دیا اور اس پر جھکا۔ اسی وقت اس نے آنکھ کھول کر مجھے دیکھا۔ میں نے جھپٹ کر ہاتھ اس کے منہ پر رکھ دیا۔ اس کے حلق سے کوئی آواز نہ نکلی۔ وہ وحشت زدہ نظروں سے مجھے دیکھتی رہی۔ میں نے جیب سے پستول نکالا اور اشارے کیا کہ اگر اس نے آواز نکالی تو میں دونوں کو گولی مار دوں گا۔ اس نے آہستہ سے سر ہلایا۔ میں نے ہاتھ اس کے منہ پر سے ہٹایا اور اسے پستول سے اشارہ کیا کہ وہ آگے آگے چلے۔ وہ بڑی خاموشی سے بستر سے اٹھی۔

''تجوری کھولو۔'' میں نے سرگوشی میں کہا۔ ''اور یاد

رکھو۔ آواز کوئی نہ ہو۔'' اس نے کانپتے ہاتھوں سے تجوری میں چابی لگائی۔ پھر ہلکا سا کھٹکا ہوا۔ میں نے فوراً پلٹ کر دیکھا۔ پرنس سویا پڑا تھا۔ میں نے جیب سے پولی تھین کا بڑا سا بیگ نکالا۔ ''نوٹ اور زیورات اس میں بھر دو۔ مگر آواز کوئی نہ ہو۔'' میں نے آہستہ سے کہا۔ ''ورنہ تم دونوں مارے جاؤں گے۔''

لرزتے ہاتھوں سے اس نے بیگ بھرنا شروع کیا۔ میں اپنے اس بیان پر غور کرنے لگا جو کل مجھے پولیس کو دینا تھا۔ پرنس کو معلوم تھا کہ پرنس کی تجوری میں دو کروڑ روپے ہیں۔ میں شام کو ان کے ساتھ نہیں تھا۔ لیکن مجھے معلوم ہے پرنس نے مجھے بتایا تھا۔ فون پر۔ وہ رقم واپس لینے آیا۔ شہزادی نے چابی دینے کے بعد پرنس کو گولی ماردی۔ اس نے مرتے مرتے شہزادی کا گلا گھونٹ دیا۔ دونوں کی لاشیں تجوری کے قریب ہوں گی۔ شہزادی کے جسم پر پرنس کی انگلیوں کے خراشوں کے نشان ہیں۔ مگر پستول۔ میں ایک قدم پیچھے ہٹا اور شہزادی کے تکیے کے نیچے سے اس کا بھرا ہوا پستول نکال لیا۔ جسے وہ ہمیشہ اپنے ساتھ رکھتی تھی۔ فائن۔ نوٹوں کی چند گڈیاں فرش پر گر پڑیں۔ پرنس نے انہیں تھیلے میں ڈالا۔ کیرولین کا گلا گھونٹ کر میں پرنس کو جگاؤں گا اور ادھر تجوری کے قریب بلا کر شہزادی کے پستول سے ٹھائیں۔ آواز بس اتنی ہوگی جیسے درخت کی ٹہنی ٹوٹنے سے ہوتی ہے۔ میں پرنس کی رقم کو ہاتھ نہیں لگاؤں گا۔ باقی سب لے جاؤں گا۔ گڈ میں نے اپنا پستول جیب میں ڈال لیا۔ اسی وقت کمرہ روشن ہوگیا۔ پرنس اٹھ کھڑا ہوا۔ میں نے اس پر فائر کیا۔ گولی نہیں چلی۔ پستول خالی تھا اور دونوں دروازوں کے علاوہ کھڑکی سے پولیس کی پستول کی نالیاں میرا رخ کیے ہوئے تھیں۔ پرنس نے میرے ہاتھ سے شہزادی کا پستول یوں لے لیا جیسے کوئی بچوں سے کھلونا لیتا ہے۔ پرنس کیرولین نے اتنی دیر میں اپنے برہنہ شانوں پر گاؤن ڈال لیا تھا۔ ''تمہیں اپنی سکرٹری کا شکر گزار ہونا چاہئے۔ اس نے تمہیں بچالیا۔ اس نے کہا۔

''ایک عورت کے حسد نے۔''

مجھے تین سال کی جیل ہوئی چوری کرنے کی کوشش کے الزام میں۔ جو قتل۔ دہرے قتل کی سزا سے بہت کم ہے۔ ایلینا جیل میں مجھ سے ملنے آئی۔ ''انتونیو۔ مجھے معاف کردو۔'' وہ روتے ہوئے بولی۔

''تم نے ایسا کیوں کیا۔'' میں نے سکون سے پوچھا۔

''انتونیو۔ آئی لو یو۔ میں نہیں چاہتی تھی کہ تم قاتل بن جاؤ۔ یا تمہیں پھانسی ہوجائے۔ تین سال ہی کی تو بات ہے۔ میں تمہارا انتظار کروں گی۔'' وہ سلاخوں سے سر لگا کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

سال بھر تک وہ باقاعدگی سے مجھ سے ملنے آتی رہی۔ میرے لیے سگریٹ پھل اور کتابیں لاتی رہی۔ اسی دوران میں نے اخبار میں دو خبریں پڑھیں۔ ایک تو پرنس کیرولین کی مشرق وسطیٰ کے ایک ولی عہد سے شادی کی خبر اور دوسری اس ریاست میں فوجی انقلاب کی جس کا وہ ولی عہد تھا۔

لیکن آج۔ جب کہ میری رہائی میں صرف ایک دن باقی ہے۔ ایلینا کے لائے ہوئے اخبار میں میری توجہ کا مرکز ایک اور خبر ہے۔ ''پرنس کیرولین نے اپنے تیسرے شوہر۔ ایک جلاوطن شہزادے سے طلاق حاصل کرلی ہے۔ شہزادے نے اپنے باقی ماندہ سرمائے سے ایک ٹیکسی خرید لی ہے۔''

کسے معلوم ہے کہ کل جب میں جیل سے باہر آؤں اور گرجا جانے کے لیے ٹیکسی پکڑوں تو اسے وہی جلا وطن شہزادہ چلا رہا ہو۔



ذوق آگہی

سباس گل

(اس ماہ کا انعام یافتہ اقتباس)

اہل تصوف کی کرامت

کہتے ہیں کہ حضرت خواجہ عثمان ہارونی رحمتہ اللہ علیہ ہندوستان تشریف لا رہے تھے کہ راستے میں ان کا گزر ایک ایسے مقام سے ہوا جہاں پارسیوں کا بڑا آتش کدہ تھا۔ حضرت خواجہ عثمان ہارونی رحمتہ اللہ علیہ نے اس کے قریب قیام کیا اور اپنے خادم کو بھیجا کہ افطار کے واسطے آگ پر روٹی پکالائے' خادم گیا تو آتش پرستوں نے آگ نہ دی حضرت کو خود اس کی طرف متوجہ ہونا پڑا جب آپ آگ کے قریب پہنچے تو وہاں ایک بوڑھا موحد مختار نام کا سات برس کے لڑکے کو گود میں لیے کھڑا تھا حضرت نے اس سے گفتگو کی' آپ نے اس سے فرمایا کہ آگ ایک فانی چیز ہے ایک چلو پانی سے معدوم ہو جاتی ہے اس کو کیوں پوجتے ہو؟ اور جو خالق کائنات ہے جو اس آگ کا خالق ہے اسے کیوں نہیں پوجتے۔ اس نے کہا کہ آگ ہمارے مذہب میں بڑا مرتبہ رکھتی ہے اس کو کیوں نہ پوجیں۔ حضرت نے کہا کہ تم اتنی مدت سے آگ کی صدق دل سے پرستش کرتے ہو کیا تم یہ کر سکتے ہو کہ اپنا ہاتھ یا پاؤں اس آگ میں ڈالو اور وہ نہ جلائے۔ بوڑھے موحد نے کہا جلانا آگ کی خاصیت ہے جو اس میں ہاتھ ڈالے گا جل جائے گا۔ حضرت نے موحد کی یہ بات سن کر موحد کے فرزند کو اس کی آغوش سے لیا اور خود یہ آیت کریمہ پڑھتے ہوئے آگ میں داخل ہو گئے قلنا یا نارِ کونی برداً وسلاماً علیٰ ابراہیم۔ یہ دیکھ کر موحد اور اس کے ساتھی حیران اور پریشان ہو گئے' آگ کے گرد شور کرنے لگے اور آہ و فغاں بلند کرتے مگر اندر جانے کی ہمت نہ ہوئی۔ تھوڑے دیر کے بعد حضرت خواجہ اس بچے کے ساتھ آگ کے شعلوں میں سے اس طرح نکلے کہ ان کے کپڑوں پر کوئی داغ دھبہ نہ تھا تمام آتش پرست یہ حال دیکھ کر ششدر رہ گئے اور حضرت کی کرامت دیکھ کر ان کے ہاتھ پر ایمان لائے' سات سالہ بچے کا نام ابراہیم اور بوڑھے موحد کا کا نام شیخ عبداللہ رکھا۔ سید العارفین کے مصنف کا کہنا ہے ان دونوں ہستیوں کے عالیشان مقبرے میں نے دیکھے اور قیام بھی کیا۔

شمائلہ رفیق...... وہاڑی

رسول اکرم ﷺ کی شان و عظمت

تیرے جیسا حسین کسی آنکھ نہ دیکھا۔ تیرے جیسے جمال والا کسی ماں نے نہ جنا۔ آپ ایسے پیدا ہوئے جیسے آپ نے اپنے آپ کو خود چاہا۔ مطلب یہ کہ اللہ نے ساری کائنات کو بنایا اپنی مرضی پر، محمد مصطفیٰ ﷺ کو بنایا ان کی مرضی پر...... اگرچہ اپنی ہی مرضی پر بنایا لیکن سب سے کامل۔ سب سے ارفع، سب سے اعلیٰ، سب سے برتر، سب سے احسن، سب سے اجمل، سب سے انور، سے سب انجی، سب سے اجود، سب سے اکرم، الفاظ کی یہ تعبیرات بہت نیچے رہ جاتی ہیں اور میرے آقا سرکار دو عالم ﷺ بہت بلند ہو جاتے ہیں۔ میرے نبی ﷺ پر کئی الزام لگے، یہ تو پاگل ہے یہ تو دیوانہ ہے یہ تو جادوگر ہے، یہ تو شاعر ہے (نعوذ باللہ) اللہ نے خود صفائی پیش کر دی کہا میرے محبوب کی آمد سے جہان روشن ہو گیا جیسے ستاروں سے بھٹکے ہوئے قافلے کو راستہ ملتا ہے۔ میرے محبوب کے آنے سے بھٹکی انسانیت کو راستہ ملا، نہ گمراہ ہوا نہ عقل سے فارغ ہوا ہے۔ یہ خواہش کا غلام نہیں، یہ اللہ کے بول بولتا ہے اور اس ﷺ کو رحمان سکھاتا ہے۔ میرا نبی ﷺ سدرۃ المنتہٰی سے بھی اوپر چلا گیا۔ اللہ فرماتا ہے کہ میرا محبوب میرے اتنا قریب ہوا جتنا دو کمانوں کے کنارے آپس میں مل جاتے ہیں۔

فلک شیر ملک...... رحیم یار خان

سیدہ فاطمہؓ کا فقر

کائنات کی سب سے افضل خاتون، جنت کی عورتوں کی سردار...... جنت کے نوجوانوں کے سرداروں کی ماں اور دنیا کے عظیم انسان کی بیوی ہر نسبت سے اعلیٰ اور بر تر...... حال یہ ہے کہ ایک مرتبہ پتا چلا بیٹی بیمار ہے حضور ﷺ جب حال پوچھنے گئے تو دروازے پر دستک دی کہا بیٹا اندر آ جاؤں، میرے ساتھ ایک صحابی عمرانؓ بھی ہے۔ انہوں نے اندر سے جواب دیا یا رسول اللہ ﷺ میرے گھر میں تو چادر بھی کوئی نہیں پردہ کرنے کے لیے دو جہاں

کے سردار کی بیٹی، جنت کی عورتوں کی سردار جس کی شان ہے کہ جب حضرت فاطمہؓ پل صراط سے گزریں گی تو میدان حشر میں اعلان ہوگا نظریں جھکالو فاطمہ بنت محمد ﷺ تشریف لے جارہی ہیں اتنی شان اور حال یہ ہے کہ پردہ کرنے کے لیے گھر میں نہ چادر ہے نہ رومال چہرہ چھپانے کے لیے۔ آپ ﷺ نے اپنی چادر اندر پیش کی اور کہا بیٹا اس سے پردہ کرلو۔ پردہ ہوا تو اندر آئے پوچھا کیا حال ہے؟ فاطمہؓ رونے لگیں یا رسول اللہ پہلے بھوک تھی روٹی کوئی نہیں تھی اب بیماری ہے علاج کوئی نہیں اتنا عظیم خاوند، خیبر کے قلعے کو اکھاڑ پھینکنے والا فاطمہ کو روٹی نہیں دے سکا؟ کوئی مقدمہ قائم نہیں ہوا بلکہ آپ ﷺ نے بیٹی کو گلے لگایا کائنات کی دو عظیم ہستیاں رو رہی ہیں اللہ کا رسول بھی رو رہا ہے اور رسول کی بیٹی بھی رو رہی ہے اور یہ وہ عظیم ہستیاں ہیں کہ اشارہ کریں تو آسمان سے سونے کی بارش ہونے لگے۔ فرمایا بیٹی غم نہ کر اس ذات کی قسم جس نے تیرے باپ کو نبی بنایا ہے آج تین دن گزر چکے ہیں تیرے باپ نے بھی کچھ نہیں کھایا۔ بھوک کا غم نہ کر، بلکہ خوش ہوجا اللہ نے تجھے جنت کی عورتوں کا سردار بنادیا ہے۔

عائشہ اعوان......رحیم یار خان

حضرت ابو بکر صدیقؓ کے حکیمانہ مقولے

سب سے زیادہ سمجھداری تقویٰ اور پرہیز گاری ہے، سب سے زایدہ حماقت فسق و فجور ہے سب سے زیادہ سچائی امانت ہے سب سے بڑا جھوٹ خیانت ہے جب کسی شخص کے دل میں دنیاوی آرائشوں کا اہتما جاگزیں ہوجاتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس سے ناراض ہوجاتا ہے۔

کاش میں وہ درخت ہوتا جس کا پھل کاٹ کر کھالیا جاتا ہو، آپؓ نے اپنی زبان کا کنارا پکڑ کر فرمایا یہی وہ ٹکرا ہے، جس نے مجھے ہلاکتوں میں ڈال دیا۔

اس بات میں کوئی خوبی نہیں جو خدا کی رضا کے لیے نہ ہو اور نہ اس مال میں کوئی خوبی ہے جو اللہ کی راہ میں خرچ نہ کیا جائے اور نہ اس شخص میں کوئی بہتری ہے۔ جس کی جہالت اس کے تحمل پر غالب ہو اور نہ اس میں کوئی بھلائی ہے جو خدا کی راہ میں (حق بات پر) ملامت کرنے والے کا خوف رکھتا ہو۔

ہم نے تقویٰ میں عظمت، یقین میں استغناء، تواضع و انکساری میں سربلندی پائی جس نے اللہ کے لیے اپنے نفس پر غلبہ پالیا اللہ اسے اپنے غضب سے محفوظ رکھے گا۔

جس نے عاجزی کی حکمت کو سمجھ لیا اس پر قرب خداوندی کا حصول آسان ہوگیا۔

فخر کرنے سے بچو بھلا اسے فخر و بڑائی کا کون سا موقع ہے جو مٹی سے پیدا ہوا پھر مٹی کی طرف لوٹ جائے گا جہاں اسے کیڑے کھاڈالیں گے۔

اس بھلائی و نعمت میں کوئی خیر نہیں جس کا انجام دوزخ اور اس برائی میں کوئی برائی نہیں جس کا انجام جنت ہو۔

مہر پرویز دولو......میاں چنوں

تیرا چہرہ

یہ کل کی بات ہے شام سے زدہ پہلے ابر آلود موسم کی اداسی، بادصبا میں تیرا احساس خوشبو مجھے باہر کھینچ لایا تھا۔ کبھی اِدھر کبھی اُدھر دیکھا تجھے بادلوں میں ڈھونڈا باد صبا سے پوچھا مگر کہیں سے بھی تیرا پتا نہ ملا، سورج ڈوبنے کو تھا عالم مایوسی میں واپس لوٹ رہا تھا اک آس اک امید باقی تھی۔ میرے ہاتھ میں گلاب کے سرخ و سفید پھول تھے شب غم، عالم تنہائی میں کسی پل پھولوں کی پتیاں بکھر گئیں۔ پھر آدھی رات میری آنکھیں وا ہوئیں۔ میں نے دیکھا پھولوں کی ان پتیوں میں تیرا معصوم سا چہرہ۔

احسان سحر......میانوالی

اجلی باتیں

❁ عورت اپنے مقام سے اک بار گر جائے تو پھر وہ ایسا کھلونا بن جاتی ہے جو ایک کے بعد دوسرے مرد کے ہاتھوں میں گھومتا رہتا ہے۔

❁ عورت بہن اور بیوی کے روپ میں سب سے زیادہ خطرناک ہے کیونکہ نہ کوئی شوہر اپنی عزت نیلام ہوتے دیکھ سکتا ہے اور نہ کوئی بھائی۔

❁ ہر مرد کو وہ عورت بدکردار معلوم ہوتی ہے جو اس کے بجائے کسی دوسرے مرد سے باتیں کررہی ہو۔

❁ عورت کو سمجھنا چاہیے کہ وہ اک آئینے کی مانند ہے۔ اس کو ٹوٹنے کے ساتھ ساتھ خود پر آنے والی خراشوں سے بھی بچنا ہے۔

انتخاب: اُم عمارہ...... مانگا منڈی لاہور

سوچنے کی بات

ایک دن میں ایک پارک میں بیٹھا ہوا تھا دو پکی عمر کے بندے بحث کر رہے تھے کہ جرائم بڑھاتے میں جاسوسی اور تفتیشی کہانیاں بڑا موثر کردار ادا کرتی ہیں۔ اتفاق سے میں بھی ایک تفتیشی کہانی لکھنے کی غرض سے پارک میں گیا تھا وہ میرے قریب ہی بیٹھے ہوئے تھے مجھ سے رہا نہیں گیا اور میں نے نرمی سے عرض کی، جناب یہ بات غلط ہے لکھنے والا تو لوگوں کو قانون کا احترام سکھانے کی کوشش کرتا ہے اور یہ بتانے کی اپنی سی سعی کرتا ہے کہ قانون کو ہاتھ میں لینے والا آخر قانون کے شکنجے میں ضرور آتا ہے ایک صاحب بولے ''جناب کوئی دلیل دیں کوئی ٹھوس وجہ بیان کریں میرے ذہن میں اچانک اپنے روحانی استاد جناب ابن صفی (مرحوم) کا ایک فقرہ در آیا وہ میں نے ان کے گوش گزار کر دیا۔ ایک دفعہ یہی بات خط میں کسی قاری نے ان سے کہی تھی انہوں نے کہا تھا بھئی میں نے ہابیل قابیل کے واقعے سے پہلے کوئی جاسوسی ناول نہیں لکھا تھا یہ سنتے ہی ان دونوں نے اپنی بحث ختم کر دی۔

ریاض بٹ...... حسن ابدال

نبی کریم ﷺ کے پیارے نام

قرآن پاک میں محمد اور احمد۔ زبور میں عاقب۔ توریت میں ماذ۔ بائبل میں فرقلیت۔ جنت میں عبدالکریم۔ آسمان میں مجتبیٰ۔ زمین پر معظم۔ دیگر انبیاء علیہ السلام آپ ﷺ کو عبدالوہاب کہتے ہیں۔ ملائکہ عبدالمجید اور اللہ تعالیٰ آپ ﷺ کو یسین کہتا ہے۔

گل مہر...... کراچی

کراچی

ہمارے کچھ لوگوں کو مار کیٹیں ''آزمانے'' کا خبط بھی ہوتا ہے ایک دوست نے بڑے عرصہ کے بعد ملنے پر پوچھا کیا کرتے رہے تم بولا۔ میں نے کوپن ہیگن میں ایئر کنڈیشنر کی دکان کھولی تھی مجھے معلوم نہ تھا کہ وہاں گرمی نہیں پڑتی۔ نقصان اٹھا کر دکان بند کر دی۔ اس نے تفصیل بیان کیا۔ وہ کئی سالوں کے بعد ملا تھا اب پوچھا کیا کرتے رہے ہو بولا ڈنمارک میں نقصان اٹھا کر سعودی عرب شفٹ ہو گیا تھا پھر جدہ میں ہیٹرز کی دکان کھول لی مجھے معلوم نہ تھا کہ وہاں سردی نہیں پڑتی نقصان اٹھا کر دکان بند کرنی پڑی۔ پھر میں نے پوچھا آج کل کیا ہو رہا ہے اس نے بتایا کہ بھئی کراچی میں کتابوں کی دکان کھول لی ہے۔

اور میں پھر ہکا بکا رہ گیا، لوگوں کی بے حسی محسوس کیجیے۔

جاوید احمد صدیقی...... راولپنڈی

سوچ

اچھی یا بری سوچ کا تعلق صحبت سے ہوتا ہے اور سوچنا انسانی فطرت میں شامل ہے جبکہ اس امر میں کوئی گنجائش نہیں کہ زیادہ سوچنے والے کو دماغی مفلوج تصور کیا جاتا ہے لیکن سوچ سے ہی انسان کے انسان ہونے کا امتیاز کیا جاتا ہے میں اکثر سوچتے سوچتے بہت دور نکل جاتا ہوں اتنا دور کہ بس پھر خود کو دور اندیشی کی حدوں سے دور پاتا ہوں اور اپنے چھوٹے سے چھوٹے مسائل کو سوچ کر ہر زاویے سے اتنا سوچتا ہوں کہ پھر ہر سوچ میں سے ایک نئی سوچ جنم لینا شروع ہو جاتی ہے معاملات اتنی شدت اختیار کر جاتے ہیں کہ بس ست چکرانے لگتا ہے دماغ شل ہو جاتا ہے اور پھر آخر میں خود کو دماغی مفلوج محسوس کرتا ہوں۔

حسین خواجہ...... سٹی منچن آباد

شادی سے پہلے و شادی کے بعد

⌘ میں نے پیار کیا

☆ ہائے یہ میں نے کیا کیا......؟

⌘ ملنے کب آؤ گی؟

☆ میکے کب جاؤ گی؟

⌘ جان ابھی مت جاؤ۔

☆ خدا کے لیے جان مت کھاؤ۔

⌘ کچھ تو بولو لب تو کھولو۔

☆ اب بس بھی کرو چپ تو ہو لو۔

⌘ تم بن رہا نہ جائے۔

☆ تم کو سہا نہ جائے۔

⌘ آئی لو یو۔

☆ آج بھی آلو......؟

نادیہ حسین......کراچی

کوئی مانگے تو سہی

رات کے پچھلے پہر
سب جہانوں کا خدا
دے رہا تھا صدا
کوئی پکارے تو مجھے
دوڑ کر اس کی سنوں
کوئی مانگے تو سہی!
جھولیاں بھر بھر کر دوں
کوئی توبہ تو کرے
معاف میں جھٹ سے کروں
اور ہم نیند میں
اس صدا سے بے خبر......
اس خدا سے بے خبر
جنتوں کی چاہ میں خواب دیکھتے رہے
اور......
سورج کی تپش اپنے گھر تک آ گئی
اپنے سر تک آ گئی

آسیہ اشرف......گنگا پور

گولڈن الفاظ

❖ گناہ سے ہر وقت بچو مگر تنہائی میں بالخصوص بچو کیونکہ اس گناہ کا گواہ خود خدا ہوگا

❖ رزق کے پیچھے اپنا ایمان خراب مت کرو کیونکہ رزق انسان کو اس طرح تلاش کرتا ہے جیسے مرنے والے کو اس کی موت۔

❖ اپنی زبان کی تیزی اس ماں پر مت جھاڑو جس نے تمہیں بولنا سکھایا۔

❖ لفظ انسان کے غلام ہوتے ہیں مگر بولنے سے پہلے بولنے کے بعد انسان اپنے لفظوں کا غلام بن جاتا ہے۔

❖ کوشش کرو کہ تم دنیا میں رہو' دنیا تم میں نہ رہے کیونکہ کشتی جب تک پانی میں رہتی ہے خوب تیرتی ہے لیکن جب پانی کشتی میں آجائے تو وہ ڈوب جاتی ہے۔

❖ دنیا کا سب سے مخلص رشتہ ماں کا ہے' ماں تیری عظمت کو سلام۔

رابعہ حنیف......منڈی بہاؤ الدین

موسیقی عذاب الٰہی کا ذریعہ

کہا جاتا ہے' جس قوم میں موسیقی پھیل جائے جس قوم میں عورتوں کا پردہ اٹھ جائے جس قوم میں معیشت سود پر آجائے اس قوم میں زنا ضرور آئے گا۔ وہ قوم زنا سے نہیں بچ سکتی اور جس قوم میں زنا عام ہوتا ہے تو وہ بے حیاء ضرور ہوگی۔ پھر وہ بے حیائی سے بچ نہیں سکتی اور جب وہ بے حیا ہوگی تو اللہ تعالیٰ کے عذاب کا کوڑا بے قرار ہوگا پھر تلوار نیام سے نکلے گی' وہ کوڑا نکلے گا......

بجلیاں تڑپیں گی' موسم بدلیں گے' ملک کی آنکھ بدلے گی' زمین کے تیور بدلیں گے' کائنات کی گردش بدلے گی۔

وہ زمین جو مسلمان کے لیے اپنا سینہ بچھاتی تھی وہ زمین زلزلے لائے گی' وہ پانی جو موتیوں کی طرح برستا تھا وہ پانی برف بن کر ان پر آگ برسائے گا وہ فرشتے جو ان کی دعاؤں پر آمین کہتے تھے ان کی مدد کو اترتے تھے' وہی فرشتے ان کے لیے قہر الٰہی بن کے نازل ہوں گے' وہ ہوائیں جو ان کا پیغام لے کر چلتی تھیں انہی ہواؤں سے اللہ تعالیٰ طوفان کی شکل پیدا کرے گا۔ وہ پانی جو ان کو راستے دیتا تھا وہ پانی ان کے ڈبونے کا سامان بنے گا اور وہی کائنات جو ان کی تابع تھی اسی کائنات کو اللہ تعالیٰ ان پر مسلط کر دے گا۔

نادیہ گل نادی سیال......مخدوم پور

نکاح نامہ

✦ ایک آدمی میڈیکل اسٹور پر گیا اور کہنے لگا۔ ''مجھے زہر چاہیے۔''

دکان دار نے پوچھا ''کیا آپ کے پاس اجازت نامہ ہے۔''

وہ کہنے لگا کہ ''اجازت نامہ تو نہیں لیکن نکاح نامہ ہے۔''

دکان دار زور سے چلایا۔

''اوئے وڈی بوتل دے ویرنوں۔''

سائرہ بتول......کراچی

خوشبوئے سخن

نوشین اقبال نوشی

(اس ماہ کا انعام یافتہ انتخاب)

اب کے تجدید وفا

اب کے تجدید وفا کا نہیں امکاں جاناں
یاد کیا تجھ کو دلائیں تیرا پیاں جاناں
یوں ہی موسم کی ادا دیکھ کے یاد آیا ہے
کس قدر جلد بھول جاتے ہیں انساں جاناں
زندگی تیری عطا تھی سو تیرے نام کی ہے
ہم نے جیسے بھی بسر کی تیرا احساں جاناں
دل یہ کہتا ہے شاید ہو افسردہ تو بھی
دل کی کیا بات کریں دل تو ہے ناداں جاناں

شاعر: احمد فراز

صداقت حسین ساجد......شورکوٹ سٹی جھنگ

انتظار کے لمحے

انتظار کے لمحے شروع ہوئے
اب دیکھو کب یہ تھمتے ہیں
یا یونہی چلتے رہتے ہیں
کسی موڑ پہ آ کر جو یہ رکے
ہم دھیرے سے مسکائیں گے
اور خود کو خوب سجائیں گے
اور تھوڑا سا شرمائیں گے
پھر تم سے ملنے کی خاطر
ہم گھر کے گیٹ تک جائیں گے
اور کھول کے اس کی کنڈی کو
ہم اس کو وا کر آئیں گے
پھر دیکھ کے تم کو اس کے پار
ہم دیوانے ہو جائیں گے
آنکھوں سے آنسو نکلیں گے
تم بھی یہ دیکھ کے رو دو گے
ہم دونوں ہی بہہ جائیں گے
وصال کے ان لمحوں کو پا کر
ہم سکھ ساون ہو جائیں گے

حنا نور......کراچی

نظم

میں چاہتی ہوں
کبھی ہنستی رہے
کبھی روتی رہے
میں چاہتی ہوں
مجھے تم سے محبت
ہوتی رہے
تیری ذات ایک معمہ ہو میرے لیے
میری ذات بھی ایک راز ہو تیرے لیے
تو پڑھ لے، سمجھ کر بھی مجھ کو
الجھا رہے
میں دل تک روح تک پہنچ کر بھی تیرے
انجاں رہوں
تو مسکرائے اگر
چین پاتی رہے
جو تو ہو غم زدہ
چین کھوتی رہے
میں چاہتی ہوں
مجھے تم سے محبت
ہوتی رہے
تجھے دریافت کرنے کی سعی کرتی رہوں
جو سمیٹوں تجھے، خود بکھرتی رہوں
سب مکمل ہو
تشنگی بھی قائم رہے
تو لگا زخم
تو ہی مرہم رکھے
کانٹوں کے شہر میں
پھول چنتی رہے
ٹوٹ جائیں اگر
خواب بوتی رہے
میں چاہتی ہوں
مجھے تم سے محبت ہوتی رہے
یہ محبت سب کچھ پا لے اگر
دلکشی کھو دیتی ہے
جو دھیرے دھیرے بڑھتی ہے

وہی راحت تو دیتی ہے
اس لیے منزل نہیں
سفر سے غرض ہے مجھے
جب جاگے
تو جنوں کی شکل میں جاگے
جب سو تو بے خبری
سوئی رہے
میں چاہتی ہوں
مجھے تم سے محبت ہوتی رہے
حمیرا افضا...... رحیم یار خان

فاصلے

فاصلوں کے بڑھتے ہی
نہ جانے ایسا کیوں ہوتا ہے
محبت بھی شدت سے
بڑھ جاتی ہے
بہت ہم کو رلاتی ہے
وہ ہی ایک چہرہ ہر سو ہر جانب
چھاسا جاتا ہے
اندھیرے اچھے سے لگتے ہیں
وحشت رونق سے ہوتی ہے
خوشی کے سب ہی منظر
نہیں جچتے ہیں آنکھوں میں
عروج فاطمہ سیدہ...... ملتان

نظم

عجب سی خوش بو رچی ہوئی ہے
عجب سی ان فضاؤں میں
عجب سے چہروں والے لوگ
عجب طرح سے ہنستے ہیں
عجیب باتیں کرتے ہیں
عجب یہاں کی بارش بھی
عجب یہاں کا ساون بھی
عجیب رت اور عجیب موسم
عجیب دنیا
عجیب لوگ
ایسے عجیب منظر میں
ایسی عجیب دنیا میں
میں اور تم کتنے تنہا لگتے ہیں
سیدہ مدینہ صادقہ جیلانی

23 مارچ

اپنی آزادی کا شہ عنوان ہے 23 مارچ
بے گماں بنیادِ پاکستان ہے 23 مارچ
صبح آزادی کے سانچے میں ڈھلی پہلی کرن
حریت کی ایک تڑپ ارمان ہے 23 مارچ
مل گیا تھا بھولے بھٹکوں کو چراغ راہِ حق
جذبہ دیں مشعل ایمان ہے 23 مارچ
شاعر مشرق نے دیکھا تھا جو آزادی کا خواب
حضرت اقبال کا فیضان ہے 23 مارچ
قائد اعظم کی محنت سے ملا آب حیات
خضر راہ و چشمہ حیوان ہے 23 مارچ
آج ہی کے دن ملے شاہین آزادی کو پَر
اپنی پرواز خودی کی شان ہے 23 مارچ
ہو سیاسی زندگی بھی تابع فرمان حق
یہ حسینی فکر کا گلدان ہے 23 مارچ
بھائیو! اس روز کا اک دوسرا پہلو بھی ہے
پہلے آئین وطن کی آن ہے 23 مارچ
شاعر: ظہور الدین نشتر
انتخاب: ایم جے قریشی...... ڈی آئی خان

نظم

صحرا میں گلزار ہوتی ہیں یہ بہنیں
اللہ کا اسرار ہوتی ہیں یہ بہنیں
جب حالات کی زد میں آتے ہیں ہم بھائی
ان حالات میں غمخوار ہوتی ہیں یہ بہنیں
ملتی ہے جب ان کے بھیا کو خوشی کوئی
مت پوچھو کتنا سرشار ہوتیں ہیں یہ بہنیں
اٹھ جائے اگر سر سے سایہ کبھی ماں کا
تب ماں کا کردار ہوتی ہیں یہ بہنیں
رحمت کہا جن کو رب نے اور نبیؐ نے
کیوں آج پھر لاچار ہوتی ہیں یہ بہنیں
سچ ہے کہ خزاؤں کے موسم جب آئیں
سمجھو تو اک بہار ہوتی ہیں یہ بہنیں

فاروق وہ لوگ جاہل ہیں گنوار ہیں
جو کہتے ہیں بے کار ہوتی ہیں یہ بہنیں
عمر فاروق ارشد.....فورٹ عباس

غزل

پردیس کو جانا تو ہے آبا کی نشانی
سادات میں ہجرت کی روایت ہے پرانی
کچھ روز رہا موسم گل میرے بھی اوپر
دو چار قدم آئی مرے ساتھ جوانی
ہم جس کے کنارے تھے کسی شام کو بیٹھے
یاد آئے مجھے اج بھی اس نہر کا پانی
تنہائی کا عالم ہے تسلی نہ دلاسہ
پردیس میں دکھنے لگی اک چوٹ پرانی
مایوس نہ ہوجاؤں کہیں اپنے خدا سے
اس نے بھی اگر آج مری بات نہ مانی
رضوان تجھے دوست بہت یاد ہیں کرتے
اے کاش نہ کرتا تو کبھی نقل مکانی
سید رضوان حیدر گردیزی.....مسقط، عمران

غزل

بات کرنے سے حل نکلتا ہے
آج سے جیسے کل نکلتا ہے
میرے پیارے مرا تری جانب
ایک خوشیوں کا پل نکلتا ہے
ایسے نکلا توئی مرے دل سے
پھول سے جیسے پھل نکلتا ہے
زر، زمین اور زن مین سے کوئی
وجہ جنگ و جدل نکلتا ہے
کوئی تو ہے سبب محبت کا
کوئی وجہ غزل نکلتا ہے
تیرے جیسے ہوئے کئی کامی
یار ہی بے بدل نکلتا ہے
سید کامی شاہ.....کراچی

غزل

جس کو اکثر سوچا تھا تھا تنہائی میں
شامل ہے وہ شخص میری رسوائی میں
مجھ سے مت پوچھو وہ چہرہ کیسا تھا
ڈوب گیا میں آنکھوں کی گہرائی میں
جاگتے رہنے کی کتنی ترغیبیں تھیں
اس کی بوجھل تھکی ہوئی انگڑائی میں
وہ اک پل کو روٹھا تو محسوس ہوا
جیسے، بیت گیا اک سال جدائی میں
جاؤ اپنے جیسے لوگ تلاش کرو
کیا پاؤ گے محسن سے ہرجائی میں
کلام: محسن نقوی
انتخاب: انتخاب فلک شیر ملک.....رحیم یار خان

غزل

خواب ہو یا خواب کی تعبیر ہو
تم مری بگڑی ہوئی تقدیر ہو
مدتوں کے صبر کا پھل وصل ہے
وصل مین پھر آج کیوں تاخیر ہو
سوچتا رہتا ہوں تجھ کو دیکھ کر
عشق میں اب کچھ نئی تعمیر ہو
گلستان، صحرا ہو یا دریا ہو تم
خواب ہو سایہ ہو یا تصویر ہو
ہاتھ میں لینا ہے تیرا ہاتھ بس
پھر بھلے ہر جا مری تشہیر ہو
یوں تو پابندی نہیں تجھ پر کوئی
پائے نازک میں مگر زنجیر ہو
ہوگا کیونکر دل تمہارا مطمئن
سولی پہ لٹکے کو کیا تعزیر ہو
وہ شریک جرم تھا عاطف مگر
معتبر یوں ہے کہ جیسے پیر ہو
عاطف محمود.....راولپنڈی

غزل

کون بچھڑا، ملا کچھ خبر ہی نہیں
عشق سے ماسوا کچھ خبر ہی نہیں
بے خبر ہیں کبھی روز محشر سے یہاں
کیا سزا کیا جزا کچھ خبر ہی نہیں
اس کو پڑھتے ہوئے سو گیا رات میں
بعد ازاں کیا ہوا کچھ خبر ہی نہیں
فون سنتا نہیں موڈ دیتا نہیں

کس لیے ہے خفا کچھ خبر ہی نہیں
نسخہ ہائے وفا، فیض کا پڑھ لیا
پڑھ کے کیوں رو پڑا کچھ خبر ہی نہیں
میں تو مدہوش تھا مرتضیٰ کی قسم
تیر کیسے لگا کچھ خبر ہی نہیں
عدیل مرتضیٰ......لاہور

غزل
یہ آرزو تھی جو میری جستجو کرتا
چپ چاپ سے خود کو میرے روبرو کرتا
گرچہ وہ مجھ سے مانوس بہت تھا
تھی ناراضگی اگر میرے دو بدو کرتا
ہر بار کم گوئی میرے آڑے آئی
میرا سکوت توڑ کر مجھے سرخرو کرتا
ما سوائے اس کے اور کچھ بھی نہیں
میری چاہتوں کو یوں نہ لہو لہو کرتا
کیوں اب باقی اوصاف تکلم نہیں رہے
مجھے پاس تو بلاتا اور گفتگو کرتا
لہجوں کے مفہوم سے ناآشنا سیف جو تھا
اپنے انداز سے رویوں سے نہ بے آبرو کرتا
سیف الاسلام......لیاقت آباد، کراچی

غزل
میرے دل کے زخموں کی دوا ہوا کرتا تھا
اک شخص محبت کی انتہا ہوا کرتا تھا
میں بھول جاتا تھا دنیا کی سب عداوتیں
چہرہ اس کا جب آغوش میں ہوا کرتا تھا
کھلتے تھے ہزاروں رنگ
میرے چہرے پہ
وہ اپنی سانسوں کے بھنور سے جب چھوا کرتا تھا
اب جو بچھڑا تو اک جمود سا طاری ہے مجھ پر
میں تو اس کی سانسوں سے جیا کرتا تھا
کڑی دھوپ میں بے آسرا چھوڑ گیا مجھ کو
کبھی جو چھاؤں میں کبھی سائباں ہوا کرتا تھا
دل توڑا، زخم دیے، الزام بھی دے گیا مجھ کو
وہ شخص دیکھنے میں تو سادہ سا ہوا کرتا تھا
میں تو آج تک ان ہی آنکھوں کا طلبگار ہوں صاحب
وہ نہ مانے میں تو اس کی امانت ہوا کرتا تھا

اب تو اسے اک لمحہ بھی گوارا نہیں مرے سنگ تابش
وہ تو ساتھ مرے جینے مرنے کی دعائیں کیا کرتا تھا
ڈاکٹر علی حسنین تابش......چشتیاں

غزل
کوئی سکھ نہیں ملا بچھڑ جانے سے
کیسے کیسے غم ملے ہیں پھر زمانے سے
بدل نہیں سکتے ہم زندگی کا معیار بھی
کوئی خوشی نہیں ملی ہمیں اسے پانے سے
دامن میں اپنے آنسوؤں کی برسات ہو جیسے
فائدہ کیا کسی کو پھر حال دل سنانے سے
نام اپنا کب آئے گا پھر سے بہاروں میں
کیا حاصل دامن ہیں یوں پھول سجانے سے
ناکام ہے زندگی مفلسی کے موڑ پر جاوید
اندھیرے ہی راس آئے ہیں چراغ جلانے سے
محمد اسلم جاوید......فیصل آباد

غزل
زندگی خود سے بھی ہے خفا ان دنوں
درد شدت سے بڑھنے لگا ان دنوں
یہ بھی ممکن ہو اگلا سفر ہو قریب
دم جو اندر ہے گھٹنے لگا ان دنوں
چاند تاروں کی جھلمل بھی بجھنے لگی
دل پہ چھائی ہے کالی گھٹا ان دنوں
وہ ازل سے لا علم ہم سے مگر
اور بڑھنے لگی ہے جفا ان دنوں
جس کا دنیا جہاں سے تعلق رہا
ہو گیا خود سے ہی لا پتہ ان دنوں
ایک نقطہ ہے عرشی جو مٹ جائے گا
زندگی کا بھروسہ کیا ان دنوں
عرشیہ ہاشمی......آزاد کشمیر



آخری حصہ

زادِ سفر

ناصر ملک

زندگی ایک سفر ہے اور یہ سفر ہے کٹھنائیوں کا جسے ہر ذی نفس نے طے کرنا ہے۔ ہر سفر کے لیے قدرت زادِ سفر مہیا کرتی ہے جو نہ صرف سفر کی دلچسپی کا سبب بنتا ہے بلکہ سانس بہ سانس، جو بہ جو گامزن رہنے کی مکمل ترغیب کا درجہ بھی رکھتا ہے۔ وہ معاشرے کا ایک روتا ہوا کردار تھا جسے قدرت نے طویل سفر اور زادِ سفر مہیا کر کے دنیا کے اونچے نیچے راستوں پر روانہ کر دیا تھا۔ سماج ہر موڑ پر اس کے سفر کو کھوٹا کرنے کے درپے تھا جبکہ اس کی سوچ اس کے آہنی وجود کی طرح پختہ اور مستحکم تھی۔ گوشت پوست کا انسان ہوتے ہوئے اسے پتھروں سے سر ٹکرانا اور اپنا زادِ سفر بچانا تھا۔ وہ قدم بہ قدم سنبھل کر رکھتے ہوئے چلتا رہا، ٹھوکریں کھا کر سنبھلتا رہا اور اپنی گٹھڑی کی دل و جان سے حفاظت کرتا رہا۔

وہ پہلے پڑاؤ پر کامیابی سے پہنچ گیا تو اس سے پہلا سفر اور پہلا زادِ سفر چھین کر نئی مسافتیں اور نیا رختِ سفر تھما دیا گیا۔

لمحہ بہ لمحہ اپنے سحر میں جکڑتی ہوئی داستان، جذبات و محسوسات جیسی آپ کی محبوب قلم کار ناصر ملک نے کسی اور ہی کیفیت میں رقم کیا

یکبارگی سے اُس کا دل دھڑک اُٹھا۔ چہرے پر نخوت سج گئی۔ ایک نگہِ تنفر سمیرا پر ڈالی اور کوئی جواب دیے بغیر گھر میں داخل ہو گئی۔ چینج لینے کے بعد پرچی کو کھول کر پڑھنے لگی۔ لکھنے والا، سمیرا کا بھائی کامران افضل، دل کو پرچی پر سجائے، اپنے جذبات کی سچائیوں سے قائل کرنے کی بھرپور کوشش کر رہا تھا۔ اُس نے خوبصورت اندازِ تحریر میں باور کرایا تھا۔ ''میرے مستقبل میں اندھیرا ہی اندھیرا ہے۔ روشنی کی کرن بن کر تم چمکی ہو اور مجھے یقین ہے کہ اگر میرے مدِنظر تمھارے جیسا خوبصورت انعام رکھ دیا جائے تو میں کرکٹ کی تیز پچ سے لے کر زندگی کے پُر ہجوم اسٹیڈیم تک کامرانیوں کے جھنڈے گاڑتا جاؤں گا۔ تم اپنے دُنیا سے پیارے وجود کو میرے مستقبل کے ساتھ منسلک کر کے اپنے چاہنے والے پر عظیم احسان کر دو۔''

اُس کے تنفس کا اعتدال گڑبڑا گیا۔ سوچ میں پڑ گئی۔ کامران کو اُس نے ایک مرتبہ دیکھا تھا جب ایک صبح راستے میں اُس نے اپنی موٹر سائیکل روک کر سمیرا کو بلایا تھا۔ کوئی بات کی تھی۔ پھر ایک طائرانہ نگاہ بانو اور صدف پر ڈال کر چلا گیا تھا۔ اُسی دِن سمیرا نے اُسے بتلایا تھا۔ ''کامی بھیا پر کرکٹ کا جنوں سوار ہے۔ روز و شب کھلاڑیوں کی باتیں کرتا رہتا ہے، اپنا جیب خرچ کرکٹ کا سامان خریدنے پر صرف کرتا ہے اور پڑھائی پر توجہ نہیں دیتا۔ پچھلے سال سالانہ کھیل میلہ میں اُسے محکمہ اسپورٹس کے صوبائی صدر نے پانچ ہزار روپے بہ طور انعام دیے تھے۔ تب سے اَب تک اُس کے کمرے میں ٹرافیوں کی تعداد بڑھی ہے یا اَبو کی جھڑکیوں میں اضافہ ہوا ہے۔ اَبو اُسے پولیس آفیسر بنانا چاہتے ہیں جبکہ وہ قومی ٹیم میں شامل ہو کر پوری دُنیا کی پروازیں کرنا چاہتا ہے۔''

بانو کو اخبارات کے رنگین صفحات پر چھپی کرکٹ کے کھلاڑیوں کی تصویریں اچھی لگتی تھیں۔ بے سبب دیکھتی رہتی تھی۔ جب اُسے پتہ چلا کہ کامران ڈویژنل لیول پر اپنے نام کے چوکے چھکے لگا رہا ہے تو اُس نے خوشی کا اظہار کیا۔ سمیرا کو سمجھانے کے سے انداز میں کہا۔ ''وہ اگر کرکٹ میں اپنا نام پیدا کرنا چاہتا ہے تو اُسے روکنا اُس کے مستقبل کے ساتھ کھیلنے کے مترادف ہوگا۔ تم اُس کا مقدمہ اپنے باپ کی عدالت میں کامیاب وکیل کی طرح لڑ سکتی ہو۔ اگر تمھارا بھائی قومی کرکٹ ٹیم میں سلیکٹ ہو گیا تو سمجھو، تمھارے سامنے بھی آٹوگراف بکس کی لائن لگ جائے گی۔''

سمیرا نے اپنے بھائی کے شوق کا مقدمہ باپ کی عدالت میں پیش کیا یا نہیں، اُس کے عشق کا مقدمہ بانو کی میز پر پٹخ دیا تھا۔ وہ ہتھیلی کے گداز میں گدگدیاں کرتی پرچی کو مٹھی میں دبائے اپنی کتابوں کی الماری تک گئی، چند پُرانے اخبارات نکال کر چارپائی پر بیٹھی اور کھلاڑیوں کی تصویروں کو انہماک سے دیکھنے لگی۔ پچھلے دِنوں جب قومی ٹیم آسٹریلیا میں ناکام سیریز کھیل کر وطن واپس پہنچی تھی تو ملک کے تمام اخبارات میں ٹیم کی ناقص کارکردگی پر سیر حاصل تبصرے شائع ہوئے تھے۔ وہی اخبارات اُس کے سامنے چارپائی پر پھیلے ہوئے تھے۔ اُسے تحریر سے کوئی سروکار نہیں تھا، اُسے تو محض شہرت کو اُجاگر کرتی، ہنستی مسکراتی اور فاتحانہ انداز میں کھنچوائی گئی تصویروں سے غرض تھی۔ ٹیم کا ہارا ہوا کپتان مسکرا کر کوئی بات کر رہا تھا، ہاتھ پھیلے ہوئے تھے اور آنکھیں بانو پر جمی ہوئی تھیں۔ وہ سوچ میں پڑ گئی۔ ایسے میں تصویر کے بار ہا دیکھے ہوئے خال و خد بدلنے لگے۔ ایک نئی تصویر اُبھر آئی۔ تیکھے نقوش، گھنگریالے بال اور سیکوئیل ہونٹ...... متجسس آنکھوں کی فطری چمک اور چمک میں ڈوبتا ہوا اپنا بے دھیان وجود...... یوں لگا جیسے پوری دُنیا ویکیوم ہوم بن گئی ہو اور وہ سانس کے احتیاج کے بغیر اکیلی چکراتی پھرتی ہو۔

اخبار کے اسپورٹس کے صفحے پر چھپی ہوئی تصویر کی مونچھیں نہیں تھیں مگر اُسے جو تصویر دکھائی دے رہی تھی اُس میں پُرکشش مونچھیں اُگی ہوئی تھیں۔ بے دھیانی میں بُڑبڑائی ''نہ جانے ہمارے کرکٹرز کو مشہور ہوتے ہی مونچھوں سے کیا دُشمنی پیدا ہو جاتی ہے۔ کامران بھی چاند تارے والی سبز کٹ پہن کر اولین فرصت میں اپنی نوک پلک سنوارنے کے لیے ہیئر ڈریسر کا تختۂ مشق بن جائے گا۔''

اُس نے چائے بنائی۔ چھوٹے چھوٹے گھونٹ حلق میں اُتارتے ہوئے کامران کے بارے میں سوچنے لگی۔ وہ خوبصورت تھا۔ اُس سے عمر میں سال بھر چھوٹا تھا۔ پڑھا لکھا اور سمیرا کے بہ قول کھلنڈرا جوان تھا۔ کہیں اُس کی محبت کو بھی کھیل کھیل میں برباد نہ کر دے۔ کھلاڑی تمام عمر ایک ہی میچ نہیں کھیلتا۔ ایک میچ جیتتا ہے تو ہارنے کے لیے

دوسرے میدان میں اُتر جاتا ہے۔ ہارنے کے بعد جیت اُسے اپنی جانب بلانے لگتی ہے اور وہ کچی ڈور سے بندھا کھنچنے لگتا ہے۔ وہ اُسے جیتنے کے بعد کسی اور محبت کے کھیل کا حصہ بن گیا تو؟...... ایسے میں دِل نے سمجھایا۔ ''تم جیسی خوبصورت لڑکی دُنیا میں کہیں نہیں۔ تمھیں جیتنے کی خواہش رکھنے والا اپنا دِل ہار بیٹھتا ہے اور ہارا ہوا دِل کبھی فتح کے چکر میں آگے نہیں بڑھ پاتا۔ کامران کا مستقبل روشن ہے۔ تمھیں بھی روشنی سے حصہ ملے گا۔ لوگ ایڑیاں اُٹھا اُٹھا کر تمھیں دیکھا کریں گے۔ وی آئی پی اِن کلوژر میں تھر کتے ہوئے تمھارے وجود پر ٹی وی کیمرے ہر چند منٹ بعد فوکس ہونے لگیں گے اور کئی ہتھیلیاں بساط بن کر پھیل گی اور دستخطوں کے مہرے طلب کریں گی اور......اور......''

جاگتی آنکھوں میں اچانک بھرنے والے خوابوں کا سلسلہ دراز ہوتا گیا۔ اُس شام میں وہ اپنے اسٹوڈنٹس کو پوری توجہ کے ساتھ نہیں پڑھا پائی۔ دِل تنہائی یا نگ رہا تھا، آنکھ اَدھورے سپنوں کا سچا سپنا طلب کر رہی تھی اور بدن اپنی حدت پر تپنا چاہتا تھا۔ وہ کبھی دانستہ، کبھی نادانستہ دماغی لیک سے آنکھیں چُراتی رہی، سورج کے افق میں اور اپنے بستر میں اُترنے کا انتظار کرتی رہی۔ جب کھانا کھا کر بالی لیٹ گیا تو اُس نے اپنی من چاہی بساط سجا لی۔ دونوں جانب اپنے ہاتھ، اپنے مہرے اور اپنی ہی سوچ کارفرما تھی مگر کھیلی جانے والی عشق بازی پر اپنی دسترس ٹھہرتی دکھائی نہیں دی تو قدرے دلبرداشتہ ہو کر سو گئی۔

کالج جانے کو جی نہ مانا۔ سمیرا کی مخصوص دستک کو پہچانتی تھی۔ دروازہ کھولا تو شرارتی نظروں سے سمیرا کو گھورتے پایا۔ بلاوجہ لہجہ سخت کر کے بے رُخی سے بولی۔ ''میں آج کالج نہیں جاؤں گی۔ تم اکیلی ہی چلی جاؤ۔''

سمیرا نے مسکرا کر پوچھا۔ ''کیوں؟ کوئی خاص وجہ ہے کیا؟''

وہ پلٹتے ہوئے بولی۔ ''آج میری طبیعت پڑھنے پر مائل نہیں ہے۔''

''چند سطروں کے سبق پر ہی تمام دِن گزارا کرو گی؟'' سمیرا کا لہجہ خاصا شوخ تھا۔

اُس نے کوئی جواب نہیں دیا بلکہ دروازہ چھوڑ کر کمرے میں آ گئی۔ سمیرا اُس کے پیچھے چلی آئی۔ بالی ورکشاپ جانے کی تیاری کر رہا تھا۔ سمیرا کو دیکھ کر قمیص کے بٹن بند کرتے ہوئے کمرے سے نکل گیا۔ سمیرا بولی۔ ''میں نے کچھ پوچھا ہے تم سے؟''

وہ چونک کر پلٹی۔ سمیرا کو اپنے کمرے میں دیکھ کر بولی۔ ''کیا تم کسی لڑکے سے محبت کرتی ہو؟''

سمیرا ایک ذرا ٹھٹک کر بولی۔ ''نہیں تو...... تمھیں کس نے کہا ہے؟''

''مجھے کسی نے کچھ نہیں کہا، میں تو ویسے ہی پوچھ رہی ہوں۔'' بانو نے قدرے چبھتے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''ہر کامیاب انسان کے پیچھے کسی عورت کا ہاتھ کارفرما ہوتا ہے۔ تم نے اپنی ہتھیلیوں کو کسی پشت پر کیوں نہیں رکھا؟''

سمیرا کچھ نہ سمجھتے ہوئے حیرانی سے بولی۔ ''کیا میں تمھیں ایسی ویسی دکھائی دیتی ہوں؟''

''میں نے تمھیں غور سے دیکھا ہی نہیں تھا۔ دیکھا تو حیران ہو گئی۔ تم اپنے بھائی کے خط اُٹھائے پھرتی ہو، اپنی دوستوں کو بھائی کے دام میں پھانستی پھرتی ہو، کیا ہو تم؟'' بانو کی آواز میں خنکی اُتر آئی۔ ''تم ایسی ویسی دکھائی نہیں دینا چاہتی ہو، مجھے ایسا ویسا بنانا چاہتی ہو۔ یہ منافقت تم نے اپنی اور میری دوستی کے بیچ میں کیوں کر حائل کر رکھی ہے؟''

سمیرا کا سر شرم سے جھک گیا۔ اپنی صفائی دیتے ہوئے بولی۔ ''بانو! طعنوں میں کچھ احتیاط برتو۔ میرا بھائی ایسا آدمی نہیں ہے۔ جس سے تعلق رکھنے پر تمھیں کسی شرمساری کا سامنا کرنا پڑے۔''

''تو پھر اپنے لیے بھی کوئی کامران کے جیسا مَر دتلاش کر لو اور کسی شرمساری کے بغیر کامیاب عشق کرو۔ خدارا! مجھے معاف رکھو۔ میں ایسے ویسے کسی بھی تعلق کی روادار نہیں ہوں۔'' بانو کا لہجہ بے حد خشک ہو گیا۔ سمیرا کا حال دِگرگوں تھا۔ کاٹو تو بدن میں لہو نہیں کے مصداق ایک دَم نادم اور پریشان ساکت کھڑی بانو کو ٹکر ٹکر دیکھنے لگی۔ پھر کوئی راہ نہ پا کر دونوں ہاتھ جوڑتے ہوئے لجا کر بولی۔ ''بانو پلیز! مجھے معاف کر دو۔ میں اپنے بھائی کی حالت زار دیکھ کر خود پر قابو نہیں پا سکی اور پیغام رَساں بن کر تم تک پہنچ گئی۔ آئی ایم ویری ساری!''

بانو نے اُس کے بندھے ہوئے ہاتھ آہستگی سے کھولتے ہوئے اپنی پیشانی پر پڑے ہوئے بَل کھول دیے۔ ہولے

سے بولی۔ ''سمیرا! تمھارا بھائی بہت اچھا انسان ہے۔ اُس کا مستقبل برباد نہیں ہونا چاہیے۔ اُسے سمجھاؤ، ابھی بچہ ہے، بچہ ہی رہے تو اچھا ہے ورنہ اپنی منزل کھو بیٹھے گا۔''

سمیرا نے تفہیمی انداز میں سر ہلایا، ندامت سے بانو کے پاس بیٹھا نہ گیا تو کالج سے تاخیر ہونے کا بہانہ کر کے فوراً گھر سے نکل گئی۔

اُس کے جانے پر بانو کے دِل کو ملال ہوا۔ اُس کا رویہ بہت نازیبا تھا۔ پشیمانی ہوئی، اسے اتنی درشتی سے پیش نہیں آنا چاہیے تھا۔ سمیرا نے کوئی نیا کام نہیں کیا تھا۔ اس سے پہلے، ہجرتوں کے اَن تھک سفر کے ایک موڑ پر بالی کا ایک نائیک رفیع اللہ اُس کی جوانی کی اَن چھوئی چادر اوڑھنے کے لیے اپنی بے تابیاں دکھا چکا تھا۔ اُستاد جاناں کی زبان پر اُس کے جواں سال بیٹے کی آنکھیں چیک کر نظروں کے وار کر چکی تھیں۔ ایسا ہی ایک پتھر اُس کی زندگی کی غیر ارتعاش پذیر جھیل میں عینی نے پھینکا تھا۔ فصیلِ جاں کو دیدہ دلیری سے توڑنے والے اُس پتھر پر شہزاد کا نام لکھا ہوا تھا جو روزنِ جان سے آج بھی چپکا ہوا تھا۔ دستکوں کے شور میں دروازے پر پڑنے والی شاہ سائیں کی ہذیانی ٹھوکروں کو بھی بہ صد کوشش اُبھی تک فراموش نہیں کر پائی تھی۔

پُر ملال کیفیت میں عینی کی چھیڑ خانی یاد آئی۔ وہ کہا کرتی تھی۔ ''بانو! تمھارا حسن ہر دیکھنے والی نظر سے خراج مانگتا ہے۔ کسی ہزارویں نظر کا نصیب پھوٹے گا تب کہیں جا کے تمھارے دِل میں عشق کا شگوفہ پھوٹے گا۔''

اُس کے لبوں سے آہ نکلی۔ ''ہائے عینی! تم نے سچ کہا تھا۔ میرے من میں عشق کی جوت جگی، تمھارے بھائی نے جھنجوڑ کر جگا دیا تھا اور میں آج تک رَت جگوں کے عذاب جھیلنے کے لیے ہر شب تڑپتی رہتی ہوں۔ اَب اُس جوت پر کامران کی انگلیاں گدگدانے لگی ہیں۔ میں آگے بڑھوں گی تو وہ شہزاد کی طرح پیچھے ہٹنے لگے گا۔ بہتر ہے میں پسپائی میں رہوں اور خاموش رہ کر اُسے پیش قدمی پر مجبور کرتی رہوں۔ ایسے ہی کچھ وقت اچھا گزر جائے گا۔''

وہ دِن بھر آنکھ مچولیوں کی زد میں رہی۔ کامران کو سوچتی تو شہزاد کی یاد ستانے لگتی۔ شہزاد کے تصور کو کامران ادھورا رکھنے پر بہ ضد ہو جاتا۔ اُس نے عینی سے فون پر رابطہ مانگا۔ مسڈ کال کے جواب میں فوراً عینی نے کال کی۔ ''ہیلو بانو! کیا کالج سے بول رہی ہو؟''

وہ بولی۔ ''نہیں بلکہ ایک ٹیوٹر کے دیے ہوئے سبق کو ازبر کر رہی تھی۔ وہ میری محبت کی بیساکھی بغلوں میں دبا کر منزل کی طرف سرپٹ دوڑنا چاہتا ہے۔ بے چارہ یہ نہیں سمجھتا کہ منہ زور جوانی کو بغل میں دبا کر ایک قدم چلنا بھی محال ہو جاتا ہے۔''

''ارے بانو! یہ تم کیا کہہ رہی ہو۔ پھر کسی نے خوش نما پتھر سے سر پھوڑنے کی کوشش کر ڈالی ہے کیا؟'' عینی نے چیخ کر کہا۔ ''فلسفہ بگھارنے کی بہ جائے تفصیل کے ساتھ بتلاؤ۔ میں اِس وقت کلاس روم میں ہوں اور وائڈ اسپیکر پر تمھاری پرانی سہیلیاں تمھارے نئے رومانس سے محظوظ ہونا چاہتی ہیں۔''

وہ جھینپ کر بولی۔ ''یعنی تم میرے جذبات کو اشتہار بنانا چاہتی ہو۔ بہت کمینی ہو تم...... میں فون بند کر رہی ہوں۔ رات میں مجھے کال کرنا۔ سننے والیوں کو میرا سلام دینا اور بتا دینا کہ میں اچھے حال میں ہوں۔ اچھا خدا حافظ!''

اُس نے کال منقطع کر دی اور شرمائے سے انداز میں مسکرا کر فون 'پاورڈ آف' کر دیا۔ جانتی تھی کہ عینی تنگ کرنے سے باز نہیں آئے گی اور کال کرتی رہے گی۔

☆  ☆

بانو کے پاس بانڈز کی شکل میں کافی رقم جمع ہو گئی تھی۔ چونکہ بالی کی آمدنی بھی معقول ہو چلی تھی، اِس لیے اُس نے جمع شدہ رقم میں سے گھر کا کچھ سامان خریدا اور اپنی دیرینہ خواہش کے مطابق تھوڑی بہت گھر کی آرائش بھی کر لی۔ بہت خوش ہوئی جب گھر نے قدرے معقول صورت اختیار کر لی۔ اُس نے اولڈ فرنیچر ہوم سے مطالعہ کی میز اور کرسی سمیت ضروری فرنیچر بھی خرید لیا تھا۔ اپنی ہر خریدی جانے والی شئے کو پُر جوش انداز میں متعدد جگہوں پر رکھ کر نظارہ کرتی۔ بعض چیزوں کو تو اُس نے پورے گھر کی سیر کروائی تھی۔ بالی اُس کے دیوانہ پن کو دیکھ کر جھوم جاتا۔

اتوار کی چمکیلی اور فراغت بھری صبح میں جب وہ کھلے صحن میں کرسی پر بیٹھی کسی نصابی کتاب کا مطالعہ کر رہی تھی، دروازے پر دستک ہوئی۔ اُسے سمیرا یا صدف کے آنے کی توقع تھی۔ دروازہ کھولنے پر جونہی اُس کی نگاہ گلی میں کھڑے کامران پر پڑی، وہ بُری طرح چونک گئی۔ دل کے بند

دروازے پر پیار کی دستک دینے والا گھر کے دروازے تک آن پہنچا تھا۔ وہ گھبرا گئی۔ خود پر قابو پانے کی بہتیری کوشش کی مگر آواز کی لرزش نے بھرم گنوا دیا۔ ''جی فرمائیے!''

''مم...... میں سمیرا کا بھائی ہوں۔ کامران افضل!'' وہ کچھ گڑبڑایا، پھر سنبھل گیا۔ وفورِ شوق سے ادھ کھلے دروازے میں کھڑی بانو کو دیکھنے لگا۔ پہلے دور سے دیکھا کرتا تھا۔ آج رُوبرو تھی۔ جی بھر کر دیکھنے کی آرزو تھی۔ پوری ہونے سے پہلے ہی وہ دروازے کی اوٹ میں چھپ گئی۔ اجنبیت بھرے انداز میں بولی۔ ''بابا دکان پر ہے، شام کو آئے گا، تم بھی شام میں آ جانا۔''

''مگر میں تم سے ملنا چاہتا ہوں۔'' کامران کا لہجہ بڑا شائستہ تھا۔

وہ بولی۔ ''مجھ سے کیوں ملنا چاہتے ہو؟''

''تم یہ خوبی جانتی ہو۔ جاننے کے باوجود پوچھنا چاہتی ہو تو میں اپنی بات دُہرا سکتا ہوں۔'' اُس کے چٹانوں جیسے مضبوط لہجے نے بانو کو لرزا دیا۔ وہ دھیمے لہجے میں اپنے پختہ عزم کا اعادہ کر رہا تھا۔ ''تمہیں دیکھنے کے بعد میں خود پر قابو نہیں رکھ پایا۔ سمیرا نے تمھارے جواب سے آگاہ کر دیا تھا مگر میں تمھارے انکار پر کبھی بھی یقین نہیں کروں گا بلکہ اِسے اقرار میں بدلنے کی کوشش کرتا رہوں گا۔ آج کل یا زندگی کے کسی روز تم پر اپنی حقیقت ثابت کر دوں گا۔ تم مجھے صرف اتنا بتلا دو کہ تم کسی کو چاہتی ہو یا نہیں؟''

وہ کوئی جواب دیے بغیر دروازہ بند کرنا چاہتی تھی مگر کامران نے ایک کواڑ تھام لیا۔ لجاجت بھرے لہجے میں بولا۔ ''پلیز بانو! مجھے غلط نہ سمجھو۔''

وہ کمزور ہو رہی تھی، تبھی پیچھے ہٹ رہی تھی مگر ہٹ نہ پائی۔ مجبوراً بولی۔ ''تم مجھ سے کیوں یہ پوچھ رہے ہو؟''

''اس لیے کہ اگر تم کسی ذات میں دلچسپی رکھتی ہو تو میں تمھارے جذبات کو اپنی خواہش پر مقدم رکھتے ہوئے پیچھے ہٹ جاؤں گا۔'' وہ بولا۔

اُس کا لہجہ بالکل شفاف اور منافقت سے عاری تھا۔ اتنا کہ وہ جھوٹ بھی نہ بول پائی۔ ایک ذرا جھجک کر بولی ۔ ''میں کسی میں دلچسپی لیتی ہوں اور نہ ہی لینا چاہتی ہوں۔ کوئی دیکھ لے گا اور مجھ پر حرف آئے گا، اِس لیے چلے جاؤ اور مجھے ڈسٹرب مت کرو۔''

کامران نے شوق بھری نگاہ ڈالی اور کواڑ چھوڑ دیا۔ پلٹ کر جاتے ہوئے چند پَل کے لیے تھما، پیچھے دیکھے بغیر دھیمی آواز میں بولا۔ ''میں نے تمھاری مصروفیات کو جانچا ہے، تم دو بجے سے چار بجے تک گھر میں اکیلی ہوتی ہو، اجازت دو تو تمھیں اِس وقت فون کر لیا کروں۔''

بانو نے کوئی جواب نہیں دیا۔ دروازہ بند کر کے پلٹ کر بند کواڑوں سے ٹیک لگا کر کھڑی ہو گئی۔ جانے والا چلا گیا تھا۔ اپنے وجود کی لرزیدہ پرچھائیاں آنکھوں میں چھوڑ گیا تھا۔ لمبی لمبی سانسیں لیتے ہوئے دل کی بے قراریوں کو تھپکنے لگی۔ کامران اُسے بُرا نہیں لگا تھا۔ اُس کی گفتگو کا انداز بڑا دل نشیں تھا۔ بات کرتے ہوئے سیدھا دل میں اُترتا جاتا تھا۔ عقب میں مدھم سی سرگوشی گونجی۔ ''بانو! اپنے چاہنے والے پر دروازہ بند کر کے دروازے سے لگ کر کھڑی ہونے والی دل میں چور رکھتی ہے۔ تمھارے دل میں بھی میری محبت کا چور گھس گیا ہے۔ بے عزت کر کے دل سے نکال بھگاؤ گی تو دل عمر بھر ویران رہے گا۔ سنبھال کر رکھو گی تو ہمیشہ پیار کی زبان میں دھڑکتا رہے گا۔ اچھا! میں چلتا ہوں۔''

کامران نے اُس کی چوری پکڑ لی تھی۔ بے ساختہ اُس کے لبوں سے نکلا۔ ''ہائے اللہ!'' اور وہ گھبرا کر دروازے سے ہٹ گئی۔ بھاگتے ہوئے اپنے کمرے میں گھس گئی۔ اپنی اسٹڈی ٹیبل پر بانہیں پھیلائیں اور بانہوں پر پیشانی ٹکا کر خود پر قابو پانے کی کوشش کرنے لگی۔ ایسے میں حسن بے سبب گستاخ ہو گیا۔ ریشمی سوتوں پر بندھا ہوا جوڑا کھل گیا۔ اسٹڈی ٹیبل پر ژولیدہ زلفیں مچل گئیں۔ اُس نے ایک ہاتھ پھیلا کر سرسراتے بالوں کو میز کے شیشے پر مزید پھیلا دیا، بے دردی سے الجھا دیا۔ دل گدگداتے ہوئے چھیڑنے لگا۔ ''بند کواڑوں کے پیچھے سے دیکھنے کی طاقت رکھنے والے عاشق کو بلاؤ، الجھی ہوئی لٹوں کو سلجھائے اور دن کے اُجالے پر رات طاری کر دینے والی زلفوں کو سمیٹ دے۔ خود سمیٹو گی تو اپنے باغی حسن کی توہین کرو گی۔''

جوانی ایسی ہی ہوتی ہے۔ جذبات کی جھیل میں پتھر گر کر ڈوب جاتا ہے مگر جوانی اپنی مضطرب انگلیوں سے سطح آب پر ارتعاش بکھیرتی رہتی ہے۔ اُس نے سر اُٹھایا۔ شیشے میں اپنا دھندلایا ہوا سرمئی عکس دکھائی دیا۔ چند ہی لمحوں میں عکس بدل گیا۔ کامران دکھائی دینے لگا۔ اُس کی چمکیلی اور

متجسس آنکھیں اُسے گھورنے لگیں۔ ہونٹ لرز کر 'بانو' کا لفظ گویائی کے سوت سے بننے لگے۔

اُس نے وارفتگی میں لہرا کر اپنے ہی ہونٹوں پر ہونٹ رکھ دیے۔ سچ کہتے ہیں، ہر ٹھوکر اَن گنت ٹھوکروں سے بچا دیتی ہے مگر عشق کی پہلی بھول، بھول بھلیوں کی اتنی طویل غلام گردش کو قدموں سے لپیٹ دیتی ہے کہ زندگی سوختہ گردشوں کی نذر ہو جاتی ہے۔ پہلے سوچا کرتی تھی کہ شہزاد کے بعد اُس کی زندگی میں کوئی مَرد نہیں آئے گا۔ آج سمجھ میں آنے لگا تھا کہ خالی گھر میں کوئی بھی وارد ہو سکتا ہے۔ شہزاد کے ہاتھوں کھلنے والا دروازہ عبور کر کے کامران اُس کے دل کی سلطنت میں قدم رکھ چکا تھا۔ اَب وہ خواہ دروازہ بند کرتی، کھلا رہنے دیتی، دستک دیے بغیر آنے والا کبھی نہ جانے کے ارادے سے براجمان ہو چکا تھا۔

اُس نے دانستہ طور پر دو سے چار بجے تک اپنا موبائل فون 'پاورڈ آف' رکھا۔ جانتی تھی کہ آس کے گھوڑے پر سوار ہو کر جانے والا عاشق اپنی مضطرب انگلیاں دستک کے لیے بڑھاتا رہے گا۔ بچوں کو ٹیوشن دینے کے بعد فارغ ہوئی تو سمیرا اور صدف آ گئیں۔ وہ تھوڑی دیر کے لیے بیٹھیں پھر چلی گئیں۔ بانو کو اپنے اور بالی کے لیے کھانا تیار کرنا تھا۔ کسل مندی کے ساتھ اُٹھی اور باورچی خانے میں اُلجھ گئی۔

بالی ورکشاپ سے لوٹا تو خاصا ست دکھائی دے رہا تھا۔ بانو نے دریافت کیا تو طبیعت کی ناسازی کا بہانہ کرنے لگا۔ کھانا بھی رغبت سے نہیں کھایا تو بانو ہاتھ دھو کر اُس کے پیچھے پڑ گئی۔ اُس نے بتلایا کہ وہ تمام دِن بخار کی حدت میں تپتا رہا تھا۔ وہ دُکان پر کوئی کام نہیں کر پایا تھا۔ بانو نے اُس کی کلائی تھامی، تپش محسوس کر کے بے چین ہو گئی، بولی۔ ''تم نے کوئی دوائی بھی نہیں کھائی ہو گی؟''

اُس نے نفی میں سر ہلایا۔ بانو برہم ہو گئی۔ ''کسی ڈاکٹر کے پاس بھی نہیں گئے ہو گے؟''

اُس نے پھر سر کو دائیں بائیں حرکت دی۔ وہ اُس پر غصہ اور پیار کی ملی جلی نگاہ ڈال کر پیراسیٹامول کی گولیاں اور دودھ کا گلاس اُٹھا لائی۔ بہ اصرار کھلانے کے بعد بستر میں لٹا کر سر دبانے لگی۔ وہ آنکھیں موند کر سونے کی کوشش کرنے لگا۔ وہ باتیں کرنے لگی، بہلانے لگی۔ وہ بہل کر سو گیا۔ کچھ دیر تک اُس کے بالوں میں انگلیاں پھیرتی رہی پھر قدرے مطمئن ہو کر اپنے بستر پر آ گئی۔ بالی کی بے چینی اور بیماری اُس کے لیے سوہانِ روح ثابت ہوئی تھی۔ رات میں متعدد بار بالی کے بستر تک آئی، ہاتھ لگا کر ٹمپریچر کا اندازہ کیا اور پھر لیٹ گئی۔ رات بھر جاگتی رہی، بالی کے بارے میں سوچتی رہی۔ کبھی اُس کے بخار اور جان مار کام پر پریشان ہو جاتی تو کبھی اُس کی رنگت جیسے سیاہ اور دبیز مستقبل پر سلگ اُٹھتی۔ اُسے رہ رہ کر اپنی وہ تمام کوششیں یاد آئیں جو اُس نے اپنے بھائی کا گھر بسانے کے لیے مختلف اوقات میں کی تھیں۔ نہ جانے کتنے گھروں سے آس بندھی تھی، ہر جگہ سے آس کے چیتھڑے واپس آئے تھے۔

اُس نے دُکھ سے سوچا۔ ''ایسا کیوں ہوتا ہے؟ مرد کے پاس پیسہ ہو تو سبھی کہتے ہیں کہ مرد کی کوئی شکل، رنگت اور حلیہ نہیں ہوتا، سب کچھ اُس کی دولت کے ترازو میں اوپر اُٹھ جاتا ہے۔ اگر مرد کے پاس دولت نہ ہو تو ہر کوئی کہتا ہے کہ ایسے مرد کے گھر میں اپنی بیٹی کو اُتار کر ہم اپنی نازوں پلی بیٹی کو جیتے جی جہنم میں اُتار بیٹھیں گے۔ وہ دِن بھر ٹھنڈے چولھے پر بیٹھ کر آہیں بھرتی رہے گی۔ رات کو درماندگی کے عالم میں پھونکیں مار مار کر جان میں خوف بھرنے والے وجود کو جگاتی رہے گی۔''

اُس نے کئی ایسی لڑکیاں بھی بالی کے لیے دیکھی اور پسند کی تھیں جو شکل وصورت میں اپسرا نہیں تھیں۔ عام سے نقوش والی، سنولائی ہوئی رنگت والی اَن پڑھ لڑکیاں بھی اُس کا فوٹو دیکھ کر بدک جاتی تھیں۔ اُسے بالی کبھی بھی بدصورت دکھائی نہیں دیا تھا۔ بجز اِس کے کہ اُس کی رنگت گہری سانولی تھی، سیاہ کہی جا سکتی تھی، نقوش بھدے، ہاتھ پاؤں بڑے بڑے اور کھردرے پھر مستزاد اُس کا روایتی ورکشاپوں والا بے ڈھنگ حلیہ...... مگر بالی کے وجود میں خوبصورتیاں بھی تو بے حد تھیں۔ وہ نرم خو تھا۔ عورت کا احترام کرتا تھا۔ ضدی نہیں تھا اور دل کا فراخ تھا مگر نہ جانے کیوں اُس کے یہ اوصاف دُنیا کو دکھائی نہیں دیتے تھے۔ نکموں سے تو وہ کہیں بہتر تھا۔

وہ خود پر قابو نہیں پا سکی تو اُٹھ کر بالی کے سرہانے بیٹھ گئی۔ اُس کا سر اُٹھا کر جھولی میں رکھ کر پیار سے گالوں پر ہاتھ پھیرنے لگی۔ وہ جاگ کر حیرانی سے دیکھنے لگا۔ اُسے جاگتے اور چہرہ سہلاتے دیکھ کر مسکرایا۔ ''اے جھلی! ہلکا سا

بخار ہے، اور کچھ بھی نہیں، تم خواہ مخواہ پریشان ہو رہی ہو۔ جاؤ، سو جاؤ۔ کہیں یہ نہ ہو کہ صبح تک تمھیں بھی بخار سر منہ لپیٹنے پر مجبور کردے۔ جاؤ، شاباش، میں ٹھیک ہوں۔"

وہ بدستور بیٹھی رہی۔ بالی نے اُس کے دونوں ہاتھ تھام لیے۔ اُس کے بائیں ہاتھ کی پشت پر اُبھری ہوئی لکیروں کو سہلانے لگا۔ بولا۔ "بانو! تمھیں عینی کی یاد ستاتی ہے؟"

وہ جھوٹ نہ بول پائی، کراہی۔ "ہاں بھائی!"

"کیا عینی کا بھائی بھی یاد آتا ہے؟" بالی کے لہجہ معصومیت بھرا تھا۔

اُس نے خاموشی سے سر جھکا لیا۔

وہ بولا۔ "ہاں بانو! وہ ایسا نہیں ہے کہ اُسے تھوڑے عرصے میں ہی بھلا دیا جائے۔ وہ بہت اچھا انسان ہے مگر شاید ہماری قسمت میں اُبھی تک گردش ہے۔ اُستاد جانے کی طرح وہ بھی ڈر گیا، نہ جانے کیوں پیچھے ہٹ گیا ورنہ میں نے تو اُس کی حوصلہ شکنی نہیں کی تھی۔"

وہ بدستور خاموش رہی۔

"تمھیں اُس کے انکار پر بہت دُکھ ہوا تھا ناں؟"

یہ پوچھنے کی بات نہیں تھی مگر بالی احمقانہ انداز میں دریافت کررہا تھا۔ بانو نے شکوہ کناں نگاہوں سے اُسے گھورا اور خاموش زبان سے خاموش رہنے کی تلقین کی۔ وہ سمجھ کر بھی چپ نہ رہ سکا، بولا۔ "میں تمھارا اچھا بھائی ثابت نہیں ہوسکا، تمھارے من کو ملنے والی سچی خوشیوں کی نگہبانی نہیں کرپایا مگر بانو! تمھیں مجھ پر یقین رکھنا چاہیے کہ میرے من میں کوئی کھوٹ نہیں تھی۔ میں شاہ سائیں کے معاملے میں خواہ کتنا ہی بھٹک کیوں نہیں گیا تھا، تمھارے لیے اپنے دِل میں مکمل خلوص رکھتا تھا اور چاہتا تھا کہ تو کسی بڑی سلطنت کی مہارانی بن جائے۔ شاید اوپر والے کے ہاں اُبھی کچھ دیر ہے۔ مجھے یقین ہے کہ دیر پرتا لنے والے نے ہمارے لیے اندھیر نگری نہیں سجا رکھی۔"

اُس کی آنکھوں سے دو آنسو بالی کے چہرے پر ٹپک گئے۔ وہ بے چین ہوگیا۔ اپنے کھردرے ہاتھوں سے اُس کی آنکھوں کی حوضیاں صاف کرتے ہوئے پیار سے بولا۔ "نہیں بانو! رونا نہیں...... تمھیں کھونے والے زندگی بھر روتے رہیں گے۔ تمھیں سچی خوشیاں ایک نہ ایک دِن ضرور ملیں گی۔ تب تک میں تمھاری دلبستگی کے لیے اپنی محبت کی چھایا کیے رہوں گا۔ سمجھ رہی ہو ناں!"

وہ بالی کی اُدھوری مگر پیار بھری باتیں سن اور سمجھ رہی تھی۔ پیشانی پر اپنے لب دھرتے ہوئے بولی۔ "بھائی! تمھارے ہوتے ہوئے مجھے کوئی ڈر، فکر یا اندیشہ نہیں ہے۔ خدا تمھیں میرے سر پر ہمیشہ سلامت رکھے۔"

ایک طویل خامشی دونوں کے بیچ بے سبب حائل ہوگئی۔ تین کا عمل ہوگا کہ بالی کے جسم کا درجہ حرارت مہمیز ہونے لگا۔ اُس نے چائے بنائی، پیرا سیٹامول کی دو گولیاں کھلائیں اور چارپائی میں لٹا دیا۔ نصف گھنٹے میں ٹمپریچر کم ہوگیا مگر اُسے نیند نہیں آئی۔ وہ بانو کے ساتھ باتیں کرنا چاہتا تھا اِس لیے اُس نے لیٹنے کا ارادہ منسوخ کردیا اور پاس بیٹھ گئی۔ مایوسی آمیز لہجے میں بولی۔ "بالی! میں بھی تو اچھی بہن ثابت نہیں ہوپائی۔ میں اُبھی تک کسی لڑکی کو اپنی بھابی بنانے پر آمادہ نہیں کرسکی ہوں۔"

بالی کے لبوں پر مسکراہٹ تیر گئی۔ "میری شادی کی فکر چھوڑو، اپنے مستقبل کے بارے میں سوچا کرو۔"

"کیا تمھارے مستقبل پر سے توجہ ہٹالوں؟"

"ہاں!" اُس کے لہجے میں یاسیت ہرگز نہیں تھی۔ "اپنی خواہشات کی طویل گزرگاہ میں اُبھی تک مجھے اپنی دُلھن دکھائی نہیں دی۔ میں نے جب بھی مستقبل پر نگاہیں جمائیں، تم ہی تم دکھائی دی ہو اور تمھارا پیارا سا گھر...... گھر میں ننھے ننھے گھروندے اور قہقہے...... میں سچ کہتا ہوں بانو! میری خوشیوں کا محور تم ہی ہو۔"

وہ جھینپ سی گئی۔ بہ صد مشکل گویا ہوئی۔ "مگر جب تک اِس گھر میں کوئی دُلھن نہیں آئے گی، میں کہیں نہیں جاؤں گی۔ اپنے بالی کو اکیلا کرنے کی سکت مجھ میں ہرگز نہیں ہے۔ میں نے یہاں ایک رشتہ کرانے والی کی خدمات حاصل کرلی ہیں۔ اُس نے مجھے یقین دلایا ہے کہ چند ہی دِنوں میں وہ کوئی نہ کوئی کھوج نکال لائے گی۔"

بالی نے کروٹ بدل لی۔ ہنکارا بھر کر بولا۔ "فضول کوشش کرتی ہو تم!"

وہ صبح کا اُجالا پھیلنے تک بالی کی گھور سیاہ زندگی میں پَرا جمائے بیٹھی رہی۔ وہ سو گیا تھا۔ اُسے جگانا مناسب نہ سمجھا اور خاموشی سے اُس کے سرہانے بیٹھی رہی۔ بالی دیر سے جاگنے کے سبب دیر سے ورکشاپ سُدھارا۔ بانو نے مجبوراً سمیرا اور

صدف کو ٹال دیا اور کالج سے پھر ناغہ کرلیا۔ بیٹ ہاتھ میں پکڑ کر گیند پر نظریں جمانے والے نے شاید بالی کی سائیکل پر نظریں جما رکھی تھیں۔ اُس کے جاتے کے فوراً بعد ہی دروازے پر آ گیا۔ دستک کی آواز سن کر بانو ایک ذرا ٹھٹک گئی۔ سمجھ میں آنے لگا تھا کہ دروازے کے باہر اُس کا مشتاق کھڑا ہے۔ شش و پنج میں پڑ گئی۔ دروازہ کھولے یا دستک کی آواز کو نظر انداز کرتی رہے تاوقتیکہ وہ مایوس ہو کر چلا نہ جائے۔

دوسری مرتبہ دستک سن کر اُس کے دل میں اندیشے کلبلانے لگے۔ بلا خوف آنے والا پلٹنے کا ارادہ نہیں رکھتا تھا۔ وہ دروازہ کھول کر اُس سے باتیں کرتی تو کسی کے دیکھ لینے کا خوف لاحق تھا۔ اگر وہ یونہی کھڑا کنڈی کھٹکھٹاتا رہتا تب بھی ارد گرد بسنے والوں کے چونک کر متوجہ ہونے کا ڈر تھا۔ وہ بے ارادہ دروازے تک آئی۔ دروازے کا بولٹ اُتارے بغیر پوچھنے لگی۔ ”جی فرمائیں!“

وہ فرمانے نہیں، اُس کی ایک جھلک دیکھنے کے لیے آیا تھا۔ چوروں کی سی سرگوشی میں بولا۔ ”میں کامران ہوں، تمھیں ایک نظر دیکھنے کیلئے آیا ہوں۔“

وہ بولی۔ ”میں نے کہا تھا، یوں نہ آیا کرو، لوگ دیکھیں گے تو مجھ پر انگلیاں اُٹھائیں گے۔“ وہ دھڑکتے دل سے بولی۔

”مجھے لوگوں کی انگلیوں کا کوئی خوف نہیں ہے۔ دروازہ کھولو پلیز!“ وہ ملتجیانہ لہجے میں بولا۔

”مگر مجھے اپنی عزت پیاری ہے۔ خدا کے لیے چلے جاؤ۔“ اُس کے لہجے سے خفگی آمیز التجا مترشح تھی۔

”تمھیں دیکھے بغیر ہرگز نہیں جاؤں گا۔“ اُس نے اٹل لہجے میں کہا۔

وہ کانپ کر بولی۔ ”میں دروازہ نہیں کھولوں گی۔ تمھیں میری عزت کی پروا نہیں ہے تو مجھے بھی تمھاری کوئی پروا نہیں ہے۔“

”تو ٹھیک ہے۔ میں تمھارا چھپنا آزماتا ہوں، تم میرا ٹھہرنا آزماؤ۔ میں ہار گیا تو زندگی بھر تمھارے سامنے نہیں آؤں گا۔ تم ہارو گی تو میری فتح کو تسلیم کرتے ہوئے اپنے حسن کے چاند کو میرے آنگن میں اُتار دو گی۔ یہ طے رہا......“

وہ ڈر گئی۔ سوچ میں پڑ گئی۔ کیا کرے، کیا نہ کرے؟ ایسے میں جان چھڑانے کا طریقہ ذہن میں آ گیا۔ بولی ”تم اِس وقت یہاں سے چلے جاؤ۔ میں سمیرا کے ساتھ کسی دن تمھارے گھر آؤں گی۔“

وہ بولا۔ ”تم مجھے ٹرخا رہی ہو۔ میں جانتا ہوں کہ تم کبھی بھی میرے گھر نہیں آؤ گی۔“

”میں وعدہ کرتی ہوں......“

”میں تمھارے وعدے پر اعتبار کر کے چلا جاتا ہوں۔ اگر تم نہیں آؤ گی تو میں چلا آؤں گا اور پھر کسی وعدے پر یقین نہیں کروں گا۔“ وہ دھمکی دے کر چلا گیا۔

بانو دروازے کے ساتھ لگ کر کھڑی تھی۔ پسینے میں نہا گئی۔ نڈھال اور پژمردہ قدموں سے دروازے سے ہٹ گئی۔ ایک ہی وقت میں اُسے چاہنے والے کی ضد پر پیار آ رہا تھا اور اُس پر غصہ بھی آ رہا تھا۔ دیکھنے کے شوق میں اپنی رُسوائی کی پروا نہ کرتے ہوئے کتنا بڑا اور مضبوط دکھائی دیا تھا۔ بس ایک نظر دیکھنے کے شوق میں ہی اُس کی عزت کو داؤ پر لگاتے ہوئے کتنا چھوٹا اور کمین نظر آیا تھا۔ بانو کا ایک ہاتھ پیشانی پر جا ٹکا، دوسرا سینے پر عین دل کے مقام پر ٹھہر گیا۔ دل اُس ناتجربہ کار عاشق کا وکیل بن گیا۔ دماغ اپنے دفاع کی جنگ لڑنے لگا۔ محبت فطرتاً بڑی ظالم ہوتی ہے۔ بار بار انسانی زندگی میں دخل دیتی ہے اور بے چین اور مضطرب کرتی ہے۔ کبھی 'ہاں ہاں' پر دیوانہ وار اُکساتی ہے، کبھی 'ناں ناں' کے ورد کو تعلق کا اٹوٹ حصہ قرار دیتی ہے...... پہلی نظر کی محبت ایسی ہی پختہ کار ہوتی ہے۔

وہ جانتی تھی کہ ہر سہ پہر میں کامران بیٹ تھامے کرکٹ گراؤنڈ میں پریکٹس کے لیے جاتا ہے۔ وہ کامران کے گھر ایسے وقت جانا چاہتی تھی جب وہ یقیناً گھر میں نہ ملتا۔ ٹیوشن لینے والے بچوں کو گھر کی صفائی ستھرائی پر لگا کر وہ سمیرا کے گھر پہنچ گئی۔ اُسے یقین تھا کہ کامران گھر پر نہیں ہوگا مگر اُسے اپنی ماں کے پاس بیٹھا دیکھ کر ٹھٹک گئی۔ اُس کی ماں کو سلام کر کے سمیرا کے کمرے کی طرف بڑھی۔ سمیرا اور اُس کی بڑی بہن حمیرا اُسے دیکھ کر حیران ہوئیں۔ وہ بتلائے بغیر آئی تھی۔ خیر و عافیت کے تبادلے کے بعد سمیرا نے چھیڑا۔ ”آج کیسے وقت نکال لیا تم نے؟“

وہ مسکرائی۔ ”تم سے ملنے کے لیے آئی ہوں۔“

حمیرا چائے بنانے کے لیے اُٹھ گئی۔ سمیرا نے سرگوشی کی۔ ”صرف مجھ سے ملنے کے لیے؟“

وہ سمیرا کی بات کا مفہوم سمجھ کر بولی۔ ”نہیں بلکہ تمھاری

ماما اور باجی سے بھی ملنے کا ارادہ رکھتی ہوں۔“

سمیرا مسکرائی اور موضوع بدل کر کالج کی باتیں کرنے لگیں۔ ایسے میں حمیرا چائے تیار کر لائی۔ تینوں چائے پینے کے دوران اپنی اپنی بولیاں بولتی رہیں۔ پہلی مرتبہ بانو کو پتہ چلا کہ سمیرا کی سانولی اور عام خال وخد والی بہن، حمیرا، نہ صرف اَن پڑھ بلکہ اپنے بہن بھائیوں میں سب سے بڑی ہونے کے ناتے پچیس سے کچھ اوپر کے سن میں تھی۔ تنہائی ملنے پر اُس نے سمیرا سے رازداری سے دریافت کیا۔ ”کیا باجی حمیرا کی کہیں منگنی ہو چکی ہے؟“

سمیرا نے ہونٹ نکوسے۔ ”باجی کی منگنی بچپن میں ہمارے چچا زاد عرفات بھائی سے ہوئی تھی۔ بدقسمتی سے باجی پڑھ لکھ نہ پائی جبکہ عرفات بھائی ایم بی اے کرنے کے بعد دوبئی میں ملازمت حاصل کرنے میں کامیاب ہو گئے۔ وہاں پہنچ کر انہوں نے منگنی توڑنے کا اعلان کر دیا۔ یہی نہیں بلکہ عرفات بھائی نے وہاں مقیم ایک ملیشیائی انجینئر لڑکی کے ساتھ شادی بھی کر لی۔ پچھلے سال اِنہی دِنوں میں دونوں میاں بیوی اپنے گول مٹول بیٹے زکریا کے ہمراہ پاکستان آئے تھے، چند دِن رہے، تحفے تحائف اور پیسے بانٹ کر واپس چلے گئے۔ تمام رشتہ داروں کے ہاں ضیافتیں اُڑانے کے لیے گئے مگر ہماری خواہش بھری دعوت کے باوجود ہمارے گھر نہیں آئے۔“

اسے دُکھ ہوا۔ متاسف لہجے میں بولی۔ ”اوہ ہو...... آپ لوگوں نے باجی کے ساتھ بہت بڑی زیادتی کی۔ اُسے پڑھاتے لکھاتے تو شاید اُس کا منگیتر اُسے یوں نظرانداز نہ کرتا۔“

”اُسے اسکول میں داخل کرایا گیا تھا مگر وہ کیا تھا کہ باجی جونہی کچھ پڑھنے لکھنے کے لیے آنکھوں پر زور دیتی، سر میں شدید درد شروع ہو جاتا۔ آنکھوں کے اسپیشل ڈاکٹرز کو چیک کروایا، کئی برس متواتر علاج کروایا مگر کوئی فائدہ نہیں ہوا۔ ماما اور پاپا نے بہتیری کوشش کی مگر شاید اُس کی قسمت نے ساتھ نہیں دیا۔ وہ اَب بھی کڑھائی، سلائی یا کوئی بھی ایسا کام جس میں نظر اور دماغ کی مشقت شامل ہو، نہیں کر پاتی۔ سر پھٹنے کو آ جاتا ہے۔“ سمیرا دُکھ سے بولی۔ ”تمام رشتہ داروں کو اُس کی اِس کمزوری کا علم ہے۔ کئی جگہ پر رشتہ کی بات چلائی مگر بات آگے نہیں بڑھی۔ اَب ماما نے باجی حمیرا کی شادی غیروں میں کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔ دیکھیں! کیا بنتا ہے۔“

بانو نے دُکھ کا اظہار کیا۔ دُنیا انکار کے بہانے مانگتی ہے وگرنہ حمیرا کا عیب اتنا بڑا بھی نہیں تھا کہ جس کی بنیاد پر اُسے جھٹک دیا جاتا۔ سمیرا اُسے غمزدہ دیکھ کر بولی۔ ”تم نے ایسی شکل کیوں بنالی ہے؟ اللہ مالک ہے۔ آج نہیں تو کل، اُس کا کہیں نہ کہیں رشتہ لگ جائے گا اور وہ اپنے گھر سدھار جائے گی۔ تم اپنی فکر کرو۔ اپنی فکر کرنے والے کے بارے میں سوچو۔ جانتی ہو، وہ آج ماما کے گھٹنے سے جُڑ کر کیوں بیٹھا ہے؟“

”وہ کون؟“ وہ جانتے بوجھتے انجان بن کر بولی۔

”کامران بھائی!“ سمیرا نے دیدے نچائے۔ ”وہ تمہارے انتظار میں اِس وقت تک بیٹھا ہوا ہے۔ مجھے علیحدگی میں تمہاری آمد کی خبر سُناتے ہوئے بتلانے لگا کہ اُس نے تمہیں کیسے یہاں آنے پر مجبور کیا تھا۔“

”کیا تم اُس کی اوچھی حرکتوں پر جذباتی لفظوں کا پردہ ڈال رہی ہو؟“ بانو کا لہجہ بہت کٹیلا تھا۔

”دیکھ بانو! کامران گلیوں محلوں میں دل ہتھیلی پر لیے پھرنے والے لڑکوں جیسا نہیں ہے۔ اُس نے آج تک کسی لڑکی کے بارے میں یوں سنجیدگی سے نہیں سوچا۔ تم اُسے دل پھینک سمجھتی ہو مگر وہ فلرٹ کرنے والا نہیں ہے۔ بہت سنجیدہ مزاج ہے، جو کہتا ہے، کر دکھاتا ہے۔“

بانو تعجب بھری نگاہوں سے اُسے ایک ٹک گھورے جا رہی تھی۔

وہ اُس کی آنکھوں کے سامنے ہاتھ لہراتے ہوئے بولی۔ ”کیا میرے سر پر سینگ نکل آئے ہیں جو یوں دیدے پھاڑے دیکھ رہی ہو؟“

”نہیں بلکہ میں دیکھ رہی ہوں کہ میرے دریافت کیے بغیر تم اپنے بھائی کی وکالت میں کس حد تک جاتی ہو۔“ بانو نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ”تمہارا بھائی بہت اچھا ہے مگر وہ مجھے بدنام کرنا چاہتا ہے۔ میں اپنے دروازے پر اُس کی آمد کو اچھا خیال نہیں کرتی مگر وہ کسی طرف دھیان دیے بغیر آن دھمکتا ہے۔ اُسے سمجھاؤ، میرے پیچھے لپکنے سے روکو وگرنہ وہ برباد ہو جائے گا اور میں بدنام ہو جاؤں گی۔ تب تم بے وقوفوں کی طرح اُس کی بے راہ روی کا ذمہ دار مجھے

ٹھہراؤ گی مگر یہ نہیں سوچو گی کہ میں نے کبھی بھی اُس کی حوصلہ افزائی نہیں کی تھی۔''

رسٹ واچ پر نگاہ پڑی، چونک کر کھڑی ہوگئی، چادر سمیٹتے ہوئے بولی۔''میں اب چلتی ہوں، بہت دیر ہوگئی ہے اور بچے چھٹی کے لیے بے چین ہو رہے ہوں گے۔''

سمیرا اُسے روکنا چاہتی تھی مگر وہ نہیں رُکی۔ سمیرا کی ماما کو سلام کرتے ہوئے دروازے کی طرف بڑھی۔ ایک دیوار مین گیٹ اور صحن کو جدا کر دیتی تھی۔ اُسی دیوار کے پار کامران اُس کا منتظر تھا۔ ایک قدم بڑھا کر بانو کا راستے روکتے ہوئے بولا۔''بانو! تمھارا شکریہ کہ تم نے اپنے وعدے کو پورا کرتے ہوئے میری ضد کو جنوں بننے سے روک دیا۔ کیا ہم پھر بھی کہیں ملیں گے؟''

اُس نے نگہ برہم سے گھورا اور سختی سے انکار کر دیا۔ بولی۔''کیا تمھیں تعلیم اور خاندانی نجابت نے یہی سکھایا ہے کہ تم اپنی بہن کی سہیلی کے پیچھے ہاتھ دھو کر پڑ جاؤ۔''

وہ شرمسار سا ہو گیا۔ سنبھل کر بولا۔''ہاتھ دُھل کر صاف ہو جاتے ہیں۔ غلاظت بھرے ہاتھوں سے کہیں بہتر ہوتے ہیں۔ تم چاہو تو میرے بڑھے ہوئے ہاتھوں کو تھام کر معتبر کر سکتی ہو۔ ویسے بھی یہ کوئی عجیب بات نہیں، پہلا قصہ نہیں کہ بہن کی سہیلی مجھے اچھی لگنے لگی ہے۔ دُنیا ایسے واقعات سے بھری پڑی ہے۔ میں تمھیں یقین دلاتا ہوں کہ میں......''

''مجھے کسی یقین کی ضرورت نہیں ہے۔ تمھیں سمجھنے کی ضرورت ہے۔ سمجھو کہ میں تمھاری شخصیت میں دِل چسپی نہیں رکھتی۔'' اُس نے پوری خود اعتمادی سے جھوٹ بولا اور دروازے سے نکل آئی۔ وہ اُس کے پیچھے گلی میں آنا چاہتا تھا مگر ٹھٹک گیا۔ دل نے سمجھا دیا کہ اُس کی محبوبہ بُزدل لڑکی ہے۔ لوگوں کی نگاہوں میں آنے سے ڈرتی ہے۔ وہ پیچھے آئے گا تو بدک جائے گی اور بعید نہیں کہ بھوکی بلی کی طرح اُس پر جھپٹ پڑے۔''

ایک سرد آہ سینے سے خارج کر کے ڈیوڑھی کی دیوار کے ساتھ ٹیک لگا کر کھڑا ہو گیا۔ آج وکٹ نے ساتھ نہیں دیا تھا۔ اُس کے بھروسہ مند بیٹ نے طوفانی باؤلنگ کے مقابل اُس کی دل جوئی نہیں کی تھی مگر اِس کا مطلب یہ نہیں تھا کہ وہ ہر میچ میں اِسی طرح صفر پر آؤٹ ہو کر پویلین کا رُخ کرتا رہے گا۔ کامیاب کھلاڑی کی طرح اُسے اگلے میدان میں کامیابی کے حصول کا سو فیصد یقین تھا۔

بانو گھر پہنچی۔ عجیب سی دماغی کیفیت اُسے بے دھیان کر رہی تھی۔ بچے واقعی بہت بے چین تھے۔ اُسے دیکھتے ہی اپنے بیگ سنبھالنے لگے۔ اُس نے صفائی کا جائزہ لیا۔ بچوں کی مستعدی اور جانفشانی نے کہیں سقم نہیں چھوڑا تھا۔ اُنھیں 'شاباش' دے کر چولھے پر بیٹھ گئی۔ سبھی چلے گئے تو اُس نے کارنس پر پڑا اپنا موبائل فون اُٹھایا۔ عینی کو مسڈ کال دی۔ کچھ ہی دیر کے بعد عینی کی کال کے بل پر اُس کے فون کا بزر بجنے لگا۔ ریسیو کرتے ہوئے بولی۔''ہیلو عینی! کیسی ہو؟''

''تم نے یاد کیا، سب تکلیفیں ہوا ہو گئیں اور میں ایک دم فٹ ہو گئی۔ تم سناؤ، تمھارے نئے معاشقے کی روداد کہاں تک پہنچی؟'' عینی نے ہنستے ہوئے کہا۔

وہ بولی۔''وہ باؤلا......''

''نئی بات کرو۔ تمھارے جیسی خوبصورت اور جوان لڑکی کے لیے ہر کوئی باؤلا بن جاتا ہے۔'' عینی نے پیار سے ڈانٹا۔

''نئی بات یہ ہے کہ وہ سمیرا کا بھائی ہے۔ سمیرا کے بارے میں میں نے تمھیں بتلا رکھا ہے۔ سمیرا اُس کی پیغام رَساں ہے جیسے تم شہزاد کے لیے سرگرم تھیں۔ کرکٹ کھیلتا ہے، کرکٹ میں نام کمانا چاہتا ہے اور نام کے بل پر مجھے فتح کرنا چاہتا ہے۔'' وہ کھلی تو پھر کھلی کتاب بن گئی۔ عینی کے ساتھ بے تکلفی کا رشتہ بدستور قائم تھا۔ اُسی رشتے کی مناسبت سے کچھ چھپائے بغیر بولتی جا رہی تھی۔

عینی نے انہماک سے سُنا۔ سن کر سوچ میں پڑ گئی۔ متردد لہجے میں بولی۔''عینی کی جان! تم نے سمیرا کی بڑی بہن کو دیکھا۔ اُس کے بارے میں مجھے تفصیل کے ساتھ بتلاؤ۔''

وہ بولی۔''آج دوسری مرتبہ ملی ہوں۔ اُس کے بارے میں جو کچھ جان پائی ہوں، بتلائے دیتی ہوں۔''

عینی سن کر خوش ہو گئی۔ جھٹ سے بولی۔''کام بنتا دکھائی دیتا ہے۔ تم ایسا کرو کہ خود کو حمیرا کے ساتھ مشروط کر دو۔ اپنے دیوانے کے بڑھے ہوئے ہاتھ میں حمیرا کے نام کی شرط تھما دو۔ اُسے سمجھا دو کہ تمھارے ہاں وٹہ سٹہ کا رواج ہے۔ وہ بالی کا گھر بسا دے، تم اُس کے آنگن میں چاند بن کر اُتر جاؤ...... ہائے بانو! مزہ آ جائے گا۔ میکہ اور سسرال ایک ہی محلّہ میں ہوں تو انسان کسی بھی جدائی کا شکار نہیں ہوتا۔ سمجھ رہی ہو ناں!''

وہ چونک گئی۔ ایک نیا در کھل گیا تھا۔ سوچتی ہوئی نگاہوں سے چولھے سے پھوٹتے نیلگوں شعلوں کو گھورنے لگی۔ عینی نے بے تابی سے کہا۔ "تم چپ کیوں ہوگئی ہو؟ کیا میں نے کوئی غلط بات کہہ دی ہے؟"

وہ جلدی سے بولی۔ "نہیں، ایسی کوئی بات نہیں۔ میں سوچ میں پڑ گئی تھی۔ ایسا ہوجائے تو بہت اچھا ہے اور اگر کسی وجہ سے ایسا ممکن نہ ہو پایا تو کامران سے میری جان چھوٹ جائے گی۔ وری گڈ آئیڈیا!"

عینی نے ہنستے ہوئے فون بند کردیا۔ اُسے جلدی تھی۔ کہیں جانے کا پروگرام بنائے بیٹھی تھی جب بانو نے اُسے 'مسڈ کال' دی تھی۔

بانو کی آنکھیں چمک اُٹھیں۔ عینی نے اُس کی تمام تر مشکلات کو چٹکی بجاتے میں حل کردیا تھا۔ سوچنے لگی۔ "کامران بُرا نہیں ہے۔ بہت اچھا ہے۔ اچھائی اگر اپنے جلو میں ایک اور اچھائی کو سمیٹے دکھائی دے تو اُسے نظر انداز نہیں کرنا چاہیے۔ حمیرا بہت اچھی ہے۔ سانولی ہے تو کیا ہوا، بالی بھی تو گورا چٹا نہیں ہے۔ اَن پڑھ ہے تو کیا ہوا، بالی بھی تو اَن پڑھ ہے۔ حمیرا کا عذر اتنا بڑا نہیں اور نہ ہی اُس کا پیدائشی عیب جرم کے ترازو پر تلنے والا ہے بلکہ نہایت معمولی نوعیت کا ہے۔ بالی کے صحن میں سلائی کڑھائی اور پڑھائی کا کوئی عمل دخل نہیں ہے۔ بالی کے خال وخد میں کوئی باریکی نہیں ہے جسے ملاحظہ کرتے رہنے سے حمیرا کے سر میں درد جاگ جائے۔"

سوچوں کے تانے بانے بنتے ہوئے اُسے عینی کا یہ خوشی مشورہ عنایت کرنا یاد آیا تو ایک دَم افسردہ ہوگئی۔ بانو کو کامران کے پہلو میں دھکیلتے ہوئے کیوں اُسے شاید یاد نہیں رہا تھا کہ وہ اُس کے بھائی کی منگیتر رہ چکی تھی۔ اُس کے بھائی کی پہلی خواہش، اُس کی اپنی آخری طلب...... واقعی، وقت اپنی گرد کے نیچے اَن گنت ناقابلِ فراموش واقعات کو چھپادیتا ہے۔ اُسے دکھ ہوا کہ وہ بھی وقت کی نادیدہ سِل کے نیچے دَب کر چاہنے والوں کے دل ودماغ سے اُتر گئی تھی۔

اُس نے تمام رات اِس نئی صورتِ حال کے بارے میں سنجیدگی سے سوچا۔ بات بنتی دکھائی پڑتی تھی کوئی مضائقہ مدنظر نہیں تھا تبھی وہ کامران کی طرف مائل ہوتی گئی۔ کامران کی دیوانگی آمیز محبت پر یقین تھا کہ وہ اپنے ماں باپ کو اِس رشتے پر آمادہ کرلے گا۔ وہ دو بہنوں کا اکلوتا بھائی تھا۔ حمیرا سے چھوٹا تھا، سمیرا سے بڑا تھا، والدین کی آنکھوں کا اکلوتا تارا تھا۔ گھر کی ہر متذبذب آنکھ کو خیرہ کرکے اپنے پیچھے چلا سکتا تھا۔

اُسے یہ بھی علم تھا کہ بالی اِس رشتے کو تسلیم کرنے میں کوئی مزاحمت نہیں کرے گا۔ وہ مصلحت پسند اور صلح جو شخص تھا۔ شاہ سائیں کے معاملے سے قطع نظر، وہ بانو کے آگے کبھی پوری تاب سے اَڑ نہیں پایا تھا۔

صبح کالج جاتے ہوئے راستے میں سمیرا نے صدف کی آنکھ بچا کر ایک ننھا سا رُقعہ بانو کے ہاتھ میں تھما دیا۔ اُس نے ایک شکوہ کناں نگاہ ڈالی اور کامران کی محبت میں ڈوبی، نم اور مہکتی پرچی کو چھپالیا۔ تمام دن اُس کے بارے میں سوچتی رہی، گھر پہنچنے کا انتظار کرتی رہی کیونکہ کلاس میں وہ کسی کے ہاتھ میں اپنی کمزوری نہیں دینا چاہتی تھی۔

بے تابی کے گھوڑے پر سوار ہوکر گھر پہنچی، کتابیں پھینک کر پرچی نکالی اور پڑھنے لگی۔ اُسے ماننا پڑا کہ کامران کی نہ صرف ہینڈ رائٹنگ غیر معمولی حد تک خوبصورت تھی بلکہ اُس کے لفظوں کا چناؤ بھی منفرد اور جاں کش تھا۔ کہیں، کسی سطر پر، کسی جل ترنگ کے بَل پر لکھ رہا تھا۔ "اب جبکہ تمہارے اقرار پر میری زندگی منحصر ہے، تمہاری ہچکچاہٹ بھی مجھ پر عجب سرور اور پُرکیف عرفان اُتارتی رہتی ہے۔ کبھی سوچتا ہوں کہ تم بلا ردوکد مجھے اپنا آپ سونپنے کا اعلان کردو، کبھی خواہش کرتا ہوں کہ تم ایسے ہی قریب آتی رہو، پیچھے ہٹتی رہو اور میں بے قراری میں تمہاری طرف کھنچتا رہوں۔"

ننھی سی پرچی پر اُس نے بہت کچھ لکھ رکھا تھا۔ اُس کے بے دھیان کردینے والے لفظوں میں اُلجھی رہی اور اُسے مطلق یاد ہی نہ رہا کہ دل کے دروازوں کی طرح موبائل فون کھلا رہ گیا ہے۔ وہ بہ طورِ احتیاط اِس وقت فون 'پاورڈ آف' رکھتی تھی۔ دروازہ ملتے ہی دستک دینے والے نے جراُت کرڈالی۔ فون کے بزر نے چونکادیا۔ نیا نمبر دیکھ کر شش وپنج میں پڑ گئی۔ ایسے میں دل یکبارگی سے دھڑکنے لگا۔ سجھائی دینے لگا کہ خوشبو میں بھیگے ہوئے الفاظ بھیجنے والا موبائل فون کے ذریعے اپنے امتحان کا نتیجہ سننا چاہتا ہے۔ نہ چاہتے ہوئے اُس نے کال ریسیو کی۔

خاموشی سے اُس کے بولنے کا انتظار کرنے لگی۔ اُس کی ہچکچاتی آواز اسپیکر میں اُبھرنے لگی۔ ''ہیلو! ہیلو! تم بولتی کیوں نہیں ہو؟ ہیلو......''

وہ دانستہ یا نادانستہ طور پر اُس کا نام نہیں لے رہا تھا مگر سمجھ رہا تھا کہ وہی فون اٹینڈ کر رہی ہے۔ 'ہیلو ہیلو' کرتے تھک کر مایوسی آمیز لہجے میں بولا۔ ''بھلے خفگی کا اظہار کرو، بھلے ڈانٹ دو مگر کچھ تو بولو کہ میرے کان تمھاری آواز کو ترس رہے ہیں۔''

وہ مزید خاموش نہ رہ پائی، لمبی سانس سینے میں کھینچ کر بولی۔ ''کہو! کیا کہنا چاہتے ہو؟''

''میں نے کچھ لفظ بھیجے تھے، کیا مل گئے؟'' اُس نے بہ عجلت اشتیاق بھرے لہجے میں پوچھا۔

''ہاں!''

''کیسے لگے؟''

''کچھ بھی نیا نہیں تھا۔ میں اِس جھوٹ کو متعدد بار پڑھ سن چکی ہوں۔ ایسے الفاظ کتابوں میں تلاش کرنے سے بہ آسانی مل جاتے ہیں۔'' وہ خود پر قابو پاتے ہوئے سنگ دِلی سے بولی۔

''مل جاتے ہوں گے مگر میں نے کچھ بھی جھوٹ نہیں لکھا۔'' وہ بے چارگی سے بولا۔

بانو ہنس پڑی۔ وہ زچ ہو کر بولا۔ ''جی بھر کے ہنس لو۔ میں تمھاری نظروں میں جھوٹا ہوں، شاید عمر بھر جھوٹا رہوں گا مگر سنو! شاعر کی تمام زندگی جھوٹ ہو سکتی ہے مگر زندگی کے تمام جھوٹ کو کشید کرتے ہوئے وہ جو لفظ کاغذ پر بکھیرتا ہے وہ دُنیا کا سب سے کامل سچ قرار پاتے ہیں۔ یوں جیسے ماں جتنی بڑی جھوٹی کیوں نہ ہو، وہ اپنے روم روم میں بہتے خون کو کھینچ کر ایک قطرہ بناتی ہے جسے اپنے بیٹے کے حلق میں ٹپکا دیتی ہے۔ جانتی ہو، اُس سفید قطرے کی سچائی اور حقیقت پر پوری دُنیا ایمان لاتی ہے۔ ایسے ہی میرا آسمان سے تارے توڑنے کا دعویٰ باطل ہے مگر تاروں کی پرستش کے شوق میں کوئی مبالغہ نہیں ہے۔ چاہو تو آزما لو، چاہو تو بغیر آزمائش کے اپنا لو۔ میں پیچھے ہٹنے والوں میں سے نہیں ہوں۔''

''آزمانے پر تمھارا اصل رنگ برآمد ہو جائے گا۔ میں چاہتی ہوں کہ تم مجھے بھدے اور پھیکے دکھائی دیے بغیر میرے راستے سے ہٹ جاؤ۔'' وہ متانت سے بولی۔

''یعنی میری اصلیت تمھیں دکھائی نہیں دے رہی؟'' وہ کراہا۔

''نہیں۔ دُنیا میں ہر شخص دوہری زندگی گزار رہا ہے۔ میں، تم، سب!'' وہ زیرِ لب مسکراتے ہوئے بولی۔

''اگر یہ بات ہے تو سُن لو! ہر چھپی ہوئی چیز پر جوا کھیلا جاتا ہے۔ عشق بذاتِ خود ایسا جوا ہے جس میں کچھ پانے کی بجائے سب کچھ گنوانے پر جیت کا انحصار ہوتا ہے۔ میں بھی گم ہونا چاہتا ہوں۔'' عاشق صدقِ دل سے اپنے جذبات کو ہویدا کرتا ہوا بہت مضبوط لگ رہا تھا۔

بانو کے اَنگ اَنگ میں سرور کی کیف آگیں لہر دوڑ گئی۔ دل کامران کی جانب کھنچ رہا تھا۔ دماغ میں حمیرا کی شبیہہ بن رہی تھی۔ بولی۔ ''تمھیں میں میسر آ جاؤں گی مگر تمھاری ضد پر سپر ڈال کر مجھے کیا ملے گا؟''

وہ غیر متوقع سوال پر گڑبڑا گیا۔ ''کیا مطلب؟''

''میں نے زیادہ مشکل اور مبہم سوال نہیں کیا۔'' وہ مزہ لینے لگی۔

''عشق میں کچھ پانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔''

''عشق تم کر رہے ہو، میں تو محض سودے بازی کر رہی ہوں۔'' وہ 'عشق' اور 'سودے بازی' پر بالخصوص زور دیتے ہوئے بولی۔ ''کیونکہ میں عشق محبت وغیرہ کی قائل نہیں ہوں۔ یہ پریکٹیکل لائف ہے، یہاں جاندار انداز میں سوچا جاتا ہے تبھی کامیابیاں ملتی ہیں۔ تیشوں، بانسریوں اور کچے گھڑوں کا عہد بہت عرصہ پہلے سمیٹ لیا گیا تھا۔ سمجھے تم؟''

وہ کچھ بھی سمجھ نہیں پایا۔ اُس نے سمجھا تھا کہ گیلی زمین سے گلاب کا نرم پودا پھوٹ نکلے گا، یہ نہیں سوچا تھا کہ نم زمین کے سینے میں سے پتھر چاٹ یا خاردار پودا بھی سر نکال سکتا ہے۔ پژمردہ لہجے میں بولا۔ ''میں تمھیں پانے کے لیے اپنی زندگی بیچ سکتا ہوں......''

''مجھے تمھارے مُردہ وجود کی ضرورت نہیں، کچھ اور کہو۔'' وہ مسکرا کر بولی۔ ''مردوں کے گھسے پٹے دعووں کے پسِ پشت ڈال کر نئی بات کرو، نیا عہد باندھو، نئی راہ بچھاؤ جس پر پھول ہوں، چاندنی ہو اور زندگی محوِ رقص دکھائی دیتی ہو۔''

وہ گرتے گرتے سنبھل گیا۔ نرم اور شاعرانہ لہجے سے شہہ پا کر بولا۔ ''تم کسی گل رنگ سلطنت کی نشاندہی کرو، میں اپنی تمام تر توانائیاں بروئے کار لاتے ہوئے اُسے فتح

کرکے تمھارے قدموں میں ڈال دوں گا۔ بولو...... مجھے کیا کرنا ہے؟"

وہ تعین کیے بیٹھی تھی، نشاندہی کرسکتی تھی مگر سرِ دست اُس نے ٹال دیا اور اُسے انتظار کی سولی پر لٹکا کر رابطہ منقطع کر دیا۔ وہ بار بار ری کال کرتا رہا، وہ بٹن دبا کر کال ریسیو کرنے سے انکار کرتی رہی پھر تنگ آ گئی۔ کامران آہنی اعصاب رکھنے والا کرکٹ کا کھلاڑی تھا۔ ایک ہی بال کے ساتھ برسوں سے نبرد آزما تھا مگر تھکا نہیں تھا۔ اَب بھی ہار ماننے پر تیار نہیں تھا مگر بانو نے اپنا فون بند کر کے سعیِ لاحاصل کی بساط سمیٹ دی اور پُرسکون ہو کر لیٹ گئی۔



بالی کا بخار بگڑ گیا۔ ہر شب اُس کے سیاہ بدن میں تیز رَو حدتیں بھرنے لگا۔ بانو اُسے متعدد بار فزیشن کے پاس لے کر گئی تھی۔ کئی دوائیں بدلیں مگر افاقہ نہ ہوا تو وہ گھبرا گئی۔ بعض اوقات تو ٹمپریچر اتنا بڑھ جاتا کہ اُسے گیلی پٹیاں پیشانی پر رکھنا پڑتیں۔ پیروں کو بھگونا پڑتا، بازوؤں پر پانی ڈالنا پڑتا تب کہیں جا کر درجۂ جسم کی تپش کم ہوتی۔ پھر ڈاکٹر نے کچھ ٹیسٹ تجویز کر ڈالے۔ ٹیسٹ رپورٹ نے بتلایا کہ اُسے ٹائیفائیڈ ہے۔ ڈاکٹر نے فوری طور پر دوائیں بدل دیں۔ شام کو انجکشن لگوا کر، گولیاں پھانک کر بالی بستر پر دراز ہوا تو یوں محسوس ہوتا تھا جیسے برسوں پرانے دِق کا مریض ہے۔ نقاہت اور لاغر پن جھلکنے لگا تھا۔ آنکھوں کی فطری چمک بھی ماند پڑ گئی تھی۔

بانو پر پھر ایک طویل رات آنے لگی تھی۔ شام کو دودھ گرم کر کے پلایا۔ پچھلی رات میں اُسے دیر گئے سمیرا کے گھر برف مانگنے کے لیے جانا پڑا تھا۔ دِل میں اندیشہ جاگا، کہیں آج پھر برف کی ضرورت نہ پڑ جائے۔ سرِ شام ہی چادر اوڑھ کر سمیرا کے گھر پہنچ گئی۔ وہاں جا کر اُسے پتہ چلا کہ گھر میں سوائے کامران کے کوئی بھی نہیں تھا۔ وہ گھبرا کر پلٹنا چاہتی تھی کہ کامران نے لپک کر اُس کی کلائی تھام لی۔ "بانو! پلیز اتنی بے اعتباری کا اظہار مت کرو۔ تمھیں اگر قسمت میری تنہائی میں لے ہی آئی ہے تو چند لمحوں کے لیے رُک جاؤ۔"

بانو کی سانس گڑبڑانے لگی۔ ایک نگاہِ شکایت کلائی تھامنے والے ہاتھ پر ڈالی اور سرزنش کرنے لگی۔ "میں یہاں ٹھہر نہیں سکتی۔ تم بے اعتبار ہو، ہاتھ پکڑے کھڑے ہو، خاموش رہوں گی تو اِس حد سے بڑھنے لگو گے۔ چھوڑو، مجھے جانے دو۔"

اُس نے ہاتھ چھوڑ دیا، راستہ روک لیا۔ بولا۔ "یوں ہی سہی، میں تمھیں ہاتھ نہیں لگاؤں گا۔ کچھ دیر کے لیے رُک جاؤ اور بتاؤ، کیسے آنا ہوا؟"

وہ بولی۔ "مجھے جلدی ہے۔ میرے بھائی کو بخار ہے۔ بخار اُتارنے کے لیے برف مانگنے آئی تھی۔ اگر مجھے پتہ ہوتا کہ تم گھر میں اکیلے ہو تو میں کبھی یہاں نہ آتی۔ فریج تو صدف کے ہاں بھی موجود ہے، وہاں چلی جاتی۔" اُس کی آواز میں واضح طور پر ارتعاش عود کر آیا تھا۔ اُسے خود بھی احساس ہو گیا تھا کہ اُس کی گفتگو میں ربط ختم ہو گیا ہے۔ سانس برابر کرتے ہوئے اپنے بکھرے پن پر قابو پانے کی کوشش کرنے لگی۔

کامران اُسے وہیں ٹھہرا کر برآمدے میں آیا۔ فریج کھول کر برف نکالی اور ایک چھوٹی بالٹی میں ڈال کر بانو کے پاس آ گیا۔ اُس کے ہاتھ میں بالٹی تھما کر مین گیٹ کی طرف ہاتھ کا اشارہ کرتے ہوئے بولا۔ "مجھے افسوس ہے کہ میں نے تمھارا وقت ضائع کیا۔ جاؤ، اپنے بھائی کی تیمار داری کرو۔ اگر میری ضرورت محسوس کرو تو کسی تکلف کے بغیر مجھے فون کر دینا۔ نمبر تمھارے سیٹ میں محفوظ ہوگا۔"

راستہ روکنے والا راستہ روکنے پر شرمسار دکھائی دیا تو بانو نے پیار اور تشکر بھری نگاہ اُس پر ڈالی اور مین گیٹ کی طرف بڑھ گئی۔ بے ساختہ اُس کے لبوں سے پھوٹا۔ "کامران! تم بہت اچھے ہو۔"

وہ مسکرایا۔ دروازے تک چھوڑنے آیا اور دھیمے لہجے میں بولا۔ "میرا اِس سے پہلے کسی محبت سے واسطہ نہیں پڑا۔ محبت کے آداب سے ناواقف ہوں، بس اتنا جانتا ہوں کہ یہ بوجھ کندھوں پر لادنے والا انسان بہت توانا ہو جاتا ہے۔ اپنے آپ کو بھول کر محبوب کی ذات میں گم ہو جاتا ہے۔ میں بھی اپنے چہار سُو تمھیں دیکھتا ہوں۔ تمھارے چہرے کی تابندہ مسکراہٹ مجھے تقویت دیتی رہتی ہے۔"

وہ اُس پر گہری نظر جمائے تھم گئی۔ "کیا تم شاعری کرتے ہو؟"

"نہیں تو......"

"شاعری لکھتے ہو، بولتے ہو مگر شاعر نہیں ہو۔" وہ دروازے میں جا کر پلٹ کر اُسے دیکھنے لگی۔

"میں محسن نقوی اور فیض کے لفظوں کو آج تک تمھارے لیے اپنے سینے میں چھپاتا رہا ہوں۔ اگر تم چاہو تو بیٹ چھوڑ دیتا ہوں، قلم تھام لیتا ہوں۔ ایسے میں دوسرا ہاتھ تمھیں تھامنا پڑے گا۔" وہ ہمت پکڑ کر قریب آ گیا۔

"نہیں نہیں...... ادب انسان کو عظیم بناتا ہے مگر مستقبل نہیں سنوارتا۔ تم جو کر رہے ہو، وہی ٹھیک ہے۔" وہ بالٹی کو دوسرے ہاتھ میں لیتے ہوئے بولی۔ "کیا اَب میں جاؤں؟"

وہ عام سے لہجے میں پوچھ بیٹھی۔ بے ضرر سا سوال قیامت بن گیا۔ کامران چند لمحوں تک اُسے بے یقینی سے دیکھتا رہا پھر اُس کے چہرے پر ہیجان آمیز آثار ہویدا ہوئے اور وہ بھڑک کر اُس کے بہت قریب ہو گیا۔ اُس کے دونوں شانوں کو سخت گرفت میں لیتے ہوئے جوش سے بولا۔ "آئی لو یو بانو! جو اقرار تم زندگی بھر میں شاید نہیں کر پاتیں، وہ تمھارے ایک سوال نے کرلیا۔ تمھارا بدن مجھ سے دور جانا چاہتا ہے، تمھارے دل و دماغ میں جانے اور نہ جانے پر ہچکچاہٹ پیدا ہوگئی۔ ہائے بانو! میں کتنا خوش نصیب ہوں۔ یہ لمحہ، یہ گھڑی کتنی بخت آور ہے۔ ویری تھینکس!"

کامران پر اُترنے والی بخت گیر گھڑی نے بانو کو بہت کمزور کر دیا تھا۔ چہرہ سرخ ہوگیا۔ ہاتھ کپکپانے لگے۔ بہ دقّت تمام پیچھے ہٹی۔ مین گیٹ کی ٹھنڈی آہنی چادر کے ساتھ چپک کر خالی خالی نظروں سے اُسے دیکھنے لگی جو نہ صرف بہت ہمت گیر بلکہ چالاک بھی تھا۔ موقع پانے والا موقع گنوانے کا قائل نہیں تھا۔ ایک قدم بڑھا اور حسن کی سلطنت میں کئی قدم آگے بڑھ گیا۔ وارفتگی کے عالم میں اُس کی زلفوں پر اپنے سلگتے ہوئے ہونٹ رکھ کر پُرحدت سانسوں کے رِدھم پر نغمہ ریز ہوگیا۔ "اے دل آویز! تیرے قرب پر دُنیا جہان کی رونقیں نثار...... تیرے موہوم اعتراف پر رومان بھری لاکھوں کتابیں قربان...... تو ہے تو جہان بھی ہے، جو تو نہیں تو کچھ بھی نہیں ہے۔"

وہ مزید پیچھے نہیں ہٹ سکتی تھی۔ عقب میں فولاد، مقابل میں فولادی ارادہ...... کھسک کر نیچے بیٹھ گئی اور گھٹنوں میں سر ڈال کر خاموش ہوگئی۔ وہ بھی اُس کے مقابل میں سرافگندہ ہوگیا۔ دایاں ہاتھ مین گیٹ کے بند بغلی دروازے پر رکھتے ہوئے بانو کی سماعت پر لرزنے لگا۔ "بانو! تم کیا ہو، تم نہیں جانتیں، میں جانتا ہوں۔ میں کیا ہوں، تم نہیں جانتیں، میں جانتا ہوں۔ سمیرا جانتی ہے۔ اس محلے کی ہر وہ جوان لڑکی جانتی ہے جو مجھے اپنی جانب ملتفت کرنے میں ناکام ہوئی۔ جاؤ! تمھیں دیر ہو رہی ہے۔ کبھی وقت نکال کر میرے دِل میں مچلتے ہوئے جذبات دیکھنا۔ دیکھ لینے کے بعد مجھے یقین ہے کہ تمھیں ہر سُو میں ہی دکھائی دیا کروں گا۔"

اُس کے ہونٹ کانپے۔ بہ دقّتِ تمام کچھ بھی کہہ نہ پائی تو مدد طلب نظروں سے اُسے دیکھنے لگی۔ جانا چاہتی تھی مگر بدن ساتھ دینے پر آمادہ نہیں تھا۔ ایسے میں بالی کا بخار یاد آ گیا۔ تڑپ کر اُٹھی، ہاتھ میں پکڑی بالٹی میں چمکتی ہوئی برف کو دیکھا اور آگ کے گولے کو بہ قوت تمام پرے دھکیل کر کھڑی ہوگئی۔ تیز تیز قدموں سے چلتے ہوئے اُس نے پیچھے مُڑ کر دیکھنے کا خطرہ مول نہیں لیا تھا۔

بالی کو گہری نیند میں پا کر اُس نے واٹر کولر میں برف ڈالی، ڈھکن سختی سے بند کیا اور بالی کی پیشانی کو چھو کر ٹمپریچر کا اندازہ کیا اور پھر اطمینان سے سر ہلاتی ہوئی اپنی چارپائی پر آ گئی۔ دل ہی دل میں کامران اور شاہ سائیں کی نظروں کا موازنہ کرنے لگی۔ دونوں کی فطرتوں کے بیچ زمین و آسمان کا فرق حائل تھا۔ ایک ٹھنڈی چاندنی بدن میں اُتار کر انگارہ بنا دیتا تھا۔ دوسرا شیطانیت بھری آگ سے روح تک خاکستر کرنے کا ارادہ رکھتا تھا۔ ایسے میں شہزاد بھی سوچ کی نگاہوں میں اپنی پوری قامت سے ایستادہ ہوگیا۔ چونک کر تھم گئی۔ اُسے سمجھ نہیں پائی تھی۔ فتح کرنے پر آیا تو دل کی دُنیا کو تہہ و بالا کرتا چلا گیا۔ جاتے ہوئے پیچھے مُڑ کر دیکھنے کا روادار بھی نہ ہوا۔ کیا تھا؟ کیوں تھا؟ اُسے کچھ بھی بتلایا نہیں گیا تھا اور نہ ہی اشارے سے سمجھایا گیا تھا۔ بس یہی سمجھ میں آیا تھا کہ وہ پارس نہیں، آگ ہے، رُسوائی کی کلنک ہے۔ جو بھی چھونے کے لیے فرطِ اشتیاق سے قریب آیا، یک دم بدک کر پیچھے ہٹ گیا۔ پیشانی پر اَن گنت بل پڑ گئے۔ اُس کے وجود میں کیسی باس تھی جسے سونگھتے ہی تتلیاں اور بھونرے دور بھاگنے لگتے تھے۔ شمع دکھائی دینے والی صورت سے نہ جانے کیسی کرنیں پھوٹ پڑتی تھیں کہ جس وجود پر پڑتیں، روح تک چبھن بھرتی جاتیں۔

ناگاہ بالی کے خوابیدہ چہرے پر نگاہ ٹھہر گئی۔ دل نے کہا۔ "بالی جانتا ہے، بتلاتا نہیں۔ شاید اِسے اندیشہ ہے کہ مجھ پر راز کھل کر دکھ کی دبیز چادر بن جائے گا جو پوری زندگی پر

سایہ کشا ہوجائے گی۔"

اُسے نیند نہیں آرہی تھی۔ سونا چاہتی تھی مگر ذہن بے سکون تھا۔ وقفے وقفے سے بالی کے بستر پر جاتی، کبھی بازو کو چھو کر، کبھی پیشانی پر ہاتھ رکھ کر بدن کی تپش کو محسوس کرتی۔ بخار تھا مگر شدّت کم تھی۔ رات نے دبے پاؤں چلتے ہوئے اپنی آدھی مسافت طے کرلی۔ تب اچانک ہی بالی کے تنفس کی آواز بدلنے لگی۔ خراٹے تھم گئے۔ سانس تیز تیز چلنے لگی۔ وہ گھبرا کر اُٹھی اور بالی کی پیشانی پر ہاتھ رکھا۔ بدن آگ پکڑ چکا تھا۔ اُس نے غیر معمولی تیزی کے ساتھ کولر سے ٹھنڈا پانی نکالا اور کپڑا بھگو کر پیروں اور ہاتھوں پر رکھنے لگی۔ پیشانی کو ٹھنڈا کرنے لگی۔ بالی نے بے ارتکاز آنکھیں کھول دیں۔ بانو نے اُسے سیرپ پلایا، دودھ کے ساتھ گولیاں کھلائیں اور لٹاتے ہوئے بولی۔ "تھوڑی دیر بس...... بخار اُتر جائے گا۔"

وہ نقاہت آمیز آواز میں گویا ہوا۔ "تم ابھی تک سوئی نہیں ہو؟"

"میری فکر نہ کرو، آنکھیں بند کرکے سونے کی کوشش کرو۔" بانو نے پیار سے ڈانٹا۔

"میرا دِل گھبرا رہا ہے۔ عجیب بوجھ سا سینے پر پڑا ہوا ہے۔" بالی نے سینے پر ہاتھ پھیرتے ہوئے بے بسی سے کہا تو وہ چونک گئی۔ جھٹ قمیص کے بٹن کھول کر اُس کا بالوں بھرا سینہ سہلانے لگی۔ ہاتھ گیلے تھے۔ بالی کے بدن کو ایک جھٹکا سا لگا۔ لرزتی ہوئی آواز میں بولا۔ "تمھارے ہاتھ بہت ٹھنڈے ہیں۔"

بانو نے کوئی جواب نہیں دیا۔ اُس نے سن پڑھ رکھا تھا کہ ٹھنڈا پانی بخار کی شدّت کو کم کردیتا ہے مگر بالی کے جسم نے نہ جانے کیسا بخار پکڑ لیا تھا کہ اُترنے کا نام ہی نہیں لے رہا تھا۔ بہ جائے کم ہونے کے درجہ حرارت بتدریج بڑھتا جاتا تھا۔ وہ متفکر ہوگئی۔ رات کے اِس وقت میں وہ کسی ڈاکٹر کے پاس نہیں جاسکتی تھی۔ کسی کو بلا نہیں سکتی تھی۔ اگر بخار اسی رفتار سے زور پکڑتا گیا تو کیا ہوگا؟...... اُس کا ذہن چابک دستی سے کام کررہا تھا مگر کوئی راستہ سجھائی نہیں دے رہا تھا۔ اچانک آنکھوں کے سامنے ایک برق کوندگئی۔ کامران نے کہا تھا کہ اگر کبھی ضرورت پڑے تو اُسے بلاسکتی ہے۔ وہ بالی کے بستر سے اُٹھی، اپنے تکیے تلے رکھے موبائل فون تک پہنچی کامران کا نمبر تلاش کرنے لگی۔ ملنے پر رابطہ کرنے کی کوشش کرنے لگی۔ کمپیوٹرفیڈ ٹنگ سنائی دی کہ 'جواب موصول نہیں ہو رہا' تو اُس نے جھنجلا کر ری کال کا بٹن پش کیا۔ دو یا تین مرتبہ کی کوشش پر کامران نے کال اٹینڈ کرلی۔ نیند بھری آواز میں بولا۔ "خیر تو ہے بانو! تمھارے بھائی کی طبیعت زیادہ خراب تو نہیں ہوگئی؟"

وہ جلدی سے بولی۔ "ہاں کامران! مجھے تمھاری مدد کی ضرورت ہے۔ پلیز! کسی ڈاکٹر کو لے آؤ یا بالی کو ڈاکٹر کے پاس لے جاؤ۔ میں تمھاری احسان مند ہوں گی۔"

"پریشان مت ہوؤ۔ میں ابھی آرہا ہوں۔" کامران کی آواز میں عود شدہ خوابیدگی ہوا ہوگئی۔ رابطہ منقطع ہوگیا۔ چند ہی لمحوں کے بعد گلی میں موٹر سائیکل دروازے پر آن رُکنے کی آواز اُبھری۔ بانو بھاگتی ہوئی دروازے پر پہنچی۔ چٹخنی کھول کر گلی کے اندھیرے میں جھانکتے ہوئے بولی۔ "کامران! بھائی کی حالت بہت خراب ہے۔ اُسے ڈاکٹر کے پاس لے کر جانا ہوگا۔"

کامران نے موٹر سائیکل کو اسٹارٹ حالت میں اسٹینڈ پر لگایا اور اُسے ہاتھ سے ہٹا کر گھر میں داخل ہوگیا۔ بالی کے بستر پر پہنچا۔ نبض اور ٹمپریچر چیک کرنے کے بعد بولا۔ "میرا خیال ہے کہ اِسے لے کر جانا مناسب نہیں ہوگا۔ ڈاکٹر زوار حسین جعفری پاپا کے بہت اچھے دوست ہیں۔ ہمارے فیملی ڈاکٹر بھی ہیں۔ میں اُنھیں چٹکی بجاتے میں اُٹھا لاتا ہوں۔ تم یہ بتلاؤ کہ اِسے ملیریا ہے یا ٹائیفائیڈ؟"

کامران کے ذمہ دار رویے نے بانو کو ڈھارس دی۔ ہولے سے بولی۔ "ٹائیفائیڈ ہے، بدقسمتی سے بگڑ گیا ہے۔"

کامران نے اُسے بالی کا دھیان رکھنے کا مشورہ دیا اور تیز تیز قدموں سے چلتا ہوا گھر سے نکل گیا۔ نصف گھنٹے کے بعد ڈاکٹر زوار حسین کے ہمراہ پہنچ گیا۔ اُس وقت تک بانو کولر میں رکھی ہوئی برف ختم کرچکی تھی۔ ڈاکٹر نے اُس کے سر پر پیار بھرا ہاتھ رکھا، بالی کا ٹمپریچر نوٹ کیا، بولا۔ "بیٹی! تم نے ہمت سے کام لے کر اپنے بھائی کی زندگی کو بچا لیا ہے۔ اگر ہمت ہار دیتیں تو یہ زندگی کی بازی ہار جاتا۔ ٹمپریچر برف لگانے کے باوجود ایک سو چار پر ہے۔ اوہ مائی گاڈ! ایسے میں تو کوئی دوا انجیکٹ بھی نہیں کی جاسکتی۔ جاؤ! فریج میں سے اور برف نکال لاؤ۔"

بانو نے گھبرا کر کامران کی طرف دیکھا۔ وہ کوئی وقت ضائع کیے بغیر برف لینے کے لیے بھاگ گیا۔ ڈاکٹر نے سرنج میں دوا بھر کر تپائی پر رکھ دی۔ برف آنے پر دونوں کو بالی کے جسم پر برف ملنے کی ذمہ داری سونپتے ہوئے اپنے میڈیکل بیگ کی طرف متوجہ ہوگیا۔ ایک بوتل کھول کر بالی کے منہ سے لگادی۔ برف نے بالی کا لباس بھگو دیا، بستر تر بہ تر کردیا تب کہیں جا کے تھرمامیٹر کا پارہ سو سے نیچے آیا۔ ڈاکٹر زوار جعفری نے بازو کی ورید میں دوا انجیکٹ کردی۔ پھر کندھے کے ماس میں بھی کوئی دوا بھر دی۔

ایسے ہی وقت میں بالی کی بے ہوشی نما غنودگی کا سکوت ٹوٹ گیا۔ وہ مدھم آواز میں پانی مانگنے لگا۔ ڈاکٹر کی اجازت پا کر بانو نے ٹھنڈے پانی کا بھرا گلاس اُس کے کانپتے لبوں سے لگا دیا۔ ڈاکٹر نے اطمینان بھری نگاہوں سے کامران کو دیکھا اور کندھے پر ہاتھ مار کر بولا۔ ''ینگ مین! تمھاری کھلاڑیوں والی مستعدی اور نوعمری کی اَن تھک ضد نے مریض کو پویلین سے نکال کر زندگی کے گراؤنڈ میں پھر اُتار دیا ہے۔ تمھارے پاپا سے کہوں گا کہ اُس کا بیٹا اَب جوان ہوگیا ہے اور اگر چاہے تو اُس کی شادی کا ارمان پورا کرسکتا ہے۔''

وہ کھسیا کر بولا۔ ''آپ تو بات بڑھانے کے شروع سے عادی رہے ہیں انکل! میں نے ایک عمومی نوعیت کا کام کیا ہے، کوئی دودھ کی نہر نہیں کھودی۔''

بانو کافی حد تک سنبھل چکی تھی۔ کامران کی بات سُن کر بالی کے بالوں میں انگلیاں پھیرتے ہوئے شکر گزار نظروں سے کامران کو دیکھنے لگی، بولی۔ ''تم نے دودھ کی نہر کھودنے سے بھی بڑا کام کیا ہے۔ خدا تمھیں اس کا اجر دے گا۔''

وہ کہنا چاہتا تھا کہ 'اجر اگر تمھاری صورت میں ہوگا تو مانوں گا کہ ناخنوں سے پہاڑ کھرچ کر جوئے شیر نکالنے میں کامیاب ہوگیا ہوں' مگر ڈاکٹر زوار کی موجودگی کے باعث کہہ نہ پایا، بولا۔ ''میں ڈاکٹر صاحب کو ان کے گھر ڈراپ کرنے کے بعد اپنے گھر چلا جاؤں گا۔ مجھے یقین ہے کہ تمھیں اَب کسی پریشانی کا سامنا نہیں کرنا پڑے گا۔ اگر، بہ فرضِ محال، میری مدد کی ضرورت پاؤ تو بلا جھجک مجھے بلالینا۔''

بانو کا سر جھک گیا۔ جھکتے جھکتے بالی کی پیشانی تک پہنچی، چومنے کے بعد اپنی نم آنکھیں پونچھنے لگی۔ کامران اور ڈاکٹر زوار جعفری پندرہ بیس منٹ تک بیٹھ کر آپس میں باتیں کرتے رہے، گاہے بگاہے بالی کا معائنہ کرتے رہے پھر اُسے تسلی دیتے ہوئے رخصت ہوگئے۔ وہ دروازہ بند کرکے پلٹی اور بالی کے پاس آ کر بیٹھ گئی۔ وہ اَب پوری طرح جاگ رہا تھا اور سنبھل چکا تھا۔ اُسے پاس بیٹھا کر، ہاتھ سہلاتے ہوئے، کمزور سے لہجے میں بولا۔ ''بانو! میری جان! تمھیں میری وجہ سے بہت پریشانی اُٹھانا پڑی مگر......''

بانو نے ہاتھ چھڑا کر اُس کے لبوں پر رکھ دیا۔ دل میں غبار بھرا ہوا تھا۔ بالی کے سینے پر سر رکھ کر بچوں کی طرح پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ بالی دِلاسہ دینے لگا۔ وہ سنبھلنے کی بہ جائے بکھر گئی۔ بھرّائی ہوئی آواز میں بولی۔ ''بالی! تمھیں اَبو کی شکل تو کچھ کچھ یاد ہوگی۔ وہ تمھارے جیسے تھے، میرے جیسے تھے، کیسے تھے؟ بتلاؤ ناں!''

وہ چونکا۔ ایک ذرا ساکت ہوا، پھر نفی میں سر ہلاتے ہوئے بولا۔ ''نہیں بانو! مجھے یاد نہیں۔''

''ماں کیسی تھی؟ وہ تو یاد ہوگی تجھے؟''

وہ مایوسی سے بولا۔ ''نہیں۔ لوگ کہتے تھے کہ تم اُس پر گئی ہو مگر میں اُسے بھی بھول چکا ہوں۔ یاد رکھنے کا کچھ فائدہ بھی تو نہیں تھا ناں۔''

''ہمارے اَبو کیا کام کرتے تھے؟'' بانو کی آس بھری آنکھیں اُس پر جم گئیں۔

''محنت مزدوری کرتے تھے۔''

''مزدوری کی بہت سی قسمیں ہیں۔''

''ہاں! وہ زمینداروں کے کھیتوں میں کام کرتے تھے۔''

''یہ بات تمھیں کس نے بتلائی؟'' وہ کریدنے لگی۔

بالی چونکا۔ اُس پر تشکیک بھری نگاہ ڈالتے ہوئے بولا۔ ''یہ آج تم کون سا قصہ لے بیٹھی ہو؟ چھوڑو، اپنی بات کرو۔ کالج کی کوئی بات بتلاؤ۔ چلو یہی بتلادو کہ ڈاکٹر کے ساتھ آنے والا لڑکا کون تھا؟''

''کامران تھا۔ سمیرا، جو میرے ساتھ کالج جایا کرتی ہے، اُس کا بھائی ہے۔ کرکٹ کھیلتا ہے۔''

''ہائیں...... کرکٹ تو بھی لڑکے کھیلتے ہیں۔ یہ کوئی کام تھوڑا ہی ہے۔'' بالی کے لبوں پر پھیکی سی مسکراہٹ تیر گئی۔

''اِس بات کو چھوڑو، یہ بتلاؤ کہ ابو اور اماں کا کوئی بھی رشتہ دار تمھیں یاد نہیں؟'' وہ منہ بنا کر بولی۔

"نہیں......" بالی نے معصومیت سے سر دائیں بائیں لہرایا۔

"بالی! تم جھوٹ بولتے ہو۔ دیکھو! تم مجھ سے چھ سات سال بڑے ہو۔ جب میں پیدا ہوئی، تب ابا اور اماں زندہ تھے۔ تم نے اپنی زندگی کے ابتدائی چھ سات سال اُن کے ساتھ گزارے، یہ کیسے ممکن ہے کہ اتنا طویل پیار بھرا عرصہ گزارنے کے باوجود تمہیں ابا اور اماں کے خال وخد یاد نہ رہے ہوں، تمہیں کسی رشتہ دار کا پتہ نہ ہو۔ تم مجھ سے کیوں چھپاتے ہو؟"

وہ نظریں چُرانے لگا۔ ملتجیانہ انداز میں بڑبڑایا۔ "مجھے کچھ چھپانے کی ضرورت ہی کیا ہے۔ تم بلاوجہ شک کرنے لگی ہو۔ ابا بتلاتے تھے کہ ہمارا کوئی بھی رشتہ دار نہیں ہے۔"

"ماں بھی یہی کہا کرتی تھی؟" بانو کی نظریں اُس کے چہرے پر ثبت ہوگئیں۔

"ہاں!" بالی نے جان چھڑانا چاہی۔

بانو کی آنکھوں میں خشونت عود کر آئی۔ ایک ذرا چبھتے ہوئے لہجے میں بولی۔ "تمہیں باتیں یاد ہیں، چہرے یاد نہیں رہے، یہ کیسے ممکن ہے؟"

بالی نے آنکھیں بند کرلیں۔ آئیں بائیں شائیں کرنے لگا۔ بانو اُس کا پیچھا چھوڑنے والی نہیں تھی۔ بولی۔ "تائی بشیراں ہماری کچھ نہیں لگتی تھی۔ ہم سے پیار نہیں کرتی تھی۔ بس ہمیں کھلاتی پلاتی اور ڈانٹتی تھی۔ میں اُس کا بوڑھا اور بے رونق چہرہ آج تک بھلا نہیں پائی ہوں اور تم نے ماں باپ کو بھلا دیا۔ میں اُس لوہار کی نفرت کو یاد کر بیٹھتی ہوں جو قسائیوں کی طرح تمہاری پٹائی کرتا تھا، تم نے ماں باپ کے پیار کو یاد نہیں رکھا۔ سچ بتلاؤ بالی! تم دیکھنے میں جتنے معصوم ہو، حقیقتاً تم اتنے معصوم نہیں ہو۔"

بالی نے شکوہ کناں نگاہوں سے اُسے گھورا اور آنکھیں بند کرلیں۔ بولا۔ "میں تھک گیا ہوں، مجھے نیند آرہی ہے۔ تم بھی سو جاؤ۔ رات بہت گزر گئی ہے۔"

وہ پھر رونے بیٹھ گئی۔ ہچکیاں لیتے ہوئے بالی کے سینے پر ننھے ننھے گھونسے مارنے لگی۔ اُس کی نقاہت کی پروا کیے بغیر چبھتے ہوئے لفظوں سے لتاڑنے لگی۔ بولی۔ "میں نے تمہارے حکم پر ہر مرتبہ خاموشی سے سامان باندھ کر سر پر رکھا، چل پڑی مگر کچھ پوچھ کر تمہیں شرمسار نہیں کیا۔ میں نے تو تب بھی لبوں پر لگی چپ کی مہر ٹوٹنے نہیں دی جب ہمیں استاد جانے نے دھکا دے کر آنکھیں پھیر لی تھیں۔ میں تو تب بھی کسی کو موردِ الزام نہ ٹھہرا پائی جب عینی اور اُس کے بھائی نے جھٹک کر دور پھینک دیا تھا۔ میں جانتی ہوں، کہیں نہ کہیں، ہماری زندگی کے دامن پر کوئی سیاہ دھبہ لگا ہوا ہے جو مجھے دکھائی نہیں دیتا۔ تم میری آنکھوں پر سے ہاتھ ہٹاؤ اور مجھے وہ داغ دکھاؤ جسے تم نے مجھ سے چھپا رکھا ہے مگر دُنیا سے چھپانے میں ناکام ہوجاتے ہو۔"

"ایسا کچھ بھی نہیں ہے......" بالی کا لہجہ ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہوگیا۔

"ایسا کچھ نہ کچھ ہے بالی!" بانو نے ایک ایک لفظ پر بہ طورِ خاص زور دیتے ہوئے سخت لہجے میں کہا۔

"تمہیں شہزاد نے کچھ کہا ہے؟" بالی چونکا۔

رسی کا ایک سرا بانو کے ہاتھ لگ گیا۔ چیخ کر بولی۔ "کیا اُس نے وہ داغ دیکھ رکھا ہے؟"

"نن......نہیں تو......تم تو بالکل جھلی ہوگئی ہو۔ کہہ رہا ہوں کہ ایسی کوئی بات نہیں جو تم سے چھپائی جائے، خواہ مخواہ مجھے پریشان نہ کرو۔" بالی نے زچ ہوکر کہا۔

"تم ہر اُس شخص پر گفتگو کرتے ہو جس کا کچھ نہ کچھ عمل دخل ہماری زندگی میں واقع ہے مگر نہ جانے کیوں ماں باپ کے سوال پر تمہیں چپ لگ جاتی ہے۔ بتاؤ ناں......اچھے بھائی اپنی بہنوں سے کچھ چھپایا نہیں کرتے۔" وہ منت سماجت کرنے لگی۔ ایسے میں ایک برق بلا کوند گئی۔ اندر ہی اندر سارے بدن کو جلا کر راکھ کرگئی۔ بالی کے کچھ بولنے سے پہلے ہی بھرائی ہوئی آواز میں پھٹ پڑی۔ "تم نے ماں باپ کو ایسے بھلا دیا جیسے وہ تھے ہی نہیں......اُن کا کوئی وجود ہی نہیں تھا۔"

بالی سینے پر سر لٹکائے جھکی بانو کی پروا کیے بغیر ایک جھٹکے کے ساتھ بستر میں اُٹھ بیٹھا۔ بانو چارپائی سے لڑھک گئی۔ سنبھلتے سنبھلتے زمین پر گرگئی۔ فی الفور اُٹھ کر چارپائی کی پائنتی کی جانب بیٹھتے ہوئے اُسے تیز نظروں سے گھورنے لگی۔ وہ بولا۔ "یہ کیسے ممکن ہے؟ ماں باپ کا اگر کوئی وجود نہیں تھا تو ہم دونوں کیسے پیدا ہوگئے؟ تم بھی کبھی بے وقوفی میں حد سے گزر جاتی ہو۔ تمہیں یہ بھی دھیان نہیں رہتا کہ تم کیا کہنے جارہی ہو، تمہیں یہ کہنا چاہیے یا نہیں۔"

اُسے بالی کی ڈھٹائی پر غصہ آیا۔ سوچ میں پڑگئی۔ یہ

طے تھا کہ گھی سیدھی انگلیوں سے نکلنے والا نہیں تھا۔ باوجود کہ بخار نے بالی کو بے حد کمزور کر دیا تھا مگر وہ اتنا بھی لاغر نہیں ہوا تھا کہ اپنا سینہ کھول کر رکھ دیتا۔ بانو نے دوسری بساط سجالی۔ ''دیکھ بالی! تم نے کبھی مجھ سے جھوٹ نہیں بولا۔ تمھارے منہ سے نکلنے والے ہر لفظ پر میرا دلِ یقین کر لیتا ہے مگر نہ جانے کیوں تم جب ماں باپ کی کوئی بات کرتے ہو تو میرا دل بیٹھنے لگتا ہے۔ اگرچہ شہزاد نے مجھے سب کچھ بتلا دیا تھا، انکار کی وجہ بھی سمجھا دی تھی مگر میں تمھارے منہ سے سننا چاہتی ہوں۔ بتا کر فائدے میں رہو گے، نہ بتا کر پچھتاؤ گے۔ تم جانتے ہو، میں ضد کی کتنی پکی ہوں، شاہ سائیں والے واقعے کو بھول گئے کیا؟''

بالی کو جھوٹ کے بلند ٹرٹاور سے اُتارنے کے لیے وہ دھمکیوں پر اُتر آئی۔ بالی کو کمزور پڑتے دیکھ کر چارپائی سے اُتری اور لپک کر برتنوں والی الماری تک آئی، چھوٹے سائز کی چمکدار ترکاری کاٹنے والی چھری اُٹھائی اور اپنی ایک آنکھ پر رکھ کر چارپائی کی پائنتی سے لگ کر کھڑی ہوگئی ۔ ''دیکھ بالی! مجھے سچ سچ بتا دے ورنہ میں اپنی آنکھ پھوڑ لوں گی۔ پھر بھی نہ مانے تو دوسری آنکھ پھوڑ لوں گی۔ پھر تمام عمر ایک اندھی لڑکی کو اُٹھائے پھرو گے۔''

اُس کے لہجے کی سنگینی نے بالی کو ہلا کر رکھ دیا۔ چیخ کر اُسے اِس کے خطرناک ارادے سے باز رکھنے کی کوشش کرنے لگا مگر وہ اپنی ہٹ پر قائم رہی۔ چند ہی لمحوں میں بالی کا حوصلہ چوپٹ ہو گیا اور وہ شکست خوردہ انداز میں سر جھکا کر بولا۔ ''بانو! ہمارا کوئی بھی نہیں ہے۔ باپ، ماں یا کوئی رشتہ دار سرے سے دُنیا میں موجود ہی نہیں ہے۔ میری نظر نے کچھ بھی نہیں دیکھا جسے یاد رکھنا ضروری ہوتا۔''

بالی کے حلق سے ایک سسکی برآمد ہوئی اور وہ گھٹنوں پر سر رکھ کر ہچکیاں لینے لگا۔ اُس کے لبوں پر دل کا داغ زندگی میں پہلی مرتبہ مچلا تھا ورنہ داغ نے کانوں کے راستے دماغ پر یلغار کا تسلسل بنائے رکھا تھا۔ بانو کے ہاتھ سے چھری چھوٹ کر فرش پر گر گئی اور وہ تڑپ کر بالی کے قدموں میں گر گئی۔ بالی ہچکیوں کے بیچ نہایت مدھم آواز میں بتلا رہا تھا ۔ ''مجھے تائی بشیراں نے لوہار کے چھپر کے دائیں ہاتھ پر موجود کوڑا کرکٹ کے ڈھیر سے تب اُٹھایا تھا جب میں محض دو تین دِنوں کا تھا۔ گاؤں والوں کے روکنے کے باوجود اُس نے میرے سینے میں سانس کا صور پھونک دیا۔ اُسی نے مجھے بالی کا نام دیا تھا۔ گاؤں والوں نے مجھے 'حرامی' کہنا شروع کر دیا تھا۔ تب مجھے نہیں علم تھا کہ حرامی کیا ہوتا ہے، بالی کیا ہوتا ہے۔ پھر جب میں سات سال کا ہوا تو میں نے بچوں کے ساتھ کھیلتے کودتے زمیندار کی حویلی کے پچھواڑے کے گوبر کے ڈھیر تلے آدھی دبی، آدھی کھلی پوٹلی دیکھی تو اُسے باہر کھینچ لیا۔ پوٹلی کے اندر تمھارا وجود کلبلا رہا تھا۔ میں تجھے اُٹھا کر تائی بشیراں کے پاس لے آیا۔ اُس نے دیکھتے ہی چیخ ماری اور مجھے کہا۔ ''کل موہے! یہ حرام کی کل کہاں سے اُٹھا لایا ہے تو؟ بھاگ اور اِسے بیرواں نہر میں پھینک آ ورنہ گاؤں والے تمھاری چمڑی اُدھیڑ دیں گے'...... میں ڈر گیا۔ تمھیں اُٹھائے نہر کے کنارے پہنچا۔ اُس وقت میں نے تمھارے بدن سے لپٹا کپڑا ہٹایا، تمھارا چہرہ دیکھا، پھر میں تجھے نہر میں پھینک نہیں پایا بلکہ اُنہی قدموں گاؤں میں لوٹ آیا۔ تائی بشیراں کو دکھا کر میں کہنے لگا۔ ''دیکھ تو سہی تائی! کتنی سوہنی کڑی ہے۔'' تائی نے دیکھا۔ آنکھوں میں جذبۂ ترحم رَچ گیا۔ میرے ہاتھوں سے چھین کر تجھے دیکھنے لگی۔ دیکھتے دیکھتے رونے لگی اور گاؤں کی کسی مٹیار کی ہوس ماری جوانی کو کوسنے لگی۔ ہائے بانو! میں تو اُس نظر، نظر میں بسے پہلے منظر اور تمھاری پہلی دید کو نہیں بھول، کوئی اور بھی ہوتا تو اُسے کیسے بھول جاتا مگر اِن باتوں کا کچھ بھی حاصل نہیں ہے۔ بھول جانے میں عافیت ہے، میں بھول گیا ہوں، تم بھی بھلا دو۔ سو جاؤ، مجھے سونے دو۔''

یوں لگا، جیسے بانو کے بدن سے تمام خون نچڑ گیا ہو۔ پھٹی پھٹی نگاہوں سے بالی کو دیکھنے لگی۔ بھولا بھالا بالی کتنا گھنا اور اندر سے مضبوط تھا کہ اِن چند قیامت گیں لفظوں کو برسوں سے سنبھالے اُس کے ساتھ سوتا بیٹھتا تھا مگر اپنے ہاتھوں دی ہوئی گرہوں کو کھولتا نہیں تھا۔ سکوت کا طویل دورانیہ گزرا تو بانو نے طویل اور سرد آہ بھر کر کہا۔ ''اب بھی، گاؤں والے تجھ سے کیوں نفرت کرتے تھے۔ کیوں ہر کوئی تجھے مارنے کے درپے رہتا تھا مگر مجھے کوئی جھڑکتا نہیں تھا، مارتا نہیں تھا۔ شاید اِس لیے کہ میں تائی کے ساتھ تمام وقت چمٹی رہتی تھی۔ مگر بالی! ایک بات کی سمجھ نہیں آئی مجھے۔ ہم نے وہ گاؤں چھوڑ دیا، پھر اُس ضلع سے نکل آئے

اور ہجرت پہ ہجرت کرتے ہوئے کہاں سے کہاں پہنچ گئے مگر ہماری بدنصیبی بھی ہمارے قدموں پر چلتی آئی۔ استاد جانے کو کیسے پتہ چلا، شاہ سائیں کو کس نے بتلایا اور شہزاد تک یہ خبر کیسے پہنچ گئی؟"

بالی کا سر جھکا ہوا تھا۔ چہرہ متغیر تھا۔ پیروں سے لپٹی بانو کو کھینچ کر سینے سے لگاتے ہوئے خشمگیں نظروں سے دیکھنے لگا۔ کانپتی ہوئی آواز میں بولا۔"استاد جانے کو گاؤں کے بڈھے کالو لوہار کے ٹرک ڈرائیور بیٹے نے میرے بارے میں بتلایا تھا۔ اُس خبیث کو یہ خبر نہیں تھی کہ مزے کی خبر سناتے ہوئے وہ چار زندگیوں کے خوابوں کو برباد کرنے لگا ہے۔"

"اور شاہ سائیں کو؟"

"شاہ سائیں کو میں نے خود ہی بتلا دیا تھا۔ اُس نے ایک شربت ایسا پلایا تھا کہ میرا دماغ اپنے اختیار میں نہیں رہا تھا۔ وہ پوچھتا گیا، میں بے اختیار اور بے چناؤ بتلاتا گیا۔ وہ شربت بڑا مزے کا تھا۔ کئی دِنوں تک مزہ دیتا رہا۔ میں یقین سے نہیں کہہ سکتا کہ میری زبان اُس شربت کے ذائقے نے کھولی تھی یا تمھاری ذات سے بے تحاشا پیار نے......" بالی کا لہجہ بتدریج کرب وابتلا کا غمازی ہوتا جاتا تھا۔

"شاہ سائیں نے شہزاد کو بتادیا اور شہزاد مجھ سے متنفر ہوکر بہت دُور چلا گیا۔ میں کبھی بھی اُس بے غیرت انسان کو معاف نہیں کروں گی۔ ہائے خدا! تو ایسے شیطانوں کی رسّی اتنی دراز کیوں کردیتا ہے کہ وہ ہم جیسے کیڑوں مکوڑوں کے بدنوں پر اژدہا بن کر پھر جاتی ہے۔" وہ پھر تڑپ کر رونے لگی۔ بالی اُسے سنبھالنے لگا۔ حوصلہ دینے لگا۔

ایسے میں بانو کے دِل میں محبت کا ایک دریا بھر کر طغیانی دار ہوگیا۔ سرافگندگی کے عالم میں نظر اُٹھا کر بالی کے چہرے کا طواف کیا۔ اُس کی عظمت کے حضور دل سجدہ ریز ہوگیا۔ سیاہ دکھائی دینے والے کا من کتنا اُجلا اور شفاف تھا۔ ایک چھوٹی سی بات...... ایک چھوٹا سا دُکھ...... دو حرفوں پر مشتمل کہانی کو کتنی صداقت اور ایمانداری سے بانو سے چھپاتا آیا تھا کہ اُسے دکھ نہ ملے۔ اُسے کسی احساسِ کمتری کے دباؤ کا سامنا نہ کرنا پڑے۔ وہ جسے آج تک بے وقوف سمجھتی آئی تھی، وہ کتنا سوجھ بُوجھ اور معتبر تھا، پتہ چلا تو دم بخود رہ گئی۔ غیر محسوس انداز میں بالی کے پیروں کی جانب کھسک گئی۔ بالی سمجھ نہ پایا مگر وہ جھک کر پیروں کو چومنے لگی، گال رگڑنے لگی اور برف رگڑنے کے سبب متورم ہونے والے پیروں کو نم گرم پانی سے حدت پہنچانے لگی۔ بے ربط لفظوں سے کہانی بننے لگی۔"ہائے بالی! میرا دُنیا میں کوئی نہیں مگر میری تمام تر حرماں نصیبی تمھاری اپنائیت پر قربان! مجھے تم نہ ملتے، سب کچھ مل جاتا تو بھی میں شاید راضی نہ ہو پاتی۔ تم مل گئے، سمجھنے لگی ہوں کہ دُنیا مل گئی ہے......تم اَن پڑھ نہیں، تم جاہل اور بدصورت نہیں بلکہ دُنیا میں تم سے بڑھ کر کوئی نہیں۔ تمھاری محبت سے بڑھ کر کچھ بھی نہیں ہے۔"

بالی نے اُسے پیروں سے لپٹا رہنے دیا، چھیڑا نہیں بلکہ ایک آزردہ، تھکی تھکی اور بے جان سی مسکراہٹ اُس کے لبوں پر ڈھلتی شام کے تانبئی افق کی آخری لالگی کی مانند ٹھہری گئی۔ دل پر عمر بھر کے لدے بوجھ نے فراغت بخش دی تھی۔

☆☆

دِن پر دِن خالی الذہنی کی کیفیت میں گزرتے جارہے تھے۔ اُس نے کالج سے بہت سی چھٹیاں کرلیں تو دِل چار دیواری کے اندر بھرے ہوئے نادیدہ حبس سے بھرنے لگا۔ بے دھیان بیٹھتی تو دیواریں طعنہ زن ہونے لگتیں 'اے بے نسب حسینہ! اترا کر چلتی ہو تو ہر آسمان بھی خندہ زن ہوجاتا ہے۔ سر جھکا کر بیٹھتی ہو تو زمین تمھارے نخرے پر انگشت بدنداں ہوجاتی ہے۔ اپنا آپ ملاحظہ کرو، بدن کے جن اُجالوں کو تم اپنے حسن کا حاصل سمجھتی ہو وہ ایک ابتدائی گناہ کے پروردہ ہیں۔ دھبا روشن رُخ ہو، تب بھی بُرا لگتا ہے۔ اپنی اوقات میں رہا کرو۔"

وہ بے چین ہوجاتی۔ سوچتی۔"دُنیا میں میرے جیسے اَن گنت وجود سانسیں لے رہے ہیں۔ سانسوں میں کتنا تعفن بھرا ہے، کوئی سونگھتا نہیں۔ میرے جیسی کتنا فاختائیں کھلے آسمانوں کی وسعتوں میں پرواز کناں ہیں۔ کوئی اُن کے پَروں پر قینچی چلانے کی جرأت نہیں رکھتا۔ رنگوں سے بھرے جہان میں لاتعداد تتلیاں اٹھکیلیاں کرتی پھرتی ہیں مگر کوئی اُن کے پَروں میں پن گاڑ کر آزادی سلب نہیں کرتا۔ مجھے ہی کیوں دُنیا مجبور کرتی ہے کہ میں اپنے بدن میں اپنے ڈنک کا زہر سمو کر بے دَم ہوجاؤں۔ کسی کے پاس نسب کا یقین نہیں ہے۔ کوئی کامل اعتماد سے نہیں کہہ سکتا کہ اُس کی تخلیق میں کہیں بے ایمانی کا بیج نہیں بویا گیا، پھر مجھ پر، بالی پر، کیوں دُنیا کے قانون، دُنیا کی زبانیں لپکتی رہتی ہیں۔"

تائی بشیراں کا عکس آئینۂ وقت بن کر نگاہوں میں ٹھہر جاتا "ریگی! تمھارا بھائی تمھیں کوڑے کرکٹ سے اُٹھا کر اِس لیے میرے آنگن میں لایا تھا کہ تمھاری چلتی رُکتی سانسوں کا رشتہ بحال رہے۔ یہ نہیں سوچا تھا کہ تم اتنی بلندی پر اُڑنے کے خواب دیکھنے لگو گی۔ میں تیرے حلق میں دودھ کی بوندیں ٹپکا سکتی تھی، ٹپکاتی رہی؛ تمھارے مستقبل میں نام ونسب کی نمو بخشنے والا رس کہاں سے لاتی جو تجھے جہان بھر میں معتبر رکھتا۔ مجھے معاف کر دینا...... تمھیں زندہ رکھنے کی خواہش بالی کے ننھے سے سینے میں پروان چڑھی تھی، میرے نہیں۔ میں اِس عذاب کو قبل اَز وقت پہچانتی تھی جو آج تمھاری زندگی کے کھلے آسمان پر قیامت بن کر ٹوٹ پڑا ہے۔"

کالو لوہار کے ہاتھوں بالی کی کمر پر لگنے والا ہر دُکھ خیز داغ آج بھی اپنی پوری آب وتاب سے اُس کی نگاہوں جھلملاتا رہتا تھا۔ پہلے اور زبان بولتا تھا، آج اُس کی بولی بدل گئی تھی۔ وہ سمجھا رہا تھا۔ "تو سمجھتی رہی کہ میں کمر پر عارضی نشیمن بنائے بیٹھا ہوں، نہیں، نہیں...... ایسا نہیں ہے۔ میں تو وہ داغ ہوں جو تمھاری زندگی کے ناپختہ بدن پر اَزل سے چمٹا ہوا ہوں۔ قبر تک تمھارا پیچھا کروں گا۔ تم نے بالی کے سیاہ بدن کو نکورتے ہوئے یہی سمجھ لیا تھا کہ میں صرف بالی کو تکلیف پہنچاتا ہوں، نہیں...... ایسا نہیں ہے۔ میں تم دونوں کی زندگی کو عذاب بنانے والا ہوں۔"

اُستاد جانے کا پَل میں بدلنے والا رویہ یاد آنے لگا۔ وہ سوچا کرتی تھی کہ اَب خوشیاں ہمیشہ اُس کے سر پر منڈلاتی رہیں گی۔ نہیں...... ایسا نہیں ہوا۔ سر بے سائبان ہو کر دُکھنے لگا تھا۔ اُستاد جاناں یوں بھڑک کر پیچھے ہٹا تھا جیسے وہ اگر اپنے پیروں پر کھڑا رہے گا تو جل کر خاکستر ہو جائے گا۔ ایسے ہی شہزاد بدک کر دور ہو گیا تھا۔ اُس کے لبوں پر بے اختیار شکوہ مچل گیا۔ "ہائے شہزادا! تم نے کہا تھا کہ تم میرے بدن کو نہیں، میری روح کو چاہتے ہو۔ بدن پر پڑی سلوٹیں دیکھ کر کنارہ کش ہو گئے، کیا یہی مرد کا قول تھا؟...... دیکھ لو، آنکھیں کھول کر، غور سے دیکھ لو! میرے آلائش زدہ بدن کے اندر کتنی مقدس روح سمائی ہوئی ہے۔ تم نے دیکھا ہی نہیں اُسے کہ اُسے تو خدا نے تخلیق کیا ہے، کسی بہکے ہوئے جوڑے نے نہیں؛ میں نے تو اپنی روح کو شاہ سائیں کی آوارہ اور گناہ آلود لپٹوں سے خون کے خول میں لپیٹ کر تمھارے لیے محفوظ کر لیا تھا! پھر تم کیوں دہلیزِ جاں پر آ کر پلٹ گئے؟"

وہ بے دھیانی میں اپنے بدن کے عضو عضو کو سونگھتی۔ کہیں تخلیق کار کی خوشبو رہ گئی ہو، کہیں کوئی اجنبی باس مخفی ہو، کہیں کوئی شبد کندہ ہو...... کچھ بھی نہیں تھا۔ بھی کوسنے لگتی۔ "ہائے ظالمو! مجھے جن کر، دُنیا کے سامنے ہاتھوں کی جھولی میں بھر کر لاتے، پھر بھلے مر جاتے۔ دُنیا مجھ پر 'تھوتھو' نہ کرتی بلکہ تم دونوں کے حوالے سے پوتر خیال کرتی......"

بھی خود کو اُس نادیدہ اور غیر فہمیدہ صورتِ حال میں لا کھڑا کرتی جس نے ایک ماں کو اتنے غیر فطری اور ناپسندیدہ کام پر مجبور کیا تھا۔ ایسے میں عورت کے فطری کمزور پہلوؤں پر دل کڑھنے لگتا۔ وہ تھک گئی۔ لوگوں پر شاکی رہتے ہوئے لوگوں میں گھلنے ملنے کا سوچنے لگی۔ ایسا ہی ہوتا ہے۔ زخم رسیدہ رہ رہ کر سماج کی طرف پلٹتا ہے، روٹھتا ہے پھر اُسی گود میں ہمکنے کے لیے بے چین ہونے لگتا ہے جسے بے توقیر سمجھ کر جھٹک دیا جاتا ہے۔

مسلسل موبائل فون کے بند ملنے پر کچی ڈور سے بندھے عاشق کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو گیا۔ وہ سر کے بَل چلتا ہوا دروازے پر پہنچ گیا۔ دروازے کے عقب میں ایستادہ بانو کے غیر مرئی وجود کو محسوس کر کے بولا۔ "میرے صبر کا امتحان لینے والی! دروازے کو ایک ذرا کھول کر مجھے اپنی جھلک دکھا دو۔ سچ مانو کہ تمھاری بے رُخی کے سبب میرا دَم گھٹنے لگا ہے۔"

وہ لرزتی ہوئی آواز میں بولی۔ "میں نے تمھیں دروازے پر آنے سے روکا تھا۔ ایسے ہی مجھے بدنام کرنے کے لیے دروازے تک پہنچتے رہے تو مجھے محلّہ والے یہاں سے نکال بھگائیں گے۔"

وہ بپھر کر بولا۔ "ایسی کی تیسی محلّہ داروں کی! تم پر اُنگلی اُٹھانے والے کا دَم زمین سے اُٹھا دوں گا۔ تم بزدلوں جیسی باتیں کرتی ہوئی بڑی عجیب لگتی ہو۔"

"تم بھی دیوانوں کی طرح بے تابی دکھا کر مجھے پریشان کرتے ہو۔"

"دیوانہ، دیوانگی بھری باتیں نہیں کرے گا تو بتا، کیا کرے گا؟" وہ ہنس کر بولا۔ "مجھے اندر آنے دو پلیز!"

وہ نہیں مانی۔ دروازے کو تھوڑا سا کھولا۔ آدھے چاند کو دھرتی پر اُتارتے ہوئے مسکرائی اور پھر چھپ گئی۔ بولی

"بس! تم اَب چلے جاؤ، کوئی دیکھ لے گا تو باتیں بنائے گا۔"
وہ دِل کی کہی اور تمام اَن کہی اُس کج فہم پر آشکار کرنے آیا تھا۔ شکار ہو کر پلٹنے لگا۔ پلٹتے ہوئے ٹھٹک گیا۔ ہولے سے بولا۔ "کبھی اتنا وقت تو بخش دو کہ میں تم پر اپنا آپ عیاں کر سکوں۔ تم ملتی نہیں ہو، فون بھی بند رکھتی ہو، یوں لگتا ہے جیسے زندگی کا ہر دروازہ مجھ پر بند ہو گیا ہے۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ میرے ساتھ کیا ہونے والا ہے۔"

اُس کا دِل جیسے مٹھی میں آ گیا۔ بے دھیانی میں، عجلت میں، اپنے خول سے بھٹک کر نکلتے ہوئے کچھ کہنا چاہتی تھی کہ لاج نے زبان کی نوک پکڑ لی۔ وہ کئی ساعتوں تک تھما رہا، اُس کے لبوں سے پھوٹنے والے شگوفے کا انتظار کرتا رہا پھر مایوس ہو کر اپنے گھر کی جانب بڑھ گیا۔ بانو نے دروازے سے جھانک کر دیکھا۔ جانے والے کی پشت دکھائی دے رہی تھی۔ شکر ہے کہ کسی اور نے کامران کو اُس کے دروازے پر کھڑے نہیں دیکھا تھا۔ عافیت بھری سانس پھیپھڑوں میں اُتار کر پلٹ آئی۔

بچوں کو پڑھا کر ستانے بیٹھی تھی کہ عینی کا فون آ گیا۔ کان سے لگاتے ہوئے چہکی۔ "کیسی ہو؟"

"ایک دم فرسٹ کلاس! تم کہو، تمہاری نئی عشق کہانی میں کوئی جاندار موڑ آیا یا اَبھی تک محض کرداروں کا تعارف چل رہا ہے؟" عینی نے شوخ لہجے میں پوچھا۔

"اُس نے حالِ دل آشکار کرنے کی مہم کا آغاز کر دیا ہے۔"

"تمہاری آنکھوں نے جواباً غزل چھیڑی؟"

"بکومت!" بانو نے ایک ذرا لجا کر کہا "وہ بہت اچھا ہے۔ میں چاہتی ہوں کہ اچھا ہی رہے اور اپنے مستقبل پر نگاہ رکھے۔"

"کیسے ممکن ہے کہ تمہیں دیکھنے کے بعد وہ دُنیا میں کسی اور طرف دیکھنے کی جرأت کرے۔" عینی نے چھیڑا۔

چھیڑے جانے پر بے ساختہ چھڑ گئی۔ دَبے دَبے لفظوں میں قلعہ بند جان کی تسخیر کے لیے کامران کی پُرجوش یورشوں اور فصیلِ جاں کی لرزشوں کا احوال سنانے لگی۔ سناتے سناتے روہانسی ہو کر بولی۔ "عینی! دل ڈرتا ہے۔ ڈرتے ڈرتے ہاتھ بڑھاتا ہے مبادا کہ ہتھیلی انگاروں سے بھر نہ جائے۔ میں پہلے کی طرح نادانوں کی طرح قدم بڑھاؤں، وہ میرے اُجلے تن میں چھپے میل کو بھانپ کر پیچھے ہٹ جائے، جیسے تمہارے بھائی نے آنکھ پھیر لی تھی، تو کیا ہو گا؟ میں ایک ہی کھیل کتنی مرتبہ کھیلنے کا حوصلہ باندھوں؟"

عینی چونکی۔ "میں کچھ سمجھی نہیں...... تم کیا کہنا چاہتی ہو؟"

وہ کراہی۔ "میں جو کہہ رہی ہوں، تم بہ خوبی سمجھ رہی ہو۔ مجھے بالی نے بتلا دیا ہے۔"

عینی بُری طرح گڑبڑا گئی۔ "کیا بتایا ہے بالی نے؟"

"وہی جس نے تمہارے مَن کو مجھ سے پھیر دیا اور تمہارے بھائی نے مٹھی کھول کر ریت کی طرح مجھے زمین پر سرکا دیا۔ عینی! دیکھ تو...... تم دونوں نے مجھے اُس جرم کی سزا دی جو سرے سے میں نے کیا ہی نہیں تھا۔ خدا بھی کسی کے گناہ کی پاداش کا بوجھ اُس کی نسل پر نہیں ڈالتا۔ تم بھی تو اُسی خدا کے ماننے والے ہو جو معافی کے بہانے ڈھونڈتا ہے۔" بانو کا لہجہ بھر آ گیا۔

عینی کو چپ لگ گئی۔ بانو نے چند ثانیے اُس کے بولنے کا انتظار کیا، مایوس ہو کر بولی۔ "عینی! رُسوائی کا داغ میرے زادِ سفر میں رہا مگر مجھے علم نہیں تھا وگرنہ کبھی سامان باندھ کر سر پر نہ رکھتی۔ ایک شہر سے دوسرے شہر کا قصد نہ کرتی۔ نہ جانے دُنیا کیسی ہے؟ لوگ قتل کرتے ہیں، خون چھپا لیتے ہیں، بات کرتے ہیں، بات کا بتنگڑ بنانے والی زبانوں پر قفل لگا دیتے ہیں مگر ہم بہن بھائی ایک ناکردہ جرم کی رُسوائی کا بدنُما داغ عمر بھر میں جھٹلا نہیں پائے۔ مجھے ڈر لگتا ہے۔ جن واقعات نے ہمیں، شہزادا اور سائیں پر برہنہ کیا، وہی مجھے کامران کی نظر میں نامعتبر کر دیں گے۔ میں ایک بار پھر بسنے سے پہلے اُجڑ جاؤں گی۔ تمہی کہو! میں کیا کروں؟"

عینی نے آہ بھری، سنبھلنے کی کوشش کی مگر ناکام ہو گئی، بہ صد جہد بولی۔ "دِل بُرا مت کرو۔ میں کل فون کروں گی۔"

اُس نے بانو کا جواب سُنے بغیر رابطہ منقطع کر دیا۔ بانو نے بے جان انداز میں موبائل فون اپنی گود میں رکھ دیا۔ وہ ری کال کرنے کا ارادہ نہیں رکھتی تھی کیوں کہ اُسے بہ خوبی علم تھا کہ عینی نے سوچنے کا وقت لیا ہے۔ وہ بانو کی غیر متوقع بات سن کر گھبرا کر لاجواب ہو گئی تھی۔

بالی کے آنے تک یونہی بیٹھی رہی۔ غسل خانے میں گھسا تو حسبِ معمول چولھا سنبھال کر بیٹھ گئی۔ بالی نے اُس

کی جھولی میں چند نوٹ رکھے، آنکھوں میں آنکھیں ڈالیں اور مسکرا کر کہا۔ ''گاڑی کا بونٹ پچکا ہوا ہے۔ کہیں ایکسی ڈنٹ تو نہیں ہو گیا؟''

اُس نے طویل سانس حلق میں اُتاری، ایک نظر بالی کو دیکھا۔ ہر سُو پیار ہی پیار موجزن دکھائی دیا تو اُس کا دِل رکھنے کو پھیکے رُو مسکرا دی۔ بولی۔ ''بالی! تم کتنے اچھے ہو۔ اگر دُنیا کے تمام باسی تمھارے جیسے فراخ دِل اور مشفق ہو جائیں تو یہ دُنیا جنت بن جائے۔''

''مشکل باتیں نہ کرو، سیدھی سیدھی بات کرو۔'' بالی نے اُس کے قریب ہی چوکی گھسیٹ لی۔

''تمھیں میری باتیں سمجھ میں نہیں آتیں کیا؟'' وہ منہ پھلا کر بولی۔

وہ کوئی جواب دیے بغیر ایک ٹک اُسے دیکھنے لگا۔ وہ لاڈ سے برہم ہو گئی۔ ''ایسے کیا دیکھ رہے ہو؟''

''دیکھ رہا ہوں، پَل پَل بدلتی ہو، جھوٹ موٹ کا منہ پھلاتی ہو اور آنکھوں سے مسکراتی ہو۔ خدا کرے میری پیاری سی بہن ایسے ہی تمام عمر مسکراتی رہے اور میں دیکھتا رہوں۔'' بالی کے لہجے میں دُنیا بھر کا پیار سمٹ آیا۔ ''بانو! دُعا کرو، دکان ایسے ہی چلتی رہے تو یقیناً ہم سال ڈیڑھ سال میں اپنا گھر خریدنے کے قابل ہو جائیں گے۔''

بانو کے دِل سے ہوک اُٹھی ''گھر، مکان یا حویلی..... سب ایک سے ہیں۔ بنیادوں کی پائیداری کی خاطر جتنا بھی خون سینچا جائے، ایک جھٹکے میں زمیں بوس ہو جاتے ہیں اور آب یاروں کو کچل دیتے ہیں۔'

بالی کی دِل آزاری کے سبب لبوں کو بھینچ کر نیم افسردہ لہجے میں بولی۔ ''میں دُعا نہیں کروں گی تو اور کون کرے گا۔''

بانو نے دیکھا کہ اُبھی تک بخار کی تھکن بالی کے چہرے سے عیاں تھی۔ وہ اُبھی پوری طرح تن درست نہیں ہوا تھا۔ اُس کے گال پر پیار سے ہاتھ پھیرا، پھر اُس کا بڑا سا مضبوط ہاتھ پکڑ کر اپنے گھٹنے پر رکھا اور اُس پر اپنا گال ٹکا دیا۔ روح تک تحفظ کا جاندار احساس اور طمانیت اُتر گئی۔ بے خود سی بیٹھی فرش کو گھورتی رہی، آہستگی سے دِلاسہ دینے کے سے انداز میں بولی۔ ''میں اپنے بھائی کے لیے ایک پیاری سی دُلہن تلاش کر رہی ہوں۔ خدا سے مانگتی ہوں، خدا کے بندوں سے مانگتی ہوں اور سر جھکائے اپنی جھولی میں جھانکتی رہتی ہوں۔ جب مل جائے گی؛ تب ہمیں اپنے گھر کی ضرورت پڑے گی۔ سمجھے؟''

وہ سمجھ کر مسکرایا پھر اپنا کھردرا ہاتھ مخمل کے نیچے سے بڑے رسان سے کھینچ کر اُس کی چمک دار زلفوں کو چھیڑنے لگا۔



سمیرا نے اُسے دہلا کر رکھ دیا۔ کالج سے واپسی پر راستے میں بڑے چاؤ سے بتلانے لگی۔ ''تمھارے عاشق نے تیشہ اپنے ہاتھوں میں تھام لیا ہے۔ اَب پتھروں کا سینہ پُر شگاف ہو گا یا عاشق کا سر......''

وہ چونکی۔ ''کیا مطلب؟''

سمیرا ایک اَدا سے ٹھہر گئی۔ آنکھوں میں شوخی بھر کر بولی۔ ''کامران نے ماما اور پاپا کی عدالت میں تمھارا مقدمہ جیت لیا ہے۔ اُس نے کھلے لفظوں میں دھمکایا کہ اگر اُسے بانو نہیں ملی تو وہ گھر چھوڑ کر چلا جائے گا، کسی کو زندگی بھر نہیں ملے گا۔ پھر ماما نے مجھے کرید کرید کر تمھارے بارے میں پوچھا۔ میں نے بھائی کی حمایت کرتے ہوئے تمھیں دُنیا کی موجودہ اپسرا قرار دیا۔ پتہ ہے پھر کیا ہوا؟''

وہ ہراساں نظروں سے اُسے دیکھنے لگی۔ مستفسر ہوئی۔ ''کیا ہوا؟''

وہ مصنوعی مایوسی سے بولی۔ ''ہونا کیا تھا؟ پاپا اور ماما بھائی کی ایک ہی دھمکی پر ٹھس ہو گئے اور......اور......''

اُس نے جان بوجھ کر اپنا فقرہ اٹک اٹک کر اُدھورا چھوڑ دیا۔ بانو نے نہ یقین کرنے کے سے انداز میں کہا۔ ''مگر یہ باتیں تو بہت قبل از وقت ہیں۔ نہ جانے تم لوگ رائی کا پہاڑ بنانے پر کیوں بے طرح تُل جاتے ہو۔ کامران اُبھی کسی منزل تک نہیں پہنچا اور نہ ہی مجھے شادی کی کوئی جلدی ہے۔ میں اُبھی پڑھنا چاہتی ہوں۔''

سمیرا نے ڈھارس بندھائی۔ ''تو کون سا اُبھی تمھاری کامران کے ساتھ شادی ہو رہی ہے، اُبھی تو صرف جوانی بھری اِس بوتل پر کامران کے نام کا لیبل لگے گا اور بس......''

وہ نفی میں سر ہلاتے ہوئے بولی۔ ''نہیں سمیرا! اپنے بھائی کو، اپنے والدین کو لب کشائی سے روکو۔ میں ایسے رویوں کی متحمل نہیں ہوں۔''

''کیوں؟'' سمیرا اَڑ گئی۔

"میرے بھائی کی شادی ہوگی، بھابھی آئے گی اور وہ میرے مستقبل کا فیصلہ کرے گی۔" بانو نے قدرے درشت لہجے میں کہا۔ "ہاں! اگر......"

اُس کے حلق میں عینی کی زبان کھلنے لگی تھی۔ بولتے بولتے رُک گئی۔ اُبھی تیر کمان میں تھا۔ ایک بار کمان سے نکل جاتا تو زندگی بھر پلٹنے والا نہیں تھا۔

سمیرا نے اچنبھے سے دیکھا۔ "کیا اگر؟"

اُس نے جلدی سے بات بنائی۔ "میں کہنے لگی تھی کہ اگر بالی کی شادی ہو جائے تو اِس موضوع پر سوچنا بنتا ہے وگرنہ نہیں۔"

سمیرا نے اُسے بہ غور دیکھا۔ سمجھ میں آ گیا کہ اُس نے فوراً کسی اندیشے کی بنا پر پٹڑی بدل ڈالی ہے۔ اپنی رَو میں بہک کر کیا کہنے لگی تھی؟ یہ سمجھ میں آنے والی بات نہیں تھی۔ سر جھٹک کر بولی۔ "میرے بھائی کو یوں رَد نہ کرو، منگنی کرلو اور جب تمھارے بھائی کی شادی ہو جائے گی، تب ڈولی میں بیٹھ کر پیا گھر سدھار آنا۔"

اُس نے بے رُخی سے منہ پھیر لیا۔ سمیرا کچھ کہنے لگی تو اُس نے ہاتھ کے اشارے سے روکتے ہوئے کہا۔ "سمیرا پلیز! اِس موضوع کو بند کردو۔"

وہ عجیب مایوسی آمیز نظروں سے گھور کر خاموش ہوگئی۔

کامران کے موضوع پر سمیرا کی زُباں بند کرنے والی اپنے گھر کا دروازہ بند کرنا بھول گئی۔ تبھی وہ دِل ہتھیلی پر رکھے، دستک دیے بغیر فراغت بھری دوپہر میں حسن کے دربار میں قدم رنجہ ہوگیا۔ وہ اُسے کمرے کے دروازے کے عین وسط میں استادہ دیکھ کر یک لخت گھبرا گئی۔ بھڑک کر چارپائی سے اُتری اور برہم لہجے میں ہونٹ بھینچ کر بولی۔ "تمھیں بغیر اجازت میرے گھر میں داخل ہونے کی جرأت کیسے ہوئی؟"

اُس کا لہجہ چٹان کی طرح سخت تھا۔ اُس کی اَز حد متجاوز برہمی کو خاطر میں نہ لاتے ہوئے بولا۔ "تم مجھ پر زندگی کے دروازے بند کرتی ہو، کھولتی ہو اور پھر بند کردیتی ہو۔ کھیلتی ہو، کھیلنے کی اجازت نہیں دیتی ہو۔ میں بے اختیار ہو کر یہاں تک چلا آیا۔ محبت کا یقین لیے بغیر واپس نہیں جاؤں گا، خواہ مجھے کوئی سی قیمت ہی کیوں ادا نہ کرنا پڑ جائے۔"

وہ گھبرا گئی۔ دونوں طاقوں پر ہاتھ رکھے وہ بے خوف اُس کے ذہن میں اندیشوں کی پُر ہیبت گھنٹیاں بجا رہا تھا۔

اُس سے دور، اپنے مطالعے کی میز کی جانب سرکتے ہوئے کراہی۔ "تم یہاں سے چلے جاؤ۔ بالی آنے والا ہے۔"

"تم جھوٹ بولتی ہو۔ بالی کبھی بھی دوپہر میں گھر نہیں آیا، آج بھی نہیں آئے گا۔ مجھ سے ڈرنے کی نہیں، مجھے سمجھنے کی ضرورت ہے۔" اُس نے کمرے میں قدم رکھنے کی کوشش نہیں کی تھی، بولا۔ "بانو! تم نے سمیرا کو جھڑک دیا۔ مجھے خوف لاحق ہے کہ تم مجھے بھی جھڑک دو گی مگر میں تمھارے انکار کو اقرار میں بدلنے کے لیے یہاں آیا ہوں۔"

اُس کی حالت متغیر تھی۔ 'کاٹو تو بدن میں لہو نہیں' کے مصداق خوف، تعجب اور غصے کے ملے جلے تاثرات آنکھوں سے مترشح کرتے ہوئے کامران کو گھور رہی تھی۔

وہ اُس پر ایک ٹک نظریں جمائے کھڑا تھا، بولا۔ "مجھ میں کیا کمی ہے جو تم مجھے یوں نظر انداز کرتی ہو۔ میں تجھے ہر صورت میں حاصل کرنا چاہتا ہوں اور تم یہ بھی سُن لو کہ اگر میں رہوں گا تو صرف تم میری ہم سفر بنو گی۔ بس!"

وہ کچھ نہیں بولی۔ کامران تھوڑے توقف کے بعد اپنے مخصوص انداز میں ہونٹ کاٹتے ہوئے گویا ہوا۔ "بانو! بالی میرا بھائی ہے۔ تم میرا ہاتھ تھام لو، میں اُس کا ہاتھ تھام لیتا ہوں۔ اُس کے لیے کوئی اچھی سی لڑکی تلاش کرنے کی ذمہ داری مجھ پر ڈال کر مطمئن ہو جاؤ۔ میں یقین دلاتا ہوں کہ بالی کی شادی کے بعد ہی تجھے اپنے گھر لے جاؤں گا۔"

اُس نے ایک جھٹکے سے سر اُٹھایا۔ کامران کے چہرے پر اُس کے ارادے کی پختگی رقم تھی۔ چند لمحے تاڑتی رہی، پھر اپنے اعصاب کو جاندار بناتے ہوئے ٹھوس لہجے میں بولی۔ "دنیا میں کوئی بھی شئے مفت میسر نہیں آتی۔"

"ہاں! میں جانتا ہوں۔" کامران نے نہ سمجھتے ہوئے عجلت میں کہا۔ "میں ہر قیمت ادا کرنے کے لیے تیار ہوں۔"

"مثلاً؟" بانو نے پُر اعتماد انداز میں اُس پر نظریں گاڑ دیں۔

"یہ تعین تم نے کرنا ہے۔ میرے پاس میری زندگی ہے، سانسیں ہیں، دھڑکن ہے اور وفا کے لحظہ بہ لحظہ ارتقائی مراحل کا تسلسل ہے، سب تمھارے نام...... میرا سب کچھ تمھارے اُس قدم پر نثار جو میری جانب بڑھے۔" کامران کے لہجے کی غیر معمولی روانی قابلِ ستائش تھی۔ "آج میں بہت خوش ہوں۔ روشن مستقبل کی پہلی

کرن دکھائی دی ہے۔ مجھے ڈومیسٹک کرکٹ کے لیے منتخب کرلیا گیا ہے۔ میں چند دنوں تک لاہور میں منعقد ہونے والے ٹریننگ کیمپ کو جوائن کرنے والا ہوں۔ پہلی کرن، پہلا قدم، پہلی خوشی...... تمہارے نام!''

وہ بُری نیت سے گھر میں داخل نہیں ہوا تھا۔ پیار کی خیرات مانگنے آیا تھا۔ ڈاکو کی ہیبت سے ہر کوئی ڈرتا ہے، بھکاری کے سوال سے کوئی نہیں گھبراتا۔ بانو کا خوف کم ہوگیا۔ چند قدم اُس کی جانب بڑھی۔ ایک حد تک قریب آئی، تھم گئی، آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بولی۔ ''سوچ لو، اونچے دعوے کرنے والے عموماً بزدل ہوتے ہیں۔''

اُس نے پوری شدت سے آنکھیں میچ لیں۔ نچلے ہونٹ کو دانتوں میں کچل کر بولا۔ ''میں اپنی جان پر کھیلنے کا حوصلہ رکھتا ہوں۔''

وہ بولی۔ ''تو پھر سن لو۔ میں جان کے بدلے جان کا سودا کروں گی۔ تم میرے بھائی کی جھولی میں خوشیاں ڈال دو، میں ٹوٹے پھل کی طرح تمہاری گود میں گر جاؤں گی۔''

کامران کا ماتھا ٹھنکا۔ ٹھٹکا، آنکھیں چوپٹ کھول کر اُسے دیکھنے لگا، بولا۔ ''میں سمجھا نہیں؟''

وہ سینے پر عین دل کے مقام پر ہاتھ رکھ کر بولی۔ ''کامران! تم نے پوچھا تھا کہ میں کسی کو چاہتی ہوں؟...... میں نے اقرار نہیں کیا تھا۔ آج اقرار کرتی ہوں کہ دُنیا میں بالی کا وجود ایسا ہے جس پر میرے پیار کی شروعات ہوتی ہیں، جس پر میری زندگی تمام ہوتی ہے...... وہ مجھے اپنے آپ سے بھی پیارا ہے۔ تم اُسے خوش کرسکتے ہو تو میری طرف ہاتھ بڑھاؤ، اگر حوصلہ نہیں رکھتے تو لوٹ جاؤ۔ اَبھی کچھ بگڑا نہیں۔''

اُس کی بولتی بند ہوگئی۔ ایک ذرا جھجک کر بولا۔ ''میں نے کہا تو ہے کہ میں اُس کے لیے بہت ہی اچھی لڑکی تلاش کروں گا۔''

اُس کے لبوں نے تھوڑا پھیل کر مسکراہٹ کی معدوم سی لکیر بنائی۔ چند قدم اور آگے بڑھی اور کامران کے دونوں ہاتھ تھام کر بولی۔ ''کامران! میں بالی کے لیے حمیرا کی جان طلب کرتی ہوں۔ اُسے دے دو، مجھے لے لو۔ اگر سودا منظور ہے تو......''

بانو کے پُرگداز ہاتھوں نے کامران کے رگ و پے میں سرمستی سرایت کردی تھی۔ کانوں میں پڑنے والے کھولتے ہوئے سیسے نے بدن کا رواں رواں انگارہ بنا کر رکھ دیا۔ بانو کے ہاتھوں کو پوری شدت سے جھٹک کر ایک قدم پیچھے ہٹ گیا۔ پھٹی پھٹی نگاہوں سے اُسے دیکھنے لگا۔ ''یہ تم کیا کہہ رہی ہو؟''

وہ جواباً برہمی سے بولی۔ ''وہی جو تم نے سنا ہے۔''

کامران کا پورا وجود سلگ اُٹھا۔ آنکھوں سے شعلے لپکنے لگے۔ بہ دقت تمام اپنی مشتعل کیفیت پر قابو پاتے ہوئے بولا۔ ''یہ نہیں ہوسکتا۔ تم نے بات کرنے سے پہلے سوچا تو ہوتا، حمیرا کا ہاتھ مانگنے سے پہلے اپنے بھائی پر حقیقت پسندانہ نگاہ تو ڈال لی ہوتی......'' کامران نے دونوں مٹھیاں بھینچ کر ہوا میں لہرائیں، اُس پر خشونت بھری نگاہ ڈالی اور کم بلند آواز میں چلّایا۔ ''یہ نہیں ہوسکتا۔ اگر آئندہ تمہاری زبان پر یہ تقاضا اُبھرا تو میں کسی لحاظ کو خاطر میں لائے بغیر تمہاری زبان کھینچ لوں گا۔ میری بہن کے لیے وہ کالا غلیظ دیو...... اوہ مائی گاڈ!''

بانو بڑی توجہ سے اُسے دیکھ رہی تھی۔ وہ جیسے اپنے آپ میں نہیں رہا تھا۔ پُرتشدد انداز میں آنکھیں میچ کر ایک قدم چلا، دہلیز پر پوری قوت سے مکا مارتے ہوئے پھنکارا۔ ''یہ نہیں ہوسکتا۔ تم نے یہ سوچ کیسے لیا؟ میں تجھے تخت پر بٹھانا چاہتا ہوں مگر اپنی اِس احمقانہ خواہش کی تکمیل میں بہن کی زندگی کو برباد نہیں کرسکتا۔''

بانو کے لیے اُس کا رویہ غیر متوقع تھا۔ نفرت اور کراہیت آمیز لہجے نے اُس کے تن بدن میں آگ بھر دی۔ غرائی۔ ''تم نے میرے بھائی کو اتنا نیچ سمجھا؟ خدا کی مار ہو تم پر! وہ تم سے کہیں اچھا ہے۔ اگر اُس کے آنگن میں اُترنے سے تمہاری بہن کی زندگی خراب ہوتی ہے تو میں بھی اپنی ذات پر تمہاری شخصیت کا دھبہ برداشت نہیں کرسکتی۔ تمہیں اپنی گوری رنگت پر ناز ہے، سمجھ لو کہ زہر اگر سفید رنگ کا بھی ہو، تو بھی جان لیوا ہوتا ہے اور گلاب خواہ سیاہ رنگ کا ہی کیوں نہ ہو، روحوں کی تشنگی کو اپنی الوہی مہک سے سیراب کر دیتا ہے۔ تم جھوٹے، تمہارا رُوپ جھوٹا، اَب یہاں سے چلے جاؤ! میرے گھر سے نکل جاؤ ورنہ میں شور مچا کر محلہ داروں کو اکٹھا کرلوں گی۔''

وہ دانت پیس کر اُس کی جانب بڑھا، ٹھٹک کر رُکا پھر

پلٹ کر تیز قدموں سے گھر سے نکل گیا۔ یوں کہ اُس کی زندگی سے نکل گیا۔ بانو کا تنفس بے حد غیر متزلزل ہو رہا تھا۔ چارپائی کی پائنتی پر ٹک کر خود کو سنبھالنے لگی۔ کامران کے تضحیک انگیز رویے نے اُسے توڑ کر رکھ دیا تھا۔ آنکھوں سے آنسو چھلک پڑے، بے حد سرخ اور متورم ہونٹوں پر شکوہ مچل گیا۔ ''ہائے ربا! اتنے پیار بھرے وجود پر اتنا سیاہ چولا کیوں اوڑھا دیا تم نے؟ اُسے اتنا اُجالا تو بخشا ہوتا کہ کسی ننھے سے سفید دھبے کے چاند بننے کی آرزو میں کوئی چند لمحے کو ہی ٹھہر جاتا، کوئی اُس کے من میں جھانک کر دیکھ لیتا اور اُس کا ہاتھ تھام لیتا۔''

وہ سوگ کی جان کن کیفیت میں جانے کتنی دیر گم صُم بیٹھی رہی۔ اُمید کی ڈور ہاتھ میں آ کر ٹوٹ گئی تھی۔ دُکھ ہوا تھا۔ تصور میں اپنے بالی کا چہرہ سجا کر بڑبڑانے لگی۔ ''ہائے بالی! تم نے اپنے شوق کی آبیاری کرتے ہوئے اپنے اور میرے بیچ اتنا فرق کیوں حائل کر دیا ہے کہ میں جس ہار میں پروئی جاتی ہوں، وہاں تمھاری گنجائش نہیں نکلتی۔ جہاں تم فٹ ہوتے ہو، وہاں مجھے مِس فٹ قرار دیا جاتا ہے۔ ایسا کیوں کیا تم نے؟''

ایسے میں فون کے بزر نے اُس کے غیر معمولی انہماک کو پاش پاش کر دیا۔ اُس نے چونک کر فون اُٹھایا، اسکرین پر نگاہ ڈالی اور آہ بھر کر کال ریسیو کر لی۔ ''ہیلو شہزاد صاحب! آپ کیسے ہیں؟''

رسمی علیک سلیک کے بعد شہزاد نے کہا۔ ''بانو! میں کاروباری سلسلے میں تمھارے شہر میں آیا ہوا ہوں۔ ایک دوست کے ہاں قیام پذیر ہوں۔ تم سے ملنے کو جی چاہتا ہے، اجازت ہو تو تمھیں دیکھنے کے لیے چلا آؤں۔''

وہ ٹھٹک کر سوچ میں پڑ گئی۔ بالی گھر پر نہیں تھا۔ اُس کی غیر موجودگی میں شہزاد کو اپنے گھر میں بلانا مناسب نہیں لگا۔ بولی۔ ''آپ بالی کی دُکان پر چلے جائیں اور اُسے ساتھ لے کر گھر آ جائیں۔ دراصل مجھے اپنے گھر کا پتہ بہ خوبی معلوم نہیں ہے۔ آپ کو بتلا نہیں پاؤں گی۔''

شہزاد کی آواز سماعت میں گھل گئی۔ ''ٹھیک ہے۔ میں بالی سے فون پر رابطہ کرتا ہوں، پتہ پوچھتا ہوں اور اُس تک پہنچنے کی کوشش کرتا ہوں۔ اچھی سی چائے تیار کر رکھو، میرے پاس وقت کم ہے۔''

فون خاموش ہو گیا۔ وہ سُرعت سے اُٹھی اور گھر کی حالت کو بلاوجہ سُدھارنے میں مشغول ہو گئی۔ اُسے اپنے استعمال کی صاف ستھری چیزوں کو بھی صاف کرنا اُس گھڑی بہت بھا رہا تھا۔ نصف گھنٹے کے بعد گلی میں کار رُکنے کی آواز سنائی دی۔ کانوں میں اُترنے والی خوش کن خبر کی دل نے فوراً ہی تصدیق کر دی۔ بالی کے ساتھ آنے والا شہزاد ہی تھا جو لبوں پر اپنی مخصوص اور ہر دَم زندہ رہنے والی مسکراہٹ سجائے اُس کے روبرو تھا۔ اُس کے بیٹھنے پر بھاگ دوڑ کر اُس کی تواضع کا بندوبست کرنے لگی۔ ساتھ ساتھ عینی، اُس کے پاپا اور ماما کے بارے میں پوچھتی جاتی تھی۔

بالی نے چائے پینے تک دونوں کا ساتھ دیا۔ پھر دُکان پر کام کا بہانہ کر کے اُٹھ گیا۔ شہزاد کی مشتاق نگاہوں نے تنہائی پاتے ہی اپنا من بھاتا شغل چھیڑ دیا۔ وہ جھینپ کر بولی۔ ''آتے ہوئے عینی کو بھی ساتھ لے آتے تو کتنا اچھا ہوتا۔''

وہ مسکرایا۔ ''وہ آنا چاہے گی تو آئندہ ضرور ساتھ لاؤں گا۔ تم کہو! تعلیم کا سلسلہ کیسے چل رہا ہے؟''

''اچھا ہے مگر پہلے سا نہیں۔''

''کیوں؟'' وہ چونکا۔

''یہاں عینی نہیں ہے۔''

''جہاں عینی نہ ہو، وہاں کسی نہ کسی وجود پر عینی کا چولا اوڑھا کر کام چلایا جا سکتا ہے۔'' شہزاد نے دلاسا دیا۔

''کیا عینی نے اپنے لیے کوئی بانو تلاش کر لی ہے؟''

''میں نے پوچھا نہیں۔'' شہزاد نے کہا۔ ''اُس نے تمھاری کمی محسوس ضرور کی ہے مگر دل پر نہیں لی۔ تم بھی ایسا ہی کرو۔''

باتوں کا سلسلہ دھیرے سے چل نکلا۔ بانو کی جھجک ختم ہو گئی۔ کھل کر بولنے لگی تو پھر دھیان نہ رہا کہ کیا کہنا اور کیا نہیں کہنا چاہیے۔ اُس نے سرافگندہ بیٹھے ہوئے اپنے اور بالی کے نامعتبر وجود اور اندھیرے میں لپٹے مستقبل پر بھی گفتگو میں کوئی مضائقہ نہیں سمجھا۔ بولنے والی تھک گئی، سننے والا ہمہ تن گوش بیٹھا رہا، وہ نہیں تھکا تھا۔ بانو کے خاموش ہونے پر ہاتھ سہلاتے ہوئے اپنی شیریں کلامی کا تسلط جمانے لگا۔

''دیکھو نائس لیڈی! زندگی ایسی نہیں کہ انسان اِسے پانے کے بعد ایک دَم گنوانے اور تاراج کرنے پر گامزن

ہوجائے۔ بدقسمتی سے مجھے تمہاری نجی زندگی کے دُکھوں سے آگہی ہوگئی اور میں اپنی زندگی کی سچی خوشی سے دستبردار ہونے پر مجبور ہوگیا مگر کبھی کبھی یہ خیال پوری شدت سے ستانے لگتا ہے کہ تمہیں خود سے جدا کرنا میرا جاہلانہ پن کے سوا کچھ بھی نہیں تھا۔ یہ ایسی بات بھی نہیں تھی جس سے نباہ نہ کیا جاسکتا ہو۔ مجھ سے بہتر، مجھ سے دلیر؛ کوئی تو تمہاری زندگی میں آئے گا اور تمہارے اِس ناکردہ گناہ کو خاطر میں نہیں لائے گا۔“

وہ پژمردگی سے کراہی۔ ”مجھے اپنی نہیں، بالی کی فکر ستائے رکھتی ہے۔ اُس کو دیکھنے والا اُسے پرکھنے اور آزمانے کا حوصلہ نہیں رکھتا۔ بدک کر پرے ہٹ جاتا ہے اور میں تڑپ کر رہ جاتی ہوں۔ آپ ہی بتائیں، میں کیا کروں؟“

زندگی میں ایسے لمحے ہر انسان کی زندگی میں ضرور آن ٹھہرتے ہیں کہ آدمی اپنے دِل کی بات کو زباں پر لانے کی سکت کھو بیٹھتا ہے۔ شہزاد بھی ایسی ہی کیفیت سے دوچار ہوگیا۔ دل ہی دل میں اپنے مشورے کو تولتا رہا، ٹٹولتا رہا پھر اپنی جھولی میں اپنی مضطرب نگاہیں مرتکز کر کے بولا۔ ”ایک بات کہتا ہوں، جی مانے تو عمل کر لینا، جی نہ مانے تو پھونک مار کر راکھ کی طرح ہوا میں تحلیل کر دینا۔ بالی اور تم...... یک جان، دو قالب...... دُنیا کی نظر میں، اپنی نظر میں بہن بھائی ہو مگر فطرت نے تمہیں بہن بھائی پیدا نہیں کیا۔ تم دونوں کی راہ میں حائل رُکاوٹیں شاید کسی مخصوص ڈگر پر تمہیں چلانا چاہتی ہیں۔ تمہیں بالی کے دُکھ کو اُسی طرح اپنے دامن میں سمیٹ لینا چاہیے جیسے اُس کے بے سپر بچپن نے تمہارے سر پر چھایا کر دی تھی۔“

یوں لگا جیسے اُسے سنائی دینا بند ہوگیا ہو۔ پھٹی پھٹی نگاہوں سے شہزاد کو دیکھنے لگی، بدن کے کنوئیں سے نیم مُردہ احتجاج اُگلنے لگی۔ ”یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں؟ ہم دونوں بہن بھائی ہیں......“

شہزاد نے نظریں اُٹھائیں، ہاتھ ہوا میں بلند کر کے تحیر آمیز آنکھوں کے سامنے لہرایا اور بولا۔ ”عم زادوں میں خون کا رشتہ جذباتی ڈورے کھینچتا ہے مگر جوانی میں وہ ڈورے کچے ہوجاتے ہیں۔ ایک دوجے کی طرف کھینچنے لگتے ہیں۔ ماموں زاد، پھوپھی زاد...... سبھی پہلے بہن بھائی ہوتے ہیں مگر جوانی رشتوں کے پیرہن بدل کر نئے بندھن بنانے لگتی ہے۔ تمہارے بیچ تو ایسا بھی کوئی رشتہ موجود نہیں ہے۔ پھر کیوں ایک دوسرے کو عذاب میں مبتلا کیے بیٹھے ہو، کیوں طعنہ زن نگاہوں کا سامنا کرنے پر بار بار تیار ہوجاتے ہو؟...... یہ حکم نہیں، مشورہ نہیں...... بس ایک اشارہ ہے۔ اِس پر تنہائی میں بیٹھ کر سوچنا اور جو دِل مانے، وہی کرنا۔ میں چلتا ہوں، پھر کبھی عینی کو ساتھ لے کر آؤں گا۔ خدا تمہیں اپنی امان میں رکھے!“

وہ اتنی پھوہڑ نہیں تھی کہ اُسے دروازے تک الوداع کہنے نہ آتی مگر جانے والے کے مشورے نے اُس کے تن بدن کو بے لہو کر کے سُن کر دیا تھا۔ وہ آنکھوں میں استعجاب آمیز بے بسی اور اُلجھن سموئے بے دَم چارپائی میں پشت کے بَل گر گئی اور آنکھوں پر بانہہ رکھ کر سلگتے ہوئے ذہن سے شہزاد کی باتوں کو جھٹکنے لگی۔ سوچ کی گہری جھیل میں پتھر زور سے گرا تھا۔ لہروں کو سنبھلنے میں کافی وقت لگ گیا۔

زندگی میں پے در پے آن ٹکرانے والے حادثات نے اُس کے اعصاب کو خاصا مضبوط بنا دیا تھا۔ وہ ہر جذباتی گرداب سے نکلنے کے بعد تعین کر لیتی تھی کہ اِس سے بڑھ کر کوئی دھچکا نہیں لگے گا۔ وہ آئندہ کسی بھی کمزور لمحے کی تاب پر لرزہ براندام نہیں ہوگی، ہر بار اُس کا ارادہ پاش پاش ہوجاتا۔ ہر بار مصیبت نئے لباس میں دکھائی دیتی تھی۔ اُس کے لیے بالی کی لب کشائی ہی سوہانِ روح ثابت ہوئی تھی، پھر کامران کا یوں مضحکانہ انداز میں ٹھکرا کر چلے جانا اور مستزاد دل کو ڈھارس دینے والے شہزاد کا جاں گسل مشورہ کانوں میں اُتر کر اپنا زہر پھیلانے لگا تھا۔

سچ کہتے ہیں، خوشی محدود ہوتی ہے، اُس کا حساب رکھا جاتا ہے جبکہ دُکھ لامتناہی ہوتا ہے۔ اُس کے نچلے، گداز بھرے ہونٹ میں دانت پیوست ہوگئے، گال آنسوؤں سے تر ہوگئے اور عجیب خالی الذہنی کی کیفیت طاری ہوگئی مگر اُسے کسی شئے کی پروا نہیں تھی۔ نہ ماحول سے سروکار، نہ اپنے وجود سے واسطہ، نہ جانے والے پر کوئی رنج وملال...... جان کنی کی حالت میں مرغِ بسمل کی طرح تڑپی۔ ”ہائے شہزاد! تم نے بھی مجھے اتنا پست قرار دیا...... آہ! میں تو پہلے بھی نہ زندوں میں تھی، نہ مُردوں میں؛ پھر تمہیں یہ کیا سوجھی؟“

جوانی بہکاوے دیتی ہے۔ خشک آنکھوں میں سپنے بھر

کرنٹ نئے رنگ دکھلاتی ہے، گدگداتی ہے پھر غیر محسوس انداز میں آنکھوں میں آنسو بھر دیتی ہے۔ وہ جس بدن پر اِترایا کرتی تھی، اُسی سے گھن آنے لگی۔ اپنے وجود سے کراہیت کا احساس جاگنے لگا۔ وہ شجر سایہ دار بننا چاہتی تھی، ایک نسل کو دھوپ اور حوادث سے محفوظ کرنا چاہتی تھی مگر دُنیا اُسے ببول بنانے پر بہ ضد تھی۔ ببول کے کانٹے دوسروں کو چبھتے ہیں، وہ اپنے آپ کو چبھنے لگی تھی۔ زندگی میں پہلی مرتبہ اُس نے کامل سنجیدگی سے اپنے وجود کو بھسم کرنے کا سوچا۔ دُکھوں کے تسلسل سے جان چھڑانے کے لیے موت کو گلے لگانا ناگزیر دکھائی دینے لگا۔ جانتی تھی کہ خودسوزی مذہب میں حرام ہے، پھر بھی سوچ رہی تھی، 'حرام مال حرام راہ پر چلا جاتا ہے۔ میں ہر کسی پر حرام ہوں، حرام موت مَروں گی تو پُرسکون ہوجاؤں گی۔'

موت سے ہر کوئی ڈرتا ہے۔ وہ بھی ڈرتی تھی۔ نادیدہ شئے ہر دَم ہلکان کیے رکھتی ہے۔ ایک جھرجھری لے کر خود سوزی کا خیال ذہن سے جھٹکتے ہوئے خدا سے شکوہ کرنے لگی۔ تقدیر ساز برا اُسے۔ بہت سے گلے تھے مگر پڑھ رکھا تھا کہ خدا اور قسمت پر شکوہ کناں ہونا انسان کو کسی بھی حالت میں زیب نہیں دیتا۔ وہ جس حال میں رکھے، اُس کی مرضی......

اُسے سمیرا سے کچھ لینا دینا نہیں تھا، اُسے کامران کے چھوڑ جانے کی کوئی پروا نہیں تھی...... وہ دل کو اچھا لگا تھا مگر یوں نہیں کہ اُس کے بغیر دل کی دُنیا ہی ویران ہوجاتی۔ وہ شہزاد پر شاکی ہو رہی تھی۔ ایک مرتبہ ٹوٹنے کے بعد پھر ٹوٹنے کے لیے کمربستہ ہوجانا ضروری نہیں ہوتا۔ بہت سارا وقت گزر گیا۔ مایوسی اور یاسیت کا دِن تمام ہوگیا۔ جاتے جاتے تھکن آلود بخار کا تحفہ دے گیا۔ بالی کے آنے تک وہ خاصی نڈھال اور پژمردہ ہوگئی۔ کوئی حال مست، کوئی مال مست۔ بالی کی قمیص کی سینے والی جیب چھوٹے بڑے نوٹوں سے بھری ہوئی تھی اور اُس کے بدن میں مسرت آمیز مستعدی بھر رہی تھی۔ بانو کے بدن میں دِن بھر میں ملنے والی پے در پے مایوسیوں کی اینٹھن بھری ہوئی تھی۔ بالی کو دیکھ کر طوعاً و کرہاً اُٹھی اور اپنے معمول کے کام میں جُت گئی۔ بالی نے اُسے مضمحل دیکھا، لپک کر قریب آیا، بولا۔ ''آج تمھاری طبیعت ٹھیک نہیں لگتی۔ خیر تو ہے؟''

وہ کہنا چاہتی تھی کہ 'خیر نہیں ہے۔ آج وہ واقعہ رُونما ہوا ہے جس کے بارے میں ہم دونوں نے زندگی بھر میں کبھی نہیں سوچا تھا۔'

کہہ نہ پائی بلکہ ایک نگہِ عجب ڈال کر کیتلی چولھے پر رکھی اور آٹا گوندھنے والی پرات گھسیٹ کر بیٹھ گئی۔ بالی نے اُس کی ٹھوڑی کو چھوا، اپنی جانب متوجہ کرتے ہوئے بولا۔ ''دیکھ تو سہی بانو! تمھارے لیے کتنے پیسے کما کر لایا ہوں۔''

اُس نے خالی خالی نظروں سے دیکھا۔ بالی اپنی جیب سے بے ترتیب رکھے ہوئے نوٹ نکال کر سیدھے کرنے میں بے حد منہمک تھا۔ بانو کے حلق سے آہ نکلی۔ اُسے پالنے والا کتنا معصوم تھا۔ ایک نظر دیکھنے والوں کی دُنیا اُتھل پتھل ہوجاتی تھی مگر اُس کی نظروں کے تقدس پر قربان جانے کو جی چاہتا تھا جو شب و روز، اُن گنت رنگوں میں گندھی، بدلتی مچلتی جوانی کو دیکھ کر بھی مچلی نہیں تھی۔ بانو نے چند ہی لمحوں میں ہوش کی پہلی ساعت سے لے کر لمحہ موجود تک کا محاسبہ کرلیا۔ بالی کی سائبانی میں، نگہبانی میں کوئی سقم نہیں تھا۔ وہ اول و آخر اُس کا بھائی تھا۔ اُس کے کسی قول و فعل نے یہ باور نہیں کرایا تھا کہ وہ سگا نہیں، سگوں جیسا بھی نہیں بلکہ اُس کی معیت میں گزرا ہوا ایک ایک پل اُس کی محبت کی صداقت کا گواہ تھا۔ بانو نے بے دھیانی میں اپنا سر نفی کے سے انداز میں ہلایا۔ انگلیوں کی اگلی پوروں سے ہتھیلی کے سرہانے کو مسلا، ہونٹوں کو بے بسی سے کچلا، مچلی۔ ''نہیں! یہ نہیں ہوسکتا۔''

بالی چونکا۔ ''کیا نہیں ہوسکتا؟''

وہ اپنی بہکی ہوئی دُنیا سے یک لخت گھبرا کر نکل آئی، ہکلا کر بولی۔ ''کک...... کچھ نہیں۔ میں کسی اور دھیان میں بیٹھی تھی۔ آج کتنے پیسے کمائے؟''

وہ نوٹ ہاتھ میں پکڑے اُسے غور سے دیکھ کر بولا۔ ''کیا تم آج روتی رہی ہو؟''

اُس نے معصومیت سے اثبات میں سر ہلایا۔

''کیوں؟ شہزاد نے کچھ ایسا ویسا تو نہیں کہہ دیا؟'' بالی پریشان ہوگیا۔

''نہیں۔ بس اپنے مقدر پر رونا آ گیا تھا۔'' وہ اُس کے ہاتھ سے پیسے لے کر گننے لگی۔

بالی نے اُس پر دُکھ بھری نگاہ ڈالی اور کھڑے ہوکر اپنی قمیص کے بٹن کھولنے لگا۔ دروازے سے نکلتے ہوئے ایک

پل کو ٹھہر کر بولا۔ ''بہن کی ڈولی کا بھار (وزن) اُٹھانے والے کو بھرا (بھائی) کہتے ہیں اور بھرا کی موجودگی میں کوئی بہن کسی کی جدائی پر آنسو نہیں بہایا کرتی۔ جو ہوا، اُسے بھلا دینے میں ہی عافیت ہے۔ ایک دَر بند ہونے پر قدرت دوسرا دَر کھول دیتی ہے جیسے ایک شہر سے دانہ پانی اُٹھا کر دوسرے شہر میں رکھ دیتی ہے۔ ویسے بھی ابھی تجھے بہت سا پڑھنا ہے۔ پڑھ لکھ کر بڑی کرسی پر بیٹھنا ہے اور دُنیا کو اپنے آگے جھکانا ہے۔''

اُس نے گردن موڑ کر دروازے کے عین وسط میں، اپنی جانب پشت کیے کھڑے بالی کو دیکھا اور مرتے مرتے یک بارگی سے جی اُٹھی۔ اُسے بالی کے ہوتے ہوئے کسی کا احتیاج نہیں تھا۔



صدف ہفتہ بھر کے لیے بیمار پڑ گئی۔ سمیرا اپنے بھائی کی حمایت میں اُس سے ناراض تھی جس کے سبب اُسے اکیلے ہی کالج جانا پڑ رہا تھا مگر اُس نے کچھ زیادہ پروا نہیں کی۔ پہلے کی طرح کامران سے بھی گلی میں بھی کبھار مڈبھیڑ ہو جاتی اور دونوں ایک دوسرے سے نظریں چُرا کر آگے بڑھ جاتے۔ عینی اُس کا فون اٹینڈ نہیں کرتی تھی۔ بانو کی کال کو 'کینسل' کر دیتی۔ وہ ناراض نہیں تھی، شرمسار تھی اور بانو سمجھتی تھی کہ اُس کی ندامت کا دورانیہ کئی دنوں پر محیط ہوتا تھا۔ بالی کی دُکان خوب چل نکلی۔ پیسہ اُن کی ضرورت سے زیادہ آنے لگا۔ معمول کی مصروفیت جاری تھی، ایسے میں ایک ڈھلتی دوپہر میں عینی کی کال اُس نے اپنے موبائل پر ریسیو کی، بولی۔ ''ہائے عینی! تم کتنی ظالم ہو۔ میری کال کینسل کرتے ہوئے تجھے ذرا بھر شرمندگی محسوس نہیں ہوتی۔ جانتی ہو کہ تم سے دِل کی بات کر کے سُکھ کی سانس سینے میں اُتارتی ہوں، پھر بھی مجھے تنہا چھوڑ جاتی ہو۔''

عینی نے کہا۔ ''تم بڑے سہل انداز میں باتوں کے نشتر چبھو دیتی ہو، میں جواباً ایسا نہیں کر پاتی تو خاموش ہو جاتی ہوں۔ سناؤ! کیسی گزر رہی ہے؟''

باتیں کرتے ہوئے اچانک عینی نے اُس کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔ ''مجھے شہزاد نے تمھارے نئے معاشقے کے پُر درد انجام کے بارے میں بتلایا تھا، سچ، بڑا دُکھ ہوا۔ اور، سچ، بڑی خوشی ہوئی وہ مشورہ سُن کر جو بھائی نے تمھیں دیا تھا۔ میں نے اپنے خاندانی قانونی مشیر سے رابطہ کیا، اُنھیں تمام روداد سنائی، کرداروں کے نام اور مقامات قطعی فرضی رکھ کر، تو جانتی ہو اُنہوں نے کیا کہا؟''

بانو کو ایک جھٹکا سا لگا، بادلِ نخواستہ بولی۔ ''کیا؟''

''اُنھوں نے کہا کہ ایک دو پریشانیاں حائل ہوں گی جنھیں بہ آسانی رَفع کیا جا سکتا ہے۔ اُنھوں نے مجھے کسی عالم دین سے رابطہ کرنے کا حکم بھی دیا تھا۔'' عینی اُس کو دیکھ نہیں رہی تھی، سُن رہی تھی اور اگر دیکھ رہی ہوتی تو شاید ایک لفظ بھی منہ سے نہ نکال پاتی، اپنی ترنگ میں کہہ رہی تھی۔ ''پھر میں نے یہاں کے معروف مفتی صاحب سے وقت لیا۔ وہ بھی وکیل صاحب کے ہم خیال تھے۔ کہنے لگے، یہ شادی احسن ہوگی اور بہ لحاظ حالات وواقعات بہت زیادہ مفید ہوگی۔ اللہ کا نام لے کر یہ بیڑا سطحِ آب پر رواں کر دیا جائے۔''

بانو نے احتجاج کیا۔ ''مگر عینی! میں یہ باتیں سننا نہیں چاہتی ہوں۔ تم کوئی اور بات کرو۔''

عینی ٹھٹک گئی، گہری سانس حلق میں اُتارتے ہوئے بولی۔ ''بانو! یہ تم کیا کہہ رہی ہو؟ میں نے تمھارے لیے اتنی محنت اِس لیے تو......''

''عینی پلیز! چپ ہو جاؤ ورنہ میں فون بند کر دوں گی۔'' وہ چیخی۔

عینی دَم بخود رہ گئی۔ سمجھاتے ہوئے بولی۔ ''میری پوری بات تو سن لو احمق لڑکی! پھر جو دل کو بھلا لگے، وہی کرتے رہنا۔''

بانو بے بسی سے گھگیائی۔ ''وہ میرا بھائی ہے، میں اُس کی بہن ہوں اور میں کبھی نہیں چاہوں گی کہ اُس کے اور میرے درمیان محبت کا یہ پردہ ہٹ جائے اور ہم بھری دُنیا میں ننگے ہو جائیں۔''

عینی نے ایک دَم موضوع بدل دیا۔ بولی۔ ''ہم دونوں، میں اور شہزاد، اِس ویک اینڈ پر تمھارے ہاں ایک شب ٹھہرنے کے لیے آنا چاہتے ہیں۔ کیا تمھارے گھر میں، دل میں اتنی سی گنجائش موجود ہے؟''

وہ دَم بخود رہ گئی۔ آن کی آن میں جیسے زبان کی جون ہی بدل گئی ہو، بولی۔ ''تم بہت کمینی ہو، تمھارے لیے میرے دل میں جگہ نہ ہو، میرے گھر میں جگہ نہ ہو، کیسے ممکن

ہے؟ سچ کہو، اِسی ویک اینڈ پر آ رہی ہوناں؟''
''ہاں......مدت ہوئی تجھے دیکھے ہوئے۔ یہاں، تمھارے جانے کے بعد تو شاید کوئی چہرہ ایسا رہا ہی نہیں جو نظروں کو گدگدائے، جو دل کو گرمائے اور سچ بانو! یوں لگتا ہے جیسے دُنیا کی تمام تر رعنائیاں تمھارے وجود سے قائم تھیں۔ تم گئیں، سب کچھ کھو گیا......'' عینی کی آواز میں پہلی سی شوخی سمٹ آئی جو بانو کو کان کی لوؤں تک سرخ کر دیتی تھی۔
''بکتی ہو تم!'' بانو جھینپ گئی۔
''ہاں! شاید ایسا ہی ہے۔ دُنیا بھی ایسی ہی ہے۔ رومانی فلم دیکھ کر انسان بہک جاتا ہے، جھوٹ اور فریب کے بیچوں بیچ معلق ہو جاتا ہے، یہ جانتے ہوئے بھی کہ 'سب بکواس ہے' وہ پور پور اُلجھ جاتا ہے۔ تم بھی ایسی ہی ہو۔ تمھارے پیچھے اندھا دُھند بھاگنے والے اندھے ہیں، میں اندھی ہوں......''
''خدا کے لیے بس کرو۔ بولتی ہو تو پھر بس بولے چلی جاتی ہو۔ تم اگر لاہور چلی جاؤ، آڈیشن دو تو مجھے یقین ہے کہ بلاتردد فلمی ہیروئن منتخب ہو جاؤ گی۔''
''مگر تم آڈیشن دینے سے پہلے چُن لی جاؤ گی۔ یقین نہیں تو دونوں اکٹھے چلتے ہیں۔'' عینی کے لہجے میں شرارت عود کر آئی۔
بانو نے بھی جواباً چھیڑا۔ ''کوئی نیا شکار؟''
''نہیں......بہت ہو چکا۔ اَب دِل سکون مانگتا ہے۔''
''کسی نے ہاتھ مانگا، انگوٹھی پہنانے کو اُنگلی مانگی؟''
''نہیں۔ فی الحال تو اَمن ہے۔''
''اپنے بھائی کے لیے کوئی دوسری ہم جماعت لڑکی تاڑی؟''
''بکومت۔ میں تمھیں ایسی لگتی ہوں؟''
''نظر کو نہیں، دل کو لگتی ہو۔ تجربے نے یہی ثابت کیا ہے۔'' بانو اَز حد سنبھل گئی تھی۔
''تمھارے جیسا چاندی کا بدن اگر کلاس تو کیا دُنیا کے کسی خطے میں بھی اُترا اور میری نظروں میں سمایا تو دیر نہیں کروں گی۔ جیسے تمھارے پیچھے ہاتھ دھو کر پڑ گئی تھی، ایسے ہی اُس کا دامن گرفت میں لے لوں گی۔'' وہ ہنسی۔
''شعبہ آرٹس کی انعم مجید کے بارے میں بھی سوچا؟''
''ہاں!'' عینی نے جھجک سے عاری لہجے میں کہا۔ ''اسے دل سے سوچا، پیار سے دیکھا اور بڑے چاؤ سے بھائی کو دکھایا مگر بھائی نے اپنے دونوں کندھے دیکھ لیے۔ 'نہ' کر دی۔''
''مگر کیوں؟ اتنی کیوٹ سی تو ہے وہ!'' بانو حیران ہوگئی۔
''بھائی کو 'اوور ایکٹ' کرنے والی لڑکیاں اچھی نہیں لگتیں۔''
بانو نے چبھتے ہوئے لہجے میں طنز کیا۔ ''یہ کوئی جُرم تو نہیں......''
''ہاں مگر یہ خاصہ بھی نہیں ہے۔ جسے قدرت نے سیر بنایا ہو، وہ کھوکھلی باتوں اور جھوٹے رنگوں سے سوا سیر بننے کی کوشش کرے گا تو کوا رہے گا نہ ہنس بن پائے گا۔'' عینی نے کہا۔
''میں فون بند کرنے لگی ہوں۔ باقی باتیں ملاقات پر ہوں گی۔ گڈ بائی!''
بانو کافی دیر تک گم صُم بیٹھی بے جان موبائل فون سے کھیلتی رہی۔ عینی کی کہی ہوئی باتوں کو دل ہی دل میں دُہراتی رہی۔ اُس کی قسمت پر رشک کرنے لگی۔ اسے کوئی روکنے ٹوکنے والا نہیں تھا، کوئی راہ میں روک کر ہاتھ تھامنے کی جرأت نہیں رکھتا تھا اور کسی میں اتنا دم نہیں تھا کہ اُس سے نام ونسب کے حوالے سے کوئی سوال کرتا۔ وہ جہاں جاتی، نسب کا امتیاز اُس سے پہلے وہاں پہنچ جاتا۔ عینی حق گو تھی۔ جھوٹ بھی بولتی تو سچ سے زیادہ چمکدار معلوم ہوتا تھا۔ بانو کی ذہنی رَو بھٹک گئی۔ عینی اور شہزاد کی سجھائی ہوئی راہ پر چل نکلی، چند قدم چلی تھی کہ بند گلی میں پہنچ گئی۔ جوانی پیچھے ہٹنا توہین سمجھتی ہے۔ عقل پیچھے ہٹنے پر آمادہ کرتی ہے۔ وہ شش و پنج میں پڑ گئی۔ سوچ کی بند گلی میں نظر کے سامنے اپنی دونوں بانہیں پوری وسعت میں کھولے بالی اُس کی جانب پشت کیے کھڑا تھا۔ عقب سے دیکھنے پر مرد، مرد ہی دکھائی دیتا ہے جو نہ تو بھائی ہوتا ہے اور نہ ہی محبوب۔ وہ سراسیمہ ہو کر گردن موڑ کر پیچھے دیکھنے لگی۔ گلی کے کھلے سرے پر دیوانہ وار بانہیں کھولے بالی کھڑا تھا۔ چہرہ دکھائی دے رہا تھا۔ لب ہل رہے تھے۔ کانوں میں پیار بھری سرگوشی اُترنے لگی۔ ''بانو! بھائی کی جان! بھائی کے پاس لوٹ آؤ۔''
وہ اُلٹے قدموں پلٹی۔ اُکسانے والوں پر اوس پڑ گئی۔ جوانی دھیمے سُروں میں شکست خوردہ راگ الاپنے لگی۔ وہ

سرپٹ دوڑتے ہوئے بالی کی بانہوں میں سما گئی۔ ایسے میں ایک سسکی ہونٹوں سے پھسلی، وہ یکبارگی سے پورے تن سے لرزی اور چارپائی پر پھسل کر ڈھے گئی۔ نہ چاہتے ہوئے بدظن ہو کر چیخ پڑی۔ ''نہیں! ایسا نہیں ہوسکتا۔ جسے پوری عمر بھائی سمجھا ہو، اُسے جوانی کی دہلیز پر دھندلائی ہوئی نظریں محبوب کیسے سمجھ سکتی ہیں۔ نہیں! عینی جھوٹی ہے، شہزاد منافق ہے اور دونوں راہ زَن مجھے بھی اپنی روشن خیالی کی راہ پر گام زَن کرنا چاہتے ہیں۔''

رات کو اُس نے بالی کو عینی اور شہزاد کی ویک اینڈ پر آمد کے بارے میں بتایا۔ بالی خوش ہوگیا۔ پوچھنے لگا کہ اُن کے قیام وطعام کے شایانِ شان بندوبست کے لیے کسی چیز کی ضرورت تو نہیں...... وہ سوچ میں پڑ گئی۔ جب پیسے ہاتھ میں نہیں تھے، تب ہر شے ٹھیک لگتی تھی۔ اَب ہر چیز میں نقص دکھائی دینے لگا تھا۔ وہ خالی کمرے کو مہمان خانہ بنانے کے لیے خریداری کرنا چاہتی تھی۔ فہرست مرتب کرتے ہوئے گاہے بہ گاہے بالی سے تائید حاصل کرتی رہی۔ بالی اُس کے شوق اور جوش کو دیکھ کر سوچنے لگا۔ ''مہمانوں کے گھر پہنچنے تک پگلی ایسے ہی کاغذ کی پرچیاں بناتی رہے گی، پھاڑتی رہے گی اور کسی پل چین سے بیٹھ نہ پائے گی۔''

☆☆

کامران اسپورٹس بیگ اور اٹیچی اُٹھائے اپنے دوستوں کے ہمراہ خوش گپیاں ہانکتے ہوئے گلی میں بانو کے دروازے پر سے گزرتے ہوئے ذرا ٹھٹک گیا۔ یہیں کہیں دِل کی دُنیا آباد ہوئی تھی۔ عشق میں سودے بازی نہیں کی جاتی مگر دل کو آباد کرنے والی نے اُکسا کر اُسے مول تول پر آمادہ کرلیا تھا۔ وہ جوانی کے جوش میں بساط سجا کر مدمقابل بیٹھ گیا اور زندگی بھر نہ ہارنے کا ارادہ رکھنے والا آنِ واحد میں پیار کی بازی ہار گیا۔ بند دروازے پر شکست خوردہ نگاہ ڈالی۔ ایسے ہی وقت میں دروازہ تھوڑا سا کھلا۔ آدھے چاند کی چاندنی گلی میں پھیل گئی۔ بانو نے آج دروازہ بند کرنے کی بجائے پورا کھول دیا۔ وہ سمجھا کہ مشتاق نگاہیں اُسے دیکھ رہی ہیں مگر وہ اُسے نہیں، گلی میں داخل ہونے والی شہزاد کی کار کو دیکھ رہی تھی۔ ہارن کی آواز سن کر کامران ٹھٹکا، گھوما، کار کو دیکھ کر رستہ بٹا گیا۔ ایسے ہی وقت میں اُس کے ایک

من چلے دوست نے پہلو میں کہنی چبھوئی۔ ''چل بے ہیرو! آج سے تم رُک کر پیچھے دیکھنا چھوڑ دو، دُنیا تمھیں دیکھ کر قدم بڑھانا بھول جائے گی۔''

اُس نے سر جھکا لیا۔ پہلو میں کہیں ٹیس جاگی تھی۔ اپنا رویہ بھول گیا۔ بانو کے ردعمل کو دیکھ کر غم بار ہوگیا۔ دیوار کے ساتھ لگ کر کار کو راستہ دیتے ہوئے اُس نے بے اختیار پھر کھلے دروازے میں کھڑی ہاتھ ہلاتی بانو کو دیکھا اور آگے بڑھ گیا۔

شہزاد اور عینی نے اُس کے دل کی ویران دُنیا کو شاداب کردیا تھا۔ وہ دیوانوں کی طرح بھاگ بھاگ کر اُن کی تواضع کررہی تھی۔ اُن کے آگے بچھی جاتی تھی۔ ایسے میں بارہا عینی نے اُس کا ہاتھ بٹانے کی کوشش کی مگر بانو نے اُسے جھڑکا، مہمان بنایا اور شہزاد کے پاس بٹھادیا۔ جھونپڑی میں چاند اُترا تھا۔ جھونپڑی والی تمام تر چاندنی کو آنکھوں میں سمیٹ لینا چاہتی تھی۔ شوقِ پذیرائی میں تھکن وارد نہیں ہوئی، چاند شرمسار ہوگیا۔ عینی نے اُس کے دونوں ہاتھ پکڑ کر آنکھوں سے لگائے، مسکرائی اور متشکر لہجے میں بولی۔ ''خدا کے لیے بانو! بہت ہوچکی، بس کردو۔ تھک گئی ہو، بیٹھ کر باتیں کرو اور مزید شرمندہ نہ کرو۔''

وہ اِٹھلائی۔ ''تم اُس خوشی کو کبھی محسوس نہیں کرسکتیں جو اِس وقت میرے تن من میں رَچی ہوئی ہے۔''

شہزاد نے ایک نگہ ستائش اُس پر ڈالی پھر بالی کو مخاطب کرتے ہوئے محوِ گفت گو ہوگیا۔

بانو نے بالی اور شہزاد کے لیے مہمان خانہ سجا رکھا تھا۔ نصف شب سے کچھ پہلے دونوں سونے کے لیے چلے گئے تو عینی نے چارپائی پر چھلانگ لگا دی۔ چت لیٹ کر کروٹ بدل گئی۔ چارپائی کی بانہہ سے بدن رگڑ کر دوسری بانہہ سے لپٹ گئی۔ بولی۔ ''میں سوچا کرتی تھی کہ تمھیں چارپائی پر نیند کیسے آجاتی ہے، آج سوچتی ہوں کہ میں اِس نعمت سے اَب تک محروم کیوں رہی ہوں۔ بچپن اور بڑھاپے میں بدن نرم لمس مانگتا ہے، جوانی میں بان کی سختی ٹکور کرتی ہے اور اُن چھوٹی اینٹھن کو چُن لیتی ہے۔''

خبر نہیں؛ وہ سچ کہہ رہی تھی یا بانو کا دِل رکھنا چاہتی تھی...... بانو کو عینی کا آرام دِہ جہازی سائز بیڈ یاد آگیا۔ اُس نے بیڈ پر پہلی مرتبہ لیٹ کر یہی احساس پایا تھا جس

کے بَل پر عینی اُس کے سامنے ماہیِ بے آب کی مانند تڑپ رہی تھی۔ وہ احساسِ کمتری کے بوجھ تلے چھپ کر اپنے محسوسات کو چھپا گئی تھی جبکہ عینی عادتاً منہ پھاڑ کر دل کے پھپھولے پھوڑ رہی تھی۔

جُڑی ہوئی چار پائیوں پر زیرو واٹ بلب کی ملگجی روشنی میں دونوں جوانیاں پہلو کے بَل مقابل میں لیٹی تھیں۔ عینی نے اُس کے چہرے پر لہراتی لٹوں کو بڑے پیار سے کانوں کے پیچھے سمیٹا اور کہا۔ ''تم نے کیا سوچا؟''

''کس بارے میں؟'' بانو کے لہجے میں تھکن اور خمار عود کر آیا۔

''اپنے اور بالی کے بارے میں۔''

''کوئی اور بات کرو۔'' بانو نے بہ عجلت کہا۔

عینی نے اُس کا بھرا بھرا گال سہلایا، نچلے ہونٹوں کے ننھے ننھے جزیروں کو چھیڑا اور بڑے ہی پیار سے کہا۔ ''بالی انسان کے رُوپ میں فرشتہ ہے۔ اُس نے معاشرے کے ہر شعلے کی تپش اور لپک اپنے تن پر لی اور تم پر کوئی آنچ نہیں آنے دی۔ کیا میں ٹھیک کہہ رہی ہوں؟''

بانو نے اُس کے ہونٹوں پر ہاتھ رکھ دیا۔ ''مت کہو کچھ اور!''

اُس نے رَسان سے ہاتھ ہٹایا، پھر ہونٹوں سے لگا کر چوما اور کہا۔ ''مہمان کے منہ پر ہاتھ نہیں رکھا جاتا، دِل پر ہاتھ رکھ کر آنکھوں پر بیٹھایا جاتا ہے۔ میں نے جو پوچھا، اُس کا جواب دو۔''

وہ گہری سانس حلق میں اُتار کر بولی۔ ''بالی نہ ہوتا تو شاید میں گوبر کے ڈھیر میں دھنس کر مر چکی ہوتی۔''

''بس؟''

''نہیں بلکہ اگر اُس نے کبھی مجھے بے رُخی سے دیکھا ہوتا تو میں......'' وہ بولتے بولتے رُک گئی۔

عینی نے جذبات آلود آواز میں کہا۔ ''تم اُس کی محبت کو کسی بھی ترازو میں تولنے کے لائق نہیں ہو۔ کیا وہ خوبصورت ہے؟''

''ہاں۔ اُس جیسا دُنیا میں کوئی نہیں۔'' بانو نے باوثوق انداز میں تائید کی۔

''کیا وہ ہر لڑکی کو خوبصورت دکھائی دیتا ہے؟''

وہ ٹھٹک گئی۔ سوال مشکل تھا۔ جواب اُس سے بھی کہیں مشکل تھا۔

عینی نے کہا۔ ''جواب دوناں!''

''بالی کی خوبصورتی لوگوں کو دکھائی نہیں دیتی۔ ہر کوئی اُس کے ظاہر پر جاتا ہے، اُس کے باطنی اُجالے کسی آنکھ کو خیرہ نہیں کرتے۔'' وہ بے بسی سے بولی۔

اُس گھڑی عینی اچانک اپنی عمر سے کہیں بڑی ہو گئی۔ سنجیدگی سے گویا ہوئی۔ ''تم ہی وہ لڑکی ہو جس نے بالی کے اندر کی تمام تر خوبصورتی کو دیکھ رکھا ہے۔ تم بالی کو جانتی ہو، اُس کے ظاہری اندھیارے اور باطنی روشن تر وجود کو بھانپتی ہو اور......اور...... تم ہی وہ عورت ہو جو اُس کی تنہائیوں کے خلا کو پُر کر سکتی ہو۔''

عینی کے مقابل اُس کی مزاحمت دَم توڑنے لگی تھی اور وہ جن باتوں کو سننا گوارا نہیں کرتی تھی، اُنھی باتوں کے محاذ پر اپنی دلیلوں کو کمر بستہ کرنے لگی تھی۔

ملحقہ کمرے میں لوہے کے پایوں والی نئی چار پائیوں پر خوش گپیوں کی غیر منظم بساط بچھی ہوئی تھی۔ ایسے میں شہزاد نے ناشناس نغمہ چھیڑ دیا۔ ''بالی! میرے خاندان کی لڑکیاں؛ چچا، ماموں اور پھوپھی زادیاں سب مجھے بھائی سمجھتی ہیں۔ پاپا میری شادی اُن میں سے کسی کے ساتھ کرنے کے خواہاں ہیں۔ اَب بھلا تم ہی بتاؤ، جن لڑکیوں کو میں آج تک بہن سمجھتا رہا، وہ مجھے بھائی کہتی رہیں، اُن کے ساتھ میں کیسے شادی کر سکتا ہوں۔''

بالی نے حیرت بھری نظروں سے اُسے دیکھا۔ ''آپ اُن میں سے کسی کے ساتھ بھی شادی کر سکتے ہیں اور میرا خیال ہے کہ آپ کو اپنے پاپا کی بات مان لینا چاہیے۔ سمجھنے سے کوئی شخص بھائی یا کوئی لڑکی بہن کیسے بن سکتی ہے؟ بھائی بہن تو صرف وہی ہوتے ہیں جو ایک ماں باپ کی اولاد ہوں۔ دیور اپنی بھابھی کو 'باجی' کہتا ہے، ماں سمجھتا ہے اور بھائی بن کر سر پر چادر اوڑھاتا ہے مگر بھائی کی ناگہانی موت پر اُسے نکاح کی پُر تحفظ چھاؤں میں لا کھڑا کرتا ہے۔''

شہزاد کی آنکھیں پھیل گئیں۔ وہ بالی کو کم فہم، غیر تعلیم یافتہ اور نیم جاہل سمجھتا تھا۔ کھلنے پر پتہ چل رہا تھا کہ وہ اَن پڑھ ہونے کے باوصف بہت گہرا تھا۔ ستائشی نگاہ ڈال کر بولا۔ ''وہ تو ٹھیک ہے مگر......''

''کیا مگر؟'' بالی مستفسر ہوا۔

''ایک لڑکی، فرزانہ، گزشتہ تین چار برسوں سے

میرے آفس میں بطور میری پرسنل سیکرٹری کام کرتی ہے۔ وہ میرے خاندان کی نہیں بلکہ دور پار کی رشتہ دار بھی نہیں ہے۔ محض، اُس کی شباہت میں عینی کا سا عکس پاتے ہوئے میں نے اُسے اپنی بہن بنالیا۔ آفس کی سالانہ تقریب میں اپنے اِس لطیف رشتے کو مشتہر بھی کر دیا۔ وہ مجھے بہت اچھی لگتی ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ کوئی ایسی صورت نکلے کہ میں اور وہ ایک ہوجائیں۔ پاپا کہتے ہیں کہ ایسا ہونا ممکن نہیں۔ وہ اُسے میری بہن قرار دیتے ہوئے بُری طرح جھڑک دیتے ہیں۔'' شہزاد کا لہجہ دَم بہ دَم گمبھیر ہوتا جارہا تھا۔ بالی کے غیر معمولی انہماک کو دیکھ کر اُس نے سلسلہ گفت گو جوڑا۔ ''اُس کا میرے سوا کوئی نہیں۔ اُسے میں ہی خوش رکھ سکتا ہوں، مجھے وہی شاد رکھ سکتی ہے۔ ڈرتا ہوں، دُنیا کیا کہے گی، ڈرتا ہوں پاپا اور ماما کا رویہ کیا ہوگا؟...... تم بتاؤ، مجھے اِس مشکل گھڑی میں کیا کرنا چاہیے؟''

بالی کے فراخ ماتھے پر بَل پڑ گئے۔ گھنی اور منتشر بھنویں تن گئیں۔ بولا۔ ''اگر اُس کا آپ کے علاوہ دُنیا میں کوئی اپنا نہیں ہے تو اُسے اپنا کر آپ دُنیا کے ساتھ ساتھ اپنی آخرت بھی سنوار لیں گے۔ اگر وہ امیر ہے، اپنے پیروں پر کھڑی ہے تو آپ کو اپنے پاپا کی بات مان کر ضد ترک کر دینی چاہیے۔''

''کیا وہ میری بہن نہیں ہے؟'' شہزاد کا انداز بہت معصوم تھا۔

''یقیناً نہیں۔'' بالی نے پُر یقین لہجے میں کہا۔

''تم نے غور نہیں کیا، میں اُسے بہن کہتا رہا ہوں۔''

''کہنے سے کیا فرق پڑتا ہے۔'' بالی مسکرایا۔

''میں اُسے اپنی ماں جائی بہن سمجھتا بھی ہوں۔''

''سمجھنے سے بھی کوئی فرق نہیں پڑتا۔ وہ آپ کی بہن نہیں ہے۔'' بالی نے ٹھوس لہجے میں کہا۔

شہزاد کا سر جھک گیا۔ سوچ میں پڑ گیا۔ اچانک، ڈرامائی انداز میں، سر اُٹھا کر، آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بولا۔ ''میں تمھاری بات مانتا ہوں۔ دُنیا بھی اِسی قانون پر سر جھکاتی ہے۔ جو تم سوچتے ہو، میں بھی وہی سوچتا ہوں کیونکہ فطری راہ ہر ایک کے لیے کھلی رہتی ہے۔ کیا بانو تمھاری بہن ہے؟''

بالی کے بدن کو ایک جھٹکا سا لگا۔ پھٹی پھٹی نگاہوں سے اُسے گھورنے لگا۔ شہزاد نے یہ کیا کہہ دیا تھا؟...... الجھ کر ہونٹ کاٹتے ہوئے بولا۔ ''ہاں تو!''

شہزاد نے اپنے دونوں ہاتھ جوڑ کر ہونٹوں پر پھیرتے ہوئے گہری نظروں سے دیکھا، قدرے جھک کر بولا۔ ''تم دونوں کے ماں باپ جُدا جُدا ہیں۔ بھائی تو کجا، ایک خاندان برادری کے بھی شاید نہیں تھے۔ ایک ماں کا دودھ بھی تم دونوں نے نہیں پی رکھا، پھر؟...... پھر کیسے تم دونوں کے بیچ بھائی بہن جیسا خونی رشتہ اُستوار ہوگیا؟''

بالی کا حلق سوکھ گیا۔ نادیدہ کسیلی شئے کو نگلتے ہوئے خاموش رہا۔ وہ ریشم کے کیڑے کی طرح اپنے چہار سُو ریشم بُن چکا تھا۔ سانس رُکنے لگی تو غلطی کا احساس ہوا مگر تیر کمان سے نکل چکا تھا۔ راہِ فرار نہ پاکر سراسیمہ، خفت بھری اور بے بسی آمیز نگاہوں سے اُسے دیکھنے لگا۔ اُسے جن الفاظ کے سماعت میں اُترنے کی توقع تک نہیں تھی، وہ کانوں میں اُتر کر دماغ میں پگھلا ہوا سیسہ ڈالنے لگے تھے۔

رات دھیرے دھیرے صبح پانے کی جستجو میں آگے کی طرف سرک رہی تھی اور ملحقہ دونوں کمروں کے اندر فتح و شکست پر منتج ہونے والی شطرنج بازیاں اپنی فطری سست روی سے شاطروں کی انگلیوں تلے تھرک رہی تھیں۔



دوپہر کا پُر تکلف کھانا تناول کرنے کے بعد بھری ہوئی لہر بن کر آنے والے ساحلی ریت پر نمی چھوڑ کر رخصت ہوگئے۔ بالی اُنھیں گاڑی تک چھوڑ آیا۔ گم صم بیٹھی بانو سے مخاطب ہوا۔ ''بانو! میری جان! فٹافٹ چائے بنا کر پلاؤ تاکہ میں دُکان پر جاسکوں۔''

وہ چونکی۔ وہ پہلے بھی اتنے ہی پیار سے کہا کرتا تھا۔ ''میری جان!''

آج بھی اُسی انداز میں، اُنھی الفاظ کو دہرا رہا تھا مگر بانو کا دِل تیزی سے دھڑکنے لگا۔ گہری نظروں سے اُسے دیکھا۔ وہ گڑبڑا گیا، گھبرا کر بولا۔ ''تمھاری طبیعت تو ٹھیک ہے ناں؟''

وہ کوئی جواب دیے بغیر اُٹھ کر چولھے پر بیٹھ گئی۔ آنکھیں بھری بھری تھیں۔ گزشتہ رات کا رتجگا ابھی تک آنکھوں میں چبھ رہا تھا۔ عینی نے رات بھر اُسے سونے نہیں دیا تھا۔ اُس نے وہ سبق پڑھا دیا تھا جس نے

اُترنے والی کئی راتوں کی نیند چاٹ لی تھی۔ کیتلی میں اُبال کھاتے دودھ پر نظریں جمائے عمیق سوچوں کے تانے بانے بنتے ہوئے بانو کے جذبات بھی بدن کی نکور کیتلی میں جوش کھانے لگے۔ دل عینی کا ہم خیال ہوا جاتا تھا۔

دماغ سوچ کی چارپائی پر اوندھا لیٹا ادوائن میں ایڑیاں پھنسائے چلا رہا تھا۔ ”نہیں! ایسا نہیں ہوسکتا۔ بھائی، بھائی ہی ہوتا ہے، کبھی لباس بدل کر محبوب یا شوہر نہیں بن سکتا۔ عینی کی دُنیا میں سب چلتا ہے۔ وہاں بھی کرد کھانے والے لوگ بستے ہیں۔ دیکھنے کا وقت کسی کے پاس نہیں ہے۔ یہاں، ہم غریبوں کی بستی میں کرد کھانے والا کوئی نہیں، سبھی دیکھنے اور دیکھ کر انگلیاں اُٹھانے والے رہتے ہیں۔“

بالی نے چائے کا گھونٹ بھرتے ہوئے اُسے ٹہوکہ دیا۔ ”اے! تو پاگلوں کی طرح کیا سوچے جا رہی ہے؟“

وہ بے دلی سے مسکرائی۔ ”ہوش کے ناخن لو۔ بے چارے پاگل خاک سوچتے ہیں، وہ تو بس روتے، چیختے یا قہقہے لگاتے رہتے ہیں کیونکہ اُن کے بس میں یہی کچھ کرنا ہی ہوتا ہے۔“

وہ خفت بھرے انداز میں بولا۔ ”بال کی کھال اُتارنے لگتی ہو۔“

اُس نے سرد آہ بھری اور سر مزید جھکا لیا۔ زندگی میں پہلی مرتبہ اُس نے چاہا تھا کہ بالی جلد سے جلد دُکان پر چلا جائے، اُسے تنہا چھوڑ دے۔ اُس کے جانے پر دِل ملول ہوگیا۔ اُسے خبر نہیں تھی کہ جیسے اُس نے عینی کے مقابل میں سر جھکایا تھا، ایسے ہی بالی بھی شہزاد کی بچھائی ہوئی بساط پر پٹ گیا تھا۔ تنہائی میں لیٹ کر وہ اپنے بیتے ہوئے ماہ وسال کا احتساب کرنے لگی۔ اُس نے کہاں غلطی کی تھی؟ یاد نہیں تھا۔ بالی کے قدم کس نہج پر ڈگمگائے تھے؟ خبر نہیں تھی۔ دونوں نے کوئی امتحان نہیں دیا تھا جس میں فیل ہوئے ہوں مگر سزا کا نہ ختم ہونے والا سلسلہ اُن کے جلو میں سرکتا چلا آرہا تھا۔ اعصاب اُبھی ایک دریا کے برہم پانی سے نبرد آزما ہوتے کہ نظر اگلے دریا پر ٹھیر جاتی۔

عینی کی میٹھی باتیں، نشان نہ چھوڑنے والے طنز کے تیر اور پُر اسرار جملے دل ہی دل میں دُہرائے جاتی تھی۔ سوچے جاتی تھی کہ عینی کیا کہنا چاہتی تھی حالانکہ وہ بلا جھجک ڈنکے کی چوٹ پر کہہ گئی تھی۔ اُس نے سمجھا دیا تھا کہ بالی کو کوئی نہیں دے گا، بانو کو کوئی نہیں لے گا۔ وہ ہاتھوں کی لکیروں میں اُلجھ کر کراہی۔ ”ہائے ربا! دُنیا دِل والوں سے بھری ہے مگر میرے قریب جو بھی آتا ہے وہ دل والا نہیں بلکہ کانوں والا ہوتا ہے۔ سنتا ہے کہ میرا وجود دھندلایا ہوا ہے مگر میرے بدن کے تقدس کی خیرگی پر نظر نہیں ڈالتا اور پلٹ جاتا ہے۔ بالی کی صورت کو دیکھنے والوں کی نگاہ اُس کے ہنر اور شرافت پر نہیں پڑتی۔“

ایسے میں سوچ کی بساط الٹ گئی۔ گزشتہ کئی دِنوں سے سوچا اور سمجھا سب غلط اور خام محسوس ہونے لگا۔ وہ بھی لوگوں کی طرح بالی کو رَد کرنے کا جُرم سرزد کر رہی تھی۔ فطرت سمجھانے لگی کہ بالی اُس کا بھائی نہیں ہے۔ اُس کا محافظ ہے۔ محافظ نے اُسے آج تک آلام ومصائب سے بچانے کے لیے اپنا آپ دھوپ میں استادہ رکھا تھا۔ اُسے بھی چھایا کی طلب ہوگی۔ چھایا دینے والی محافظ کو بھائی بناتی تھی، شوہر بنانے سے ہچکچاتی تھی۔ ایسے ہی دُنیا اُسے دیکھتے ہی تذبذب کا شکار ہوجاتی تھی، کیا بُرا کرتی تھی، کیا جُدا کرتی تھی...... بانو بھی تو وہی کچھ ہی کر رہی تھی۔ الجھے ڈوروں والی آنکھ اپنے پاؤں پر مرتکز ہوئی۔ ڈورے بھی رقصاں ہوگئے۔ وہ ایسی مورنی تھی جس کے پیر بھی خوبصورت تھے۔ دائیں ہاتھ کی پشت دکھائی دی۔ اپنی نظر ہی پھسلنے لگی تو یقین ہوگیا کہ وہ خوبصورت ہے۔ بائیں ہاتھ کی پشت پر زخموں کے نشان بھی خوبصورت دکھائی دینے لگے۔ بڑبڑانے لگی۔ ”عام سی شکل وصورت والی حمیرا کے بھائی نے میرے بالی کو پرے جھٹک دیا۔ کوئی خوش نُما صورت کیوں کر بالی کی زندگی میں جلوہ گر ہوسکتی ہے؟ مجھے اُجالنے میں جس نے اپنی تمام عمر تج دی، مجھے نکھارنے کے لیے جس نے اپنی انگلیوں کو لوہے کے خول میں بھینچ ڈالا، کیا مجھ پر اُس کا کوئی حق نہیں ہے؟“

زندگی ایسی ہی ہوتی ہے۔ پَل میں آنکھوں میں روشنی بھر دیتی ہے۔ پَل میں آنکھوں کی بینائی کو اندھیاروں میں دھکیل دیتی ہے۔ بینا ہوکر بالی سے دور ہٹنے لگتی۔ نابینا ہوکر اُسی کی بانہوں میں سمانا چاہتی...... سر پھٹنے کو آگیا۔ جھٹکنے سے عفریتی سوچوں سے چھٹکارا نہیں ملا تو صدف کے بارے میں سوچنے لگی۔ سمیرا کے ناراض ہونے کے بعد وہی اُس کی اکلوتی سہیلی تھی۔ اُس نے ایک مرتبہ بتلایا تھا کہ اُس

کا پھوپھا شہر کا معروف عالم دین ہے۔ صدف کے پاس موبائل فون نہیں تھا جس کے سبب اُس کے پاس جانا ناگزیر تھا۔ اُس نے چادر اوڑھی اور صدف کے گھر پہنچ گئی۔ حسنِ اتفاق تھا کہ صدف کا والد گھر میں مل گیا جس نے اُسے اپنے بہنوئی کا فون نمبر دیتے ہوئے پوچھا۔ "بیٹا! خیر تو ہے ناں؟"

وہ سنجیدگی سے بولی۔ "جی انکل! میں نے میگزین میں ایک کہانی پڑھی تھی۔ تب سے ایک اُلجھن نے گھیر رکھا ہے۔ اُسے سلجھانے کے لیے اُن سے کچھ دریافت کرنا چاہتی ہوں۔"

"میرا حوالہ دینا، وہ بہت اچھی طرح سمجھا دیں گے۔"

وہ اُلٹے قدموں گھر پہنچی اور فون پر علامہ صاحب کا فون نمبر پنچ کرنے لگی۔ رابطہ ہونے پر صدف کے پاپا کے حوالے سے اپنا تعارف کرانے کے بعد درخواست گزار ہوئی۔ "انکل! میں ایک اُلجھن میں ہوں۔ میں نے ایک کہانی پڑھی ہے۔ جس میں ہیرو اور ہیروئن، یوں سمجھ لیں کہ لڑکا اور لڑکی، بیس پچیس سال تک ایک چھت تلے بہن بھائی بن کر رہتے ہیں مگر حقیقت میں وہ بہن بھائی تو کجا، ایک دوسرے کے رشتہ دار تک نہیں تھے۔ دونوں ایک دوسرے کو ایک ہی لڑی کے دو موتی سمجھتے رہے۔ دونوں کے والدین بہ قید حیات نہیں تھے۔ پھر کسی دوست نے انھیں آپس میں شادی کر لینے کا مشورہ دیا اور دونوں نے شادی کر لی۔ کہانی ختم ہوگئی مگر میں الجھ کر رہ گئی۔ آپ بتلائیں، کیا وہ دونوں ازدواجی بندھن کی رَسی کو اپنے جسموں کے گرد لپیٹ سکتے ہیں؟"

علامہ صاحب نے کچھ توقف کے بعد بھاری آواز میں سوال کیا۔ "وہ ایک گھر میں کیسے پلے؟"

وہ چونکہ پہلے ہی کہانی بُن چکی تھی، اِس لیے بغیر کسی پریشانی کے بولی۔ "لڑکی کے ماں باپ ایک حادثے میں مر جاتے ہیں۔ اُس وقت لڑکی کی عمر بہ مشکل چار پانچ ماہ ہوتی ہے۔ لڑکی کا کوئی رشتہ دار نہ ہونے کے سبب اُسے لڑکے کا والد اپنے گھر لے آتا ہے اور اپنے بیٹے کے ساتھ ساتھ اُس کی پرورش بھی کرتا ہے۔ لڑکے کی والدہ بھی مر چکی ہوتی ہے۔ جب لڑکی پانچ چھ سال کی ہوتی ہے تو لڑکے کا باپ بھی دُنیا سے رخصت ہو جاتا ہے۔ یوں گھر میں صرف دونوں رہ جاتے ہیں۔ لڑکا بڑا ہونے کی وجہ سے لڑکی کا خیال رکھتا ہے اور اُس کی پرورش کرتا ہے۔ بہن بھائی کا فطری پیار اُس وقت دَم توڑ دیتا ہے جب دونوں کو جوانی میں پتہ چلتا ہے کہ وہ تو ایک دوسرے کے کچھ بھی نہیں لگتے۔"

علامہ صاحب نے مسکرا کر کہا۔ "بیٹی! خدا تمھیں سکھی رکھے۔ کہانیوں کو بس تفریح اور عبرت کے حصول تک محدود رکھنا چاہیے، زندگی پر انہیں اثر انداز ہونے کی مہلت نہیں دینا چاہیے مگر لگتا ہے تم نے اس جھوٹی سچی کہانی کو اپنے دِل پر لے لیا ہے۔ اِس کا مطلب یہ ہے کہ تم بے حد حساس ہو۔ حساس لوگ ایسے ہی ہوتے ہیں۔ بہ ہر حال! میں اپنے علم کی روشنی میں تمھاری اُلجھن دور کرنے کی کوشش کرتا ہوں، آسان لفظوں میں بتلاتا ہوں کہ دونوں کی شادی میں بہ ظاہر کوئی رُکاوٹ حائل نہیں ہے۔"

وہ اُسے تفصیل کے ساتھ بتلانے لگے۔ وہ مطمئن ہونے تک سنتی رہی پھر شکریہ ادا کر کے کال منقطع کرتے ہوئے بڑبڑائی۔ "اِس کا مطلب ہے کہ عینی نے سچ کہا تھا۔"

ایک پریشانی سے جان چھوٹی تو دوسری آن وارد ہوئی۔ اِس طرف نہ تو عینی نے دھیان دیا تھا، نہ شہزاد نے اور نہ ہی خود اُس کا ذہن اِس مسئلے کی نشاندہی کر پایا تھا۔ اُس نے عینی کا نمبر ملایا، کال ریسیو ہونے پر بولی۔ "عینی! کیا تم فری ہو؟"

"میری فراغت کو چھوڑو، اپنا رونے دھونے کا شوق پورا کرو۔" عینی نے ہنس کر کہا۔

"تم نے بالی کو اپنانے کا مشورہ دیتے ہوئے یہ نہیں سوچا تھا کہ ہم دونوں کے شناختی کارڈ بن چکے ہیں جن کی رُو سے ہم دونوں قانونی طور پر بہن بھائی ہیں۔" بانو نے تفکر آمیز انداز میں کہا۔

"تو پھر کیا ہے؟" عینی کی استعجاب بھری آواز اُبھری۔

"تم شاید میری بات کو سمجھ نہیں پائی ہو۔ دیکھو ناں! اگر پھر کوئی شیطان بیچ میں ٹپک پڑا اور اُس نے ہم پر مقدمہ کر دیا تو......"

عینی ہنسنے لگی۔ فون میں چنچل سی جل ترنگ بج اُٹھی۔ بانو نے غصے سے جھڑکا۔ "یہ کیا بدتمیزی ہے؟ میری جان پر بنی ہوئی ہے اور تم بے وقوفوں کی طرح ہنس رہی ہو۔ کیا میری بے بسی پر ہنس رہی ہو؟"

عینی نے بہ وقتِ تمام خود پر قابو پایا مگر آواز سے مترشح

شرارت کو دبا نہ پائی۔ بولی۔ ''مت گھبراؤ میری جان! اس موضوع پر شہزاد مجھ سے بحث کر چکا ہے۔ اُس کے ایک دوست کا بڑا بھائی دو تین سال کی عمر میں اللہ کو پیارا ہو گیا تھا۔ وہ غریب لوگ ہیں، انھیں جائیداد کے بٹوارے کا کوئی خوف لاحق نہیں ہے۔ بھائی نے اُن سے بات پکی کر لی ہے۔ سودا طے پا چکا ہے۔ بالی کا شناختی کارڈ پھینک دیا جائے گا۔ مرنے والے کے برتھ سرٹیفکیٹ اور رجسٹریشن آفس کے ریکارڈ میں موجود گھرانے کے افراد کی تعداد اور تفصیل کا سہارا لے کر نیا کارڈ بنوالیا جائے گا۔ تمھارے بالی کا نام اور ولدیت بدل جائے گی۔ پیسے والے ایسے ہی دُنیا کو بدل ڈالتے ہیں۔ میں بھی اپنی پیاری سی دوست کی خوشی کی خاطر سب کچھ اُلٹا کر دوں گی۔ سمجھی؟''

''مگر......'' بانو کے سینے پر پڑی ہوئی بھاری سل ہٹتے ہٹتے اپنی جان کا ہ رگڑ چھوڑ گئی۔

''تم اپنے ننھے سے ذہن کو اگر مگر جیسے الجھن خیز لفظوں سے دور رکھو اور جو کچھ میں نے کہا تھا، اُس پر عمل کرو۔ باقی تمام معاملات شہزاد کے ذمہ رہے۔ او کے؟'' عینی نے پیار سے کہا۔

''وہ تو ٹھیک ہے مگر بالی شاید یہ سب کچھ نہ کر پائے۔ میں تمھاری باتوں میں آ گئی ہوں، وہ نہیں آئے گا اور پھر کر آسمان سر پر اُٹھا لے گا۔'' بانو کے لہجے میں اَن جان اندیشے کلبلا اُٹھے۔

''اُس کی فکر نہ کرو، اپنی فکر کرو۔ شہزاد نے اُسے منا لیا ہے۔''

''نہیں!'' بانو نے پوری شدت سے نفی میں سر ہلایا۔

''میں سچ کہتی ہوں۔ یقین نہیں آتا تو شہزاد سے پوچھ لو۔'' عینی کے لہجے سے یقین اور وثوق مترشح تھا۔

دیکھ لینا!'' بانو کا ڈر ابھی پوری طرح فرو نہیں ہوا تھا۔

''کس کو؟ تمھیں، تمھاری جاں فگار جوانی کو یا جوانی کو سراہنے والے دیوانے بالی کو؟'' عینی شوخ ہو گئی۔

''تم کبھی نہیں بدلو گی۔'' بانو نے تیز لہجے میں کہا اور جھٹ سے کال منقطع کر دی۔ یہ خوبی جانتی تھی کہ عینی کی زبانِ تیز رَد کو روکا نہیں جا سکتا تھا اور نہ ہی وہ اُس کے ذومعانی جملوں کی یلغار کے سامنے زیادہ دیر ٹھہر سکتی تھی۔

اُترتی رات کے پہلو میں دونوں ایک دوسرے سے نظریں چُرا کر سونے کی کوشش کر رہے تھے۔ ایسے میں بانو اُٹھی، جھکے ہوئے سر کے ساتھ بالی کی چارپائی کی بانہہ سے لگ کر کھڑی ہو گئی، بولی۔ ''بالی! کیا تم جاگ رہے ہو؟''

وہ جاگ رہا تھا۔ سونے کی اداکاری کر رہا تھا۔ بانو کے پکارنے پر خاموش نہ رہ سکا، آنکھیں موندے دھیرے سے بولا۔ ''ہاں! کیا بات ہے؟ تمھیں نیند کیوں نہیں آئی اَب تک؟''

بانو چارپائی کی بانہہ پر ٹِک گئی۔ پہلے کی طرح بالی کے گالوں کو سہلانا چاہتی تھی۔ ہاتھ بڑھایا مگر کسی نادیدہ قوت نے ہاتھ پکڑ لیا۔ ٹھٹک کر سوچنے لگی۔ ''یہ کیا ہوا؟ میرا بڑھا ہوا ہاتھ تھم کیوں گیا؟ آج تک ایسا نہیں ہوا، آج کیوں ہوا ہے؟''

بالی نے اُسے دیکھا، کٹ کر رہ گیا، بولا۔ ''بانو! سچ بتاؤ، کیا سوچ رہی ہو؟''

وہ دیوار کی جانب منہ کر کے بولی۔ ''میں اُسی بات کو لبوں پر لانے کی کوشش کر رہی ہوں جو تجھے جاگتے رہنے پر مجبور کیے بیٹھی ہے۔ مجھے عینی نے شکست دے دی، کیا تم بھی شہزاد کے مقابلے میں ہار گئے ہو؟''

وہ شکست خوردہ لہجے میں بولا۔ ''وہ باتوں میں مجھ سے جیت گیا مگر میں ہار کر بھی ہارا ہوا نہیں ہوں۔ میرے خوابوں نے تجھے بڑے اونچے مقام پر فائز کر رکھا ہے۔ وہاں، جہاں میرا ہاتھ نہیں پہنچتا۔ تم میری بہن نہیں ہو تو کیا ہوا، میں تم سے پیار تو کرتا ہوں ناں! جس انسان کو دُنیا میں کوئی پسند نہیں کرتا، وہ تمھارے لائق کیوں کر ہو سکتا ہے۔ نہیں بانو نہیں! تمھارے لیے آسمان سے تارے توڑ کر لانے والے کا ظرف اتنا پست نہیں ہے کہ وہ تمھارے اُجلے وجود پر ورکشاپ کی کالک مل دے۔ تم چاند ہو، تم آسمان ہو، تمھارے لیے فلک سے ہی ہم سر اُترے گا اور میں اپنے ہاتھوں تمھیں اُجالوں گا۔ تم فکر نہ کرو۔ ڈرو نہیں، میں وہی بالی ہوں، جس نے عمر بھر تمھارے کہے کو مقدم جانا۔''

''تو کیا تم مجھ سے شادی نہیں کرو گے؟'' بانو بھونچکی رہ گئی۔

بالی ایک دَم اُٹھ بیٹھا۔ پھاڑ کھانے سے انداز میں اُسے دیکھتے ہوئے درشتی سے بولا۔ ''کیا تم پاگل ہو گئی ہو؟ میں نے کوئی راہ نہ پا کر شہزاد کے سامنے خاموشی اختیار کر لی تھی جسے اُس نے میرا اقرار سمجھ لیا۔ میں تمھارے ساتھ

کیسے شادی کرسکتا ہوں؟ جس نظر نے تمھیں آج تک حرمت کے پردے میں لپیٹے رکھا، جس دل نے تمھارے لبوں سے پھوٹنے والے لفظ 'بھائی' پر دھڑکنا شروع کیا اور 'بالی' پر دھڑکنا بند کیا، جن ہونٹوں نے تمھاری پیشانی کو چوم کر دُعائیں دیں، کیسے بدل سکتے ہیں؟"

وہ عجیب سی کیفیت سے دوچار ہوگئی۔ سینے پر ہاتھ رکھا، پشت کے بَل لٹایا اور اپنا لرزتا ہوا ہاتھ اُس کے گھنے بالوں میں ڈالتے ہوئے سسکنے لگی۔ پیشانی پر جھکی اور اپنے ساتھ ساتھ بالی کو بھی آنسوؤں سے بھگونے لگی۔ بالی نے آنکھیں بند کرلیں۔ سمجھانے لگا۔" دیکھ بانو! وہ امیر اور بہت پڑھے لکھے لوگ ہیں۔ جو سوچیں، کرسکتے ہیں۔ ہم غریب لوگ ہیں۔ ایک ہی خواب کی زندگی بھر میں کامیابی سے آبیاری کرلیں تو بڑی بات ہے۔ درخت لگانے والا کبھی اپنے ہاتھوں سے اُس کی ٹہنیاں نہیں کاٹتا۔ کسی کو بے دردی سے کاٹنے نہیں دیتا مگر تم کیا جانو، درخت لگانا کیا ہوتا ہے؟"

وہ سسکی۔" میں جانتی ہوں۔ تم بھول گئے ہو کہ تمھارے لگائے ہوئے شجر کو تمھارے ہاتھوں کی آبیاری کی ہی طلب رہتی ہے۔ کوئی اور چھولے تو مُرجھا لگتا ہے۔"

بالی نے نرمی سے نفی میں سر ہلایا۔

" بالی! جو کوئی بھی سمجھا سکتا تھا، عینی نے مجھے سمجھا دیا ہے۔ ایک زمانہ تھا جب لڑکی اپنی عزت بچانے والے کو اپنی عزت کا مالک قرار دیا کرتی تھی اور پھر زندگی میں کسی کو اپنے قریب پھٹکنے نہیں دیتی تھی۔ سمجھ لو، ہم اُسی زمانے کے ہیں۔ تم میرے مالک ہو۔ تم نے میری نادیدہ رگوں میں خون کی گردش سرایت کی، تم نے مجھے زندہ رکھا، تم ہی میرے مالک ہو۔ مجھے وہ رشتہ بھی منظور تھا جس کا عنوان تم نے مجھے ازبر کرایا۔ مجھے یہ تعلق بھی پیارا ہے جس کا ادراک عینی نے میرے قلب وذہن میں جگایا۔ بالی! مجھے تمھارے علاوہ دُنیا کا کوئی مرد خوش نہیں رکھ سکتا۔"

بالی ایک ٹک اُسے دیکھ رہا تھا۔ وہ خاموش ہوئی تو بے اختیار بھرّائی ہوئی آواز میں بولا۔" تم پڑھی لکھی ہو، باتوں کا ہنر جانتی ہو۔ میں لوہے کو توڑنے موڑنے والا جاہل ہوں، سمجھا نہیں سکتا۔ تم خود ہی سمجھنے کی کوشش کرو کہ تمھارا اور میرا کوئی جوڑ نہیں۔ ہم کچے دھاگے نہیں کہ کوئی جیسے چاہے گانٹھ دے، جہاں سے چاہے کاٹ دے، ہم انسان ہیں خواہ دوسرے انسانوں سے کم تر ہیں۔ مجھے دُکھ نہ دو، پریشان نہ کرو اور جاؤ، جا کر سوجاؤ۔ مجھے بہن گنوا کر بیوی حاصل کرنے کی حماقت پر مت اکساؤ۔"

وہ اُٹھ کھڑی ہوئی۔ اپنی چارپائی پر جانے کی بجائے بالی کی پائنتی پر بیٹھ کر اُس کے پیروں سے لپٹ کر رونے لگی۔ یوں لگا جیسے روح تک میں اَن جان سی طمانیت سرایت کرگئی ہو اور وہ تھوڑی ہی دیر میں روتے روتے سو گئی۔ کمرے کے پُرسکوت ماحول میں اُس کے ننھے ننھے خراٹے گونجنے لگے۔ بالی کھلی آنکھوں سے چھت کی کڑیوں کو گھورنے لگا۔ اُس کا ذہن بالکل ماؤف ہوکر رہ گیا تھا۔ وہ خالی الذہنی کی سی کیفیت میں کھو کر رہ گیا۔ سچ کہتے ہیں، ایسی حالت میں انسان نہ تو زندوں میں شمار ہوتا ہے اور نہ مردوں میں...... احساسات وجذبات سے قطعاً عاری...... تفکرات اور الجھاوؤں سے یکسر ماورا......

یہ کرب ناک کیفیت دونوں پر طویل دورانیے کے لیے حاوی رہی۔ قسمت نے انھیں رشتوں کے بیچ معلق کر دیا۔ وہ نہ تو بہن بھائی تھے اور نہ ہی ایک دوسرے کی چند لمحوں کی دوری برداشت کرتے تھے۔



دُنیا کی ہتھیلی پر مہینوں میں جا کے کہیں سرسوں پھوٹتی ہے، محبت کی ہتھیلی پر لمحوں میں گلاب اُگنے لگتے ہیں۔ بانو اپنے سالانہ امتحانات سے فارغ ہوئی تو عینی نے اُسے فون پر خوش خبری دی کہ شہزاد نے بالی کے متعلقہ تمام تر اُمور کو بہ حسن پایہ تکمیل تک پہنچا دیا ہے۔ اُس نے 'اقبال حسین' کو 'ظفر اقبال' بنا کر سماج کے ہاتھ میں نیا کھلونا تھما دیا ہے۔

بانو قدرے بے چین ہوگئی۔" مرنے والے تین سالہ بچے کا نام ظفر اقبال تھا؟"

عینی نے جواب دیا۔" ہاں۔ حسنِ اتفاق دیکھو، جسے تمھاری زُباں نے بالی کہہ کر پکارنا سیکھا تھا، اُسے آئندہ بھی بالی کہہ کر پکارتی رہے گی۔ امتحانات سے جان چھوٹ گئی ہے۔ اَب راوی چین ہی چین لکھتا ہے۔ میں اور شہزاد چند دنوں تک لاہور جارہے ہیں، سیر سپاٹے کی غرض سے۔ ارادہ ہے کہ تم دونوں کو میاں بیوی بنا کر لاہور میں منتقل کریں گے۔ شہزاد نے تم دونوں کے لیے نیا اور اچھوتا لائحہ عمل تیار کر رکھا ہے۔"

وہ ذرم بخود رہ گئی۔ "تو کیا ایک بار پھر مجھے سامان باندھنا ہوگا؟"

عینی ہنسی۔ "تو کیا تم اس معاشرے میں رہنا چاہو گی جو تم دونوں کو از حد جاننے لگا ہے؟ ——— بے وقوف! اگر تم دونوں کی شادی اسی شہر میں انجام پذیر ہوئی تو ایک واویلا مچ جائے گا۔ لوگ منہ میں انگلیاں ڈال کر کچکچاتے دانتوں سے تم دونوں کو نوچ کھائیں گے۔ لاہور شہر نہیں، انسانوں کا جنگل ہے۔ وہاں کوئی کسی کو نہیں جانتا، کوئی کسی کے پس منظر میں دلچسپی نہیں لیتا۔ وہاں کھو جانے والا انسان تو کبھی اپنے آپ کو بھی نہیں پاتا۔"

لاہور کے تذکرے سن رکھے تھے، دیکھا نہیں تھا۔ حیرانی سے بولی۔ "کیا وہ تمھارے شہر سے بھی بڑا ہے؟"

عینی ہنس پڑی۔ "عنقریب خود ہی دیکھ لوگی۔ دیکھنے اور سننے میں بہت فرق ہوتا ہے۔"

بانو کو عینی کی پُرخلوص ذات پر بھروسہ تھا مگر اپنی ہمیشہ کی مضطرب قسمت کی اٹکھیلیوں سے ڈرتی تھی۔ جب کچھ سجھائی نہ دیتا تو عینی کی تدبیر اور خدا کی مرضی پر ڈال کر خاموش ہو جاتی۔ اب بھی چپ سادھے وقت کے کولہو سے نکلتے تیل کو دیکھ رہی تھی، اپنی ہتھیلی پر پڑنے والی تیل کی دھار کو دیکھ رہی تھی اور دل کو سمجھا رہی تھی، "عینی اور شہزاد میرے لیے گڑھا نہیں کھودیں گے۔ جو بھی کریں گے، میرے اور بالی کے فائدے کے لیے ہی کریں گے۔"

بالی اس نئی درپیش آنے والی خودساختہ صورت حال پر مزاحمت دکھا رہا تھا۔ بانو نے اُسے اپنے ہر ہتھکنڈے سے منانے کی کوشش کر ڈالی تھی مگر وہ تذبذب کا شکار رہا۔ کبھی خاموش ہو جاتا، کبھی اپنے مخصوص انداز میں چیخ اٹھتا۔ بانو جانتی تھی کہ بالی کا دل آپے، بہن کے سوا کسی روپ میں دیکھنے کا روادار نہیں ہے۔ فون پر اکثر عینی کو بالی کے شدت آمیز انکار کے بارے میں بتاتی رہتی۔ عینی اُسے دلاسا دیتی، حوصلہ بندھاتی اور معاملے کی کٹھنائیوں کو شہزاد پر ڈال کر مطمئن رہنے کا مشورہ دیتی۔

لاہور کا قصد کرتے ہی عینی نے فون پر بانو اور بالی کو متنبہ کر دیا کہ اُنھیں آنے والے چند روز میں ہی جملہ اسباب و سامان سمیت لاہور پہنچنا ہوگا۔ بانو نے کسی ردوکد کے بغیر اپنا وجود اور گھر کا سامان سنبھالنا شروع کر دیا تھا۔

بالی نے بھی با دل نخواستہ اپنے کاروبار کی بساط کو کانپتے ہاتھوں سے لپیٹنا شروع کر دیا تاکہ علم سفر کے ملتے ہی اُسے دکان کا سامان ٹرک میں لادتے ہوئے کسی پریشانی کا سامنا نہ کرنا پڑے۔ زندگی نے ایک یہی کام تو پوری مہارت کے ساتھ سکھلایا تھا۔

ہر روز شام کو عینی فون پر بانو سے رابطہ کرتی اور اُس کا دل دھڑکا دیتی۔ اُن جگہوں کے بارے میں مزہ لیتے ہوئے بتاتی جہاں پر دن میں اپنے بھائی کے ہمراہ گھومنے نکلتی تھی۔ چند دنوں میں ہی اُس نے بانو کے دل میں لاہور دیکھنے کا اشتیاق بھر دیا تھا۔ بانو کی زندگی کے یہی وہ دن تھے جب وہ بالی کو جی بھر کر دیکھا کرتی مگر دونوں کے بیچ پورا پورا دن کوئی بات نہیں ہوا کرتی تھی۔ بالی اُس سے قدرے گریزاں رہا کرتا تھا۔ بولتا بھی تو بمشکل ضرورت کے وقت...... بانو اُس کی جذباتی کیفیت کو بخوبی سمجھتی تھی کہ وہ سوچتا کچھ ہے، کرتا کچھ ہے۔ اس لیے زیادہ پریشان نہیں کرتی تھی۔ اُس کے اپنے وجود میں، ذہن و احساسات میں ہمہ وقت ایک بے چینی سی کروٹیں بدلتی رہتی تھی جو اُس کی منتشر سوچوں کو کسی نقطے پر مرکوز نہیں ہونے دیتی تھی۔

حمیرا اور صدف کو اُس کے لاہور شفٹ ہونے کے ارادوں کی بھنک مل گئی۔ حمیرا نے اپنا ہر رنجش بالائے طاق رکھی اور اُس کے پاس پہنچ کر رونے لگی۔ شہر چھوڑنے کی وجہ دریافت کرنے لگی۔ وہ یونیورسٹی میں داخلہ لینے اور اپنے رشتہ داروں کے اصرار کو مدنظر رکھ کر لاہور سدھارنے کا بہانہ بناتے ہوئے مطمئن کرنے لگی۔ ایسے ہی دُکھ کالو فضا میں حمیرا کی بھرائی ہوئی آواز گونجی۔ "بانو! میں نے تمھیں دل میں جگہ دی تھی۔ چاہا تھا کہ تم میرے گھر کی مالکن بن کر، بھائی کے آنگن کا چاند بن کر ہمیشہ میری نگاہوں کے سامنے رہو مگر قسمت کو شاید یہ منظور نہ ہوا۔ مجھے بہت بعد میں پتہ چلا کہ تم نے کامران سے حمیرا کے رشتے کی بات کی تھی جس پر وہ بپھر گیا۔ کاش! اُسے کہنے کی بجائے تم نے مجھ سے بات کی ہوتی۔ میں ماما اور پاپا کو شاید منا لیتی۔ سچ بانو! تمھارے ذرے سے مایوس پلٹنے کے بعد کامران پہلے جیسا نہیں رہا۔ وہ بہت سنجیدہ اور کھویا کھویا رہتا ہے حالانکہ اُس کا خواب پایہ تکمیل کو پہنچنے والا ہے۔ اُسے ڈومیسٹک ٹرائکز میں بڑی پذیرائی ملی ہے۔ دوران

تربیت بھی کیمپ لیڈر نے اُس کے کھیل کو بہت سراہا اور یقین دلایا کہ وہ دِن زیادہ دور نہیں، جب وہ قومی کرکٹ ٹیم کا حصہ بن کر شہرت کے فلک پر چاند بن کر چمکنے لگے گا۔"

بانو نے اُسے مبارکباد دی، اپنی مجبوری کے اظہار کا اعادہ کیا اور کہا۔"تم دونوں ناحق مجھ سے خفا ہوئے۔ میں گزرے کل میں تمھاری نظروں میں آئی تھی، آنے والے کل میں اوجھل ہو جاؤں گی۔ لوگ کہتے ہیں، زندگی محبت کرنے کے لیے کم ہے، تم لوگوں نے پَل دو پَل کے ساتھ میں بھی ناراضی کا وقت نکال لیا۔ بہ ہر حال! کامران کا مستقبل روشن ہے۔ اُسے کہیں بھی تھک کر، مایوس ہو کر یا غمزدہ ہو کر رُکنا نہیں چاہیے۔ میں شاید اُسے وہ تقویت نہ دے پاتی جس کی اُسے ضرورت ہے۔"

ایسے میں صدف بھی پہنچ گئی۔ محلّہ میں جو لڑکیاں شناسائی کے مراحل طے کر چکی تھی، وہ بھی ملنے کے لیے آئیں اور سفر بہ خیر کی دعائیں دیتے ہوئے رابطہ رکھنے کی استدعا کرنے لگیں۔ وہ جھوٹ پر جھوٹ بولتی جا رہی تھی، جھوٹے وعدے کرتی جاتی تھی جبکہ جانتی تھی کہ وہ رابطہ نہیں کر پائے گی۔ جہاں سے بھی گئی، پلٹ کر نہ دیکھ پائی۔ ایک عینی تھی جو اُس کی ندامتوں بھرے وجود کے ساتھ نہ جانے کیوں چمٹی رہ گئی تھی وگرنہ اُس کی ہجرتوں کا ساتھ سوائے بالی کے کوئی نہیں دے پایا تھا۔

یہ ہجرت پہلے سے جُدا گانہ تھی۔ رختِ راہ میں بھی کچھ موجود تھا مگر اَب کے آنسوؤں کی نمی نہیں تھی۔ ہمیشہ ایک گھر سے نکلتے ہوئے دوسرے گھر کے بارے میں نہیں سوچا کرتی تھی۔ آج سوچ سوچ کر باؤلی ہونے لگی تھی۔ اذنِ سفر نے اُس کے بدن میں عجیب اور ناشناس بے تابی بھر دی تھی۔

زندگی میں پہلی مرتبہ لاہور دیکھا۔ لاہور دیکھنے کی چیز ہے، ہر کوئی کہتا تھا۔ وہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے انسانوں کے اژدحام کو دیکھ رہی تھی اور سوچ رہی تھی، 'عینی سچ کہتی تھی۔ یہاں انسان کو اپنا کھویا ہوا وجود بھی تلاشِ بسیار کے بعد میسر نہیں آتا، کوئی مجھے کیوں کر کھوج پائے گا۔ ویسے بھی مجھے کھوجنے والا اَب کوئی نہیں رہا اور لگتا ہے، پُرفتن زندگی کے تکلیف دِہ ایام رخصت ہونے والے ہیں۔ جنم دِن سے نام کے ساتھ چپکی ندامت اور شرمساری کی جونک جھڑ گئی ہے، وجود سے پھوٹتا تعفن ہوا میں تحلیل ہو گیا ہے اور اَب کوئی بھی مجھے سونگھ کر تعاقب نہیں کر پائے گا۔'

بالی سامان والے ٹرک کے ساتھ آ رہا تھا جبکہ وہ بس کے ذریعہ لاہور پہنچی تھی۔ موبائل فون کان سے لگائے بس اسٹینڈ سے باہر نکلی، عینی کی راہ نمائی میں رکشہ پر بیٹھی اور نادیدہ منزل کی طرف گامزن ہو گئی۔ ایسے میں اُس کے پورے وجود میں ہیجان بھرا ہوا تھا۔ عینی اور شہزاد نے اُسے ایک نو تعمیر شدہ ہاؤسنگ کالونی میں بلایا تھا۔ پہنچنے پر بڑے تپاک سے ملے۔ اُسے اپنی معیت میں لے کر ایک چھوٹی مگر بہت خوبصورت کوٹھی کے دروازے پر پہنچے۔ عینی نے اُس کی کمر میں بازو حمائل کرتے ہوئے جوش سے کہا۔"دیکھ بانو! میں تمھیں اپنی بھابی نہیں بنا سکی مگر میں نے اپنی وفا کا حق ادا کر دیا ہے۔ اَب تم اِس چھوٹے سے تاج محل میں اپنے بالی کے ساتھ خوش و خرم رہ سکتی ہو۔"

بانو نے پھٹی پھٹی نظروں سے تاج محل کو دیکھا۔ ہکا بکا رہ گئی۔ آنکھیں پوری وسعت میں کھولتے ہوئے چلائی۔"سچ عینی؟"

عینی نے اُسے اپنے ہم قدم چلاتے ہوئے گھر کا دروازہ کھولا، اندر داخل ہوئی اور ایک ایک کمرہ دکھاتے ہوئے خوشی سے چلاتی گئی۔"یہ تمھارا بیڈ روم، یہ رہا اسٹور اور اِدھر دیکھو...... ڈرائنگ روم...... یہاں سب کچھ ہے اور مزے کی بات ہے کہ صرف تمھارا ہے، تمھارا! اِس میں بالی کے سوا کوئی شریک نہیں اور اَب آگے تمھاری مرضی کہ کتنے شریک پیدا کرتی ہو۔"

بانو کا چہرہ سُرخ ہو گیا۔ فرطِ تشکر سے عینی سے چمٹ گئی، اُس کے ہاتھوں کو چوم کر آنکھوں سے لگاتے ہوئے پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ ایسے میں شہزاد نے دِلاسہ دیا، کندھوں سے پکڑ کر اپنی جانب موڑا اور پیار سے بولا۔"تم نے مجھے بے وفا سمجھا تھا مگر میری مجبوریوں سے آگہی حاصل نہیں کی تھی۔ میں نے عملی طور پر اپنی محبت کو تم پر آشکار کر دیا ہے۔ بھلے، درخت پر میری نیم پلیٹ نہیں لگی مگر مجھے تو بس ایک درخت لگانا تھا، لگا دیا۔ اَب تم جانو، تمھاری قسمت جانے اور ہاں...... میں نے بالی کے لیے ایک دُکان کرایہ پر حاصل کر لی ہے۔ اُسے اپنا ورکنگ پارٹنر بناتے ہوئے وسیع پیمانے پر بزنس کی داغ بیل ڈالی ہے۔ اَب وہ ایک بڑی ورکشاپ کا مالک تو کہلائے گا مگر اُس کے بدن پر، جسے تم صبح

شام چھوڑ گی، کوئی سیاہ دھبہ نہیں پڑے گا۔"

بانو کا وجود سنسنا اٹھا۔ بینی کو چھوڑ کر شہزاد کے قریب آئی۔ ایسے میں تعلیم، شخصی نزاکت اور طنطنہ زمین پر ڈھیر ہوگیا۔ وہ اُس کے ہاتھوں کو چومتی ہوئی، پھسلتی ہوئی پیروں میں بیٹھ گئی، زندھی ہوئی آواز میں بولی۔ "آپ انسان نہیں، فرشتہ ہیں۔ پڑھتی رہی ہوں کہ امیرزادوں کی دُنیا میں غریب محض کھلونا بن کر اترتے ہیں اور ٹکڑے چاٹتے چاٹتے دُنیا سے گزر جاتے ہیں۔ دیکھنے میں یہ آیا ہے کہ امیروں میں فرشتے بھی موجود ہیں جو مجھ جیسی غریب زادی کو آنکھوں پر بٹھاتے ہیں اور دل میں جگہ دیتے ہیں۔ مجھے آپ کی ذات سے کوئی شکوہ نہیں رہا۔"

شہزاد کا اشارہ پا کر بینی نے اُسے بازو سے پکڑ کر اُٹھایا، اپنی شال سے اُس کا تر بہ تر چہرہ پونچھا اور بولی۔ "ان باتوں کو چھوڑو۔ آؤ دیکھیں کہ تمھارے گھر کی آرائش کیسے کرنا ہوگی۔ تمھیں یہاں رہنے کے لیے ابھی بہت کچھ سمجھنا ہوگا۔ امیروں کے چونچلے سیکھنے ہوں گے۔ اپنے آپ میں اعتماد پیدا کرنا ہوگا ورنہ کہیں نہ کہیں اپنا ہما شہ اپنے ہاتھوں چھوڑ بیٹھو گی۔"

بالی کی موبائل فون کی نادیدہ رسی تھامے پہنچ گیا۔ اس کی حالت بانو سے بھی زیادہ دگرگوں ہوگئی۔ یقین کرنے کی بات نہیں تھی مگر دینے والا معتبر تھا۔ خوابوں کی کچی تعمیر پر استادہ تاج محل کی چابیاں ہاتھ میں پکڑ کر بھی زندگی جھوٹ سے عبارت محسوس ہو رہی تھی۔ زندگی چیز ہی ایسی ہے۔ دینے پر آتی ہے تو بے حد و حساب دیتی چلی جاتی ہے، چھیننے پر آتی ہے تو انگلیاں تک کاٹ لیتی ہے۔

دو تین روز میں بہ مشکل بانو نے گھر سنوارا، بالی نے دُکان سنبھالی۔ بینی اور شہزاد گاہے بہ گاہے اُن کی اعانت کے لیے آجاتے، ہاتھ بٹاتے اور مسکراہٹیں اچھال کر چلے جاتے۔ بینی نے بانو اور بالی کے موبائل فون سیٹوں میں دھڑکتے ہوئے دل بدل ڈالے۔ اس نے سختی سے دونوں کو تاکید کر دی تھی کہ وہ اپنی گزشتہ زندگی کے کسی بھی رابطے کو بحال نہیں کریں گے۔ نئے سفر میں پرانے مسافروں کی سنگت کبھی گل کھلاتی نہیں بگل کھلاتی ہی ہے۔

ایک رات، بینی اور شہزاد کی عدم موجودگی میں، بانو اور بالی نے اپنی دانست کو بروئے کار لاتے ہوئے شہزاد کی عنایات کا شمار کیا، تخمینہ لگایا تو دماغ بھک سے اُڑ گیا۔ شہزاد اُن پر لگ بھگ پندرہ لاکھ روپے خرچ کر چکا تھا۔ یہ رقم واپسی کے وعدے سے مبرا تھی۔ بانو نے تحیرآمیز لہجے میں کہا۔ "یقین نہیں آتا، کوئی اتنی بڑی رقم کسی وجہ کے بغیر اندھے کنویں میں پھینکنے کی جرأت رکھتا ہو۔"

بالی بڑبڑایا۔ "کوئی بتلاتا تو شاید ہم بھی یقین نہ کرتے۔"

دن بہ دن بینی کی واپسی کا وقت قریب آتا جاتا تھا۔ موسم سرما کا آغاز ہوا چاہتا تھا۔ اکتوبر کے پہلے ہفتے میں، جب بانو اور بالی اپنے نئے پیرہن میں سج گئے، تب شہزاد نے اُن کے لیے زندگی کی شب خیز رات کو سرخ و سنہری لڑیوں سے سجا دیا۔ دونوں کا نکاح کورٹ میں ہوا تھا، دستاویزی کارروائی مکمل ہونے پر شہزاد نے دونوں کو نئے سامان سے آراستہ و پیراستہ بیڈروم کے وسط میں بچھے نہایت آرام دہ بیڈ پر لا بٹھاتے ہوئے کہا۔

"بانو! میری محبت کا احساس ہمیشہ تمھارے ساتھ ساتھ چلے گا۔ میں نے کوئی خیرات نہیں دی، اولاد نہیں کی بلکہ اپنی ناکام محبت کو تھکنے کی آسودگی بخشی ہے۔ میں شاید تمھیں کبھی بھی بھول نہیں پاؤں گا۔"

بانو کے پاس شکریہ کی ادائیگی کے لیے الفاظ نہیں تھے۔ ٹک ٹک بیٹھی، نظریں جمائے عجیب سے خیالات کے زیرِ بار ہونٹ کاٹتی رہی۔ ہاتھ میں دبی ہوئی فائل بانو کے سرخ گھیر والے بڑے گھاگھرے کے زرطراز گھیرے پر رکھتے ہوئے وہ بولا تو اُس کی آواز جذبات سے بوجھل ہوگئی۔ "بانو! اس فائل میں اس گھر کے کاغذات، کاروباری دستاویزات اور کورٹ کے پیپرز ہیں جن میں بالی، یہ چھوٹا سا گھر اور گھر کے نظام کو چلانے والا کاروبار تمھارے نام لکھ دیا گیا ہے۔ قبول کرلو، نئے سفر کے لیے زادِ راہ قرار دے کر یا شادی کا تحفہ سمجھ کر۔ ایک بات بھی سوچتا ہوں کہ تم بولنا، ہنسنا اور توڑنا سیکھ لو۔ جو کینہ توز تم پر الزام سے لتھڑی انگلی اٹھائے، تم اس کی انگلی توڑ دو۔ جو تہمت آلود طنز کی چادر تمھارے وجود پر اوڑھانے چلے، تم اُس پر قہر بن کر برس پڑو۔ یہی زندگی ہے، یہی کامیابی کا چلن ہے۔ تم نے کوئی جرم نہیں کیا۔ تم نے کچھ بھی غلط نہیں کیا۔ جیسے بالی نے تمھیں پڑھایا، گفتگو کے قابل بنایا، ایسے ہی

تم بالی پر محنت کرتے ہوئے اِسے کامیاب اور پُر اعتماد بناؤ۔۔ یاد رکھنا، بالی کے قرض کا بار تم زندگی بھر خدمت کر کے بھی اتار نہیں پاؤ گی۔"

بانو نے کن اکھیوں سے بالی کو دیکھا۔ وہ سر جھکائے نہ جانے کن خیالوں میں کھویا ہوا تھا۔ اُس نے کہنی چبھوئی۔ "اے بالی! سن رہے ہو ناں کہ شہزاد صاحب کیا کہہ رہے ہیں؟"

اُس نے بے دھیانی میں اپنا سر اثبات میں ہلا دیا۔

عینی کا چہرہ فرطِ مسرت سے کھلا جا رہا تھا۔ بیڈ پر چڑھ کر بانو کو چھیڑنے لگی۔ خود لال تھی، اُسے لال گوں کرنے لگی۔ بانو نے اُسے دھکیل کر خود سے علیحدہ کیا، شرما کر شرم کرنے کا حکم صادر کیا اور پرے دھکیلے ہوئے وجود سے دیوانہ وار چمٹ گئی۔ عینی چلائی۔ "یہ کیا بدتمیزی ہے، کبھی دھکا دیتی ہو، کبھی گلے سے لگاتی ہو۔ عجیب ہو تم بھی ——— چھوڑو مجھے، جانے دو۔ میں اور شہزاد اگلے سال تمہارے مہمان بنیں گے اور یاد رکھنا، اگلے سال یہاں وہ بھی موجود ہو۔ کون بھلا؟"

بانو نے سوالیہ نگاہوں سے اُسے دیکھا۔

عینی نے دونوں ہاتھوں کو مخصوص انداز میں جھلایا، نچلا ہونٹ دانتوں میں پھنسا کر دائیں بائیں گھسیٹا اور کھلکھلا کر ہنستے ہوئے بیڈ سے اتر گئی۔ شہزاد کے پہلو میں کھڑی ہو گئی، بولی۔ "اب ہمیں چلنا چاہیے۔ یہ نہ ہو کہ ہم ان کی ایک کا مزہ لیتے رہیں اور کباب میں ہڈیاں ڈال کر ان کا مزہ کرکرا کرتے رہیں۔ بانو! ایک بار مسکراؤ ——— میری نظریں تمہاری مسکراہٹ کو محفوظ کر لیں اور پھر میں یہاں سے چلی جاؤں۔"

وہ لجا کر شرما کر مسکرائی اور سر جھکا کر اپنی پلکوں پر تھرتھراتے ہوئے آنسوؤں کو مسکراہٹ بانٹنے والوں سے چھپانے کی کوشش کرنے لگی۔

شہزاد نے عینی کا ہاتھ پکڑا، دروازے کی طرف گیا، چند لمحوں کے لیے رُکا اور عجیب تافر خیز نگاہوں سے بانو کو دیکھتے ہوئے بولا۔ "تھینکس لیڈی! آئی کینٹ لیاؤٹ یو ——— ناؤ اینڈ فار ایور ——"

بانو نے سر اٹھا کر دیکھا مگر آہستگی سے چوکھٹ کی طرف سرکتے ہوئے طاق کے سوا کچھ دکھائی نہیں دیا۔ جانے والا اُس کی دُنیا سا کر اس کی دُنیا سے دور چلا گیا تھا۔ کبھی وہ بے چینی سے پہلو بدلتے ہوئے، بجرے سے ندامت دِکھاتے ہوئے بالی کی جانب جھکی اور بے اختیار اُس کے سرد ہاتھ کو پکڑ کر ہونٹوں پر وارفتگی سے رگڑنے لگی۔ لوہا، لوہے کو کاٹتا ہے۔ بالی کے ہاتھ لوہے سے کھیلنے کے عادی تھے۔ گرم ہونے میں دیر لگاتے تھے۔ اُس کے ہونٹ دہک کر انگاروں کی طرح سرخ ہو گئے اور لوہے کی قوتِ انجذاب کے لیے امتحان بن گئے۔

سچ کہتے ہیں کہنے والے کہ فولادی سلاخ کو سرخ کر کے موڑنے کے لیے آگ کو اپنی تمام تر شدت میں دیر تک جلنا پڑتا ہے۔

☆☆☆

عینی کی پیش بینی درست تھی۔ بانو کی زندگی پہلے سے کہیں زیادہ خوبصورت ہو گئی تھی۔ ازدواجی مسرتوں نے اتنی تشنگیں سدھا آنکھوں میں بھر دی تھی کہ زندگی میں پہلی مرتبہ دکھائی دینے والا شہر بھی اجنبی نہیں لگتا تھا۔ کام بھی خوب چل نکلا تھا۔ شہزاد کا نصف حصہ اُس کے اکاؤنٹ میں جمع کرانے کے بعد بھی اتنی رقم بچ جاتی تھی جو ان کی ضرورتوں سے کہیں زیادہ ہوتی تھی۔ چھوٹے سے گھر میں جسم کو سورج کی تمازت سوچنے کے لیے ایک گوشہ مخصوص تھا۔ وہ سورج نکلتے ہر دن میں کافی وقت اُس گوشے میں بیٹھ کر رسائل کی ورق گردانی کرتی تھی۔ ایسے ہی ایک سنہری دھوپ کے غسل میں مشغول تھی کہ اچانک آنکھوں کے سامنے نقطے ناچنے لگے۔ دھندلا کر غائب ہو گئے۔ زور کا چکر آیا تھا۔ دل بوجھل ہو گیا۔ جی متلانے لگا تو بجلی کی سی تیزی سے اٹھی اور دوڑتے ہوئے واش بیسن تک پہنچی۔ ابکائیوں کے تسلسل سے دل گھبرانے لگا۔ واش بیسن پر جھکی سوچ میں پڑ گئی۔ "ابھی تو ٹھیک تھی، ایسا اچانک مجھے کیا ہو گیا مجھے؟"

نادان نہیں تھی۔ کانوں نے کچھ سنا نہیں تھا مگر آنکھوں نے بہت کچھ پڑھ رکھا تھا۔ ابکائیاں تھمی تو لبوں پر بے اختیار معصوم سی مسکراہٹ تیرنے لگی۔ کسی خوش آئند خیال کو دونوں ہاتھوں میں رکھ کر ہاتھ جھلانے لگی۔ عینی کی نقل کرنے لگی۔ تمام دن میں، بالی کے کلف لگے سفید کپڑوں کو استری کرتے، اپنا بناؤ سنگھار کرتے، آنکھوں میں دھندلائے ہوئے نقوش والا بچہ گلکاریاں کرتا رہا۔ بالی کی موٹر سائیکل کی آواز کانوں میں پڑی تو بچوں کی طرح ایک ایک جست میں دو دو سیڑھیاں پھلانگتی ہوئی مین گیٹ پر

آئی، گیٹ کھولتے ہی چلائی۔ "ہائے بالی! آج بڑی مزے کی خوش خبری تمھیں سنانے کے لیے موجود ہے میرے پاس!"

"اندر تو آنے دو!" بالی مسکرایا۔

اندر پہنچا، کانوں کے سنے کی سمجھ آئی تو مسکراہٹ رقص میں بدل گئی۔ بانو کو بانہوں میں بھر کر گھماتے ہوئے قہقہے لگانے لگا۔ خوشی اس کے انگ انگ سے پھوٹ رہی تھی۔ بانو نے بہ دقت تمام خود کو اس کی آہنی گرفت سے نکالا اور پھولی ہوئی سانس برابر کرتے ہوئے بولی۔ "کیا مارنے کا ارادہ رکھتے ہو؟"

جوانی ایسے ہی انداز میں یاد دلاتی ہے۔ بھولا ہوا سبق دہراتی ہے۔ بالی نے جھپٹ کر کتاب پکڑ لی۔ بیڈ پر پھینک کر ورق ورق پڑھنے لگا۔ سبق بھولا نہیں تھا مگر جب سبق ہی ٹالنے پر آمادہ ہو تو پڑھنے والے کی لپک غیر معمولی شرارت پکڑ لیتی ہے۔ ننھے سے تاج محل کی دیواروں میں کوئی چہتا نہیں گیا تھا، تبھی سکوت نے دم توڑ دیا اور چنچل قہقہوں کی جلترنگ چھوٹ کر شہر کی ہنگامہ فضا میں تحلیل ہونے لگی۔ اگلی صبح جب وہ اپنی ہاؤسنگ کالونی میں واقع گائنی ہوم سے نکلی تو اس نے بغیر کوئی وقت ضائع کیے یمنی تک اپنی خوشی کے سوتے پہنچا دیے۔ یمنی نے اپنی ماما کو بتلایا۔ ماما نے اُسے مبارک باد دیتے ہوئے مفید مشوروں سے نوازا۔ اپنا فون نمبر نوٹ کرایا اور حکم صادر کیا۔ "اپنی ہر پرابلم مجھ سے شیئر کرتے رہنا۔ دیکھنا، کوئی غلطی نہ کرنا ورنہ بہت بڑے نقصان کا احتمال ہے۔"

اندر کہیں ممتائی احساس جاگنے لگا تھا۔ دل پر ہاتھ رکھ کر بولی۔ "ہائے آنٹی! ڈرائیں تو نہیں۔ مجھے یوں محسوس ہوتا ہے جیسے میں ابھی دنیا میں اتری ہوں۔ میرے اندر عجیب سی ہل چل مچی ہوئی ہے۔ اتنی بھی نادان نہیں ہوں کہ بے پروائی برتوں۔"

ماما نے خوش ہو کر دعائیں دیں اور فون یمنی کو تھما دیا۔ وہ مچلی۔ "کیا تعلیمی سلسلے کو خیرباد کہہ چکی ہو؟"

وہ ہنسی۔ "اب پڑھوں گی نہیں، پڑھاؤں گی۔"

"کس کو؟" یمنی نے مزہ لیا۔

"جانتی تو ہو!" وہ جھینپ کر بولی۔ لال گوں چہرہ مزید سرخ ہو گیا۔ سب کچھ نیا تھا۔ ہر نیاپن، ہر نیا جذبہ، ہر نئی

امانت شرمانے پر مجبور کر دیتی ہے۔ وہ فون بند کر کے شرما رہی تھی، مسکرا رہی تھی اور دل ہی دل میں یمنی اور شہزاد کو دعائیں دے رہی تھی۔ ٹوٹ کے بہار دیکھتے ہی بہار لانے والے کے لیے من میں تشکر کے جذبات بھر جاتے ہیں۔

پیار کی پہلی امانت پہلی مرتبہ پیٹ میں دھڑکی تو وہ ہیجان آمیز خوشی کے ساتھ ساتھ تکلیف سے دہری ہو گئی۔ بھاگتی ہوئی گائنی ہوم پہنچی۔ چیک اپ کروایا۔ سب کچھ 'اوکے' تھا۔ ڈاکٹر نے کچھ احتیاطیں بتلائیں، چند دوائیاں لکھ دیں اور باقاعدگی سے کھاتے رہنے کا مشورہ دیا۔ وہ کلینک میں پوچھ کر اپنی بے تابی پر بہت دیر تک ہنستی رہی تھی۔ "ڈاکٹر صاحبہ! بیٹا ہے یا بیٹی؟"

"ابھی کچھ نہیں کہا جاسکتا۔ چھٹے یا ساتویں مہینے میں الٹراساؤنڈ رپورٹ دیکھ کر اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔" ڈاکٹر مسکرائی۔

وہ بہت سی باتیں بالی سے چھپا لیتی تھی۔ کبھی کبھی لطف لیتے ہوئے بتلا بھی دیتی تھی۔ بالی نے اُس کے لیے ایک نوکرانی کا بندوبست کر دیا۔ وہ گھر سے جاتے جاتے کوئی سخت کام نہ کرنے اور اپنی کیئر کرنے کے حکم کا اعادہ کرتا رہتا تھا۔ پھر جب وہ اپنی بے تابی کو تکلیف کے بہانے میں لپیٹ کر ڈاکٹرز کی الٹراساؤنڈ ٹیبل پر لیٹی تو اس کا دل تیزی سے دھڑک رہا تھا۔ ڈاکٹر کا چہرہ متفکر نظر آیا تو ڈر سی گئی۔ مستفسر ہوئی۔ "کیا ہوا ڈاکٹر صاحبہ؟"

"کچھ نہیں ---- بس کچھ الجھن درپیش ہے۔ لگتا ہے تمھارا سیزیرین ہوگا۔" ڈاکٹر نے سوچ میں مستغرق ہو کر کہا۔ اس کی نظریں متواتر کسی سی بلیک اینڈ وائٹ سکرین پر جمی ہوئی تھیں۔

"یہ سیزیرین کیا ہوتا ہے؟" وہ حیرت سے بولی۔

"یعنی بچے کی ولادت کے لیے تمھارا آپریشن کیا جائے گا۔" ڈاکٹر نے بتلایا تو وہ گھبرا گئی۔

"گھبرانے کی کوئی بات نہیں۔ زمانہ بدل چکا ہے۔ میڈیکل سائنس نے اتنی ترقی کر لی ہے کہ اس آپریشن کو خطرناک قرار نہیں دیا جاتا۔ تم بالکل صحت مند بچے کی ماں ہوگی اور فٹ رہو گی۔"

اسے بیٹی اور بیٹے کا سوال سرے سے بھول گیا۔ نئی افتاد آن پڑی۔ دل پر ہاتھ رکھے گھر لوٹ آئی۔ بالی کو بتلایا

تو وہ بھی پریشان ہوگیا۔ عینی کو بتلایا تو اُس نے ڈھارس بندھائی۔ "ڈاکٹر ٹھیک کہتی ہے۔ آج کل زچگی کے آپریشن کی صورتِ حال بہت بہتر اور حوصلہ بخش ہے۔ فکر نہ کرو، اللہ بھلا کرے گا۔ دل کو لگاؤ گی تو اپنی صحت خراب کر بیٹھو گی۔"

"عینی! مجھے ڈر لگ رہا ہے۔" وہ لرزتی ہوئی آواز میں گھگھیائی۔

"میں ہوں ناں!" عینی نے کہا۔ "میں اور شہزاد آپریشن کے وقت تمھارے پاس موجود ہوں گے۔ ڈرو مت، تمھیں ہم مرنے نہیں دیں گے۔ ابھی تو ہم نے تمھارا بچوں سے بھرا ہوا آنگن دیکھنا ہے۔ ابھی چھٹی نہیں ملے گی میری جان!"

"مجھے اپنی زندگی کا ڈر نہیں، اُس کو سوچتی ہوں تو دل بیٹھنے لگتا ہے۔" وہ رو پڑی۔

"اُس کی زندگی اللہ سے مانگو، احتیاط کرو اور وقتاً فوقتاً ڈاکٹر کے پاس جاتی رہا کرو۔ اُسے کچھ بھی نہیں ہوگا۔" عینی نے کہا۔ "اور ہاں! شہزاد بتا رہا تھا کہ شاہ سائیں نے اُس کی پرسنل سیکرٹری کو بہلا پھسلا کر تمھارا موجودہ پتہ حاصل کر لیا ہے۔ ممکن ہے کہ وہ اپنی خشونت کو تسکین پہنچانے کے لیے کوئی شرارت کرے۔ ایسے میں تم ڈرے بغیر، پورے اعتماد سے اُس کا سامنا کرو گی اور اپنے تئیں محتاط بھی رہو گی۔"

اُسے دھچکا سا لگا۔ "وہ کیا کر سکتا ہے؟"

عینی بولی۔ "یہی سمجھنے کی بات ہے کہ وہ تمھارا کچھ بھی بگاڑ نہیں سکتا۔ اُس نے اَب تک محض تمھاری بُزدلی کی وجہ سے پیش قدمی کی ہے۔ تم ٹھہر کر اُس کا مقابلہ کرو گی تو وہ پچھلے پیروں بھاگ جائے گا۔ سمجھی؟"

وہ گھٹے گھٹے لہجے میں بولی۔ "سمجھ گئی مگر تمھیں میرا ساتھ دینا ہوگا۔"

"پگلی ہو تم! میں تمھارا ساتھ نہیں دوں گی تو کون دے گا؟" عینی مسکرائی۔ "جیسا کہا ہے، ویسا کرو اور اللہ میاں سے اپنی اور اپنے بچے کی سلامتی مانگو۔ خدا حافظ!"

عینی کی نصیحت پر عمل پیرا ہو کر خدا کے حضور جھک گئی۔ جونہی دِل میں کوئی اندیشہ سرسرانے لگتا، وضو کر کے جائے نماز پر بیٹھ جاتی اور ہر خوف سے بے نیاز ہو جاتی۔

جوں جوں خوشی کی ساعت قریب آتی گئی، تکلیف میں اضافہ ہوتا گیا۔ بالی اُسے لے کر شہر کے بڑے میٹرنٹی اسپتالوں میں گیا۔ اُس کا معروف ڈاکٹرز سے چیک اَپ کروایا۔ ہر کسی نے آپریشن تجویز کرتے ہوئے تاریخ مقرر کر دی۔ چونکہ نارمل ڈلیوری کی کوئی گنجائش نہیں تھی، اِس لیے انتظار کو فضول قرار دیا گیا۔

بانو نے عینی کو اطلاع کر دی اور فوراً پہنچنے کی درخواست کی۔ عینی اور شہزاد گھر سے روانہ ہونے لگے تو اُنھوں نے فون پر بانو کو تسلی دیتے ہوئے اپنی روانگی سے مطلع کر دیا۔

سہ پہر، ساڑھے تین بجے، بالی اور بانو اُدھیڑ عمر نوکرانی سمیت گھر سے نکلے۔ گلی میں ٹیکسی موجود تھی۔ پانچ بجے آپریشن کیا جانا مقرر تھا۔ بالی نے کار کا دروازہ کھولا، اُسے بیٹھنے کا اشارہ کرتے ہوئے اگلا دروازہ کھولا اور بیٹھنا ہی چاہتا تھا کہ چونک کر تھم گیا۔ گلی میں سفید رنگ کی نئی چمچماتی کار داخل ہوئی۔ چند لمحوں کے بعد اُس کے عقب میں آتی ہوئی پولیس کی موبائل وین دکھائی دی۔ بریکوں کی زوردار چرچراہٹ کے ساتھ دونوں گاڑیاں اُن کی ٹیکسی کے مقابل آن رکیں۔ پولیس وین کے عقبی حصے سے تین چار سپاہی کودے اور گنیں سنبھالتے ہوئے بالی تک پہنچے۔ وہ ہونق بنا دیدے پھاڑے کھڑا تھا۔ ایسے میں سفید کار کا پچھلا دروازہ کھول کر نکلنے والے شاہ سائیں پر نظر پڑی تو یکبارگی سے دل دھڑک اُٹھا۔ کاٹو تو بدن میں لہو کے مصداق وہ زمین میں گڑ سا گیا۔ بانو ٹیکسی کے اندر بیٹھی شاہ سائیں کو سراسیمہ نگاہوں سے گھور رہی تھی۔ اُس کے سان وگمان میں بھی نہیں تھا کہ یوں، اچانک، بغیر اطلاع کے شاہ سائیں کسی دِن اُس کے راستے میں حائل ہو جائے گا۔

پولیس وین کے اگلے کیبن سے ایک درشت چہرے والا اہلکار اُترا اور تیز تیز قدم اُٹھاتا ہوا شاہ سائیں کے پاس پہنچا۔ بالی کی طرف انگلی کا اشارہ کرتے ہوئے بولا۔ "یہی وہ مردود ہے شاہ سائیں؟"

سچ کہا جاتا ہے کہ قانون کے ہاتھ میں ڈنڈا نہیں ہوتا، ڈنڈے والا قانون کو اپنے ہاتھ میں لیے چلتا ہے۔ شاہ سائیں کی فرعونیت کی آبیاری کے لیے قانون کٹھ پتلی کی طرح اُس کے آگے ہاتھ باندھے کھڑا تھا۔ اس نے استہزائیہ نگاہ بالی پر ڈالی، جھک کر ٹیکسی کے اندر جھانکنے کی کوشش کی اور اپنی پاٹ دار آواز میں بولا۔ "ہاں تھانیدار صاحب! یہی وہ لعین ہے جس نے اپنی سگی بہن کے ساتھ

شادی رچا رکھی ہے۔ ہاۓ ہائے نہ جانے زمین اس ظلم پر شق کیوں نہیں ہوئی، آسمان سے عذاب کیوں نازل نہیں ہوا.... اسے گرفتار کرلیں۔"

بالی کی سانس سینے میں ہی کہیں اٹک گئی۔ بانو نے شاہ سائیں کی بات سنی تو بغیر کوئی وقت ضائع کیے دروازہ کھولا، ٹوکرائی کے سہارے پر باہر نکلی اور چیخی۔ "یہ شخص نہیں بلکہ کمینہ اور خبیث شخص ہے۔ کوئی شخص اپنی بہن سے شادی نہیں کرسکتا، تمہارا ذہن ایسی خباثتیں سوچ سکتا ہے۔ راستے سے ہٹ جاؤ، میں اسپتال جارہی ہوں جہاں میرا ایمرجنسی آپریشن ہے۔"

بانو کا لہجہ غیر معمولی طور پر کرخت تھا۔ تھانیدار ایک ذرا ٹھٹکا، حتر ازل سی نگاہ شاہ سائیں پر ڈالی اور بالی کے قریب آ کر بولا۔ "کیا تمہارے پاس شناختی کارڈ ہے؟"

بالی نے تھوک نگل کر اثبات میں سر ہلایا۔ بانو نے پرس کھولا، بالی کا شناختی کارڈ نکالا اور تھانیدار کی آنکھوں کے سامنے ہوا میں لہراتے ہوئے بولی۔ "دیکھ لیجیے! یہ میرے شوہر، ظفر اقبال کا شناختی کارڈ ہے۔ یہ سرکاری شناخت ہے۔ اسے آپ تو کیا، ملک کی کوئی عدالت بھی جھٹلا نہیں سکتی اور ہاں ایدھا میرا کارڈ، یہ بھی لگے ہاتھوں دیکھ لیجیے۔ دونوں کی ولدیت پر ایک نظر ڈال کر اس خبیث کے منہ پر تھوکیں جو چاند پر تھوکنے کے لیے منہ پھاڑے کھڑا ہے۔"

اس نے یہ یک نگہ متنفر شاہ سائیں کو دیکھا اور پھاڑ کھانے والے لہجے میں بولی۔ "میں کہہ رہی ہوں کہ اپنی حرام کی کمائی سے خریدی ہوئی کار کو ہٹاؤ، مجھے راستہ دو ورنہ میں تمہیں اسی پولیس وین میں بیٹھا کر شہر بھر میں تمہیں تماشا بنادوں گی۔"

شاہ سائیں کے ساتھ ساتھ تھانیدار کی رنگت بھی متغیر ہوگئی۔ اس نے شاہ سائیں پر ایک غصیلی نگاہ ڈالی اور غرایا۔ "آپ تو کہتے تھے کہ یہ دونوں بہن بھائی ہیں۔ یہ تو واقعتاً میاں بیوی نکلے۔ دونوں کے شناختی کارڈ جوتے کی طرح میرے منہ پر لگے ہیں۔ اب آپ بھی اپنی شکل گم کریں ورنہ کسی کو شکل دکھانے کے لائق نہیں رہیں گے۔"

بساط پلٹ گئی تھی۔ شاہ سائیں زخم خوردہ بھیڑیے کی طرح برق رفتاری سے پلٹا اور کاٹ کھانے والی نگاہ بانو پر ڈال کر اپنی گاڑی کی طرف بڑھ گیا۔ پولیس والوں کی تنی ہوئی رائفلیں رعشہ زدہ ہاتھ کی طرح گھٹنوں پر گر گئیں اور چند ہی لمحوں میں راستہ صاف ہوگیا۔

بانو نے بت کی طرح استادہ بالی کی قمیص کو عقب سے پکڑ کر کھینچا اور غصہ سے بولی۔ "تم تو نرے بھوسے کے بنے ہوئے مرد ہو۔ آپ جلدی سے بیٹھ جاؤ، پہلے ہی کافی دیر ہوگئی ہے۔"

بالی خفت بھرے انداز میں سیٹ پر بیٹھ گیا اور اپنے سر کو دونوں ہاتھوں میں پوری قوت سے بھینچ لیا۔ بانو آدھے راستے تک شاہ سائیں کو کوستی رہی پھر قدرے پُرسکون ہوکر خاموش ہوگئی۔ مینی نے سچ کہا تھا، پیسہ انسان کو بہت زیادہ اندرونی قوت بھی فراہم کرتا ہے۔ کل تک کسی سے نظریں ملا کر بات نہ کر پانے والی بانو بھوکی شیرنی کی طرح راستہ روکنے والے پر جھپٹ پڑی تھی اور پل بھر میں اسے اُدھیڑ کر رکھ دیا تھا۔ دونوں شناختی کارڈ ابھی تک اس کے ہاتھ میں دبے ہوئے تھے۔ ان پر دھیان گیا تو طویل سانس حلق سے خارج کرتے ہوئے انہیں واپس پرس میں رکھ دیا۔

راستے میں بانو نے مینی سے فون پر رابطہ کیا، مینی کی آواز سنائی دی۔ "ہم پہنچنے والے ہیں۔ تم گھر میں ہو یا اسپتال میں؟"

وہ بولی۔ "گھر سے اسپتال کے لیے نکل چکی ہوں۔ تم ایسا کرو کہ گھر میں آنے کی بجائے اسپتال پہنچ جاؤ۔" پھر اس نے اسپتال کا نام اور اس کا پتہ سمجھایا اور فون بند کردیا۔ شاہ سائیں کی وارودگی کے سبب ضائع ہونے والے وقت کو ٹیکسی ڈرائیور نے تیز رفتاری سے کافی حد تک پورا کرلیا تھا۔ چونکہ اس کے ٹیسٹ پہلے ہی لیے جاچکے تھے، کیس بھی پوری طرح اسٹڈی کیا جاچکا تھا اس لیے اسپتال پہنچتے ہی اسے فی الفور آپریشن تھیٹر میں منتقل کردیا گیا۔ وہ تھیٹر میں داخل ہونے تک پیچھے مُڑ مُڑ کر دیکھتی گئی۔ نظریں مینی اور شہزاد کو کھوجتی رہیں مگر ان کی آمد قدرے تاخیر سے ہوئی۔ مینی نے پہنچتے ہی، تھکاوٹ کے باوصف، تمام تر متعلقہ امور کو تندہی سے اپنی تحویل میں لے لیا۔

انتظار کا طویل مرحلہ حائل تھا۔ چھ بجے کے قریب آپریشن کا آغاز ہوا۔ مینی گاہے بہ گاہے جالی والے دروازے سے جھانک کر گیلری کے آخری سرے پر واقع تھیٹر کے بند دروازے کو دیکھتی اور دعا کے لیے ہاتھ بلند کر

تھی۔ پونے سات بجے کے قریب تھیٹر کا دروازہ کھلا اور سفید لباس میں ملبوس نرس ہاتھوں میں بچے کو اٹھائے تیزی سے چلتی ہوئی دوسرے کمرے میں گھس گئی۔ یمنی کے کانوں میں بچے کے رونے کی آواز پڑی تھی۔ اُس کے حلق سے اطمینان کی سانس خارج ہوئی۔ بالی نے بے تاب انداز میں پوچھا۔ "آپریشن ہوگیا؟"

یمنی نے کہا۔ "ہاں! اللہ کے کرم سے بچہ بالکل ٹھیک ہے۔"

بالی کا چہرہ فرطِ مسرت سے دمکنے لگا۔ ایسے میں آپریشن ٹیبل پر زندگی اور موت کے بیچ معلق لیٹی ہوئی بانو کی طرف دھیان چلا گیا۔ آنکھیں سوئے آسمان اُٹھ گئیں۔ ایسے میں اچانک جیسے آپریشن تھیٹر میں بھونچال سا آ گیا۔ اندر کوئی ایمرجنسی لاحق ہوگئی تھی جس کے اثرات تھیٹر کے عملے کے چہروں پر ثبت ہوگئے۔ بالی، شہزاد اور یمنی کے چہرے اَن جانے خوف سے فق ہوگئے۔ پندرہ بیس منٹ کا اعصاب شکن وقت گزرتے ہوئے صدیوں کی نقاہت طاری کر گیا۔ پھر طوفان جیسے آیا تھا ویسے ہی فی الفور تھم گیا۔ دو نرسیں سال سائز کے کمبل میں لپٹے، بلکتے نوزائیدہ بچے کو لے کر باہر آ گئیں۔ تینوں جھپٹ کر اُن کے قریب آئے۔ فرطِ اشتیاق سے یمنی نے بچے کو جھپٹنے کے سے انداز میں اُن کے ہاتھ سے لیا اور دیوار کی جڑ کے ساتھ فرش پر بیٹھ گئی۔ دیوانہ وار چومنے لگی۔ اُسے بچے پر جھکے ہوئے بالی کی شاید کوئی پروا نہیں تھی۔ خوشی سے چلائی۔ "یہ بالکل بانو پر گیا ہے، یہ دیکھو، کتنا صاف رنگ ہے اور ......اور ـــ وہ ـــ دیکھو ـــ جت ہاتو ـــ"

بولتے بولتے زبان میں لکنت عود کر آئی۔ یمنی کو یوں لگا جیسے اچانک کوئی بے چینی سی بدن میں بھر گئی ہو، سر اُٹھا کر نرسوں کو باری باری دیکھتے ہوئے بولی۔ "میری بانو کیسی ہے؟"

ایک نرس نے منہ پھیر لیا، دوسری کا چہرہ بجھ گیا۔ بولی تو مایوسی لفظ لفظ سے چھلکنے لگی۔ "اس بچے کی ماں ـــ بے چاری اپنے بیٹے کو بھی دیکھ نہ پائی۔ کوئی پیچیدگی نہیں تھی مگر اچانک، کسی سبب کے بغیر، بلڈ پریشر اس حد تک ڈاؤن ہوگیا کہ ہمارے ہاتھ پاؤں پھول گئے۔ ہمارے دیکھتے دیکھتے تمام تر کوششوں کے باوجود صفر ہوگیا اور ہم اُسے بچا نہ پائے ـــ"

اسپتال کے در و دیوار بالی کی نگاہ میں گھوم گئے۔ اُس نے متوحش نگاہوں سے باری باری یمنی اور شہزاد کو دیکھا، نرسوں کو دیکھا اور کوئی لفظ کہے بغیر گھٹنوں کے بل فرش پر گر گیا۔ کئی ساعتیں ایسے ہی موت کی سی خاموشی کی نذر ہوگئیں۔ شہزاد نے بالی کے کندھے پر ہاتھ رکھا، اپنی نم آنکھوں کو پونچھا اور گلوگیر آواز میں بولا۔ "بالی! حوصلہ کر ـــ"

بالی بہ دقت تمام فرش پر ہتھیلیاں رکھ کر اُٹھا، لڑکھڑایا، بچے کو یمنی کے ہاتھ سے لیتے ہوئے گلوگیر لہجے میں بولا۔ "ہائے بانو! تم نے یہ کیسی خوشی میری جھولی میں ڈالی کہ جھولی ہی خون سے بھر گئی ـــ"

اُس کی آنکھیں پتھرا گئیں۔ لب بس گئے۔ پھر اس کے جسم نے ایک جھٹکا لیا اور وہ اطراف سے غافل ہوگیا۔ چار سُو برپا شور و غوغا سے بے خبر ہو کر دیوانوں کی طرح بچے کو چومنے لگا۔

زندگی کا سفر ایسا ہی دل فریب ہوتا ہے۔ ایک پونجی کھو جاتی ہے تو دوسری ہاتھ لگ جاتی ہے۔ ایک آس کے بعد دوسری آس جاگ پڑتی ہے اور آنکھوں میں چبھی ہوئی کرچیاں چُن لیتی ہے۔ نئے خواب بھرنے لگتی ہے۔

یمنی اور شہزاد کے رنگ و پے میں دُکھ سنسنانے لگا۔ یمنی منہ پر سختی سے ہاتھ جمائے بلک بلک کر رونے لگی۔

ختم شد

